منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

زینت امان

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۲۲ء

منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ نگار

زینت امان

یہ مقالہ

پی ایچ ڈی(اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۲۲ء

©زینت امان

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ مقالہ پڑھنے کے بعد مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان	:	**منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی و تنقیدی جائزہ**
پیش کار	:	زینت امان
رجسٹریشن نمبر	:	763/PhD/URD-F18

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر بشریٰ پروین

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی

(ڈین فیکلٹی آف لینگویجز)

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی، ہلالِ امتیاز (ملٹری)

ریکٹر

تاریخ

اقرار نامہ

میں، زینت امان حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ ڈی اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

زینت امان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم	i
اقرار نامہ	ii
فہرست ابواب	iii
Abstract	vi
اظہار تشکر	vii
باب اوّل: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	**۱**
الف۔ تمہید	**۱**
i موضوع کا تعارف	۱
ii بیان مسئلہ	۲
iii مقاصد تحقیق	۲
iv تحقیقی سوالات	۲
v نظری دائرہ کار	۳
vi تحقیقی طریقہ کار	۴
vii مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۵
viii تحدید	۵
ix پس منظری مطالعہ	۵
x تحقیق کی اہمیت	۶
ب۔ ثقافت: بنیادی مباحث و تصورات	**۶**
ج۔ بحران: بنیادی مباحث و تصورات	**۴۶**

☆ حوالہ جات ۷۹

باب دوم پاکستانی اُردوناولوں میں ثقافتی بحران کے سماجی پہلو ۸۵

الف پاکستانی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات ۱۰۳

ب مغربی کلچر کا فروغ ۱۲۰

ج اقدار کا زوال ۱۳۴

د دیہی و شہری اسالیب زندگی ۱۵۰

☆ حوالہ جات ۱۶۹

باب سوم: پاکستانی اُردوناولوں میں ثقافتی بحران کے معاشی پہلو ۱۷۴

الف مواصلات ۲۲۲

ب ترقیاتی کام ۲۳۴

ج صنعت ۲۴۵

د کمرشلزم و صارفیت ۲۶۴

☆ حوالہ جات ۲۸۰

باب چہارم: پاکستانی اُردوناولوں میں ثقافتی بحران کے دیگر پہلو ۲۸۵

الف سیاست ۲۸۷

ب تعلیم ۳۰۵

ج ہجرت ۳۲۱

د مذہب ۳۳۶

☆ حوالہ جات ۳۵۴

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات ۳۵۹

الف۔ مجموعی جائزہ ۳۵۹

ب۔ نتائج ۳۷۴

ج۔ سفارشات ۳۷۶

☆ کتابیات ۳۷۸

ABSTRACT

Title:Cultural Crisis in selected Pakistani Urdu Novels: Research and Critical Review

Covering the entire society,the novel draws the reader's attention to the problems that the society is facing.The development and decline of society has a direct or indirect effect on literature as well as the novelists have mentioned the challenger in the society in a very good way.Social,economic,psychological and spiritual aspects have been reflected.In selected Pakistani urdu novels,the culture crisis has been critically and researched and such aspects have been brought forward from which the effects of modern civilization can be seen in our culture.The importance of topic also increases from the fact that every person has attachment to his predecessors and he is inclined towards innovation by getting rid of their things.Dicussing the styles and themes of different novels in the thesis.The cultural crisis has been presented.In the first chapter,introducing the subject,the basic discussions have been covered,in which the basic discussions and concepts of culture and crisis have been discussed.

Chapter two describe the traces of modern civilization on Pakistani society,how modern civilization has affected our values.western influence on our culture is becoming more prominent due to which our values are deteriorating.Its influence has been clarified by the study of our rural and urban life.In the third chapter,the communication,industry,commercialism and consumerism are described through the various characters in the novels,reflecting the economic aspects of the cultural crisis in Pakistani urdu novels.Chapter four discusses other aspects of cultural crisis in Pakistani urdu novels including politics,education,migration and religion.

Chapter five contains overall assessment,conclusions and recommendations.This chapter summarizes the first four chapters.An attempt has been made to warp it up.After that,the conclusions have been drawn,while at the end some recommendation have also been made.

اظہار تشکر

میں اللہ رب العزت کی بے حد شکر گزار ہوں کیونکہ انسان خدا کی مدد کے بغیر انتہائی بے بس ہے۔ آج میں جس مقام پر ہوں اُس ذات کا ہی مجھ پر خاص کرم ہے کہ میں اس مقام تک پہنچ سکی۔ پھر اس کے بعد اپنے والدین کی بے حد احسان مند ہوں، اس مقالے کی تکمیل میں میرے اساتذہ، والدین، بہن بھائیوں اور دوستوں کی دعاوٗں، نیک تمناوٗں اور کاوشوں سے انکار ممکن نہیں۔ چونکہ ڈاکٹریٹ کی سطح کے مقالے کی تکمیل اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر بشریٰ پروین کی زیرِ نگرانی عمل میں آئی تو اس سلسلے میں، میں ان کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی اور دل جوئی کی۔ ڈاکٹر بشریٰ پروین جو ایک انتہائی قابل اور شفیق استاد ہیں، ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے باعث اس مقالے کی تکمیل ممکن ہوئی۔ اس کے علاوہ میں دیگر اساتذہ کرام کہ تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میرے ساتھ شفقت کا رویہ رکھا اور مفید مشورے دیئے۔

میرے والدین نے مجھے مالی، اخلاقی اور روحانی ہر طرح کا تعاون مہیا کیا جس کے لیے میں ان کی انتہائی مشکور ہوں۔ اس کے علاوہ میرے بھائیوں اور بہنوں نے میرے لیے ہر طرح کی قربانی دی اور میری رہنمائی کی جس کے لیے میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میری تمام تر کامیابیوں کے پسِ پردہ میری امی اور ابو کی دعائیں ہیں جنھوں نے ہر لمحہ میرے حوصلے کو بلند رکھا اور میرے لیے ہمیشہ باعثِ افتخار ہیں۔ اللہ ان کو اجرِ عظیم عطا کرے اور ان کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ (آمین)

تحقیق کا کام لائبریری کے بغیر پایہ تکمیل کو پہنچنا ممکن نہیں۔ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ جناب ڈائریکٹر لائبریری نمل کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ مقتدرہ قومی زبان، نیشنل لائبریری، اکادمی ادبیاتِ پاکستان لائبریری کا سٹاف بھی شکریے کا مستحق ہے۔

ایک بار پھر میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے ہمت اور طاقت دی کہ میں یہ کام تکمیل تک پہنچا سکوں۔ میں نے اپنے مقالے " منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی و تنقیدی جائزہ " سے متعلق تمام امور کو سمیٹنے اور اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔ انسانی کوشش میں خامیوں اور کوتاہیوں کا رہ جانا خارج از امکان نہیں۔ اُمیدِ واثق ہے کہ میری اس کوشش میں رہ جانے والی نادانستہ فروگزاشتوں اور کم علمی کے باعث ہونے والی کوتاہیوں سے اربابِ علم صرفِ نظر فرمائیں گے۔ اس مقالے

کی خوبی ہے تو وہ میرے اساتذہ کرام کا کمال ہے اور جو خامیاں ہیں وہ سراسر میری اپنی کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری ان خامیوں کو نظر انداز کیا جائے گا۔ شکریہ

زینت امان

اسکالر پی ایچ ڈی (اُردو)

باب اوّل:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف

مجوزہ تحقیقی مقالہ "منتخب پاکستانی اردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی و تنقیدی جائزہ" پر مشتمل ہے۔ بحران شدید مشکل یا خطرے کی صورتحال کا نام ہے، جس کے لغوی معنی بیماری کے زور کا دن، تعطل، اڑچن، نازک حالت کے ہیں۔ ثقافتی بحران کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ وہ صورتحال ہوتی ہے جس میں کوئی معاشرہ یا ثقافت اپنی اقدار، عقائد یا عادات میں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں یا زوال کا سامنا کرتی ہے۔ اس بحران میں مختلف عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں جس میں عالمگیریت، تکنیکی ترقی، معاشرتی تبدیلیاں یا دیگر ثقافتوں کے اثرات، تیز رفتار سماجی تبدیلی شامل ہیں۔ ثقافتی بحران معاشرتی امن و استحکام کو متاثر کرتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں پچاس اور نوے کی دہائیوں کی دو نسلیں آباد ہیں۔ پچاسویں دہائی کی نسل کا مشاہدہ سب سے زیادہ ہے اس نسل نے معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ لیکن جدید ٹیکنالوجی کے جو مظاہر آج کی نسل دیکھ رہی ہے پچھلی نسل اُس سے ناآشنا ہے مگر اِس وقت یہ نسل اُن ثقافتی اثرات کی زد میں ہے۔ طاقتور قوتیں اپنے معاشی ایجنڈے کو پورا کرنے کے لیے عالمگیریت کا نظریہ نافذ کرنے میں لگی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے دنیا میں مختلف قسم کے بحرانوں نے سر اٹھایا ہوا ہے جس میں ثقافتی بحران اہمیت کا حامل ہے۔

اکیسویں صدی میں بدلتے ہوئے حالات نے ناول نگاری کو ایک نئی جہت دی، فکری سطح پر ناول نگار متاثر ہوا اور ناول کے موضوعات کو بھی وسعت ملی۔ نئی صدی جہاں انسان کے لیے بہت خوشیاں، آسانیاں اور ایجادات لے کر آئی وہیں بین الاقوامی سیاسی چالیں، دہشت گردی، قدرتی آفات، میڈیا کا پھیلتا جال اور نوجوانوں میں بڑھتا ہوا اُداسی، ناکامی اور مایوسی کا احساس بھی لے کر آئی۔ ادیب جو کہ معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے وہ اپنے اردگرد کی فضا سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے احساسات کو قلم کی روشنائی سے عیاں کرتا ہے۔ اس حوالے سے زیرِ نظر مقالے میں "دشتِ وفا" آغا گل، "پانی مر رہا ہے" آمنہ مفتی، "روشن اندھیرے" امجد جاوید، "دھنی بخش کے بیٹے" حسن منظر، "کوہ گراں" خالد فتح محمد، "میرواہ کی راتیں" رفاقت

حیات،"گل مینہ "زیف سید،"ناتمام"عاصم بٹ،"نولکھی کوٹھی "علی اکبر ناطق،"صفر سے ایک تک"مرزا اطہر بیگ،"ادھ ادھورے لوگ"محمد حفیظ خان،"کاروانِ وجود"نثار عزیزبٹ،"چار درویش اور ایک کچھوا"سید کاشف رضا،"گراں"طاہرہ اقبال کے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے۔اس مقالے میں منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو کہ اُردو ادب میں اضافے کی ادنیٰ کاوش ہوگی۔

ii۔بیانِ مسئلہ:

ناول نگار اپنے عہد کا نباض اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے،اس لیے ناول اپنے دور کے سماج، تہذیب وثقافت کے حوالے سے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔پاکستان میں ہر علاقے کا ایک اپنا کلچر اور روایات ہیں جو اس علاقے کی ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔دنیا ایک گلوبل ولیج کی مانند ہے،کسی بھی ملک میں کوئی اقتصادی،سیاسی،سماجی تبدیلی آتی ہے تو غیر مشروط طور پر سماجیاتی بشریات اس سے متاثر ہوتی ہے اور بلاواسطہ اس کے کلچر یا ثقافت پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔منتخب پاکستانی اُردو ناولوں کے ذریعے مصنفین نے اپنے عہد کے سماج کی گھٹن،معاشی ناانصافیوں،طبقاتی کشمکش،معاشی وسماجی حالات کی خرابی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سماج کے ثقافتی بحران کو مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس لیے ان ناولوں میں موجود ثقافتی بحران کے پہلوؤں کے متعلق تحقیق کی گئی ہے۔

iii۔مقاصدِ تحقیق

۱۔ثقافتی بحران کے مختلف پہلوؤں کے حامل منتخب ناولوں کے فن کی تفہیم وپیشکش کرنا۔
۲۔منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران کے سماجی،معاشی اور دیگر پہلوؤں کی نوعیت کو واضح کرنا۔
۳۔منتخب پاکستانی اُردو ناولوں کی کہانیوں میں پاکستان کی مختلف ثقافتوں کے بحران کا تجزیہ کرنا۔

iv ۔ تحقیقی سوالات

۱۔ثقافتی بحران کیا ہے اور یہ بحران معاشرے میں کیسے اثرانداز ہوتا ہے؟
۲۔منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں کون کون سے عوامل ثقافتی بحران کا باعث بنتے ہیں اور پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافت کو درپیش چیلنجز کیا ہیں؟
۳۔منتخب پاکستانی اُردو ناولوں کے کردار کہاں تک ثقافتی بحران سے متاثر ہوئے اور کیوں؟
۴۔ثقافتی بحران کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مثبت ومنفی کیفیات کیا ہو سکتی ہیں؟

۷۔ نظری دائرہ کار

ناول ادب کی انتہائی اہم صنف ہے، آج ناول نگاری کا فن اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے ناول کو زندگی کا عکس کہا جاتا ہے۔ اس لیے ناول اپنے دور کے سماج، تہذیب و ثقافت کے حوالے سے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں ہر علاقے کا اپنا کلچر اور روایات و اقدار ہیں جو اس علاقے کی ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔ دنیا گلوبل ولیج کی مانند ہے، کسی بھی ملک میں اقتصادی سماجی، سیاسی تبدیلی آتی ہے تو غیر مشروط پر سماجیاتی بشریات بھی اس سے متاثر ہوتی ہے اور بلاواسطہ اس کے اثرات کلچر یا ثقافت پر مرتب ہوتے ہیں۔ حالات کا تغیر، تعلیم کا بڑھتا ہوا رجحان، صنعت کا فروغ، صرفی کلچر اور دیگر معاشرتی عناصر کے باعث ثقافتوں میں بحران پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مصنفین نے اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے سماج کی گھٹن، معاشی ناانصافیوں، طبقاتی کشمکش، معاشی و سماجی حالات کی خرابی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سماج کے ثقافتی بحران کے مختلف پہلوؤں کو مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب "پاکستانی کلچر" میں ثقافت کو کچھ یوں بیان کیا ہے "کلچر اس کل کا نام ہے جس میں مذہب وعقائد، علوم واخلاقیات، معاملات و معاشرت، فنون وہنر، رسم ورواج، افعال ارادی و قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسان معاشرے کی ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔"

فیروز الغات میں بحران کے معنی تعطل، اڑچن اور نازک حالت کے ہیں۔ ویکیپیڈیا کے مطابق کسی شے میں خطرناک حد تک کمی واقع ہونا بحران کہلاتا ہے۔ ثقافتی بحران سے مراد ایسی صورتحال ہے جس میں معاشرے کو اپنے ثقافتی اصولوں، اقدار یا شناخت میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسے میں حالات ایک جیسی صورتحال پر برقرار نہیں رہتے بلکہ ان میں تغیر و تبدل آتا رہتا ہے۔ مفتی منیب الرحمن اپنے مضمون "بحران در بحران" میں بحران کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دیوانگی کی حالت، بخار وغیرہ میں اچانک پیدا ہونے والا تغیر، مریض پر حالت بیماری اور تندرستی کی کشمکش" اس حوالے سے دیکھا جائے تو ثقافتی بحران ایک ایسے واقع کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک خطرناک صورتحال کا باعث ہوتا ہے اور مجموعی طور پر معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ڈاکٹر مظفر حسن ملک اپنی کتاب

"ثقافتی بشریات" میں لکھتے ہیں کہ "ثقافتوں کے زوال کے اسباب متعدد اور متنوع ہیں۔ دنیا اتنی سکڑ گئی ہے کہ ایک معاشرے کے اثرات دوسرے پر کئی طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں اور یوں کمزور ثقافتیں موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔"

سیموئیل پی ہنٹنگٹن اپنی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" میں لکھتے ہیں کہ:" تہذیبیں فنا ہوتی ہیں وہ جامد نہیں ہوا کرتی، ان میں عروج و زوال رونما ہوتے رہتے ہیں وہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ ہر تہذیب کسی نہ کسی چیلنج کے جواب میں پیدا ہوتی ہے، خوشحالی کے مرحلے سے گزرتی ہے اس کے بعد مسائل کا زمانہ آتا ہے یا پھر آفاقی حالت ظاہر ہوتی ہے اور اس کے بعد منتشر ہو جاتی ہے۔" ہر شے پر زوال آنا لازم ہے، کوئی چیز ہو یا نظریہ، ضرورت ہو یا قدر، تہذیب ہو یا ثقافت ایک عروج کے بعد زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے بنیادی رہنمائی، تحقیقی و تنقیدی کتب جن میں ایڈورڈ سعید کی کتاب "شرق شناسی"، سیموئیل پی ہنٹنگٹن کی کتاب "تہذیبوں کا تصادم"، زبیر رانا کی کتاب "پاکستان تہذیب کا بحران"، محمد نعیم ورک کی کتاب "اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۷ء)"، ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب "پاکستانی معاشرہ"، ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی کتاب "ثقافتی بشریات"، ارشد محمود کی کتاب "ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ" وغیرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے منتخب پاکستانی اردو ناول میں ثقافتی بحران کے پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق حقائق کی تلاش و جستجو اور جانچ پڑتال کا نام ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں موضوع سے متعلق بنیادی ماخذات میں مصنفین کے ناول جبکہ ثانوی ماخذات میں موضوع سے متعلق تنقیدی و تحقیقی کتب اور شائع شدہ مواد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حصول مواد کے لیے سرکاری، نجی اور جامعاتی کتب خانوں تک رسائی کو ممکن بنایا گیا، اس کے ساتھ ساتھ تحقیقی مواد کو حاصل کرنے کے لیے انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں مشاہداتی اور تجزیاتی طریقہ کار کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ پاکستانی اور علاقائی ثقافتوں کے موضوع پر گزشتہ برسوں کے دوران کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور جدید ذرائع مواصلات میں حیرت انگیز حد تک ترقی نے ہماری ثقافت پر گہرے

نقوش مرتب کیے ہیں، جہاں ایک طرف اس کے مثبت نتائج ہیں تو وہاں ہی دوسری طرف یہ ہماری ثقافت میں بحران کا باعث بنے ہیں۔

vii ۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

اردو ناولوں پر مختلف نوعیت کے تحقیقی کام کیے گئے ہیں مثلاً اُردو ناول میں تہذیبی شناخت کا مسئلہ، تحقیقی مقالہ ایم فل اُردو، مقالہ نگار سعیدہ ارم، نگران ڈاکٹر صلاح الدین درویش، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔ اُردو ناول پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات (آغاز تا ۲۰۱۲) تحقیقی مقالہ پی۔ایچ۔ڈی اُردو، مقالہ نگار انیلا سعید، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد۔ لیکن ابھی تک اس حوالے سے کوئی تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔

viii ۔ تحدید

مجوزہ تحقیقی مقالہ "منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران: تحقیقی و تنقیدی جائزہ" پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں کل چودہ پاکستانی اردو ناولوں کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں "دشتِ وفا" آغا گل، "پانی مر رہا ہے" آمنہ مفتی، "روشن اندھیرے" امجد جاوید، "دھنی بخش کے بیٹے" حسن منظر، "کوہِ گراں" خالد فتح محمد، "میر واہ کی راتیں" رفاقت حسین، "گلُ مینہ" زیف سید، "ناتمام" عاصم بٹ، "نولکھی کوٹھی" علی اکبر ناطق، "صفر سے ایک تک" مرزا اطہر بیگ، "ادھ ادھورے لوگ" محمد حفیظ خان، "کاروانِ وجود" نثار عزیز بٹ، "چار درویش اور ایک کچھوا" سید کاشف رضا، "گراں" طاہرہ اقبال کے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جس میں منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں موجود ثقافتی بحران سے متعلق تحقیق کی گئی ہے اور اس دوران ان ناولوں میں موجود ثقافتی بحران کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر کُتب کا مطالعہ بھی تحقیق میں شامل کیا گیا ہے۔

ix ۔ پس منظری مطالعہ

اس موضوع پر تحقیقی کام مکمل کرنے کے لیے مطلوبہ علم کی جو جہتیں بنتی ہیں ان میں اردو ناول، ثقافت، تہذیب، پاکستانی ناول نگاروں کے ناولوں کے بارے میں ابتدائی اور ضروری معلومات شامل ہیں مگر یہ تحقیق پاکستانی ناولوں میں ثقافتی بحران کے متعلق ہے لہٰذا مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے:

۱۔ تہذیبوں کا تصادم از سیموئیل پی ہنٹنگٹن

۲۔ شرق شناسی از ایڈورڈ سعید

۳۔ پاکستان تہذیب کا بحران از زبیر رانا

۴۔ پاکستانی کلچر از جمیل جالبی

۵۔ اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ از محمد نعیم ورک

۶۔ نقوشِ ثقافت (مرتب) سید قاسم محمود

۷۔ ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ از ارشد محمود

x ۔ تحقیق کی اہمیت

ناول اپنی گوناگوں خصوصیات کی بناء پر اردو ادب میں نمایاں مقام و مرتبے کا حامل رہا ہے۔ ادیبوں کے تخلیقی جوہر کا اظہار شاعری کے بعد اگر صحیح معنوں میں ہوا ہے تو وہ ناول ہے۔ اُردو ناول اپنے آغاز سے اب تک سماج میں ہونے والی مختلف سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور مذہبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خوبصورت مناظرِ فطرت سے اپنا دامن سجاتا رہا ہے۔ ناول نگار ناول میں سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور مذہبی صورتحال کی تفصیلات بیان کر کے ناول کو ایک دستاویزی حیثیت عطا کرتا ہے یہ مقالہ منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران کے حوالے سے اردو ناول کو سمجھنے میں ایک اہم قدم ہے۔ سیاست، معاشرت، مذہب اور تہذیب و ثقافت یہ سارے موضوعات ہیں جو کسی ناول کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں، ان تمام ناولوں میں یہ عناصر موجود ہیں اور زیرِ نظر ناول نگاروں کی تحریروں کا خاص وصف پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران کی عکاسی ہے۔ اس مقالے میں ایک طرف تو ناول نگاری کے فنی حوالے سے ثقافتی مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے اور دوسری طرف ان تمام لکھنے والوں کی نثر نگاری کے ایک اہم پہلو کو اجاگر کر کے ان کی تخلیقی روش کی تفہیم کا ایک دریچہ وا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب: ثقافت: بنیادی مباحث و تصورات

تہذیب و تمدن اور ثقافت کا جنم انسان کے زمین پر قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا اور اسی بنا پر دنیا کی ہر قوم اپنی تہذیب و ثقافت اور اسلوبِ حیات سے پہچانی جاتی ہے۔ تمام بنی نوع انسان یکساں اہمیت کے حامل ہیں، اسی وجہ سے سب کی سوچ اور مقصد بلند معیارِ زندگی گزارنا ہے۔ مگر زندگی گزارنے کے جو طریقے انسان نے دریافت کیے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، پھر بھی دیکھا جائے تو ان طور طریقوں میں کافی حد تک یکسانیت

پائی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہر علاقے کی تہذیب و ثقافت اور تمدن ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہیں۔ انسان کے مختلف گروہوں اور نسلوں کے علاقائی، جغرافیائی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے زیرِ سایہ تہذیب و تمدن کا مزاج بنتا اور بگڑتا رہتا ہے۔ ہر قوم اپنی اقدار، رسوم و رواج، زبان اور مذہب کی بدولت انفرادی شناخت رکھتی ہے۔ ہر ثقافت میں خوبیاں اور خامیاں موجود ہوتی ہیں جنھیں کسی تعصب کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کی خامیوں پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے۔

ہر ملک ہر معاشرے کی اپنی ایک خاص ثقافت ہوتی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سماج کا ہر فرد ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے اور ہر شخص کی اُمیدیں دوسرے شخص سے جُڑی ہوتی ہیں۔ ان ہی اُمیدوں کے دائروں اور لہروں کی بدولت ہر معاشرہ ایک خاص ثقافت کا پابند ہوتا ہے۔ ثقافت کی بنیاد کچھ خاص اُصولوں پر ہوتی ہے اور ہر شخص پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اِن اُصولوں پر عمل پیرا ہو۔ ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی فرد پیدائشی طور پر کوئی خاص ثقافت لے کر نہیں آتا بلکہ وہ سماج میں رہ کر اُسی کو اپناتا ہے جو اسے وراثت میں ملتی ہے ۔یہ دوسری بات ہے کہ عصری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ثقافتی حالات میں بھی تغیر و تبدل، ترمیم و اضافہ کا عمل جاری رہتا ہے۔ ثقافت کسی کی بھوک تو نہیں مٹا سکتی البتہ یہ انسان کی سوچ کو ایک ایسے مقام پر لاتی ہے جہاں وہ اپنی خوشی اور غم دوسروں کے ساتھ بانٹ سکے اور دوسروں کے جذبات و احساسات کو محسوس کر سکے۔ ثقافت جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ سماج کے چند اشخاص جب دوسرے سماج کی ثقافت کے چند اُصولوں کو اپناتے ہیں اور پھر پورا سماج ان اُصولوں کو اپنالیتا ہے تو یہ اُصول دوسرے سماج کی ثقافت کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی شخصیت کو اسی وقت اُجاگر کر سکتا ہے جب وہ اپنی ثقافت کو مکمل طور پر اپنائے گا۔ یہ بات صحیح ہے کہ انسان کی پہچان اس کی ثقافت سے ہوتی ہے ایک اکیلا شخص کسی ملک کی ثقافت کو نہیں بناتا بلکہ اس ملک کی پوری قوم ثقافت بناتی ہے۔

ثقافت سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے مطالعہ میں کن عناصر پر توجہ ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے ہمیں ثقافت کے بارے میں زیادہ معلومات ہونی چاہیے۔ لفظ ثقافت انگریزی لفظ کلچر کے مترادف ہے۔ کلچر کے لیے اُردو میں تہذیب و تمدن اور ثقافت جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن عام طور پر ثقافت کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ "ثقافت" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ "ث۔ق۔ف" ہے۔ لغوی طور پر اس سے مراد کسی شے، مقام یا مقصد کو تلاش کر لینا یا پالینا ہے۔ عربی زبان میں "التقیف" کا لفظ بہت

زیرک اور چالاک شخص کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ "ثقیف" سے مراد بہت زیادہ ترش سرکہ ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ثقافت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"دوسرا لفظ "ثقافت ہے۔ لسان العرب میں اس کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ علوم وفنون وادبیات پر قدرت ومہارت۔ کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ،سیدھا کرنا۔ گویا کہ یہ لفظ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق "ذہن" سے ہے۔"(۱)

عربی زبان کے علاوہ فارسی میں بھی اس لفظ کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ فارسی میں ثقافت "فرہنگ" کو کہتے ہیں۔ جو کہ دو اجزاء پر مشتمل ہے "فر" اور "ہنگ"، فر کے معنی ہیں آگے یا اُوپر۔ یہ لفظ جب اسم سے پہلے استعمال ہوتا ہے تو چمک دمک ، عظمت اور شکوہ کے معنی دیتا ہے ، جبکہ ہنگ اوستائی زبان کے لفظ تھنگا سے مشتق ہے جو کہ کھینچنے ، لے جانے ، وزن اور بوجھ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کے مرکب (فرہنگ) کا لفظی مفہوم اُوپر لے جانا، یا باہر نکالنا ہے۔ قرآن پاک میں لفظ ثقافت کا مفہوم پانا یا تلاش کرنا ہے۔ انگریزی میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ رائج ہے۔ ثقافت دراصل نام ہے کسی قوم یا انسانی گروہ کے ان مخصوص نظریات اور عقائد ،افکار و اخلاق، تہذیبی رواج وروایات ،طرزِ بودوباش ،اندازِ معاشرت، فکری اور تحقیقی سرگرمیوں کا جو اُسے دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہے۔ ہر قوم کی ثقافت ایک مخصوص ومنفرد نظریات پر انحصار کرتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زندہ و باوقار قوم کبھی اپنی ثقافت کے تحفظ سے غافل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کو مٹانے والی قوتیں اس کی جڑ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں رکھتیں وہ اس کی ثقافت پر حملہ آور ہو کر اسے مسخ کر کے اپنے لیے کامیابی کی راہ نکال لیتی ہیں۔ کسی قوم کی مخصوص ثقافت کا کسی دوسری قوم کی ثقافت میں گم ہو جانا اس قوم کی موت کا اعلان ہے۔ اس قوم کو خواہ دوسرے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں لیکن وہ نہ ہی کوئی حرکت کر سکتی ہے اور نہ ہی اُسے اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ انسان اور تہذیب و ثقافت لازم وملزوم ہیں، تہذیب و ثقافت کا انسان سے گہرا تعلق ہے۔ تہذیب و ثقافت کا انسان کے بغیر کوئی وجود نہیں اسی طرح بنا تہذیب و ثقافت انسان نہ صرف ادھورا ہے بلکہ انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔ اس لیے کہ یہی وہ چیز ہے جو اسے باقی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اور اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی ہے۔ ثقافت کی توضیحی تعریف ایس۔اے۔رحمان نے بھی کی ہے، ان کے مطابق:

"ثقافت سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کی پوری زندگی کا بھرپور نمونہ پیش کرتی ہے جو قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہتے سہتے ہیں اور جو معاشرے میں سرایت کر جانے والا

ایک ایسا ہمہ گیر نقطہ نظر باہم متحد کر دیتا ہے جسے یہ لوگ شعوری طور پر اپناتے یا خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔"(۲)

آگے چل کر رحمان نے ثقافت میں انسانی سرگرمیاں، دل چسپیاں، رسم و رواج، مذہب اور سیاسی اداروں کو شامل کر کے اپنے تصورِ ثقافت کو ہمہ گیر پہلو بنالیا ہے۔ ثقافت کا ایک اور توضیحی اگرچہ قدرے مبہم تصور ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے پیش کیا ہے: ثقافت تین چیزوں سے عبارت ہے مذہب، تاریخ اور جغرافیہ۔ تین چیزیں اسے نمو بخشتی ہیں دل، دماغ اور دھرتی۔(۳) ثقافت کے ہمہ گیر تصور کو اپنانے والوں میں ملک حسن اختر بھی شامل ہیں، ان کی رائے میں ثقافت طرزِ زندگی ہے: اس میں لوگوں کے رہن سہن، سوچ، علوم و فنون، معیشت اور سیاست کے اُصول، شاعری اور موسیقی، روایات، مذہبی عقائد، زبان اور رسوم شامل ہیں۔"(۴) فیض احمد فیض اپنی کتاب "ہماری قومی ثقافت" میں ثقافت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

"ثقافت تو ایک عمل تشخص کا نام ہے اگر آپ یہ کہیں کہ انسان کو دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اس کے خدوخال کیا ہیں یا کسی کو اپنے خدوخال کا علم ہی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا اس کی شخصیت مفقاد ہے اسی طرح قومی ثقافت زندگی سے قومیت کے وجود سے یا کسی وطن کے وجود سے الگ اور علیحدہ نہیں ہوتی وہ تو اس کا داخلی حصّہ ہے۔"(۵)

جن چیزوں کو معاشرہ اہم سمجھتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے وہی اس کی معاشرتی قدریں ہوتی ہیں۔ ان قدروں میں عقائد شامل ہیں، معاشرے کے مستقبل کے متعلق ان کے خواب شامل ہیں۔ اسی طرح ان کی اُمنگیں اور اُمیدیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب جو باطنی نظام ہے اچھائی اور بُرائی کا، خوب صورتی کا، سلیقے اور بد سلیقگی کا یہ سب ان کے کلچر کا باطنی پہلو ہے۔ ظاہری پہلو وہ ہوتا ہے جب وہ ان قدروں، ان جذبات اور ان عقائد کا اپنی زندگی میں اظہار کرتے ہیں:

"ثقافت میں زندگی کا جتنا کاروبار ہے وہ سب شامل ہے۔ لباس ہے، زبان ہے، خوراک ہے، رہائش کے طریقے ہیں، رسوم و رواج ہیں، آپس میں ملنے جلنے کے طریقے ہیں، زندگی کا جتنا روزمرہ ہے جس کو انگریزی میں "وے آف لائف" کہتے ہیں وہ سب زندگی کا تمام روزمرہ کسی معاشرے کے کلچر کی ناتراشیدہ صورت ہے۔ جب کوئی آدمی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے یا خاص قسم کا کھانا کھاتا ہے اُس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں کلچر کا کام کر رہا ہوں وہ تو غیر

شعوری بات ہے۔وہ تو روزمرہ کے طریقے سے عمل کرتا ہے۔"(۶)

معاشرے کے وجود کی بنیادی اکائی ثقافت ہے، ثقافت اپنے پیروکاروں کی اجتماعی سوچ اور ان کی اچھائیوں اور برائیوں کے اختیارات کی عکاس ہوتی ہے۔بنیادی طور پر ثقافت اپنے اندر کسی بھی معاشرے کی تمام خوب صورتیوں کو سموئے ہوتی ہے، کوئی بھی معاشرہ اپنی ثقافت کی وجہ سے دوسرے معاشروں سے ممتاز ہوتا ہے اور ہر معاشرہ کی ثقافت منفرد ہوتی ہے جو کہ اس علاقے کے لوگوں کی تاریخ، تہذیب اور اس کے رسم و رواج کا عکاس ہے۔کسی بھی معاشرے میں ایک فرد کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی تمام پہلوؤں کی تربیت اس معاشرے کی ثقافت کے مطابق تشکیل پاتی ہے:

"کلچر یا ثقافت گانے بجانے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قومی اور معاشرتی زندگی کا بہت ہی اہم شعبہ ہے۔ کلچر معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے، پورے طریقہ زندگی کو کلچر کہتے ہیں۔ کلچر کی اثر اندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے۔عقائد اور نظریات کے ذریعے بھی۔"(۷)

معاشرے کا جو ڈھانچہ ہو گا اس کی جیسی ہیت ترکیبی ہو گی یا جیسا سوشل اسٹرکچر ہو گا کلچر تمام تر اس کے تابع ہو گا۔ جیسے سیاسی یا معاشرتی حالات بدلتے ہیں تو اس کے مطابق کلچر کے تصورات اور اس کی اشکال بھی بدلتی رہتی ہیں۔ کلچر نہ کوئی جامد شے ہے اور نہ اسے دوام حاصل ہے، کسی بھی معاشرے کا وجود اس کی ثقافت کے بغیر ناممکن ہے۔ثقافت کی اصطلاح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ثقافت کو انسانی علوم کے مختلف ماہرین نے اپنے اپنے دور میں اپنی دانست کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔انگریزی زبان میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ موجود ہے جو اب اُردو زبان میں بکثرت استعمال ہونے لگا ہے۔نامور ادیب، محقق اور استاد ڈاکٹر غلام علی الانا نے ثقافت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا ہے:

"ثقافت کے دائرے کے اندر لوگوں کی روزانہ زندگی، خوراک، گزر معاش، لباس، رہن سہن کے طریقے، زبان، رسم و رواج، زراعت اور اس کے ذرائع آجاتے ہیں۔ مقامی زبانیں، بولیاں بھی ثقافت کے مطالعے کے دائرے میں آجاتی ہیں کیونکہ وہ لوگوں کے خیالات، اظہار، سوچ بچار، تخیل اور ذہنی ارتقاء کے مطالعے میں مددگار ہوتی ہیں۔ اس لیے ثقافت ایک طرف انسان کی مادی زندگی کے لیے ضروری اشیا اوزار، اسلحہ،

لباس اور رہائش وغیرہ سے واسطہ رکھتی ہے اور دوسری طرف غیر مادی یعنی روحانی
زندگی سے متعلق چیزوں جیسا کہ زبان، علم و ادب، فن، مذہب، اخلاق اور قانون
سے بھی نسبت رکھتی ہے۔"(۸)

ڈاکٹر غلام علی الانا نے ثقافت میں شامل جن چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں لوگوں کی خوراک، زندگی گزارنے کے طریقے، رسم و رواج، روایات، زبانیں اور بولیاں وغیرہ شامل ہیں۔ڈاکٹر غلام علی الانا نے کسی مخصوص علاقے کی ثقافت کے حوالے سے مادی چیزوں کے علاوہ غیر مادی چیزوں مثلاً زبان، مذہب، عقیدوں اور زندگی گزارنے کے طریقوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ان کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثقافت دو بڑے اجزاء یعنی مادی اور غیر مادی اجزائے ثقافت پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر سید عبد اللہ ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کلچر وہ ہے جو اندر کی کسی غیر مرئی قوت کے زیرِ اثر، خارج میں انسان کے اعمال و افعال
اور مادی ماحول میں ظہور پاتا ہے۔خواہ وہ ظہور افراد کی انفرادی زندگی میں ہو (جیسا کہ
قدیم خیال یہی تھا مثلاً افلاطون کے یہاں تہذیب نفس اور تکمیل نفس کا تعلق فرد سے
ہے) یا اجتماع کے اعمال و افعال میں ہو (جیسا کہ جدید سوشیو آلوجی اور این تھروپالوجی کے
علماء کا خیال ہے)۔"(۹)

ثقافت تہذیب کی ابتدائی شکل کا نام ہے جو نسل در نسل کے عمل و تعامل سے تشکیل پاتی ہے۔اس کا تصور اتنا وسیع ہے کہ اس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جنہیں انسانی فکر اپنی گرفت میں لاسکتی ہے۔ثقافت کا ماخذ انسان اور اس کے ارد گرد کے طبعی، جغرافیائی، معاشی عوامل، مذہب اور اس کے لامحدود تجربات ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کے لیے قواعد و ضوابط اور نظامِ زندگی مرتب کرتا ہے۔ثقافت مذہب سے اثر انداز تو ہوتی ہے لیکن یہ کوئی مذہبی بندش یا کسی قبیلے، معاشرے، قوم یا آمر مطلق کا کوئی حکم نہیں ہے۔ثقافت افرادِ معاشرہ کی زندگی اور ان کے رویے کے اندر گھل مل کر ان کی زندگی کا حصّہ بن جاتی ہے۔بلاشبہ اس عمل میں طویل وقت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کسی عمل کو ہماری زندگیوں اور رویوں کا جزو بننے میں اتنا عرصہ تو لگتا ہی ہے۔بقول انوار ہاشمی: ثقافت انسان کی جدوجہد اور عمل کے اس پہلو کا نام ہے جسے وہ مالی منفعت یا مادی نقطہ نظر سے نہیں کرتا بلکہ اس عمل سے اس کا مقصود روحانی اور ذہنی تسکین ہوتا ہے۔(۱۰)

ثقافت وہ ضابطہ حیات یا مذہبی، فکری اور جذباتی قوت ہے جو انسان کی زندگی کی تمام تر سرگرمیوں اور افعال میں توازن، ترتیب، ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرتی ہے۔ یہ ہماری جبلت پر اثر انداز ہو کر ہمیں کسی معاشرے میں رہنے اور اس کے قواعد و ضوابط اور ضروریات کو پورا کرنے کا اہل بناتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر اپنی کتاب "ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری" میں لکھتے ہیں کہ: ثقافت، اقدار و رسمیات کا مجموعی نظام ہے جس سے کسی ایک سماجی گروہ کے تمام افراد خود کو وابستہ محسوس کرتے ہیں۔ ثقافتی وابستگی کا اثبات جسے فرد داخلی طور پر محسوس کرے، اس کی ثقافتی شناخت ہے۔[11]

ثقافت ایک پابندی کا نام ہے جو افرادِ معاشرہ کی زندگی کو قواعد کا پابند کرتی ہے۔ اگر یہ قوت موجود نہ ہو تو شاید آج کا جدید معاشرہ بھی جنگل کا سماں پیش کرنے لگے اور ایک دھاگے کے ٹوٹنے سے جیسے موتی بکھر جاتے ہیں ویسے ہی یہ معاشرہ بھی انتشار کا شکار ہو جائے۔ اس لیے ثقافت کو معاشرے کی روح مانا جاتا ہے۔ ثقافت کی ضرورت و اہمیت ایک طرف لیکن اس کی حدود میں وہ وسعت اور پائیداری نہیں ہوتی جو تہذیب میں ہوتی ہے۔ ثقافت کے یہی تمام مظاہر جب عوامی سطح پر اُتر کر اور تقلیدی انداز اختیار کر کے دور دراز تک پھیل جاتے ہیں تو تہذیب کہلاتے ہیں اور وہ ثقافت جو جغرافیائی حد بندیوں میں جکڑی ہوتی ہے، تہذیب کی صورت اختیار کر کے اکثر جغرافیائی حد بندیوں کو بھی پار کر جاتی ہے یعنی تہذیب، ثقافت ہی کے پھیلاؤ کا دوسرا نام ہے اور ثقافت تہذیب کی وہ صورت ہے جو بنیادی طور پر تخلیقی ہے جبکہ تہذیب اس صورت کا نام ہے جو تقلیدی ہے۔ ہنٹنگٹن اس حوالے سے کہتا ہے: تہذیب وہ ہوتی ہے جو میکانات، ٹیکنالوجی اور مادی طاقت پر محیط ہوتی ہے جبکہ ثقافت کسی معاشرے کی اقدار، آئیڈیلز اور اعلیٰ ترین فلسفیانہ، فن اور اخلاقی صفات پر مشتمل ہوتی ہے۔[12] ہنٹنگٹن کی یہ تعریف بڑی حد تک درست نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب کا تعلق ہماری مادی زندگی کے مادی مظاہر کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ایسے مظاہر ثقافتی مظاہر ہوتے ہیں۔ اس بات کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سجاد نقوی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "کلچر اور تہذیب میں وہی فرق ہے جو بیج کے مغز اور چھلکے میں ہوتا ہے۔ کلچر مغز ہونے کے باعث تخلیق کا منبع ہے اور جبکہ تہذیب کی حیثیت اس محافظ کی سی ہے جو چھلکے کی صورت میں مغز کی حفاظت کرتا ہے۔ کلچر بنیادی طور پر کومل، گداز، قوت کی نمو کا خزینہ اور ارتقاء کا محرک ہے جبکہ تہذیب اُصولوں اور قدروں، قوانین اور ضوابط، رسوم و رواج کے تابع اور اسی لیے بیضوی لپٹی ہوئی اور بے لچک ہے۔"[13]

کسی ثقافت کی جڑیں عوام میں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ ایک عوامی مزاج کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ مذہب اور تاریخی ورثے کی شمولیت اسے اور زیادہ موثر کر دیتی ہے۔ یہ ایک طرح سے ایک تخلیقی قوت کا نام ہے جو کسی معاشرے کے افراد میں بہت گہری رچ بس چکی ہوتی ہے۔ تہذیب اگر ایک درخت کی مانند ہے تو ثقافت اسی درخت کی شاخیں ہیں جن پر پھل پھول لگتے ہیں اور درخت کے حسن و خوبصورتی کو دوچند کرتے ہیں۔ تہذیب کو افراد کی ایک ثقافتی گروہ بندی بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ ثقافتی تشخص کی وہ وسیع ترین سطح ہوتی ہے جو انسانوں کے مابین مشترک عوامل کی بناء پر تشکیل پاتی ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے اسی تعلق کو ریاض انور اس طرح بیان کرتے ہیں: تہذیب ہماری حیات کے ظاہری پہلو کا نام ہے بر خلاف اس کے ہمارے اندرونی اور داخلی افکار و احساسات ہماری ثقافت کو آشکار کرتے ہیں۔ [۱۴] ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب "قومی تہذیب کا مسئلہ" میں تہذیب یا ثقافت کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی ہے:

> "تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے۔ جسے افراد اپنے جذبات و رجحانات اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔" [۱۵]

ثقافت کے ساتھ بالعموم تہذیب، تمدن اور کلچر کے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے اور عوامی اور عملی کثرتِ استعمال سے اب یہ الفاظ مترادف بنتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن یہ عمل صرف ان اصطلاحات کے ساتھ مخصوص نہیں، ہم روزمرہ کی زبان میں ایسے بے شمار الفاظ استعمال کرتے ہیں جس کے معنی موقع محل یا ذہنی کیفیات کے زیرِ اثر بدل جاتے ہیں۔ ثقافت کے ساتھ تہذیب کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ "تہذیب" عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مادہ "ہ۔ذ۔ب" ہے جس کے معنی کسی چیز کو درست کرنے کے لیے اس کی کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کرنے کے ہیں۔ انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے "کلچر" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اس کے لیے "ثقافت" کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں "کسی درخت یا پودے کو کاٹنا چھانٹنا، تراشنا کہ اس میں نئی شاخیں نکلیں" کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہونے کے ساتھ ساتھ علمِ بشریات کی ایک اہم اصطلاح بھی ہے۔ ڈاکٹر فاروق احمد اپنے ایک مضمون میں علم بشریات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "علم بشریات ایک کثیر الشعبہ سماجی سائنس ہے جو انسانی ارتقاء، تاریخ، تہذیب، ثقافت، معاشرت، زبانیں، نفسیات، مذہب، سیاست، معیشت، پیداوار، سماجی ترقی، سماجی بہبود

اور انسانی صحت اور تعلیم کا مطالعہ کرتی ہے۔"(۱۶)

بشریات یا علم الانسان وہ علم ہے جس سے کسی علاقہ، ملک کی کسی خاص قوم کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہاں سے آئے ہیں۔ ان کو جانچنے کے لیے کچھ اُمور کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، محض ان کے دعوں اور شجرہ ناموں سے بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ ویکیپیڈیا کے مطابق: بشریات ایسا علم ہے، جس میں انسانی عادات و اطوار اور انسانی سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔(۱۷) علوم بشریات یعنی علوم انسانیات اپنے معنی میں بے حد وسعت رکھتا ہے مگر اختصار کے ساتھ اگر اس کی تعریف کی جائے تو اسے ان الفاظ سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا علمی شعبہ ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں یعنی انسانی جسم کی ساخت، عقلی، نسلی خصوصیات اور سماجی ارتقاء سے مختلف تناظر میں بحث کی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر ماہرینِ بشریات انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویہ نظر سے غور و فکر کرتے ہیں۔ قدیم و جدید تناظر میں انسانی گروہ و زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کی حیاتیاتی، جنیاتی، معاشرتی و مادی ثقافت پر مباحثہ و موازنہ کرتے ہیں۔ المختصر یہ کہ علومِ بشریات میں انسانی زندگی سے متعلقہ ہر دور، پہلو اور انسانی زندگی کے معاشرتی ادوار، انسانیت کی نسلی تقسیم اور خصوصیات، ابتداء اور انتہاسب کو مفصل طور پر زیرِ کلام لایا جاتا ہے۔ ریختہ ڈکشنری میں بشریات کے معنی کچھ یوں بیان ہوئے ہیں: انسان اور نوع انسانی کا، اس کی جسمانی اور ذہنی ہیئت کے لحاظ سے علم، انسان کی ثقافتی ترقی اور معاشرتی حالات کا مطالعہ، ماضی و حال دونوں کے حوالے سے۔(۱۸)

کلچر کے لیے عربی میں "الثقافۃ"، فارسی میں "فرھنگ" اور اُردو میں "تہذیب" یا "ثقافت" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ان الفاظ کے لغوی معنی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ نور الغات کے مطابق: تہذیب: "(پاک کرنا، اصلاح کرنا)، ۱۔ آراستگی، پاکیزگی۔ ۲۔ شائستگی۔ ۳۔ خوش اخلاقی۔"(۱۹) اُردو لغت تاریخی اُصول پر درج بالا مفاہیم میں یوں اضافہ کرتی ہے: "۱۔ ذہنی ترقی جو زندگی کے چلن میں کارفرما ہو، شائستگی، ادب و تمیز۔ ۲۔ طرزِ معاشرت، رہنے سہنے کا انداز، تمدن۔ ۳۔ ترقی، بہتری۔"(۲۰)

ابتدا میں فرد کی کسی گروہ میں شمولیت اسے کچھ حقوق اور کچھ ذمہ داریاں عطا کرتی تھی اور اس کے تحفظ اور ضروریات کی فراہمی وغیرہ کے سلسلے میں اس کی مددگار ثابت ہوتی تھی۔ ذرائع ابلاغ کی عدم موجودگی اور جغرافیائی کٹھنائیوں کے باعث یہ گروہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔ ہر گروہ انسانی نے اپنی ضروریات اور حالات و واقعات کے مطابق اپنے اپنے قواعد و ضوابط مرتب کر لئے لیکن بحیثیت انسان اپنی

فطرت اور جبلت کے مطابق بہت سے مشترکہ ضرورتوں اور اقدار کے باعث ان میں کچھ قواعد وضوابط میں یکسانیت موجود رہی۔ جوں جوں انسان نے اس دنیا میں رہنے اور اپنی زندگی کو آسان بنانے کے طریقے سیکھے یہ گروہ زیادہ منظم صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ باہمی رابطوں نے اس عمل میں تیزی کا رجحان پیدا کیا اور ایک گروہ کے قواعد و ضوابط اور اقدار سے دوسرے گروہ روشناس ہونے لگے۔ ان گروہوں کے درمیان باہمی روابط کے باوجود ان کی انفرادیت اور الگ پہچان بہر صورت قائم رہتی ہے جو کسی ایک گروہ انسانی کو باقی تمام گروہوں سے الگ اور ممتاز حیثیت اور مقام عطا کرتی ہے۔ یہ انفرادی پہچان وہ اقدار، روایات، طرزِ زندگی، طرزِ فکر و احساس، اخلاق و عادات اور رسوم و رواج ہیں جو ایک قوم کی انفرادیت ہوتے ہیں اور جن کے مجموعے کو ہم تہذیب کا نام دیتے ہیں۔

تہذیب ایک طرزِ زندگی کا نام ہے جس میں لوگوں کے رہن سہن، سوچ، علم و فنون، معیشت اور سیاست کے اُصول، شادی، موسیقی، روایات، مذہبی عقائد، زبان، اقدار اور رسوم سبھی شامل ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ چیزیں طرزِ زندگی کا تعین کرتی ہیں جو کسی تہذیب کی بنیاد اور اساس ہے۔ سجاد باقر رضوی کے الفاظ میں: "Civilization شہر میں رہن سہن اور زندگی کرنے کے طرز کا نام ہے اس لئے ہم اسے زندگی کا خارجی اظہار کہہ سکتے ہیں۔"(۲۱) تہذیب ایک ایسا تصور ہے جس کی ابتداء اسی وقت ہو گئی تھی جب انسان نے تمدن کا آغاز کیا تھا کیونکہ انسان ہر دور میں کسی نہ کسی تہذیب کا حصّہ ضرور رہا ہے۔ جب انسان نے خود کو فطرت کے جبر سے آزاد کیا اور زراعت کو باقاعدہ شروع کیا اور ایک باقاعدہ ثقافتی سرگرمی کا آغاز کیا۔ یعنی خودرو پودوں کے بجائے انسان نے اپنی محنت سے کاشت کرنا شروع کیا تو کاشت شدہ پوداوہ پہلی تخلیقی سرگرمی تھی جس نے انسانی ذہن کو بدل دیا اور شاید اسی وقت تہذیب کے ایک مکمل تصور کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

انسان ہر دور میں کسی نہ کسی صورت تہذیب کی تشکیل کرتا ہے اس وقت بھی جب تہذیب کے تصّور سے اس کی شناسائی نہ تھی کیونکہ ہر دور میں انسانوں کے باہمی تعامل سے ایک معاشرتی ماحول تشکیل پاتا رہا ہے جو بعد میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ ہر نسل نے اس دور کی ضرورت کے مطابق اس ضابطے میں اضافے اور تبدیلیاں پیدا کیں جس کے نتیجے میں تہذیب ہر دور کی ضروریات کی تکمیل کرنے کی اہلیت حاصل کرتی رہی۔ پروفیسر ممتاز حسین اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تاریخ سے ماقبل، یا سولیزیشن سے پہلے کے ادوار میں بھی وہ کلچر کے بنیادی عناصر سے واقف تھا۔ وہ بولتا، سوچتا، گاتا، رقص کرتا، نقش و نگار بناتا، پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں کو استعمال کرتا

اپنے تن بدن کو چھال سے ڈھانکتا اپنے جذبات، عادات و اطوار کو رُسوم و قیود کے تابع کرتا لیکن وہ اپنے خیالات اور جذبات کو حروف یا علامتوں کے ذریعے اپنی آنے والی نسلوں یا دوسری قوموں کو منتقل کرنے کے ہنر سے ناواقف تھا۔ یہ چیز انسان نے خالصتاً سیویلیزیشن کے دور میں حاصل کی۔"(۲۲)

کسی قوم کی تہذیب کے تین اہم پہلو ہوتے ہیں ایک اس قوم کے اقدار و احساسات اور عقائد، دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے (جس میں کسی بھی قوم کے افراد کے اخلاق و عادات، آداب و روایات وغیرہ سب شامل ہیں) اور تیسرے اس کے فنون، یہ تینوں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا اور وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ایک فرد جس معاشرے یا قوم کا فرد ہوتا ہے اس معاشرے یا قوم کی روایات و اقدار اور اخلاق و عقائد خود بخود اس فرد کی زندگی کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے معاشرے سے کسی دوسرے معاشرے میں ہجرت کرتے ہیں وہ اس نئے معاشرے کے عقائد، اقدار و روایات، ثقافت، اعمالِ زندگی اور طرزِ زندگی کے اثرات کو قبول کرتے ہیں جس سے ان کے رویے، سوچ اور طرزِ عمل کے علاوہ اقدار و روایات بھی تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ جب معاشروں کی صورت اور اس کے حالات بدلتے ہیں تو اقدار کی تبدیلی ناگریز ہو جاتی ہے انہی اقدار کا اظہار اس معاشرے میں مروج فنون پر بھی ہوتا ہے جو عوام کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فرد کے لیے کسی تہذیب کے ساتھ وابستگی اس کے کسی قوم یا خطے کے ساتھ تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ فرد کے لیے کسی تہذیب کے ساتھ رشتہ اور اس تہذیب کا اس فرد کی شخصیت پر اثر انداز ہونا بالکل ایسا ہے جیسا ایک انسان کے لیے اس کی مادری زبان، رسوم و رواج ہوتے ہیں۔ یہ ایک طاقت ہے جو افراد کے مابین تعلق بناتی ہے اور اس تعلق کی بناء پر فرد ایک معاشرے کی طاقت بن کر اُبھرتا ہے۔ ڈاکٹر روتھ بنی ڈکٹ کے مطابق: فرد کی پوری زندگی ہی اول و آخر ان سانچوں اور معیاروں سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے جو اس کی اپنی قوم میں نسل در نسل منتقل ہوتے ہوتے اس تک پہنچتے ہیں۔(۲۳)

ہر فرد کی عادات، عقائد و شخصیت میں اس کی تہذیب کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں ایک مخصوص گروہ یا قوم میں پیدا ہونے والا بچہ اس گروہ یا قوم کی عادات، عقائد اور روایات کا برابر حصّہ دار بنتا ہے۔ جبکہ وہ بچہ جو دنیا کی کسی دوسری تہذیب میں پیدا ہوتا ہے وہ ان عادات، عقائد اور روایات کا ہزارواں حصّہ بھی نہیں اپنا سکتا۔ تہذیب ان تمام چیزوں اور اعمال کا احاطہ کرتی ہے جن کا تعلق ہمارے ظاہر، ہماری طرزِ

زندگی، معاشرت، اخلاق اور افعال وغیرہ سے ہے۔ ہماری زندگی پر سب سے گہری چھاپ ہماری تہذیبی حیثیت کی ہوتی ہے۔ اس تہذیبی زندگی میں چونکہ ہمارے آباؤ اجداد کے تجربات، ہماری تربیت، ہمارا مذہب سبھی داخل ہوتے ہیں اسی لئے ہر فرد کے لیے اس تہذیبی حیثیت کو اپنانا ناگزیر ہوتا ہے۔ تہذیب کی کوئی متفقہ اور جامع تعریف تو اب تک سامنے نہیں آئی لیکن ہر دور میں مختلف ماہرین اور مفکرین نے مختلف انداز میں تہذیب کی وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں:

> "تہذیب کا لفظ نہ صرف اردو میں بلکہ عربی، فارسی میں بھی عام و مستعمل ہے۔ عربی زبان میں لفظ تہذیب کے لغوی معنی ہیں، درخت کو تراشنا، کاٹنا اور اس کی اصلاح کرنا، فارسی زبان میں اس کے معنی ہیں آراستن و پیراستن، پاک و درست اصلاح نمودن۔ یہ لفظ مجازی معنی میں شائستگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس میں خوش اخلاقی مزاج کی نرمی اور اطوار و کردار و گفتار کی شائستگی بھی شامل ہے جیسے کہا جائے کہ وہ مہذب انسان ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اطوار و گفتار میں شائستہ ہے۔"[۲۴]

جمیل جالبی نے تہذیب کے لیے جو تعریف متعین کی ہے وہی تعریف کم و بیش کلچر کے لیے بھی درست قرار دی جاتی ہے۔ تہذیب کے لئے انگریزی میں لفظ Civilization استعمال ہوتا ہے جو لاطینی زبان کے لفظ (Civis) سے نکلا ہے جس کے معنی شہر یا قبیلے میں رہنے والے کے ہیں اور انہی معنوں کو نظر میں رکھ کر ہم تہذیب کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سر سید احمد خان "تہذیب الاخلاق" کے پہلے پرچے کی اشاعت ۱۸۷۰ء میں تہذیب کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "سویلائزیشن انگریزی کا لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت، تمدن اور طریقہ تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"[۲۵]

یعنی انسان کے تمام ارادی افعال جو انسان کی خارجی اور ظاہری زندگی کا مکمل احاطہ کیے ہوتے ہیں تہذیب کے زمرے میں آتے ہیں اور ایک انسان کی معاشرتی و سماجی زندگی کو ایک نظام کا پابند کرتے

ہیں۔اس نظام میں انسانی اخلاق و اقدار ، عادات و عقائد،رسوم و رواج اور فنونِ لطیفہ سب شامل ہوتے ہیں۔یہی وہ تمام افعال ہوتے ہیں جن سے ایک فرد کا اپنی معاشرتی و قومی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ایک عام آدمی کے نزدیک تہذیب ایک مکمل لائحہ عمل اور بڑی حد تک ایک ضابطہ اخلاق اور ضابطہ حیات کا کام کرتی ہے جس کی وہ جانے انجانے میں پیروی کرتا ہے اور اپنی پوری زندگی اسی کے تحت بسر کرتا ہے۔تہذیب کسی فرد پر زبردستی مسلط کیے جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ فرد میں رفتہ رفتہ سرایت کرتی ہے اور ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو بن جاتی ہے۔تہذیب معاشروں پر اتنی گہری چھاپ رکھتی ہے کہ اس سے بغاوت کو اکثر اوقات قبول نہیں کیا جاتا۔تہذیب کے مفہوم اور اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

> "اس کے سب سے زیادہ مشہور معنی ہیں پاکیزہ و پسندیدہ اخلاق و آداب۔جس شخص کی طبیعت، چال ڈھال، گفتگو اور برتاؤ میں ایک خاص موزونیت اور دلکشی ہو وہ مہذب کہلاتا ہے۔بعض اوقات تہذیب کا لفظ اس سے زیادہ مجرد اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی زندگی کا مکمل نصب العین جو کسی قوم کے سامنے ہو۔"(۲۶)

ایک معاشرے اور ایک قوم کی خصوصیات عادات و اطوار، اس کا طرزِ فکر، اس کا دینی نظریہ اور اس کے اہداف و مقاصد خصوصاً اس معاشرے کی تہذیب کی بنیاد ہوتی ہیں۔یہی وہ بنیادی چیزیں ہیں جو ایک قوم کو شجاع و غیور اور خود مختار بنا دیتی ہیں اور ان کا فقدان قوم کو بزدل اور حقیر بنا دیتا ہے۔تہذیب قوموں کے تشخص کا سرچشمہ ہے، تہذیب کے دو حصّے ہیں۔ایک حصّہ ان اُمور اور مسائل سے تعلق رکھتا ہے جو ظاہر و آشکار ہیں اور نگاہیں انہیں دیکھ سکتی ہیں۔مثال کے طور پر لباس کیسا ہو؟ کیسے پہنا جائے؟ بدن ڈھانکنے کا کون سا انداز اپنایا جائے؟ گھر کس طرح بنائے جائیں، رہن سہن کا طریقہ کیا ہو؟ یہ سب معاشرے کی ظاہری تہذیب کا آئینہ ہے۔تہذیب کا دوسرا حصّہ وہ ہے جو کسی قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔اگر کسی قوم کو اس کے تہذیبی تشخص اور افتخارات سے دور کر دیا جائے تو وہ قوم زیادہ دیر تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ پاتی ان افتخارات میں سب سے زیادہ اہم اخلاقیات ہیں۔

ہر تہذیب میں دوسری تہذیبوں کو متاثر کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔جغرافیائی، مذہبی اور لسانی عناصر کا اختلاف جہاں تہذیبوں کی انفرادیت کا باعث ہوتا ہے وہیں بہت سے مشترکہ انسانی، جغرافیائی، تاریخی، اخلاقی یا مذہبی عوامل اور روابط کے باعث ہر تہذیب میں دوسری تہذیبوں کے ساتھ مشترک یا بڑی حد تک ملتے جلتے

عناصر بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ عناصر ان تہذیبوں کے درمیان ایک تعلق اور رابطے کو قائم کرتی ہیں اور مختلف قوموں کے افراد کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ہر تہذیب مختلف قوموں کی اجتماعی کوششوں یا مختلف تہذیبوں کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے اسی لیے ہر تہذیب کسی نہ کسی حد تک دوسری تہذیب سے جُڑی ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ: "موجودہ زمانے میں کسی ملک کو بین الاقوامی تہذیب سے کٹا ہوا دیکھا نہیں جا سکتا۔"(۲۷) کوئی تہذیب کسی جغرافیے میں قید نہیں رہتی اور نہ ہی ان کا متعین آغاز اور انجام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ تہذیب کو کبھی زوال نہیں آتا لیکن تہذیبوں کا زوال نہ تو یکا یک آتا ہے اور نہ ہی یہ کبھی مکمل طور پر مردہ ہوتی ہے۔ یہی تسلسل تہذیبوں کی ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق: "تہذیب ایک تسلسل کا نام ہے اور یہ دریا کے بہاؤ کی مانند ہے۔ ایسا دریا جس کا منبع کہیں دور ماضی بعید کی تاریکی میں نہاں ہے۔ اور اسی دریا کے مختلف مقامات پر اُبھرتی اور ڈوبتی لہریں کلچر۔"(۲۸)

تہذیب ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے اسے لئے یہ عمل کبھی جمود کا شکار نہیں ہوتا ہے اور ایک تسلسل کے ساتھ اس میں تبدیلیاں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ دوسری جانب تبدیلیوں کا یہ سلسلہ نہایت مربوط ہوتا ہے اور ہر زمانہ تہذیبی رشتوں کے ذریعے ماضی سے جُڑا ہوتا ہے اسی لئے تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک اہمیت دی جاتی ہے۔ کوئی بھی تہذیبی روایت یکا یک سامنے نہیں آتی بلکہ ایک تہذیب کی تشکیل میں صدیوں کا سفر ہوتا ہے۔ جب کچھ لوگ یا کوئی گروہ کسی مخصوص جگہ پر اکٹھا رہنا شروع کرتا ہے تو اس باہمی میل ملاپ کے نتیجے میں ایک معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ معاشرتی لین دین اور باہمی تعلقات وغیرہ کے لئے اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آتی ہے جس کے لئے زبان سے کام لیا جاتا ہے جو ان کی موسیقی اور ادب کو تخلیق کرتی ہے۔

افراد اپنی مذہبی حدود، جغرافیائی حالات اور ضرورتوں کے مطابق لباس، مکان اور عادات و رسوم اپناتے ہیں۔ موسمی حالات اور پیداوار کے مطابق غذائی عادات تشکیل پاتی ہیں۔ ان کے مذہبی عقائد و اقدار ان کے لئے فکر و فلسفہ کی راہیں متعین کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ ایک پورا نظام تشکیل پاتا جاتا ہے۔ یہی نظام پہلے کلچر یا ثقافت اور پھر تہذیب کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ثقافت اور تہذیب جنہیں ہم مترادف کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں ان میں ایک مضبوط اور اٹوٹ تعلق موجود ہے جس کے باعث ان میں جزوی

فرق ہونے کے باوجود ان میں کوئی واضح حد نہیں کھینچی جا سکتی۔ لیکن ان دونوں میں ایک بہت واضح فرق بھی موجود ہے جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

ثقافت کے ساتھ تہذیب کے علاوہ ایک لفظ کلچر بھی مستعمل ہے اور بڑی حد تک یہ لفظ بھی تہذیب کے مترادف ہی کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ کلچر کا لفظKult سے ماخوذ ہے جس کے رومن میں معانی کھیتی باڑی کے علاوہ ذہنی تربیت اور مذہبی عقائد وغیرہ کے ہیں۔ عموماً شائستہ، تعلیم یافتہ فرد کو مہذب یعنی کلچرڈ تصوّر کیا جاتا ہے، جو ذوقِ لطیف رکھتا ہو اور مُہذب زندگی کی نفیس اشیاء سے واقف ہو۔ تاہم کلچر کی توضیح آسان نہیں کیونکہ یہ انگریزی زبان کے اُن چند الفاظ میں شمار ہوتا ہے جن کا مفہوم بیان کرنا بہت مشکل تصوّر کیا جاتا ہے۔ کلچر کے لیے اُردو میں دو الفاظ "تہذیب" اور "ثقافت" استعمال ہوتے ہیں اور تعریف کے ضمن میں بھی اتفاقِ رائے موجود نہیں ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ان الفاظ کے استعمال اور کلچر کی تعریف کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "لغات میں جن معنی میں یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں اور لفظ" ثقافت " کا زور ذہنی صفات پر ہے جن میں علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنا اور ترقی دینے کی صفات شامل ہیں۔ میں نے لفظ تہذیب اور ثقافت کے معنی یکجا کر کے ان کے لیے ایک لفظ" کلچر " استعمال کیا ہے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفہوم شامل ہیں۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا، خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی، احاطہ کر لیتا ہے۔"(۲۹)

جب کوئی لفظ اصطلاح کا روپ دھار لیتا ہے تو اس کے معنی میں لغوی مفہوم کے مقابلے میں بہت وسعت آجاتی ہے۔ انگریزی لفظ کلچر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں آنے کے نتیجے میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ یہی نہیں بطور اصطلاح بھی اس کے مفہوم پر اتفاق موجود نہ ہونے کے باعث کسی ایک لفظ کو اس کے ترجمے کے طور پر اختیار کرنے میں بھی کئی مسائل در پیش ہوتے ہیں۔ اُردو میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ طویل عرصے تک رائج رہا ہے اور اب بھی استعمال ہوتا

ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ثقافت کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور انگریزی لفظ کلچر بھی ان دونوں مذکورہ الفاظ کے ساتھ شامل ہو چکا ہے۔ کلچر کی تعریف کرتے ہوئے فیض احمد فیض رقم طراز ہیں:

"ہم کلچر کو تین چار معنوں میں استعمال کرتے ہیں اوّل تو شخصی معنوں میں، ایک شخصی صفت کے طور پر کہ۔۔۔وہ مہذب ہے، شائستہ ہے۔۔۔ کلچر کا لفظ عام طور پر محض فنون کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ خاص قسم کی جمالیاتی تخلیقات جو کوئی معاشرہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں مصوری ہے، شاعری ہے، فنِ تعمیر ہے۔۔۔ عمومی طور پر معاشرہ جس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے، اس کے رہن سہن میں جو چیزیں داخل ہیں، وہ بھی کلچر ہیں۔"(۳۰)

فیض احمد فیض نے کلچر کی عمومی تعریف بیان کی ہے، بالخصوص پہلے دو معنوں میں اُن کی بیان کردہ تعریف اصطلاحی مفہوم سے مُطابقت نہیں رکھتی۔ فنون کلچر کا محض ایک جزو ہیں، تاہم تعریف کا آخری حصّہ اصطلاحی مفہوم سے قریب تر ہے لیکن اپنی وسعت اور عمومیت کے باعث کلچر کی واضح تصویر کشی میں ناکام ہے۔ کلچر کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں فیض احمد فیض کہتے ہیں:

"کلچر کی دو صورتیں ہیں۔۔۔ ایک اس کی ظاہری صورت اور دوسری اس کی باطنی صورت۔ باطنی صورت وہ ہے جسے ہم ذہنی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری صورت سے آگے بھی دو پہلو یا اس کے دو اجزاء ہیں، ایک اس کا شعوری جزو ہے اور دوسرا اس کا غیر شعوری جزو۔"(۳۱)

کلچر کی درج بالا دو صورتیں مادی اور غیر مادی کلچر کہلاتی ہیں۔ مادی کلچر عمارات، آلات، کتابوں، ملبوسات، زیورات، برتنوں، نمونہ ہائے فنون وغیرہ، جبکہ غیر مادی کلچر افکار، عقائد، معیارات، اُصول، اخلاق، قواعد وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عارفہ کے نزدیک کلچر:

"اگر کلچر کو کسی انسانی جسم سے تعبیر کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ کسی قوم کے معاشرتی اقدار اس کی ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہوتے ہیں جبکہ زبان، آدابِ معاشرت، فنونِ لطیفہ، مذہب اور دیگر ارکانِ معاشرت کی حیثیت دل و دماغ، گوشت پوست اور دیگر اعضاء کی سی ہے۔"(۳۲)

ڈاکٹر سیّد عبد اللہ نے کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے "اس میں فنون و تفریحات، انفرادی و مجلسی آداب اور ذوقیات کی دیگر شکلوں کو بھی شامل قرار دیا ہے جو جبری نہیں۔"(۳۳) یعنی ایک مخصوص کلچر پر عمل پیرا افراد کسی قاعدے یا قانون کے تحت ان آداب و رسومات کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتے۔ سیّد عبد اللہ"

کلچر کو تمدّن سے ممیز کرتے ہوئے تمدّن کو اُن مظاہر پر مبنی قرار دیتے ہیں جو کسی جبری و قانونی تنظیم یا منصوبہ بندی کے نتیجے میں اُبھرتے ہیں۔"[۳۴] سیّد عبد اللہ کہتے ہیں کہ جیسے جیسے ماحول تبدیل ہوتا ہے کلچر میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، جو قومیں اپنی روایات کو حرفِ آخر مان لیتی ہیں اُن کا کلچر بوڑھا اور ضعیف ہو جاتا ہے۔ سیاسی طور پر غلام قوموں پر کلچر کی تین تہیں آجاتی ہیں جن میں حکمران قوم کا کلچر، محکوم قوم کا کلچر اور پھر حاکموں کے قریب ہو کر اُن کا رنگ اپنا لینے والوں کا کلچر شامل ہیں۔ یہاں پر وہ ابنِ خلدون کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ جب قومیں قدرتی تغیر سے مُنہ موڑتی ہیں تو اُن کا کلچر گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ تہذیب کو سولائزیشن کا نام دیتے ہوئے کلچر کو عام لوگوں کے طرزِ حیات کا عکس خیال کرتے ہیں۔ اور وہ ثقافت کو ہی کلچر کا نام دیتے ہیں اور وہ اپنی کتاب کلچر کا مسئلہ میں لکھتے ہیں:

"ثقافت ہی کلچر کا سب معروف و مروجہ اردو متبادل ہے عربی کا یہ لفظ ث، ق، ف مادے سے ہے اس کے لغوی معنی ہیں پا لینا، سیدھا کرنا وغیرہ، کلاسیکل عربی ادب میں ثقافت کا لفظ موجودہ (کلچر) کے معنوں میں شاذ ہی استعمال ہوا ہے۔ غالباً بیسویں صدی کے نصف اول میں پہلی مرتبہ عرب ممالک میں کلچر کے معنوں میں استعمال ہو کر عام ہوا ایران میں اس کی جگہ عموماً شائستگی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔"[۳۵]

اُن کے خیال میں صنعتی اور مشینی انقلاب نے انسان کو فطرت سے دور کر دیا ہے، وہ نمود و نمائش اور ریاکاری کو کلچر کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ وہ معاشرے میں نیک لوگوں کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان صوفیاء نے برصغیر میں کلچر، تہذیب، اخلاق و آداب کے لیے لوگوں کو امام غزالی کی کیمیا سعادت پڑھنے کی طرف راغب کیا۔ تاکہ لوگوں کے اندر اچھائیاں جنم لیں اور ایک بہتر معاشرہ پروان چڑھا۔ غلام جیلانی برق کے مطابق:

"کلچر "انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی ہیں "ہل چلانا، پالنا، تربیت دینا اور قوائے ذہنی کو چمکانا (تعلیم مطالعہ اور مشاہدہ سے) کسی کھیت میں ہل چلا کر اسے نرم کرنا، کھاد ڈالنا، بیکار بوٹیوں کو اکھاڑنا اور اسے پانی دینا۔"[۳۶]

کلچر کی حدود اور وسعت بیان کرتے ہوئے حسن ریاض کہتے ہیں:

"کلچر مجازی معنوں میں ذہنی جلا، دانش، علم، مطالعہ اور ایمان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بادی النظر میں اس کا جھکاؤ روحانیت کی طرف زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ کلچر میں ایک طرف

انسان کی پوری مادی تہذیب داخل ہے اور دوسری طرف پوری روحانی تہذیب یعنی اس میں صرف کھانا، لباس، گھر، حیثیتیں اور وسائل مواصلات نقل و حمل ہی نہیں بلکہ مذہب، قانون، اخلاق، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، ادب اور حکومت بھی شامل ہے۔"(۳۷)

محمد حسن عسکری پاکستانی کلچر کو دہلی اور لکھنو کے کلچر سے مختلف دیکھنے کے خواہاں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ثقافتی تعلقات مسلمان ممالک کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہمارے کلچر پر اُس کی چھاپ نظر آئے۔ ہمارے ہاں پہنچنے والا کلچر ہندوستانی اسلامی کلچر ہے جو مغل سلطنت میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بننے والے پاکستان کو اسی ہندو اسلامی کلچر کو اپنانا پڑا۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ نئ جدتوں کی بدولت ہمیں ایک الگ کلچر ترتیب دینا پڑا جو ہندو کلچر سے بہتر ہے وہ لکھتے ہیں:

"ہماری کلچری عمارت اسی کے اوپر تعمیر ہونی چاہیئے مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ پاکستان کا کلچر لفظ بہ لفظ وہی ہو جو دہلی یا لکھنو کا کلچر تھا ایک مطلق العنان بادشاہی جمہوری ریاست میں فرق ہونا چاہیئے۔ اس زبردست کلچری اختلاف کی وجہ سے ہند اسلامی کلچر کی ایک روایت اور اس میں ایک تسلسل بھی باقی رہے اور جمود بھی پیدا نہ ہو۔ ہم تجربے بے راہ روی سے بچ جائیں گے لکیر کے فقیر بھی نہیں بنیں گے۔"(۳۸)

حسن عسکری کہتے ہیں کہ پاکستان کا کلچر اس قدر مضبوط ہونا چاہیئے کہ بیرونی کلچر کی یلغار سے متاثر نہ ہو۔ اگر بیرونی کلچر کی کچھ اچھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں تو ہم اُن سے بھاگیں نہیں بلکہ اُن کی اچھائیوں سمیت اپنالیں۔ ہمیں پاکستانی کلچر کی ترقی کے لیے اپنے ادب میں غیر ملکی ادیبوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ حسن عسکری کے مطابق اسلام کے بنیادی اُصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے ہم پر سب سے زیادہ حق ہندو اسلامی کلچر کا ہے۔ پاکستان کا کلچر دنیا کے کسی جدید کلچر سے کم نہیں ہے۔ اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے ہمارے کلچر پر اسلام کی چھاپ نمایاں ہے۔ اسلام اچھائی کی ترغیب دیتا ہے اور ساتھ ہی بُری چیزوں کو چھوڑنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ حسن عسکری کے مطابق پاکستانی کلچر اپنی روایت اور تہذیب کا امین ہے۔

دنیا میں مختلف طرح کی تہذیبیں ہیں جن ملکوں میں کئی لوگ گروہ کی صورت میں رہتے ہوں، وہاں پر ریاستی تہذیب الگ ہوتی ہے۔ ریاستی تہذیب ملک میں رہنے والے تمام قبیلوں اور قوموں کے ملاپ سے قومی تہذیب میں ضم ہو جاتی ہے۔ جس میں شامل تمام گروہ باہمی رغبت اور رضامندی سے شامل ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ وہ بین الاقوامی تہذیب میں بدل جاتی ہے۔ سبط حسن تہذیب کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"کسی معاشرے کے بامقصد تخلیقات اور سماجی اقتدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی، طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رہن سہن، فنون لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ، حکمت و عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوق اور خاندانی تعلقات و غیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"(۳۹)

سبط حسن نے تہذیب کی تعریف جامع انداز میں کی ہے وہ کہتے ہیں کہ تہذیب ایک ارتقائی عمل کا نام ہے جو موافق ماحول میں دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک دُنیا کی مہذب ترین قوموں میں سب سے پہلے یورپ کا نام آتا ہے۔ جس ملک کی تہذیب سب سے اچھی ہو گی اور اِن کا کسی اور قوم، قبیلے یا مذہب سے تضاد نہیں ہو گا وہی تہذیب دنیا میں پزیرائی پائے گی۔

پروفیسر کرار حسین کلچر کے متعلق غور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ کلچر کا یہ مسئلہ کیسے اور کیوں اُٹھا۔ ہمارا کلچر ہے کیا؟ کلچر کہتے کس کو ہیں؟ ابھی تک ہم ان سوالوں کے جواب ہی نہیں ڈھونڈ پائے۔ اظہار کاظمی صاحب کہہ رہے تھے کہ اس کو تہذیب کہہ لو یا ثقافت کہہ لو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے ادیبوں کے ہاں بھی تہذیب، کلچر اور ثقافت کا کوئی واضح مطلب نہیں ہے جس سے ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب معلوم ہو سکیں۔ لوگوں میں کلچر کے حوالے سے آگاہی کسی عارضی جھٹکے کا ہی ردِ عمل ہے جس سے ہم اپنی آنکھیں کھول بیٹھے ہیں اور یورپی کلچر سے متعارف ہوئے ہیں۔ انگریز کی اپنی ایک سوچ تھی اور ہم اُس کے محکوم تھے ہم آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا اور ہمیں اِس بات کی فکر ہوئی کہ ہمارا کلچر کیا ہے۔ ہم اپنے کلچر کو محفوظ کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے کہ مشرقی پاکستان ہم سے جُدا ہو گیا۔ ہمارا ذہن پھر کلچر کی تعریف میں کھو گیا اور یہ لگتا ہے کہ فریقِ مخالف ہمیں کلچر کی تعریف میں اُلجھا کر ہمیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ ہمارے ورثے میں جو کچھ ہے وہ ہمارا نہیں ہے۔ جب ہم محکوم تھے تو ہماری ترجیح آزادی ہونی چاہیئے تھی نہ کہ کلچر کی تعریف میں کھو جانا۔ کلچر کی واضح تعریف کسی بھی ادیب کے ہاں نہیں پائی جاتی سب اپنے اپنے طور پر اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"روزمرہ کی نشست و برخاست کے طریقوں تک ملنے جلنے کے طریقے، مہمان نوازی کے طریقے، اخلاق کا نظام کہ ہم کس بات کو اچھا سمجھتے ہیں، کس بات کو بُرا سمجھتے ہیں، یہ تمام

کی تمام باتیں جن سے زندگی کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، کوالٹی پیدا ہوتی ہے، ایک قدر پیدا ہوتی ہے جو زندگی کو اس قابل بناتی ہے کہ زندہ رہا جائے۔ زندگی کے اندر جو قدر وقیمت اور اہمیت پیدا کرنے والی چیز ہوتی ہے تو اس کو ہم کلچر کہتے ہیں"(۴۰)

قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے اپنے کلچر کو فطری طور پر نشوونما کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ کلچر میں زبان اور شاعری بھی آتی ہے اس کے ساتھ ہی کچھ لوگ کلچر کو سیاست سے جوڑتے ہیں۔ غرض ہر ایک نے اپنے تیئں کلچر کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی معاشرے کے افراد کی روزمرہ زندگی میں دانستہ ونادانستہ داخل ہونے والی تمام اقدار، رویے، خیالات اور اطوار سب کے سب انسان کے کلچر کے اظہار ہیں۔ کلچر صرف ان معنوں تک محدود نہیں جن تک آج تک ہم اسے محدود کیے ہوئے ہیں مثلاً فنونِ لطیفہ، لباس اور خوراک وغیرہ۔ بلکہ یہ ہماری زندگی کی زیادہ تر عادات واطوار کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ جس طرح تہذیب اور ثقافت ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہیں اسی طرح کلچر بھی تہذیب کا مترادف نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ تہذیب کا ایک جزولانیفک ضرور ہے۔ تہذیب کے پہلو بہ پہلو تمدن کا لفظ بھی تقریباً انہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

انگریزی زبان کے لفظ سویلزیشن کے لیے اُردو میں تہذیب یا تُمدّن کے الفاظ مستعمل ہیں۔ تمدّن عربی کا لفظ ہے، اس کا مادّہ "م۔د۔ن" سے ہے، جس کے معنی ہیں مُتمدّن بنانا، شہری بنانا۔ تُمدّن کے لغوی معنی ہیں شہری بنانے کا عمل، شہر میں سکونت اختیار کرنا۔ تُمدّن کا لفظی مفہوم جاننے کے لیے ایک نظر اُردو لغات پر ڈالتے ہیں۔ "نورالغات" کے مطابق "تمدن" سے مراد ہے:"(ع) شہر میں بودوباش کرنا۔ شہر کا انتظام کرنا۔ طرزِ معاشرت۔ رہنے سہنے کا انداز۔"(۴۱) اُردو لغت (تاریخی اُصول پر) "تمّدن کے معنی یوں بتاتی ہے:

"۱۔ شہری بودوباش، (کسی ایک جگہ) مل جل کر رہنا، سماجی زندگی، Civilization

۲۔ شائستگی، تہذیب۔

۳۔ رہنے سہنے کے خاص طریقے، طرزِ معاشرت۔"(۴۲)

یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ لغات میں تُمدّن کے عمومی مفاہیم بیان کیے گئے ہیں اور اس سے شہری زندگی مراد لی جاتی ہے۔ محمد ارشد بھٹی کے مطابق:

"تمدن" لفظ مدن سے ملا ہے جس کے معنی اقامت کرنا، شہریت اختیار کرنا، شہر بسانا اور معاشرے میں رہنے کے ہیں۔ اسی لفظ سے "مدینہ" ہے جس کے معنی شہر کے ہیں چنانچہ

تمدن کسی ملک یا تصادم کے طرزِ معاشرت کا نام ہے۔"(۴۳)

تُمدّن سے مُراد شہری زندگی لی جاتی ہے، جب کوئی تہذیب زیادہ ترقی یافتہ شکل کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی یہ حالت تُمدّن کہلاتی ہے۔ تُمدّن اپنے اصطلاحی مفہوم کے مطابق ملنے جلنے، رہنے سہنے کے طریقے، شخصی اور گروہی آزادی، انفرادی، اجتماعی اور انسانی حقوق و فرائض کی ادائیگی کے قاعدوں اور طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اصطلاحاً تُمدّن کے ذیل میں انسانی کوششوں سے تخلیق ہونے والی ساری اشیاء شامل ہوتی ہیں مثلاً آلات، اوزار، عمارات، مجسمے، آلاتِ موسیقی وغیرہ اور ایسی تمام ایجادات جو انسان اپنی سہولیات میں اضافے اور زندگی کے لوازمات وضروریات کی تکمیل کے لیے ایجاد کرتا یا بناتا ہے نیز تمام سماجی ادارے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں اور یہ سب تُمدّن کے مظاہر کہلاتے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم بھی تُمدّن سے مراد شہری زندگی لیتے ہیں۔ وہ تُمدّن کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تُمدّن حقیقت میں وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں لوگ شہروں میں رہنے لگتے ہیں۔ شہری زندگی میں مختلف پیشے ہوتے ہیں اور تقسیمِ کار سے ہر کام اور ہر فن کو ترقی حاصل ہوتی ہے ۔۔۔ رسوم ورواج ترقی کرتے کرتے منضبط قوانین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ دولت اور سامانِ حیات میں افزونی ہوتی ہے۔۔۔ علوم وفنون کی ترقی سے زینت کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔ انسانی عقل بھی مدنیت ہی سے ترقی پاتی ہے۔"(۴۴)

خلیفہ عبدالحکیم تُمدّن کو شہری زندگی قرار دیتے ہیں جو دیہات یا قصبات کی زندگی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس میں ایک شخص کسی ایک مخصوص پیشے میں مہارت حاصل کرتا ہے اور اپنے سارے کام خود کرنے کے بجائے کام کو مختلف افراد میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ جو اپنی مہارت کے شعبے میں ہی کام کرتے اور خدمات فراہم کرتے ہیں۔ یہ شہری زندگی باقاعدہ قوانین کے تحت معاملات چلاتی ہے۔ بعض مفکرین تہذیب اور تمدن کے معانی میں تفریق کرتے ہوئے تمدن کو انسان کی خارجی ترقی اور تہذیب کو داخلی یا ذہنی ارتقاء سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن کچھ مفکرین کے نزدیک تمدن انسان کے خارجی ماحول اور اس کے ذہن کے عمل و ردِ عمل ہی کی ایک تخلیقی شکل ہے۔ دراصل تہذیب کا تعلق روحانی عقائد سے ہے اور عقائد جب عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو یہ تُمدّن کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین کے الفاظ میں:

"تمدن، تہذیب کا مادی پہلو ہے یہ اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب تہذیب عملی شکل اختیار کرتی ہے۔ کسی قوم کا تمدن اس کی تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تہذیب کی تکمیل کے لیے

مادی وسائل کی بھی ضرورت ہے۔ ابتداء میں مادی ترقی کی وہ منزل جس میں انسان ایک بہت بڑی تعداد میں ایک جگہ سے یعنی شہر آباد ہونے لگے "تمدن" کہلائی۔"(۴۵)

زرعی انقلاب کے بعد جب انسان نے فصلیں اُگانے کا راز دریافت کیا اور جگہ جگہ رزق کی تلاش میں گھومنے کے بجائے دریاؤں کے کناروں پر رہنے لگا تو وہیں اس نے اپنی زندگی کو ایک تمدنی شکل دینی شروع کی اور دورِ وحشت سے نکل کر تمدن کے دور میں داخل ہو گیا۔ بقول ڈاکٹر ساجد امجد:

"تمدن و تہذیب کو ہم معنی سمجھنے کا تصور مغرب سے ہمارے یہاں آیا۔ ان کا جھکاؤ چونکہ مادیت کی طرف ہے اس لیے انہوں نے تمدن ہی کو تہذیب کی ابتداء سمجھا۔ اور اسی کو معیارات زندگی گردانا جو شہر وجود میں آنے کے بعد قائم ہوئے۔"(۴۶)

تمدن ایک خالص مادی اصطلاح ہے جو تہذیب کا ایک جزو یا ابتدائی شکل ہے جبکہ تہذیب ایک یکسر مختلف مفہوم کی مالک اصطلاح ہے جو یکسر ایک خارجی حیثیت کی مالک ہے اور اس کی بنیاد عقائد پر ہے۔ غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

"یہ چاروں الفاظ ہم معنی نہیں ان میں بعض خصوصیات مشترک ہیں لیکن فرق ضرور ہے۔ خواہ وہ بہت معمولی سا ہو۔ "کلچر" ایک نقطہ نگاہ کا نام ہے اس کا عملی اظہار "تہذیب" ہے۔ کلچر صرف ذہن کا عمل ہے اور تہذیب ذہنی تصورات اور خارجی اعمال ہر دو کا مجموعہ۔ ثقافت، تمدن اور کلچر خاص ہیں۔ ثقافت کا تعلق علوم و فنون سے ہے، تمدن کا عمارات و باغات سے ہے کلچر کا دانش، ذہنی تصورات اور ایمانیات سے جب کہ تہذیب ایک عام چیز ہے ان تینوں پر حاوی۔"(۴۷)

دراصل تہذیب ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کا ایک ایسا لائحہ عمل یا مجموعہ قواعد ہے جو کسی قوم یا گروہ انسانی کے باہمی تعامل سے وجود میں آتی ہے اور اس کے بعد نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس میں ہمارا مذہب، جغرافیہ، اعتقادات، تاریخ اور ترجیحات سبھی شامل ہیں۔ تُمدّن کی تعریفوں کا مفصل جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین کی اکثریت شہری زندگی کو تُمدّن قرار دیتی ہے۔ اُن کے نزدیک جب کوئی تہذیب شہروں میں پائی جائے، تُمدّن کہلاتی ہے۔ کچھ ماہرین تہذیب اور تُمدّن میں صرف پھیلاؤ، وسعت اور سائز کا فرق دیکھتے ہیں، اُن کے مطابق تُمدّن، تہذیب کی وسعت یافتہ صورت ہوتی ہے۔ تہذیب کے مترادف کے

طور پر کلچر، ثقافت، تُمدّن وغیرہ کے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں لیکن یہ تمام الفاظ اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔

ثقافت اور مذہب:

ثقافت زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے اور مذہب اس سے الگ نہیں ہے۔ ثقافت میں مذہب کا ہر رنگ دیکھا جا سکتا ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ثقافت مذہب کا حصّہ ہے۔ ثقافت میں مذہبی تصّورات اور تخیلات پوری توانائی کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور ہماری زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتے ہیں۔ ہر تمدن، تہذیب اور ثقافت کی بنیاد معنویت کے اعتبار سے مذہبی عقائد پر استوار ہوتی ہے۔ مذہب قلبی سکون اور روحانی طمانیت کا ذریعہ بنا۔ مشکلات کو برداشت کرنے کی قوت بھی مذہب ہی کی عطا کردہ ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید لکھتے ہیں:

> "جب سے انسانی معاشرے میں بستی، قبیلے یا دیس کے روپ میں منظم زندگی کا آغاز ہوا ہے، ثقافت کی بنیاد مذہب ہی رہا ہے۔ کسی زمانے میں مذہب جادوگری اور اوہام کا دوسرا نام تھا۔۔۔۔۔ پھر توحید کے تصور نے مذہب کو نیا رنگ دیا۔"(۴۸)

ہماری زندگی کا سارا نظام ہمیشہ سے مذہب کے تابع رہا ہے۔ روحانیت نے ہماری معاشرتی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ شہروں میں رہنے والے لوگوں کا رہن سہن دیہی علاقوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں اور ریگ زاروں میں رہنے والے لوگوں کے بھی الگ عقائد اور ثقافت ہوتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے آنے سے شہروں میں وسعت آئی اور بہت سی مختلف جگہوں کے لوگوں نے شہروں میں سکونت اختیار کی اور لوگوں کے باہمی امتزاج اور میل جول نے زندگی میں نئی ثقافت کو جنم دیا۔ پاکستانی اسلامی کلچر میں رُسومات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا، جن میں میلاد کی محفلیں، محرم کی مجالس، تعزیئے، شامِ غریباں، شبِ ماتم، حضرت امام جعفر کے کونڈے، شبِ برات پر حلوہ اور پٹاخے، شبِ معراج اور شبِ قدر کے موقعوں پر شبِ بیداری کی مجالس کا انعقاد، رمضان المبارک میں سحری اور افطار کا اہتمام اور افطار پارٹیاں، عید الفطر اور عید الضحیٰ کے موقعوں پر نئے لباس کی تیاری اور بازاروں کی گہما گہمی، قبل از حج روانگی ملاقاتیں اور بعد از واپسی مبارکباد کے لیے ملاقاتیں، خانقاہوں اور درگاہوں پر حاضری، وہاں قوالی کی محفلیں، پیروں فقیروں سے دعاؤں کی طلب یا ان کی مریدی، نذر و نیاز، تبرک، جن اُتارنے کے عمل اور تعویذ گنڈے شامل ہیں۔ نذر و نیاز اور پیری مریدی بھی پاکستانی مذہبی کلچر کا حصّہ رہی ہے۔ اب بعض سنی العقیدہ شہروں میں ربیع الاوّل کے مہینے میں گھروں اور

کاروباری علاقوں میں چراغاں کرتے ہیں۔ خانقاہوں اور درگاہوں پر جانے والوں کی اپنی دنیا ہے، دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں خصوصاً یہ مذہبی کلچر کا اہم حصّہ ہے۔ درگاہوں پر منت مانی جاتیں ہیں اور مرادیں پوری ہونے پر مقبروں پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔

مذہبی تصورات اور تخیلات پوری توانائی کے ساتھ ہر ثقافت پر نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ اُس معاشرے کی پوری زندگی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے ولادت، عائلی نظام، موت، شادی بیاہ اور دکھ درد وغیرہ پر مذہب کا مظاہرہ دیکھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثقافت اور مذہب کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اگر کسی ثقافت کی بنیاد میں مذہبی عنصر نہ ہو تو پھر بھی کسی مذہبی روایت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ عماد الحسن نے اس کی مثال یوں پیش کی ہے:"قدیم تاریخ میں رومی تمدن کی مثال اس طرح ہے کہ بادشاہ کی پرستش کے مسلک نے تہذیبی اور ثقافتی سانچے میں مذہب کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔"(۴۹)

زندگی کا سارا نظام مذہب کے ہی تابع رہا، جذباتی اور روحانی زندگی کے اثرات معاشرتی زندگی پر بھی پڑے۔ شہر میں بسنے والوں کا رہن سہن دیہی علاقوں میں بسنے والے لوگوں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ پہاڑوں میں بسنے والے لوگوں کا رنگ وروپ الگ ہوتا ہے جبکہ میدانی علاقوں کا تمدن بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ریگ زاروں میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کا مزاج بھی جُدا ہوتا ہے۔ صنعتی انقلاب کی بدولت دیہاتی لوگ شہروں کی طرف متوجہ ہوئے، یوں شہر آباد اور وسیع ہونے لگے۔ لوگوں کے میل جول اور باہمی امتزاج نے زندگی میں نئی ثقافت کو نیا روپ دیا۔ معاش اور مذہب نے بھی سرگرمی دکھائی، چنانچہ انسانوں کے میل جول سے اخلاقی قدریں بدلیں، روایات نے جنم لیا۔ لوگوں میں محبت اور اخوت پیدا ہوئی، تفریح گاہیں آباد ہونے لگیں۔ ان چیزوں نے مہمان نوازی میں نیا رنگ بھرا اور اس طرح ایک قومی تشخص نے جنم لیا۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اس کا سب سے بڑا ورثہ ثقافت قرار دیا گیا ہے اگر ثقافتی تشخص موجود نہ ہوتا تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ مسلمانوں کو اپنی مذہبی آزادی کے لیے ایک الگ ملک کی ضرورت تھی۔ اس ثقافت کی بنیادیں ہند عرب ثقافتی ڈھانچے میں موجود ہیں جس میں ہڑپہ، ٹیکسلا، گندھارا اور موہنجوداڑو ہیں۔ اس دور کی تہذیبیں اور ثقافتیں ردوبدل کے ساتھ نسل در نسل مذہب کے ہمراہ آگے چلتی رہی ہیں جو بدلتے معاشرتی رویوں کے ساتھ ہم تک پہنچی لیکن اُس وقت اور آج کی پاکستانی ثقافت میں فرق ہے۔ ڈاکٹر ممتاز حسین کہتے ہیں کہ:

"موہن جوداڑو کی منصوبہ بندی قابل تعریف ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارا عقیدہ پروہت راجا کے عقیدے سے مختلف ہے۔ وہ سورج کا پجاری تھا اور ہمارا

ایمان ایک ایسے خدا پر ہے جس کی سورج پر بھی حکمرانی ہے۔"(۵۰)

عرب تہذیب سے متاثر وادی سندھ کی تہذیب کے شواہد آج کے پاکستانی معاشرے میں یوں دیکھے جا سکتے ہیں کہ موہنجو داڑو سے ملنے والی تختیوں پر جس بیل گاڑی کی تصویر کندہ ہے وہ آج معمولی ردو بدل کے ساتھ ہماری کھیتی باڑی میں نظر آتی ہے۔ بہر حال اس دور کی یادگاریں ہمارا قیمتی ورثہ ہے۔ پاکستان کی ثقافتی بنیاد اسلام پر ہے جسے دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی پاکستانی میل جول میں انجام دیتے ہیں۔ مذہب کے حوالے سے سید مودودی نے "اسلامی تہذیب اور اس کے مبادیات" میں فکری سرچشمے کے حوالے سے ثقافت کو تہذیب کے معنی میں برتا ہے اور اس کے پانچ عناصر "۱۔ تصور حیات۔ ۲۔ آئیڈیالوجی۔ ۳۔ بنیادی عقائد۔ ۴۔ اخلاقی تربیت اور ۔ ۵۔ اجتماعی نظام قرار دیئے ہیں۔"(۵۱) اسلامی ثقافتی مادی میراث کو چھ بڑے درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ فنِ تعمیر۔ ۲۔ مخطوطات اور خطاطی کے نادر نمونے۔ ۳۔ نقاشی۔ ۴۔ سنگ تراشی۔ ۵۔ سفال سازی۔ ۶۔ فنونِ لطیفہ۔ فنِ خطاطی ہمارا مذہبی ورثہ ہے جسے مسلمانوں نے عظیم فن کی شکل دی خصوصاً قرآنی آیات کو عمارتوں پر سجاوٹ کے لیے بھی لکھا گیا۔ ثقافتی ورثے سے مراد وہ اثاثے ہیں جو معاشرہ اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کرتا ہے اور انہیں آنے والی نسلوں تک منتقل کرتا ہے۔ قائد اعظم نے ایک الگ وطن کا خواب نوجوان نسل کو دکھایا اور اُن کے تشخص کے جذبے کو اُبھارا۔ پاکستانی ثقافت کے تین لازمی اجزاء بیان کیے جاتے ہیں جن میں جغرافیہ، تاریخ اور مذہب شامل ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگوں کی ثقافت مذہب کے حوالے سے رہی ہے اور پھر یہ بت پرستی، آتش پرستی، جادو ٹونہ کے عروج پر رہی پھر اسلام نے اس سارے رنگوں کو تبدیل کر دیا۔ اسلام سے پہلے بھی پیغمبروں نے بہت حد تک اس ثقافت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ہمیشہ سے ثقافت مذہب کے تابع نہیں رہی مگر اس کی آمیزش ضرور ہوتی رہی ہے۔ لوگوں کے عقائد اور معاش سے ایک ملی جلی ثقافت سامنے آتی ہے اس سے ایک تہذیب پیدا ہوتی ہے ۔ اسلامی ورثہ پاکستان کی ثقافت ہے کیونکہ پاکستان دو قومی نظریے یعنی ہندو اور مسلم الگ قومیں ہیں کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ مسلمانوں کے نزدیک "اسلامی ثقافت" ہی ان کی ثقافت ہے مسلمان اپنی ثقافت پر فخر کرتے ہیں۔ پاکستان کی حدود کے اندر جو تاریخی عمارات ہیں، آثار ہیں وہ پاکستانی ثقافت کا حصہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خطے میں بتوں کو بنانا اور بتوں کو پوجنا بھی لوگوں کی ثقافت اور مذہبی ضرورت رہی ہے۔ مگر قیام پاکستان کے بعد اس خطے کی یہ ثقافت نہیں رہی ثقافت موجود بھی ہوتی ہے اور بنتی بھی ہے اور ختم بھی ہوتی ہے اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس خطے میں مختلف علاقوں میں روایتی میلے ٹھیلے ہوتے ہیں وہ پاکستان کی ثقافت کا حصہ ہیں بعض میلے

مذہبی تہوار کے طور پر سامنے آتے ہیں مگر ان میں روایتی رقص، طرح طرح کے کھانے، بیلوں کی دوڑ، گھوڑوں کی دوڑ، نیزہ بازی ہی ثقافت کا حصہ ہیں۔ یہ ثقافتیں اور تہذیبیں قدیم ہیں اور اس علاقے میں پہلے سے قائم تھیں۔ جن کو اپنی ثقافت کہنے میں کوئی قباحت یا پریشانی نہیں ہے۔ اسلام تمام اچھی چیزوں کو اپنانے سے منع نہیں کرتا اور نہ ہی تفریح کو۔ ہندوؤں سے مسلمانوں کا ثقافتی اور تہذیبی اختلاف پاکستان کو تحریکِ پاکستان کے لیے متحرک کرنے کا سبب بنا۔ ہماری پاکستانی ثقافت میں دستکاری، فن پارے، روایات، میلے، عوامی اُمنگوں کا زندہ جاوید نمونہ ہیں تہذیب مرتی نہیں ہے۔ عکسی مفتی کہتے ہیں: "جب وراثت کھو جاتی ہے۔ تہذیب مر جاتی ہے تو میوزیم وجود میں آتا ہے اس لحاظ سے میوزیم تہذیبوں کا قبرستان ہے۔"[۵۲]

ثقافت کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک اربن ثقافت اور ایک رورل ثقافت۔ دونوں کا رنگ ایک جیسا ہی ہوتا ہے مگر لوک ثقافت میں وسعت زیادہ ہوتی ہے وہاں کے میلے ٹھیلے زیادہ دنوں کے لیے ہوتے ہیں۔ شہروں میں لوگوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے یہاں پر ذرا چیزیں بھی مختلف انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ معاشرے کی ثقافت بعض اوقات از خود عدالتوں کے فرائض بھی انجام دینے لگتی ہے جس میں علاقے کا بزرگ جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات کو نپٹاتا ہے اور وہ کسی کے مر جانے پر کئی دن تک اس کے گھر والوں کو کھانا مہیا کرتے ہیں۔ پُرسہ دینے کے لیے آنے والے مہمانوں کے لیے رہائش کا انتظام کرتے ہیں یہ بھی ہماری ثقافت کا حصہ ہے۔ پاکستانی ثقافت کا یہ بھی ایک حصہ ہے کہ مرحوم کی قبر پر لوگ مٹی اپنے ہاتھوں سے بھی ڈالتے ہیں۔ پاکستان کی ثقافت پاکستان کا حسن نکھارتی ہے۔ بعض لوگ ثقافت کو ناچ گانا، پتنگ بازی سے بھی منسوب کرتے ہیں جبکہ اسلام تفریح سے منع نہیں کرتا البتہ فحش ناچ گانا مسلمانوں کی ثقافت نہیں ہے اور پھر ایسا تہوار جس میں لوگوں کی جان چلی جائے بھی ممنوع ہے۔ ثقافت کو آج کل مادیت سے بھی منسوب کیا گیا ہے جبکہ وہ تو ایک حصہ ہے جو ورثے میں آیا ہے جیسے موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کے کھنڈرات جس سے ہم کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں وہ ہمارا ورثہ ہیں۔ پرانی تہذیب کے آثار ہیں مگر پاکستان کے اندر پیدا ہونے والی ثقافت جو پاکستان کی اساس سے منطبق ہے ہی پاکستانی ثقافت ہے۔

عکسی مفتی کے مطابق پاکستان کی ثقافت جسے پھول کے ایک گلدان سے منسوب کیا جاتا ہے حقیقت میں ہے نہیں اور نہ اس پر کوئی کام کیا گیا ہے یہ کوئی عمارت یا قلعہ نہیں کہ یکجا ہو۔ اس کے کہیں پہلو ہیں سب ایک دوسرے میں پیوست تو ہیں مگر الگ الگ ہیں ان میں کبھی بھی بڑا شگاف پڑ سکتا ہے۔ دشمن ممالک کی ریشہ

دوانیاں، مکار اور بدعنوان سیاستدان ثقافت کے نام پر علیٰحدگی کا طوفان کھڑا کر سکتے ہیں جس طرف ہمارے ادیب اور حکمرانوں کو دھیان دیناہو گا:

> "پاکستانی ثقافت کاڈرامہ درحقیقت ایک ورائٹی شو ہے جسے رنگ برنگی پھولوں کے گلدستے سے تشبیہ دی تو جاتی ہے لیکن اس کی ہم آہنگی، ملاپ اور یکجہتی پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ کوئی مستند کتاب یا نظریہ منظرِعام پر نہیں آیا۔"(۵۳)

پاکستان کی ثقافت کا ذکر دنیا کی بڑی ثقافتوں میں ہوتا ہے مگر اسے حکومتی طور پر کوئی وقعت نہیں دی جاتی اور نہ ہی ثقافت کو سمجھانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جاتی ہے۔ پاکستان اپنی ثقافت سے اپنی معیشت کو بہتر کر سکتا ہے اس سے پاکستان میں سیاح آسکتے ہیں کئی صنعتیں چل سکتی ہیں جبکہ سیاستدان ذاتی مفادات کے لیے اور بیرونی اشاروں پر مقامی ثقافت کو نظرانداز کرنے کے سیاسی ایجنڈے کو نفرت کے لیے استعمال کر کے خود مقبول ہونا چاہتے ہیں جدید دور میں ثقافت معیشت میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے کئی ممالک کی معیشت صرف اپنے ورثے اور فنونِ لطیفہ پر چل رہی ہے۔

ثقافت کے بنیادی عناصر:

ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جو زندگی کے ہر ایک گوشے کے لیے راہیں متعین کرتی ہے۔ گویا یوں ثقافت ہماری کل زندگی کا احاطہ کر رہی ہوتی ہے۔ چونکہ ثقافت پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اس لیے مختلف مصنفین اور محققین نے اپنی اپنی تحقیق کی روشنی میں ثقافت کے مختلف عناصرِ ترکیبی گنوائے ہیں۔ لیکن جس طرح ثقافت کی تعریف پر تمام محققین متفق نہیں ہیں اسی طرح ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں بھی محققین کے ہاں اختلاف نظر آتا ہے۔ یہ اختلاف گو انفرادی طور پر اور بعض شکوں میں ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ ثقافت انسان کی ساری زندگی کے کل عوامل اور لوازمات کا مجموعہ ہے۔ ثقافت کے عناصر ترکیبی کو ترتیب دیتے وقت محققین اپنے افکار کی روشنی میں بعض اوقات ثقافت کے کسی ایک عنصر کو دوسرے عنصر پر فوقیت دیتے ہیں اور پہلے والے کو دوسرے نمبر پر لے آتے ہیں جبکہ دوسرے محققین پہلے محقق سے اختلاف کرتے ہیں پھر اپنی فکر کی روشنی میں کسی عنصر کو پہلے اور کسی عنصر کو بعد میں رکھ لیتے ہیں لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

دراصل ثقافت کے عناصرِ ترکیبی کی فہرست بہت طویل ہے جس طرح زندگی کے کل افکار اور اعمال کا احاطہ کرنا انسانی اختیار سے باہر ہے۔ اُسی طرح ثقافت کے عناصر ترکیبی کی مدعین فہرست مرتب کرنا مشکل ہے

لیکن بحیثیت مجموعی اگر ثقافت کے عناصر کی بات کی جائے تو ثقافت کے اندر افکار، بنیادی نظریات اور فکر شامل ہے۔اس کے علاوہ ایمانیات ، مذہب، عقائد، عبادت اور مناسک وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ افکار و ایمانیات کے علاوہ ثقافت کے اندر کسی معاشرے کے علوم، اس کی زبان، بولیاں، لب و لہجہ، رسم الخط، جبکہ فنونِ لطیفہ جن میں ادبیات، تخلیقات اور پیشہ ورانہ مہارتیں شامل ہوں تمام ثقافت کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان عناصر کے علاوہ ثقافت کے اندر انسان کے معاملات، معاشرت، اس کے رہن سہن کے طریقے، لباس، حقوق و فرائض، رسم و رواج خواہ خوشی، غمی یا کسی اور جذبے کا اظہار ہو، تقریبات، ایک معاشرے کی عادات، نیکی، بدی، رویے، اسی طرح سیاست و حکومت، نظام و حکومت، داخلی و خارجی سلامتی کے اُمور اور قانون سے متعلق تمام معاملات شامل ہوتے ہیں۔ ثقافت کے ذیلی عناصر میں کسی معاشرے کے کھیل، اس کی تفریحات، سیر و سیاحت وغیرہ یہ تمام ان کے اجزاء میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے بالترتیب تاریخ، جغرافیہ اور مذہب کو بھی ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں شمار کیا ہے۔"[۵۴] ان میں بعض پہلو کسی ایک محقق کے ہاں بیان ہوئے ہیں تو بعض پہلو کسی دوسرے کے ہاں، لیکن ان کے اجزاء کے بارے میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔ یہ ثقافت میں نہیں آتے بلکہ انسانی زندگی کے تمام اُمور ثقافت کے زمرے میں آتے ہیں۔ لہٰذا انسانی عمل کے مجموعے کا نام ہی ثقافت کو قرار دیا جاتا ہے۔

ثقافت یا کلچر کسی خاص خطے، علاقے یا قوم کی طرزِ زندگی، مذہبی عقائد و روایات، تہذیبی اقدار، رنگ و نسل اور زبان و لباس کی مجموعی خصوصیات کا نام ہے۔ ثقافت کی توسیع و ترقی میں ذرائع مواصلات، تعلیمی، مذہبی ادارے اور معاشی وسائل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ذرائع میں تبدیلی اور ترقی کے اثرات لوگوں کی زندگی پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور لوگوں کی زندگی کے انداز بدلتے ہی ثقافت ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ خواہ یہ رنگ اس کے بنیادی رنگ سے کسی قدر مختلف ہی کیوں نہ ہوں، درج ذیل ثقافت کے بنیادی عناصر قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

ا۔ مذہب:

مذہب ہی کی بدولت معاشرے کی سمتیں متعین ہوتی ہیں، یہ اندھیرے میں روشن کرن کی مانند ہے۔ جس کے اثرات انسان کے ظاہر و باطن پر مرتب ہوتے ہیں اور ثقافت بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہر مذہب اپنے پیروکاروں کی زندگی، ان کی عادات و اطوار اور ان کے رہن سہن پر انمٹ نقوش چھوڑتا ہے کیونکہ مذہب انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تمام عناصر مل کر اس قوم کی ثقافت بنتے

ہیں، زندگی کے ہر قدم پر ہم مذہبی عقائد کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کی زندگی پر پیدائش سے لے کر موت تک مذہبی رسومات کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

۲۔ جغرافیہ:

کسی علاقے کی ثقافت کی تشکیل میں وہاں کے جغرافیائی حالات کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ انسان جہاں سکونت اختیار کرتا ہے وہاں کی بدوباش بھی اپناتا ہے۔ وہاں کے جغرافیائی اور موسمی حالات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی ثقافت اُن کے لباس اور رہن سہن سے دیکھی جا سکتی ہے اسی طرح ریتلے علاقوں میں رہنے والوں کی ثقافت اُن کے علاقے کے مطابق بالکل مختلف ہوگی۔ اسی لیے کہا جائے گا کہ کسی بھی علاقے کا جغرافیہ اُس کی ثقافت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بلکہ وہاں کے میدان، جنگل، کھیت، باغ، صحرا، پہاڑ، سبزہ زار، دیہات، شہر، شہر کی گلیاں، گھر وغیرہ یہ سب مل کر ان کی ثقافت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

۳۔ زبان:

زبان اللہ کی طرف سے انسان کو دیا گیا سب سے بڑا عطیہ ہے اور سب سے بڑا ذریعہ ابلاغ بھی ہے۔ اس کے ذریعے سے مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے رابطہ اور گفتگو کرتے ہیں۔ زبان ذریعہ ابلاغ ہونے کے ساتھ انسانی حالات، سوچوں، توہمات، اقدار اور سماجی حالات کی آئینہ دار ہے۔ زبان کسی علاقے کی ثقافت اور وہاں بسنے والے لوگوں کے اخلاق کی عکاس ہوتی ہے۔ کسی بھی اعلیٰ قوم کی زبان شائستگی، پاکیزگی، شگفتگی، سنجیدگی، وقار و متانت کا مرقع ہوتی ہے۔

۴۔ لباس:

لباس، جہاں ایک طرف بدن کو ڈھانپنے اور زیبائش کے لیے استعمال ہوتا ہے وہاں یہ کسی بھی قوم کی ثقافت اور تشخص کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کے مختلف علاقے ہوتے ہیں، وہاں بسنے والے لوگ اپنی جغرافیائی اور موسمی حالات کے مطابق لباس کا انتخاب کرتے ہیں جو اُن کی ثقافت کی پہچان بنتا ہے۔ لباس کے انتخاب میں مذہب بھی بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لباس کسی شخص کی شخصیت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اور اسی سے کسی قوم کی مجموعی ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۵۔رسوم ورواج وعقائد:

اسلام دین امن ہے اور اس میں اقلیتوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس میں صفائی، پاکیزگی، حیاء، عفت وشرم پر بہت زور دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی شعوری طور پر اور بہت سی رسومات کے باوصف، بچے کی پاکیزگی کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔سب سے پہلے اسے اسلامی طریقے سے غسل دیا جاتا ہے پھر کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے کان میں اذان دی جائے۔عقائد میں مسلمان توحید پرست ہیں ایک اللہ کے ماننے والے ہیں، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرتے ہیں۔اللہ کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں یوم آخرت پر ان کا مکمل یقین ہے۔

ان تمام عقائد کا تعلق انسان کے باطن سے ہے ظاہری طور پر مسلمان نماز ادا کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، حج جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں ادا کرتے ہیں۔یہ تمام عوامل مل کر ان کے اندر ایک بہتر معاشرہ میں بہترین زندگی گزارنے کی خواہش پیدا کرتے ہیں۔کلچر کا ایک اور شعبہ زندگی کے لوازم ہیں یعنی رہنا سہنا، کھانا پکانا وغیرہ۔مذہب کے لوگوں کی زندگی پر حاوی ہونے کی وجہ سے تمام رسوم ورواج بھی مذہب اور ثقافت کے تابع ہیں۔

۶۔بناؤسنگار:

بناؤسنگار بھی ثقافت کا حصّہ رہا ہے، جس میں پردے کا خیال رکھا جاتا تھا۔پہلے بالوں کی چوٹی اور جوڑا بنانے کا رواج تھا لیکن وقت کے ساتھ بالوں کے بہت سے ڈیزائن سامنے آتے گئے۔پہلے چہرے پر غازہ ملا جاتا تھا اُس کی جگہ مختلف اقسام کی کریموں نے لے لی۔جدّت آنے سے مہندی، پان، عطر کے ساتھ پوڈر، لپ اسٹک اور نیل پالش متعارف ہوئی۔

تہذیب کے بنیادی عناصر:

سبط حسن ہر نئی پرانی تہذیب کی تشکیل کے لیے چار عناصر کو ضروری قرار دیتے ہیں جن میں شامل ہیں: "۱۔طبعی حالات۔۲۔آلات و اوزار۔۳۔ سماجی اقدار۔۴۔ نظام فکر و احساس۔"[۵۵] جبکہ پروفیسر ڈاکٹر ساجد امجد اپنی کتاب "اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات" میں سبط حسن کی اس ترتیب کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ اس طرح مرتب کرتے ہیں "۱۔طبعی حالات۔۲۔ انسانی شعور۔۳۔نظام فکر و احساس۔۴۔سماجی اقدار۔۵۔بیرونی اثرات۔"[۵۶]

ا۔ طبعی حالات:

کسی بھی تہذیب کے تشکیلی عناصر میں طبعی حالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں یعنی ہر تہذیب کا اپنا مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے:

> "کیونکہ وہ مخصوص جغرافیہ کے اندر ہی نشو نما پاتی ہے۔اس کے مخصوص دریا، پہاڑ، جنگل، میدان، پھل پھول، سبزیاں، چرند پرند، آب وہوا اور موسم یعنی خارجی ماحول نہ صرف انسانوں کے ذریعہ طرز عمل، معاش، رہن سہن، خوراک وپوشاک، مزاج و مذاق، اخلاق وعادات، جذبات واحساسات پر اثر انداز ہوتا ہے۔"(۵۷)

بلکہ طبعی ماحول کا انسانوں کے جسم اور بالواسطہ ان کی سیرت کو متاثر کرنا ایک صریحی عمل ہے۔ مختلف طبعی ماحول ہی کی وجہ سے ہم بآسانی ریگستانی، سمندری، برفانی، پہاڑی اور میدانی علاقوں کی تہذیبوں میں فرق کر سکتے ہیں۔ جیسے مشرقی اور مغربی تہذیب، عربی اور عجمی تہذیب میں واضح فرق نظر آتا ہے کیونکہ ان علاقوں کے طبعی حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ طبعی ماحول کا انسانی ذہن پر براہ راست اثر انداز ہونا عام بات ہے۔ جیسے تنگ و تاریک گھروں اور گندی وبدبودار گلیوں میں رہنے والے بچوں اور بڑوں کی شخصیت ان لوگوں سے الگ ہوتی ہے جن کو زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں نصیب ہوتی ہیں۔ طبعی حالات کسی قوم کی ایک خاص شخصیت تخلیق کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کا اظہار زندگی کے جس شعبے میں ہوتا ہے اسے ہم اس قوم کی تہذیب کہتے ہیں۔بقول سبطِ حسن:

> "تہذیب کے ابتدائی دور میں انسان طبعی ماحول کا زیادہ تابع تھا۔اس کی پوری تاریخ طبعی ماحول کی تسخیر کی تاریخ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں نے اپنے طبعی ماحول کو اتنا بدل دیا ہے کہ دو ہزار سال قبل کا انسان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ صنعت و حرفت اور سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے باعث طبعی ماحول کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے۔"(۵۸)

اب انسان دریاؤں کے رخ بدل سکتا ہے، جہاں تیل کا ایک قطرہ نہیں ملتا وہاں تیل سے چلنے والی مشینوں کی بہتات ہے۔ جہاں پانی کی ایک بوند میسر نہ تھی وہاں نہریں چشمے اُبلتے ہیں۔ لیکن یہ سب انسانی شعور کی ترقی کے باعث ہوا۔

۲۔ آلات و اوزار:

تہذیب کی عمارت کا مدار آلات و اوزار پر ہے اور انسانی تہذیب کی ترقی آلات و اوزار کی ترقی پر ہی منحصر ہوتی ہے۔ جس قسم کے آلات و اوزار ہوں گے تہذیب بھی اسی قسم کی ہو گی۔ تہذیب کے مختلف ارتقائی ادوار آلات و اوزار ہی کی مناسبت سے مقرر کئے ہیں۔ مثلاً ا۔ پتھر کے زمانے کی تہذیب۔ ۲۔ کانسے کے زمانے کی تہذیب ۳۔ اور لوہے کے زمانے کی تہذیب وغیرہ۔ مراد ہے کہ جس زمانے میں انسان پتھر یا ہڈی کے آلات و اوزار استعمال کرتا تھا تو اس کا رہن سہن، رسم و رواج، باہمی رشتے، عادات و اطوار اور سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز یعنی اس کی تہذیب مخصوص طرز کی ہوتی تھی۔ کانسے کے آلات و اوزار نے رواج پایا تو معاشرے کا پورا بالائی ڈھانچہ بدل گیا۔ لوگوں نے جنگل بیابانوں میں مارے مارے پھرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد کر لیں، موشی پالے اور کھیتی باڑی شروع کی۔ مٹی اور دھات کے برتن بنائے رفتہ رفتہ ریاستیں قائم ہوئیں، نئے نئے ہنر اور پیشے وجود میں آئے۔ آلات و اوزار کی تبدیلی سے معاشرے کی زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی تغیرات آئے۔ لوہے کے زمانے کی تہذیب میں فصلوں کی کاشت ہل بیل کی بجائے بھاری بھاری مشینوں سے ہوتی ہے۔ فارم کی نگرانی کسی ماہر زراعت کے سپرد ہو گی۔ جتائی، بوآئی، کٹائی اور ذخیرہ اندوزی کے لیے مشینیں استعمال ہوں گی۔ فارم میں گوبر کے بجائے مصنوعی کھاد ڈالی جائے گی۔ آب پاشی کے لیے رہٹ کے بجائے انجن سے چلنے والے ٹیوب ویل لگے ہوں گے۔ اناج کو صاف کرنے اور آٹا پیسنے کی مشینیں لگی ہوں گی۔

۳۔ نظام فکر و احساس:

ہر تہذیب کا مخصوص نظام فکر و احساس ہوتا ہے۔ ہر معاشرے کا نظام فکر و احساس اس کے سماجی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ تغیرات آلات و اوزار اور سماجی روابط میں تبدیلی کی وجہ سے آتے ہیں۔ دراصل نظام فکر و احساس کی تبدیلی خود اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ معاشرے کی تخلیقی احساس اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی، مثلاً پتھر کے زمانے کی تہذیب کو لیں تو اس وقت انسان تیر کمان سے شکار کر کے یا خود رو درختوں کے پھل پھول کھا کر ہی اپنی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ جو چیزیں اس کو سکھ دیتی تھیں ان کو وہ پسند کرتا تھا اور جو چیزیں اسے دُکھ پہنچاتی تھیں ان سے وہ ڈرتا تھا (بعد میں یہی نیکی اور بدی، خیر و شر کی قوتیں قرار پائیں) اس وقت اس کا نظام فکر و احساس افزائش نسل اور افزائش خوراک کی ضرورتوں کے محور پر گھومتا تھا۔ کانسے

کے زمانے میں بھی عام عقیدہ یہی تھا کہ بیماری کا باعث کسی رب، کسی دیوی یا جن بھوت کی ناراضگی ہے۔ اس لئے لوگ دوا دارو کی بجائے جھاڑ پھونک، دعا تعویز، نذر نیاز کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ کانسے کی تہذیبوں کا انداز فکر و احساس زیادہ ترقی یافتہ تھا کیونکہ کانسے کے دور میں پیداواری آلات و اوزار بہتر ہو گئے تھے۔ پتھر کے زمانے کا معاشرہ شکاری اور سفری معاشرہ تھا، کانسے کا معاشرہ زرعی معاشرہ تھا۔

۴۔ سماجی اقدار:

سماجی اقدار میں کسی معاشرے کے رسم ورواج، طرز بود وباش، روابط وسلوک اور اخلاق وعادات شامل ہیں اور اس کے پیچھے صدیوں کی روایات ہوتی ہیں۔ بقول معروف محقق ڈاکٹر عابد حسین:

"تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے جسے وہ اپنے اجتماعی ادارت میں ایک معروضی شکل دیتی ہے جسے افراد اپنے جذبات، رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔"(۵۹)

جبکہ سبط حسن کے نزدیک:

کسی معاشی میں روابط وسلوک، اخلاق اور عادات، طرز بود وباش، رسم ورواج، حسن وعشق، جمال اور فن کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کی سماجی اقدار کہلاتے ہیں۔"(۶۰)

اس کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں۔ معاشرے کے افراد ان قدروں کی پابندی کرتے ہیں۔ سماجی رشتوں کی بعض غیر پیداواری قدریں مشترک ہوتی ہیں مثلاً راست بازی، مہمان نوازی، رحم دلی، عدل وانصاف، مظلوم کے ساتھ ہمدردی، فنکاروں کی عزت، عالم فاضل بزرگوں کا احترام، شعر وشاعری اور گانے بجانے کا شوق، شادی بیاہ کی تقریبوں میں خوشی اور غمی یا موت پر افسوس کا اظہار یہ قدریں کم وبیش سب تہذیبوں میں رائج ہوتی ہیں۔ البتہ ان کو برتنے کے انداز اور قاعدے جدا جدا ہوتے ہیں۔

لیکن بعض قدریں معاشرے کی انفرادی خصوصیت ہوتی ہیں اور ضروری نہیں کہ دوسرا معاشرہ بھی ان قدروں کی پیروی کرے۔ مثلاً بعض قومیں چھپکلی، مینڈک، سانپ، سور حتیٰ کہ کتے کا گوشت بھی بڑے شوق سے کھاتی ہیں جبکہ دوسری قومیں ان جانوروں کو چھونا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اسی طرح تن کی عُریانی ہمارے معاشرے میں نہایت معیوب ہے حالانکہ بعض قبیلے بالکل ننگے رہتے ہیں۔ بعض تہذیبوں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ہے، بعضوں میں ممنوع نہیں ہے۔ بعضوں میں طلاق کا رواج ہے بعضوں میں نہیں ہے۔ سماجی قدریں جامد اور ناقابل تغیر نہیں ہوتیں بلکہ اُن میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی

ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی معاشرے میں سماجی قدروں کے مختلف پیمانے رائج ہوتے ہیں۔ اخلاقی پیمانہ عورتوں کے لیے مردوں سے جدا ہوتا ہے۔ چنانچہ عصمت اور پاک بازی ہمارے معاشرے میں فقط عورت کا زیور ہے۔ انہی عناصر میں تغیر و تبدل معاشرے میں انتشار کا باعث بھی بنتا ہے۔

ثقافتی انتشار سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انتشار کے معنی کیا ہیں تاکہ ثقافتی انتشار کو سمجھا جا سکے۔ انتشار کے لغوی معنی پراگندگی، بے ترتیبی، بد نظمی، پریشانی، تردد، گھبراہٹ، پھیلنے اور بکھیرنے کی کیفیت کا عمل ہے۔ عوام میں اضطراب اور بے چینی، تخریبی کاروائی، بدامنی کی فضا، منتشر ہو جانے والے کے ہیں۔ یہ ایک نظریہ ہے جسے انگریزی میں Butterfly Effect کہتے ہیں۔ نظریہ انتشار کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ شروع میں بظاہر نظر آنے والی چھوٹی چھوٹی سی تبدیلیاں بعد میں آنے والی بہت بڑی تبدیلیوں کو جنم دے سکتی ہیں۔ یہ نظریہ ہماری توجہ ان عوامل کی جانب لے جاتا ہے جو بظاہر ایک معمولی دکھائی دینے والی تبدیلی کے نتیجے میں حیران کن نتائج دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ثقافتی انتشار سے مراد معاشرے کے ثقافتی اُصولوں اور اقدار میں پائے جانے والی خراب حالت ہے۔ یہ انتشار معاشرے میں مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے اور بہت سے عوامل سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ ثقافتی انتشار کا سامنا تب ہوتا ہے جب کوئی شخص ایک نئی اور مختلف ثقافت میں داخل ہوتا ہے اور اسے وہاں کے رسوم و رواج، زبان اور طرزِ زندگی کے مطابق خود کو ڈھالنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے ثقافتی انتشار کا باعث بننے والی وجوہات میں زبان کی رکاوٹ، سماجی روایات و عادات، غذائی عادات، لباس اور طرز زندگی، سماجی تعلقات، ماحولیاتی تبدیلیاں اور نفسیاتی دباؤ شامل ہے۔ ثقافتی انتشار میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف ثقافتوں کے ساتھ بڑھتی ہوئی نمائش کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ معاشرے میں متضاد اقدار اور عقائد کی وجہ سے ثقافتی انتشار پھیلتا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی بدولت تعلقات بہتر بننے اور معلومات کے استعمال میں بہتری آئی ہے وہاں ہی یہ بیگانگی کا باعث بھی بنی ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ثقافتی انتشار فطری طور پر منفی نہیں ہوتا یہ تیز رفتار سماجی تبدیلی، عالمگیریت، آبادیاتی تبدیلیاں، تکنیکی ترقی، سیاسی اور سماجی ہلچل، نسلی فرق، ماحولیاتی اور اقتصادی عوامل یہ سب عناصر مل کر ثقافتی انتشار پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ ثقافتی افراتفری کو اپنانے میں اکثر ورثے کا احترام کرنے اور زندگی کے نئے طریقوں کو اپنانے کے درمیان توازن تلاش کرنا شامل ہے۔ ثقافتی انتشار کے اثرات اکثر باہم مربوط ہوتے ہیں اور معاشرے کی ثقافتی حرکیات پر پیچیدہ اثرات

مرتب کرتے ہیں۔ ثقافتی افراتفری کو عالمگیریت، تکنیکی ترقی، میڈیا کے اثر و رسوخ، نقل مکانی، سماجی نقل و حرکت، اقتصادی رکاوٹ اور تعلیم جیسے عوامل سے فروغ دیا جاسکتا ہے۔

ثقافتی انتشار مختلف محرکات، اسباب اور عوامل سے متاثر ہوتا ہے۔ لوگوں میں ترقی کی خواہش کی حوصلہ افزائی کر کے سماجی بہتری لانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ ثقافتی افراتفری جن محرکات، اسباب اور عوامل سے متاثر ہوتی ہے ان میں ترقی اور اختراع کی خواہشات، شناخت اور صداقت کی تلاش، عالمی رابطہ اور نمائش، تیز رفتار تکنیکی ترقی، عالمگیریت، آبادیاتی تبدیلیاں، سیاسی اور سماجی تحریکیں، نسلی حرکیات، میڈیا کا اثر ورسوخ، معاشی بدحالی، ماحولیاتی عوامل اور تعلیم شامل ہیں۔ یہ عناصر مل کر ثقافت کی متحرک نوعیت کو تشکیل دیتے ہیں کیونکہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ ڈھلتی ہیں۔

ثقافتی الجھنوں کو ختم کرنے میں معاشرے کے ثقافتی منظر نامے میں وضاحت اور تفہیم کا احساس فراہم کرنے کی کوششیں شامل ہیں۔ جو ایک زیادہ ہم آہنگ اور جامع معاشرے کو سامنے لاتی ہیں۔ جہاں مختلف ثقافتی پسِ منظر سے تعلق رکھنے والے افراد باہمی احترام کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ ثقافتی انتشار کو ختم کرنے کے لیے ٹھوس کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ افراد، تعلیمی ادارے، حکومتیں اور میڈیا ثقافتی خواندگی کو فروغ دے کر معاشرے کے لیے بہتر طریقے سے کام کر سکتے ہیں۔ ثقافتی انتشار کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ثقافتی انتشار کے اثرات انفرادی نقطہ نظر، سماجی سیاق و سباق اور مخصوص حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ثقافتی افراتفری سے تخلیقی صلاحیتیں سامنے آتی ہیں جو نئے خیالات، فن کی شکلوں اور اظہار کے ظہور کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ثقافتی منظر نامے کو تقویت ملتی ہے اور یہ نئی روایات کی ترقی کا باعث بن سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں ہیگل کے نظریہ تصوریت اور ماورائیت کے خلاف رد عمل شروع ہوا جس کے بانی کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز تھے۔ ان دونوں نے مل کر ایک نظریہ پیش کیا جسے آج کل جدلیاتی مادیت کہا جاتا ہے۔ مادیت کو انگریزی میں Materialism کہا جاتا ہے اس کے معنی ایسے نظریہ کے ہیں جس کی رو سے سوائے مادے کے دنیا میں کوئی جوہر موجود نہیں ہے یعنی مادہ پرستی۔

انگریزی کے جس لفظ کا ترجمہ جدلیات کیا گیا ہے یعنی (Dialectics) وہ بہت پرانا لفظ ہے اور اس کی پیدائش قدیم یونان میں ہوئی جس کے لغوی معنی دو آدمیوں کے درمیان گفتگو کے ہیں۔ دوران گفتگو عام طور پر اس بات کا امکان رہتا ہے کہ ایک شخص ایک بات کہے دوسرا اس میں کوئی نقص پا کر اس کی تردید

کرے اور اس کے برعکس کوئی دوسری بات کرے یعنی اکثر گفتگو مناظرہ اور مباحثہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور اس میں مقابلہ کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ہیگل کے فلسفے کی بنیاد بھی یونان کے ان دو خیالات پر ہے، پہلی یہ کہ کوئی شے ساکن نہیں ہے ہر شے متحرک ہے۔ دوسری ہر شے نہ صرف بدلتی ہے بلکہ اس کے بدلنے میں اپنی پہلی ہیت کی تردید کرکے اس سے بہتر اور برتر صورت اختیار کرتی ہے۔

مادیت پسند دانشوروں اور فلسفیوں کے مطابق اشیاء میں حرکت مخصوص قانون کے تحت جاری و ساری رہتی ہے جسے تضاد کا قانون کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر وجود اپنے اندرونی تضادات کے ٹکراؤ یا کشمکش کے ساتھ ہی برقرار رہتا ہے۔ اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں جب وجود ختم ہو جاتا ہے تو نیا وجود جنم لیتا ہے اور اپنے نئے تضادات کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ "جدلیاتی" فکر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حرکت اور تبدیلی کی بنیاد تضاد اور کشمکش پر ہے۔ روایتی رسمی منطق تضاد کو ختم کرنا چاہتی ہے جبکہ جدلیات اسے قبول کرتی ہے۔ تضاد تمام موجودات کی لازمی خصوصیت ہے یہ بذات خود مادے میں موجود ہے یہ تمام حرکت، تبدیلی، ترقی اور زندگی کا سرچشمہ ہے۔

جدلیات کے عمل میں تین اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ تھیس (دعویٰ) اینٹی تھیس (جواب دعویٰ) اور سنتھیس (حاضر شدہ نتیجہ)۔ کسی بھی شے یا نظام کے بارے میں موجود خیال کو (دعویٰ) اور اس کے ضد میں پیدا ہونے والی سوچ کو (جواب دعویٰ) اور دونوں کے ٹکراؤ سے ظہور پذیر ہونے والی سچائی کو (حاصل شدہ نتیجہ) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ علم و تحقیق کے سفر میں کوئی بھی حاصل شدہ نتیجہ حتمی نہیں ہوتا اور نیا وجود یا (حاصل شدہ نتیجہ) خود ایک (دعویٰ) کی جگہ اختیار کرلیتا ہے جس میں تضادات کی موجودگی کے باعث حرکت کا عمل جاری رہتا ہے اور بالآخر ایک نیا وجود ظہور پذیر ہوتا ہے۔ نفی کی نفی کا یہ عمل بدستور جاری رہتا ہے۔ اینگلس کہتا ہے کہ:

> "یہ عظیم بنیادی خیال کہ کائنات کو تیار شدہ اشیاء کے مجموعے کی طرح نہیں بلکہ عوامل کے ایسے مجموعے کی طرح سمجھنا چاہیے جس میں چیزیں جو بظاہر پائیدار ہیں، ذہن میں ان کی شبیہوں، تصورات کی طرح وجود میں آنے اور ختم ہو جانے کی مسلسل تبدیلی سے گزرتی ہیں۔"[۲۱]

یہ خیال ہیگل کے زمانے میں عام شعور رکھنے والوں کے ذہن میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ اس کی عمومیت کی تردید مشکل سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس بنیادی خیال کو الفاظ میں تسلیم کرنا اور بعد میں تحقیق کے ہر

شعبے میں تفصیل سے اس خیال کا اطلاق کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ "جدلیاتی فلسفے کی نظر میں کوئی چیز آخری" مطلق اور مقدس نہیں ہے:

"وہ ہر شے کا آنے اور ہر شے میں عبوری کردار عیاں کرتا ہے۔ سوائے وجود میں آنے اور گزر جانے کے مسلسل عمل، نشیب سے فراز کی جانب لاانتہا عروج کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اور بذات خود جدلیاتی فلسفہ اس عمل کا سوچنے والے دماغ میں محض انعکاس ہے۔"(۶۲)

چنانچہ مارکس کے مطابق جدلیات: "بیرونی دنیا اور انسانی غور و فکر دونوں کے عام قوانین حرکت کی سائنس ہے۔"(۶۳) مارکس اور انجلز نے ہیگل کے تصورات کو طبقات معاشرہ کی آویزش میں منتقل کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہیگل کا یہ خیال درست ہے کہ فکرِ انسانی اور کائنات بدلتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذہن میں جو بھی تغیرات ہوتے ہیں وہی عالم مادی میں بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ معاشرے اور عالم مادی کے بدلنے کے ساتھ ہی تصورات بھی بدل جاتے ہیں اس حوالے سے کارل مارکس کہتا ہے کہ: "جرمن فلسفہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے، ہمارا فلسفہ زمین سے آسمان کی طرف جاتا ہے۔"(۶۴) قدیم یونانی فلاسفہ اور اٹھارویں صدی عیسوی کے فرانسیسی قاموسیوں کے نزدیک مادیت مابعد الطبیعاتی تھی یعنی وہ کائنات کو جامد، ساکت اشیاء کا ملغوبہ سمجھتے تھے اور اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ کائنات اشیاء کا نہیں اعمال کا مجموعہ ہے۔ انجلز لکھتا ہے کہ:

"دنیا بنی بنائی اشیاء کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ گوناگوں اعمال کا مجموعہ ہے۔ جس میں اشیاء جو بظاہر ہمیں ساکن دکھائی دیتی ہیں اور ان کے عکس جو ہمارے ذہنوں پر پڑتے ہیں بدلتے رہتے ہیں۔"(۶۵)

ہر شے رواں دواں ہے اور کسی کو دوام نہیں۔ جدلیات فطرت اور معاشرے کے بارے میں غور و فکر کرنے اور ان کی وضاحت کرنے کا طریقہ کار ہے۔ کائنات کو دیکھنے کے اس طریقہ کار کا نقطہ آغاز یہ اصول ہے کہ ہر چیز مسلسل تغیر اور بہاؤ کی حالت میں ہے۔ جدلیات واضح کرتی ہے کہ تغیر اور حرکت میں تضاد شامل ہوتا ہے اور صرف تضادات کے ذریعے ہی تغیر اور حرکت ممکن ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترقی کا عمل ایک سیدھی لکیر کی طرح نہیں ہے بلکہ عرصے تک اس میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں واقعہ ہوتی رہتی ہیں۔ جنہیں ہم مقداری تبدیلیاں کہتے ہیں۔ اس کے بعد یکایک نہایت تیز رفتار اور دھماکہ خیز تبدیلی کے ادوار آتے ہیں جن میں مقدار معیار میں تبدیل ہو جاتی ہے، جدلیات تضاد کی منطق ہے۔ جدلیات کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ

یہ نہ صرف ترقی کو مسلسل انداز میں دیکھتی ہے بلکہ یہ بھی دکھاتی ہے کہ تضاد سے ترقی کس طرح جنم لیتی ہے۔ جدلیاتی طریقہ کار بتاتا ہے کہ کس طرح انتہائی معمولی تبدیلیاں ایک نقطہ انتہا پر پہنچ کر بہت بڑی تبدیلیوں کو جنم دیتی ہیں۔ اسی کو ہم مقدار کی معیار میں تبدیلی کا قانون کہتے ہیں۔ جدلیاتی مادیت سماج اور فطرت کو بالکل نئی طرح سے سمجھنے کا ایک طریقہ کار ہے۔ جدلیت سے مراد یہ ہے کہ:

> "فطرت کے حوادثات برابر متحرک ہوتے ہیں، وہ برابر بدلتے رہتے ہیں اور فطرت کی متضاد طاقتوں کے باہمی جدل و پیکار سے فطرت کا ارتقاء ہوتا ہے۔ جبکہ خیال پرستوں کے نزدیک فطرت اشیاء اور حوادث کا ایک اتفاقی مجموعہ ہے۔ وہ حوادثات اور اشیاء کو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے، ایک دوسرے کو بدلتے ہوئے، ایک دوسرے سے بندھوا نہیں سکتے۔ اس کے برخلاف جدلیت فطری واقعات اور حوادث کو ایک دوسرے سے متعلق ہر فطری حادثہ کو اس کے ماحول اور دوسرے حوادث سے اثر پذیر سمجھتی ہے۔"[۲۶]

جدلیت کا یہ قانون صرف فطری حادثات کے ارتقاء میں کار فرما نہیں بلکہ انسانی معیشت کے ساتھ ساتھ تاریخ کے ارتقاء میں بھی موجود ہے۔ کارل مارکس کے افکار سے جہاں بہت سے لوگ متاثر نظر آتے ہیں وہیں سوویت روس کا بانی لینن بھی اس کے افکار سے متاثر ہوا۔ لینن نے کارل مارکس کے افکار کو دل و جان سے اپنایا اور ان افکار کی بنیاد پر عملی طور پر ایک مملکت کے نظام کو استوار کیا اور مارکس کے اُصولوں کو ایک ریاستی نظام کی شکل میں عملی طور پر برت کے دکھایا۔ جدلیت کے نزدیک کوئی بھی ایک فطری حادثہ اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس کے ارد گرد کے حوادث سے اس کے تعلق کو نہ سمجھا جائے۔ اس رو سے سماجی نظام کا ارتقاء یا اس کی تاریخ میں سماجی تبدیلی کسی اٹل یا ابدی تصور یا کسی بیرونی آفاقی تصور کے ماتحت نہیں ہوتی بلکہ ہر سماجی تبدیلی کے اسباب اس کے گرد و پیش کے حالات میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر سماجی تبدیلی کو سمجھنے کے لیے اُن تمام حالات کو سمجھنا ضروری ہے جس کی وجہ سے وہ تبدیلی ہوتی ہے۔

جدلیت کے نزدیک فطرت جامد، غیر متحرک اور ساکن نہیں ہے بلکہ اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ فطرت ہمیشہ ارتقاء پذیر رہتی ہے اس میں بعض چیزیں بڑھنے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہتی ہیں اور بعض چیزیں منتشر اور برباد ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے واقعات و حادثات کو سمجھنے کے لیے نہ صرف ان کے باہمی تعلقات اور رشتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے بلکہ ان کی حرکات، ان کے وجود میں آنے اور مِٹ جانے کے عمل، ان کی تبدیلی کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز ایک خاص وقت

میں بہت مستحکم نظر آتی ہو لیکن اصل میں اس کا زوال شروع ہو چکا ہو۔اور دوسری چیز ایک خاص وقت میں غیر مستحکم ،زوال پذیر اور کمزور معلوم ہوتی ہو لیکن در حقیقت وہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ترقی کر رہی ہو، جدلیت اسی چیز کو مضبوط خیال کرتی ہے جو بڑھ رہی ہو۔ جس کی طاقت میں مسلسل اضافہ اور نمو ہو رہی ہو۔

جدلیات کا طریقہ ہمیں سماج میں بکھرے بے ترتیب اور بے شمار حقائق کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ طریقہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ کون سے مادی حقائق ہیں جن کا آپس میں تعلق ہے جو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ کون سی چیزیں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے متعلقہ تو ہیں لیکن ان کا آپس میں ایسا رابطہ نہیں ہوتا جیسے کہ حاصل اور علت کا ہوتا ہے یہ طریقہ ہیگل نے بھی استعمال کیا تھا۔ جدلیت کے اس اُصول کی رو سے اگر ہم سماج کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کوئی سماجی نظام انمٹ اور اٹل نہیں ہے۔ ذاتی ملکیت کا حق کوئی آفاقی یا ابدی کلیہ نہیں ہے۔ کسان اور جاگیر دار کا رشتہ کسی "ابدی انصاف" اُصول پر مبنی نہیں ہے۔ سرمایہ دار اور مزدور کا موجودہ رشتہ، سرمایہ داری کا نظام، عدل کے کسی لافانی تصور کی پیداوار نہیں ہے۔ جس طرح غلامی کے نظام کی جگہ جاگیرداری کا نظام قائم ہوا اور غلامی کے نظام کا خاتمہ ہوا۔ جس طرح جاگیرداری نظام پر سرمایہ دارانہ نظام حاوی ہو گیا، اسی طرح حالات کے تقاضے کے مطابق سرمایہ داری نظام کو مٹا کر اس کی جگہ سوشلزم یا اشتراکیت کا نظام قائم ہوا۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک کہتے ہیں کہ :

> "ثقافتوں کے زوال کے اسباب بھی متعدد اور متنوع ہیں۔ دنیا اتنی سکڑ گئی ہے کہ ایک معاشرے کے اثرات دوسرے پر کئی طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں اور یوں کمزور ثقافتیں موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔"(٦٧)

طاقت ور اقوام کے کمزور اقوام سے تعلقات کا جائزہ، یا کثیر الثقافتی ممالک (مثلاً بھارت کا مطالعہ یا ان ممالک کی ثقافت کا جائزہ لیتے ہیں جہاں کسی غالب قوم نے مختلف ثقافتوں کے حامل افراد کو طاقت کے زور سے یکجا کر دیا۔ اس کی مثال جزائر عرب الہند یا سری لنکا ہیں جہاں بڑی تعداد میں تامل آباد کر دیئے گئے یا جزائر فجی جہاں ہندی مزدوروں کی آبادی مقامی آبادی سے کئی گنا زیادہ ہے یا جنوبی افریقہ جہاں آباد کاروں کی معمولی تعداد مقامی اکثریت پر اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے حاوی ہے۔ دیکھا جائے تو ان صورتوں میں ثقافتی تنازعات کا پتہ چلتا ہے۔ ان ممالک میں سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی نظام کے قیام اور عمل میں ہمیشہ رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں گی اور یہی صورتحال آج کل پاکستان کو درپیش ہے۔ اس سلسلے میں زبیر رانا لکھتے ہیں کہ:

> "پاکستانی اخلاقیات اور ثقافتی قدروں کے رواجوں کو آج ۱۹۹۷ء کے دور میں اشتہاری کمپنیوں

کے ذریعے متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اشتہاری کمپنیاں یہ بتاتی ہیں کہ انسان کی اچھائی اور برائی کا تعین اس کے پیشے سے ہو گا۔"(۶۸)

اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ معاشی اور سیاسی نظام میں انسان کا کردار، ثقافت، اخلاقیات اور تہذیب کے حوالے سے نہیں پرکھا جاتا بلکہ اس کے پیشہ ورانہ عہدے اور مرتبے کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے۔ ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستانی لوگ انسانیت کو معیار نہیں سمجھتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شخص جس مشین کا پرزہ ہے کیا اس میں فٹ ہوتا ہے یا نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

"موجودہ نظام میں ثقافت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے اور اصل مقام معیشت کو حاصل ہے جس کی غلامی کرنا انسان کی مجبوری بن چکا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں معیشت انسانیت کی خدا بن کر راج کرتی ہے۔"(۶۹)

زبیر رانا اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"پاکستانی علاقوں میں تہذیب و ثقافت کے ارتقاء کی راہوں کو بگاڑنے اور بچپن سے جوانی تک پہنچتی ہوئی ثقافت کو اجاڑنے کی وارداتیں سیاسی طریقوں سے کی گئیں کیونکہ اس خطے کی سیاست کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ اس میں بسنے والی مخلوق کو انسان نہ بننے دیا جائے مویشی بنا کر استعمال کیا جائے۔"(۷۰)

پاکستان کی سیاسی قیادتوں نے سیاسی اور تہذیبی ارتقاء کو برباد کرنے کے سوا کوئی اور کام کیا ہی نہیں، اس لیے یہاں آج تک ہر وہ شخص جبر و ستم اور بھوک کا نشانہ بنتا آ رہا ہے جو انسانی تہذیب و ثقافت کی نشو نما کرنے لگتا ہے۔ اس جمہوریت میں پاکستان میں موجود سیاسی پارٹیوں نے ہمیشہ انسانی تہذیب کے ارتقائی پروسس کو تباہی کی ڈگر پر چلانے والا کردار ادا کیا۔ ذات برادری کا جو سسٹم جاگیرداری اور قبائلی سسٹم کی روایت لے کر چلا آ رہا تھا وہ محنت کش اور محکوم طبقات کی جدوجہد کے راستے میں ہمیشہ رکاوٹ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

شادی بیاہ کی رسومات میں کروڑوں روپے کے کھانے، جہیز کے شو، نیو نیدروں اور سلامیوں کی نیلامی اور کلاشنکوفوں کی فائرنگ کے مناظر بھی اُبھر کر سامنے آئے اور اس کے ساتھ جبری شادیوں کے لیے قتل و غارت کی وارداتیں بھی۔ غریبوں کی بیٹیاں جہیز نہ لانے کی وجہ سے جلا کر مار دی جاتی ہیں اور چولہے پھٹنے کے

کیس بھی منظر عام پر آتے رہے۔ تعلیم سے طالب علموں کے کردار کی نشوو نما سے ہٹ کر ان کو صرف غلام بنایا جاتا ہے پاکستان میں جو میلے لگتے تھے ان کو بھی کچل دیا گیا ہے کہ:

"جاگیر دارانہ دور کی فرقہ پرستی کے خلاف تحریکیں چلانے والے صوفیائے کرام کے مزاروں پر جو میلے منعقد ہوتے تھے، ان پر ماشل لاء کے دور میں تو پابندیاں لگادی گئیں، لیکن ان کے بعد بھی ان میلوں کو محکمہ اوقاف کی فرقہ پرست پالیسیوں اور رشوت خوریوں کے کنٹرول میں منعقد ہونے والے عرس بنا دیا گیا۔ فصلوں کی کٹائی کے تہواروں پر لگنے والے میلے اور موسمی تہوار بھی تباہ کر دیئے گئے۔ حالانکہ یہ میلے برصغیر میں صدیوں سے چلتی آنے والی ان طبقاتی تحریکوں کی تہذیبی و ثقافتی اظہار بن کر تہواروں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔"(۷۱)

ہماری تہذیب دنیا کی تمام تہذیبوں کی طرح ایک طبقاتی جدل میں تشکیل ہوتی رہی ہے۔ اس جدل میں جب جب تخلیقی اور پیداواری طبقے کامیاب ہوتے رہے ہیں تب تک تہذیب نکھرتی، سدھرتی اور سنورتی رہی، لیکن جب جب حیوانی بستیوں کے تحت جینے والے اس استحصالی اور امیر طبقے اپنا غلبہ حاصل کرتے رہے، تو یہ اجڑتی رہی۔ آج یہ تہذیب اجڑی ہوئی نظر آتی ہے تو اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس عالمی سرمایہ دار طبقے کے سرمایہ دارانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا مالک ہے اور اس نے انسان کی تہذیبی ضرورتوں کو کبھی پوری ہی نہیں ہونے دیا جن کو پوری کیے بنا انسان اپنے وجود کی تکمیل ہی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا رہن سہن حیوانوں سے الگ تو ہے لیکن حیوانی کلچر سے ممتاز نہیں۔

ج۔ بحران: بنیادی مباحث و تصورات:

بحران شدید مشکل یا خطرے کی صورتحال کا نام ہے۔ یہ مختلف صورتوں میں رونما ہوتا ہے جیسے معاشی بحران، صحت کا بحران اور ثقافتی بحران۔ ثقافتی بحران ایک پیچیدہ موضوع ہے جو مختلف عوامل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بحران کسی معاشرے میں ثقافتی شناخت، روایات اور اقدار کی تبدیلی کے نتیجے میں جنم لیتا ہے۔ جب کوئی معاشرہ جدید عالمی سطح پر رابطوں یا سیاسی تبدیلیوں کا سامنا کرتا ہے تو اس کی ثقافت پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ثقافتی بحران اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب معاشرے کو اپنے ثقافتی اُصولوں، اقدار یا شناخت میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ثقافتی شناخت مشترکہ عقائد، روایات، زبان، رسوم و رواج اور تاریخ کے باہم ربط سے قائم ہوتی ہے اور افراد کو آپس میں سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ فیروز الغات میں بحران کے معنی کچھ ان الفاظ میں ملتے ہیں: بیماری کے زور کا دن، تُعطل، اڑچن، نازک حالت۔(۷۲) ڈاکٹر ارشد محمود اپنی

کتاب "ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ" میں ثقافتی بحران کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ: جن اقدار اور نظریات کو ہم سینے سے لگائے ہوئے ہیں وہ تہذیب کے عجائب گھروں کا حصّہ بن چکے ہیں۔(۷۳) مفتی منیب الرحمٰن اپنے ایک مضمون میں بحران کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: سراسیمگی، دیوانگی کی حالت، بخار وغیرہ میں اچانک پیدا ہونے والا تغیر، مریض پر حالتِ بیماری اور تندرستی کی کشمکش۔(۷۴) یعنی حالات ایک جیسی صورتِ حال پر برقرار نہ رہ سکیں، اُن میں مدّ و جزر اور تغیّر و تبدّل آتا رہے تو ایسی صورتحال کو بحران کہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اعتماد کا قائم رہنا دشوار ہوتا ہے۔ ریختہ ڈکشنری میں بحران کے معنی کچھ یوں ملتے ہیں:

> "مرض کا زور، بیماری کی غیر معمولی شدت جو یکایک واقع ہو یا مخصوص دنوں میں جیسے
> تیسرے دن یا چوتھے دن وغیرہ (طبیبوں کا خیال ہے کہ اس حالت میں طبیعت مرض
> سے جنگ کرتی ہے جس کا نتیجہ موت ہوتا ہے یا صحت، طبیعت اور مرض کا مقابلہ)"(۷۵)

بحران کی مزید وضاحت ان الفاظ میں ملتی ہے: مجازاً واقعات اور حالات کے سنگین مرحلے پر پہنچنے کی صورت حال۔(۷۶) جب بھی کسی معاشرے کی بات آتی ہے تو سب سے پہلے اس کی پہچان وہاں بسنے والے لوگوں کے رسم و رواج اور ان کی مروجہ روایات کی نشاندہی سے اس معاشرے کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل ہوتی ہے کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک مکمل معاشرہ نہیں کہلا سکتا جب تک اس کے باسی ان روایات کی پاسداری اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ ہر معاشرے کی ثقافت ہوتی ہے لیکن علاقائی یا مقامی اثرات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر ثقافت میں تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں وقت کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ ثقافت میں یہ تبدیلیاں دو عوامل کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں ایک رابطے کی وجہ سے اور دوسری ایجادات یا ٹیکنالوجی کی وجہ سے۔

ا۔ رابطے:

جب مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو قدرتی طور پر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی اچھی چیزوں کو بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے رہن سہن، رسم و رواج اور عادات تک کو اپنا لیتے ہیں۔ جس طرح مغلوں کی ثقافت کو مقامی لوگوں نے اپنایا، انگریزوں کی ثقافت کو ہندوستانیوں نے اپنایا لیکن ثقافت میں صرف مادی ثقافت کو اپنایا جاتا ہے، بغیر مادی ثقافت مثلاً اخلاقی اقدار اور مذہبی نظریات کو نہیں اپنایا جاتا ہے۔

۲۔ ٹیکنالوجی:

ٹیکنالوجی کی وجہ سے ثقافت میں بہت زیادہ تبدیلیاں آتی ہیں۔ زراعت کے شعبے سے لے کر زندگی کے ہر شعبے میں جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں وہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہیں۔ ہم گھر بیٹھے الیکٹرانک میڈیا کی بدولت مختلف ملکوں کے حالات دیکھتے ہیں۔ ان کے رسم ورواج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لباس، کھانے پینے کی چیزیں، کھانا کھانے کے طریقے، گھروں کی تعمیر، گھروں کی آرائش و زیبائش کے طریقے وغیرہ سب صنعت اور ٹیکنالوجی کے فروغ سے بدل گئے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید تبدیل ہوتے رہیں گے۔

ثقافتی بحران میں ایک ثقافتی گروہ دوسرے ثقافتی گروہ پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ امریکہ کی دریافت کے بعد ثقافتی بحران کے اہم مسئلے کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ دراصل یہ بحران ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں ہمارے معاشرے میں موجود رہا ہے۔ مذہبی مبلغین، سیاحوں، ڈاکٹروں، تاجروں اور مہم پسندوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب یو این او بنا تو ہمارے تعلقات، رسل و رسائل اور نقل و حمل کی وجہ سے مزید مضبوط ہو گئے۔

کسی معاشرے کی تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا ڈھانچہ فرد کے لیے تشکیل پاتا ہے اور اس کا مقصد فرد کی انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تحفظ ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے روحانی، جذباتی، معاشی و معاشرتی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کر سکے۔ قدیم عہد کے انسان کو بہت سے خطرات کا سامنا تھا۔ موسمی تغیرات کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے زندگی آسان نہ تھی اس لیے اُس نے محفوظ پناہ گاہ کی تلاش شروع کی اور اس سفر کا اختتام غار کے دہانے پر ہوا۔ اور یہیں سے انسان کی گروہی زندگی کا آغاز ہوا۔ معاشرتی زندگی کے ابتدائی مراحل میں افراد کا مل جل کر گروہ کی صورت میں رہنا، غاروں کا مشترکہ استعمال اور ایک دوسرے کے کام آنا فطری عمل کے طور پر سامنے آیا۔ ابتداء میں فرد کے لیے ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا اس لیے شکار کا گوشت سب لوگ مل جل کر استعمال کرتے تھے: اس عہد کے لوگ شکار کے گوشت کے بڑے بڑے مچے باہم مل بیٹھ کر اور باری باری دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔[۷۷]

جوں جوں انسان کا مادی ذرائع پر تسلط ہوتا گیا اسی طرح انفرادی زندگی اور ملکیت کے رجحانات بھی فروغ پانے لگے۔ غار میں رہنے والا انسان تہذیب کا اوّلین معمار تھا۔ انسان نے مختلف علوم وفنون اور پیشوں کو اپناتے ہوئے تہذیب و تمدن کی جانب پہلا قدم رکھا۔ اس سفر میں آگ کی دریافت نے انسان کے آگے بڑھنے اور اُس کے رہن سہن میں واضح تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا:

"آگ نہ صرف انہیں جاڑے کی سختی سے محفوظ رکھتی تھی بلکہ تاریک راتوں میں اس کے روشن الاؤ خونخوار درندوں کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ آگ کو دیوتا بنا دیا گیا اور اس کی پرستش قدیم مذاہب میں رواج پا گئی۔(۴۸)

مردوں کے شکار پر چلے جانے کے بعد عورتیں اپنا فارغ وقت قدرتی مظاہر اور فطرت کے مشاہدے میں مشغول رہ کر گزارتیں۔ اُن کے مشاہدے میں آیا کہ کسی جگہ پر جب کوئی بیج گرتا ہے تو وہاں پر ایک نئی قسم کا پودا اُگ آتا ہے جن میں سے کچھ پھل دار پودے پرندوں اور جانداروں کی خوراک کا حصّہ بن گئے۔ ان کے ذائقے کو چکھا گیا اور رفتہ رفتہ گوشت کے متبادل کے طور پر ان نباتات کا استعمال شروع ہو گیا۔ غاروں کے قریب کی جگہ کو صاف کر کے وہاں کاشت کاری کا آغاز کیا گیا اور اس طرح انسان نے زرعی سماج کی بنیاد رکھی۔ زرعی انقلاب کے اس آغاز نے معاشرتی زندگی کو ایک سانچے میں ڈھال لیا۔ اس سے قبل ہی انسان نے شکار کے لیے نوکیلے پتھروں اور نوکیلی لکڑی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ جیسے جیسے انسان نے آلات و اوزار کے استعمال کو ترقی اور وسعت دینی شروع کی تو ایسے وہ ترقی کے سفر کو زیادہ تیز رفتاری سے انجام دینے لگا۔ بقول سبط حسن:

"جس زمانے میں انسان پتھر یا ہڈی کے آلات و اوزار استعمال کرتا تھا تو اس کا رہن سہن، رسم و رواج، باہمی رشتے، عادات و اطوار اور سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز یعنی اس کی تہذیب مخصوص طرز کی ہوتی تھی۔ لیکن جب کانسی کے آلات و اوزار نے رواج پایا تو معاشرے کا پورا بالائی ڈھانچہ بدل گیا۔ لوگوں نے جنگل، بیابانوں میں مارے مارے پھرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد کر لیں، اور مویشی پالے، کھیتی باڑی شروع کی، ہنر اور پیشے وجود میں آئے۔ طبقے بنے، قانون وضع کیے گئے اور اخلاق و مذہب کے ضابطے تیار ہوئے، غرضیکہ معاشرے میں طرزِ عمل، طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا ایک نیا نظام قائم ہو گیا جو پتھر کے زمانے کے سماجی نظام سے بالکل مختلف تھا۔"(۴۹)

زرعی سماج کی وجہ سے انسانی معاشرے کی گروہی تقسیم شروع ہوئی۔ جب انسان نے زراعت شروع کی اور مویشی پالنے شروع کیے تو موسمی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت محسوس کی۔ جہاں پر وہ اپنے اناج کو طاقتور گروہ سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس کام کے لیے قبیلے کے طاقتور افراد کو حفاظت کے لیے چُن لیا گیا۔ اس طرح فوج وجود میں آ گئی، ساتھ ہی اقتدار، حکومت، محکوم اور حاکم کا تصور بھی جنم لینے

لگا اور بستیوں نے شہروں، ملکوں اور ریاستوں کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔ اب معاشرتی ڈھانچے کی ہیئت بدل چکی تھی اور اسے تہذیب و ثقافت کی جانب انسان کا پہلا قدم قرار دیا جاتا ہے۔ ذاتی ملکیت کا تصور پیدا ہوتے ہی انسان نے قدرتی غاروں کو چھوڑ کر میدانوں میں اپنے گھر بنائے، موسمی اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پہلے کھالوں اور پھر کپڑوں سے خود کو ڈھانپنا شروع کیا۔ زبان کے طفیل ادب نے فروغ پایا جس سے جذبات واحساسات کو اظہار کا راستہ ملا۔ زبان ہی کی بدولت آج کی دنیا نے ایک گلوبل ویلج کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ زبان تہذیبی ورثے کی منتقلی کا اہم ذریعہ ہے، زبان ہی کی بدولت ایک نسل اپنی اقدار وروایات کو اگلی نسل تک منتقل کرتی ہے۔ یہی تجربات وروایات آگے چل کر کسی قوم کی تہذیبی حیثیت اور شناخت کو طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ تصادم کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے، تہذیب و ثقافت کی وضاحت کے بعد دیکھتے ہیں کہ آویزش کا مطلب کیا ہے:

> آویزش فارسی زبان کا لفظ ہے جو کہ آویختن سے نکلا ہے جس کے معنی (لٹکانا، لٹکنا، دست و گریبان ہونا کے ہیں) نزاع، جھگڑا، لڑائی، مقابلہ، کھینچا تانی، کشتی، دشمنی، لاگ، ڈانٹ، چپقلش، فساد، باہم کشیدگی کے ہیں۔"[۸۰]

یعنی تہذیبی و ثقافتی آویزش سے مراد تہذیبی و ثقافتی کش مکش یا تہذیبی و ثقافتی کشیدگی ہے۔ تہذیبی آویزش کے نظریے کو تقویت تب ملی جب مغرب کے مفکر سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے "فارن افیئرز" کے ۱۹۹۳ء میں موسم گرما کے شمارے میں "تہذیبوں کا تصادم" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جس کا لب لباب کچھ یہ تھا کہ: "ابھرتی ہوئی گلوبل سیاست کا بنیادی اور خطرناک ترین رُخ مختلف تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ ہوگا"[۸۱] اس مضمون کے بعد اس موضوع پر مصنف کی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" منظر عام پر آئی جس میں تہذیبوں کا تصور، اقدار اور ثقافت کا باہمی تعلق، ایک آفاقی تہذیب کا مسئلہ، غیر مغربی معاشروں میں مقامیت پذیری، تہذیبوں کے درمیان بدلتا ہوا طاقت کا توازن، تہذیبوں کی سیاسی ساخت، مسلم عسکریت پسندی اور چین کا دعویٰ، مغربی آفاقیت کے پیدا کردہ جھگڑے، خطِ تقسیم کی جنگوں کے اسباب و حرکیات، مغرب اور تہذیبوں پر مشتمل دنیا کا مستقبل جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان تمام مباحث کے بعد سیموئیل پی ہنٹنگٹن کا اس بار پر اصرار ہے کہ:

> "تہذیبوں کے ٹکراؤ عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور مستقبل میں عالمی جنگ سے بچنے کی یقینی تدبیر یہ ہے کہ تہذیبوں کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی نظام کو تشکیل دیا

جائے۔"[۸۲]

"تہذیبوں کا تصادم" کے رد عمل میں کئی مضامین منظر عام پر آئے جن میں دلائل کے ساتھ مصنف کی طرف داری کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا تہذیبی آویزش کا کوئی تاریخی پس منظر بھی ہے یا نہیں، کسی اور مفکر نے بھی کیا اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یا نہیں؟ کیا سماجی و سیاسی عوامل بھی تہذیبی آویزش پیدا کرنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ تہذیبی آویزش کے پس منظر پر غور کرنے سے یہ بات ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد روز ازل سے ہی پڑ گئی تھی۔ جب عالم انسانی پر ایسا دور آئے کہ دین و اخلاق کی ابدی و ازلی قدریں برباد ہو جائیں، جب انسان خدائے واحد کی عبادت چھوڑ کر بے شمار جھوٹے معبود بنا لیں۔ نیکی اور پرہیز گاری کی جگہ مال و نسب کو وسعت وعظمت ملنے لگے تو بعض انسان ظلم و جبر یا مکاری و عیاری سے کام لے کر کمزور انسانوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر ذلیل کر دیتے ہیں اور ایسے حالات میں ناانصافی و ظلم کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ افراد و قبائل کے امتیازات اور انسانی گروہوں کی اونچ نیچ سے نسل انسانی کے اتحاد اور انسانیت کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ فحاشی و عریانی اور شراب و قمار اور اس کے ساتھ ساتھ تمام حرام چیزیں حلال سمجھ لی جاتی ہیں۔ ایسے معاشرے یا قوموں میں سچ کی جگہ جھوٹ اور عدل کی جگہ بے انصافی شروع ہو جاتی ہے۔

شروع میں انسانوں کی رہنمائی کے لیے خدا پیغمبر بھیجتا رہا۔ جب حضور ﷺ کے ذریعے نبوت اور خدا کے پیغام کی تکمیل ہوئی تو بعد میں مجددین بھیجے گئے جو لوگوں کو دین کی طرف بلاتے۔ تہذیبی آویزش اصل میں حق و باطل کی جنگ ہے۔ جن تہذیبوں نے خدائی پیغام کو بھلا دیا ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا اور ان کی جگہ ان تہذیبوں نے لے لی جو ان سے بہتر تھیں۔ اللہ نے قران پاک میں فرمایا ہے:

بے شک اللہ کسی قوم کی اچھی حالت نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ خود اپنی حالت بدل لیں۔"[۸۳]

اللہ نے قران پاک میں فرمایا:

"اسی طرح اللہ حق اور باطل کو بیان کرتا ہے، سو جھاگ دور ہو جاتا ہے (ضائع ہو جاتا ہے)
سوکھ کر، لیکن جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔"[۸۴]

ارشاد باری تعالی ہے:

"کیا تمہارے پاس لشکروں کی بات (خبر) پہنچی، فرعون اور ثمود کی، بلکہ جن لوگوں نے کفر کیا
(کافر) جھٹلانے میں (لگے ہوئے ہیں) اور اللہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔"[۸۵]

عاد و ثمود یا فرعون کی قوم ہو ان کی تہذیبیں غلط اعمال کے باعث مٹ گئیں اور ان کی جگہ بہتر تہذیبوں نے لے لی۔ تہذیبی آویزش کا سلسلہ روز ازل سے یونہی چلا آرہا ہے، جب کوئی تہذیب مردہ ہو جاتی ہے اور انسانیت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تو اس سے بہتر تہذیب اس کی جگہ لینے آجاتی ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد ہو یا عرب کی بلکہ عرب ہی کیا مصر، ایران، روما اور یورپ کے بڑے بڑے ملک بھی اس طرح کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ خدا نے اپنا آخری پیغام پہنچانے کے لیے عرب کو چنا جو تہذیب و شائستگی کے ادنیٰ ترین مراحل پر تھا اور اس میں بھی افتراق، شرک، انسان پرستی، اوہام پرستی، بت پرستی، مے پرستی، نفس پرستی، قمار پرستی اور فحش پرستی کا ہنگامہ برپا تھا۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے توفیق الٰہی سے مصلح ہو کر تنہائی اور بے سروسامانی کی حالت میں اپنے گرد و پیش کی پوری دنیا کو چیلنج دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں سے کہا کہ تم سب ایک انسان کو خدا کا بیٹا کہتے ہو اور باطل عقائد کے پابند ہو اس لیے گمراہ ہو۔ یہودیوں کو للکارا کہ عزیز خدا کا بیٹا نہ تھا، تم نے موسیٰ کی شریعت کو ترک کیا۔ عیسیٰ کی نبوت سے انکار کیا، لہٰذا تم بھی گمراہ ہو۔ گویا تم خدا کی خدائی کے منکر ہو اس لیے تمہاری گمراہی میں کوئی شک نہیں۔ تم نے انسانوں کو خدا بنا رکھا ہے اور خدا کے بندوں کو ظلم و جور کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ غرض محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر تھے اس لیے ان کا چیلنج دنیا بھر کے نام تھا:

> "اللہ کسی گمراہی کو روا نہیں رکھ سکتا خواہ وہ کتنی شان و شوکت والی ہو۔ اسلامی تہذیب کے دیگر تہذیبوں پر برتری اور آویزش اس اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور اقدار کے باعث حاصل ہے۔"(۸۶)

یہ تعلیمات شرک کی مذمت، مظاہر قدرت کی تسخیر، توحید، بشریت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، پاک بازی، عدل و انصاف، راست بازی، اخوت، رواداری، مساوات، جذبہ، امانت میں خیانت سے ممانعت، سود خوری کی مذمت، غصے کی ممانعت، عجز و انکسار، متانت و تواضع، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، غلاموں، یتیموں، عورتوں، اتحاد کی نصیحت، والدین کے حقوق، شراب، زنا، ظن، جوا، تجسس اور غیبت کی ممانعت، قرض حسنہ اور وراثتی نظام ہیں یہی اقدار اسلامی تہذیب میں رچی ہوئی ہیں۔

تہذیبی تصادم یا آویزش ایک نظریہ ہے جو کہ مغرب کا ایجاد کردہ ہے، جس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اصل میں اس نظریے سے مغرب کے دانشور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ دور میں تہذیبوں کا

تصادم ضرور ہوگا۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے یہ نظریہ دراصل فرانسس فوکویاما کے مضمون جو بعد میں The end of history and the last man کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جس کا لب لباب یہ ہے:

"سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جنگ کا کوئی مخصوص زمانہ گزر رہا، بلکہ اس تاریخ کا یہ اختتام ہے جس میں انسانیت نے نظریات کی بنیاد پر ارتقا کرلی تھی۔ اب بین الاقوامی مغربی لبرل جمہوریت کے فروغ کا زمانہ ہے جو انسانی حاکمیت کی آخری شکل ہے۔"[۸۷]

فرانسس فوکو کے نزدیک تاریخ کے اختتام سے مراد دنیا کے قدرتی عوامل کا رک جانا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بڑے سوالات حل ہو چکے ہیں اور اداروں میں مزید ترقی نہیں ہوگی۔ اس نظریے کے رد عمل کے نتیجے میں کئی نظریات منظر عام پر آئے جس میں سب سے پہلے انگریز مورخ Bernard lewis کا ۱۹۹۰ء میں The Atlantic Monthly کے ستمبر کے شمارے میں شائع ہونے والے مضمون "اسلامی طیش کی جڑیں The roots of Muslims rage" جس میں سب سے پہلے "تہذیبی تصادم" کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ اس کے علاوہ ممتاز امریکی سکالر ایلون ٹوفلر نے اپنی تصنیف Creating a new Civilization میں تہذیبی تصادم کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ایلون ٹوفلر کے خیال میں مستقبل میں تہذیبی تصادم کی بنیاد مذہب کی بجائے، ذرائع پیداوار کے اختلاف و امتیاز پر رکھی جائے گی۔ اس کے نزدیک "انسانی تاریخ زرعی، صنعتی اور مابعد صنعتی ادوار میں تقسیم ہے اور ان کے درمیان تصادم کا عمل ابھی تک جاری ہے۔"[۸۸] ان نظریات میں سب سے زیادہ مقبولیت سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے تہذیبی تصادم کے نظریے کو حاصل ہوئی "تہذیبوں کا تصادم اور ورلڈ آرڈر کی از سر نو تعمیر" میں سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے تصورات بنیادی طور پر مندرجہ بالا تمام نظریات سے الگ ہیں۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن کا تہذیبی تصادم کا مفروضہ پانچ فکری بنیادوں پر استوار ہے:

۱۔ "تہذیب اپنی اصلیت میں مکمل طور پر مختلف اور منفرد ہوتی ہیں اور ان میں اشتراک و تعاون کا امکان بہت مشکل ہوتا ہے۔

۲۔ ان کا ٹکراؤ وجود میں آتا ہے اور یہ بڑی حد تک ایک منطقی ضرورت بن جاتا ہے۔

۳۔ تہذیبیں دراصل نسل اور مذہب کی بنیاد پر اپنا تشخص قائم کرتی ہیں۔

۴۔ مغربی تہذیب کے فکری اور ثقافتی اتحاد نے مغرب اور باقی دنیا کو غیروں میں تقسیم کردیا ہے۔ گویا مغرب کا مقابلہ بقیہ "دوسروں" کے ساتھ ہی ہے۔"[۸۹]

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے مطابق کی تہذیبوں کے درمیان طاقت کے توازن میں کمی آرہی ہے۔اس کے ساتھ مغرب کے اثرات کم ہو رہے ہیں اور ایشیائی تہذیبیں اپنی سیاسی،اقتصادی اور فوجی قوت میں روز بروز اضافہ کر رہی ہیں۔ اسلام کو عالمی سطح پر تیزی سے فروغ حاصل ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ اسلام مسلم ممالک کے پڑوسیوں اور غیر مغربی تہذیبوں پر اثر انداز ہو کر انھیں اپنی ثقافتی اقدار سے وابستہ ہونے پر آمادہ کر رہا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم سے سیموئیل پی ہنٹنگٹن یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ تہذیبی بنیاد پر "ورلڈ آرڈر"اُبھر رہا ہے۔ جو معاشرے ثقافتی ہم آہنگی اور یکسانیت رکھتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ مختلف معاشروں کی ایک تہذیب کو چھوڑ کر دوسری تہذیب کو اپنانے کے سلسلے میں جو بھی کوششیں ہو رہی ہیں ناکام ہیں۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن مزید لکھتا ہے کہ مغرب کا آفاقیت کا دعوٰی اسے تہذیبی تصادم کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ اسلامی بنیاد پرستی کا جائزہ لیتے ہوئے مغرب اور اسلام کے درمیان ممکنہ تصادم کا مفروضہ پیش کرتا ہے۔ وہ مغرب کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

> "مغرب ایک گلوبل جنگ کے خطرے سے اگر بچنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کے رہنما کثیر ثقافتی کردار کی حامل عالمی سیاست کو نہ صرف تسلیم کر لیں بلکہ اسے برقرار رکھنے میں تعاون بھی دیں اس کے نزدیک اہل مغرب کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی شناخت کے تعین کے لیے کون سا رویہ اپناتے ہیں۔ اتحاد یا نفاق؟"[۹۰]

یہ تصادم دیکھا جائے تو بنیادی طور پر موجودہ غالب مغربی تہذیب اور ان تہذیبوں کے درمیان ہو گا جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ طاقتور اور مختلف ہیں۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے مذکورہ فارمولے کے مطابق تصادم اور ٹکراؤ کے جو امکانات پیدا ہوتے ہیں ان میں تین تہذیبوں کا کردار بنیادی نوعیت کا ہو گا:

۱۔ مغرب، جو غالب تہذیب کا نمائندہ ہے۔

۲۔ اسلام، جس میں تہذیب اور ثقافتی طور پر مغرب کو چیلنج کرنے کی صلاحیت ہے۔

۳۔ چین، جو ثقافتی طور پر متمول اور ایک الگ کلچر کا نمائندہ ہے۔"[۹۱]

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے نزدیک انسانوں کے درمیان جنگ اب ثقافت (کلچر) کی بنیاد پر ہو گی اور اس کا کہنا ہے کہ: "تہذیبوں کا تصادم ہی دنیا پر سکہ چلائے گا اور ہو سکتا ہے یہی ثقافتی و تہذیبی تصادم ہی مستقبل کی مروجہ جنگوں کا پیش خیمہ ہو۔"[۹۲]سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے خیال میں یہ تصادم اسلام اور مغرب، چین اتحاد کے درمیان ہو گا اگرچہ چین اور اسلام تہذیبی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن

مغرب کے خلاف ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ اقتصادی اور ثقافتی طور پر جاپان مغرب کے لیے چیلنج ہے۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے نزدیک مسلمان ممالک میں کوئی ملک ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جسے مسلم دنیا کی تہذیبی مرکز کی حیثیت حاصل ہو۔ اس لیے ہر مسلمان ملک کا مغربی ممالک سے تعلق اپنی نوعیت کا ہے۔ بعض مسلمان ممالک میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مغرب مخالفت کا رجحان پیدا ہوا تو اس کی وجہ وہاں اقدار کی تبدیلی تھی۔ بنیاد پرستی کا عروج ہوا، اسلامی گروپوں اور مغرب کے درمیان جنگ کی ایسی صورتحال پیدا ہوئی اور امریکہ اور مسلم ممالک کے درمیان روابط کمزور ہوئے۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے مطابق اسلحے کی عدم توسیع، انسانی حقوق اور جمہوریت اور نقل مکانی ان تین مسائل کی جانب مغرب نے خاص توجہ دی ہے۔ لیکن مغرب اور دیگر تہذیبوں کو تقسیم کرنے والے مسائل اب بین الاقوامی سیاسی ایجنڈے میں بہت اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے مطابق بیسویں صدی میں متعدد عوامل نے اسلام اور مغرب کے درمیان فاصلوں کو وسیع کیا مثلاً مسلم ممالک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کی وجہ سے نئی نسل کا اسلام پسندوں کے ہتھوں چڑھ کر مغرب کی طرف نقل مکانی کرنا۔ اسلامی احیا کی وجہ سے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ان میں اپنی تہذیبی اقدار پر قائم رہنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ کمیونزم کے زوال سے مغرب اور اسلام اپنے مشترکہ دشمن کے خاتمے کے بعد ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے۔ ترقی کے باعث علیحدہ تہذیبی شناخت کا شعور بڑھا اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ اور مذہبی رواداری کمزور پڑ گئی۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے مطابق یہ تہذیبی تصادم ان علاقوں میں موجود ہو گا جہاں پر دو مخالف تہذیبیں ایک ساتھ ہوں گی۔ بالخصوص مسلم دنیا کے وہ علاقے جن کو فالٹ لائن تنازے کہا جاتا ہے جو مختلف تہذیبی گروہوں کی آپس میں جنگ ہے اور انہی جنگوں کی وجہ سے دنیا میں پناہ گزینوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ تنازعے کوئی نئی بات نہیں بلکہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس کے خیال میں تہذیبوں کے درمیان موجود ان تنازعوں کے باعث عالمی امن کو خطرہ درپیش ہے اور ان کا ذمہ دار وہ اسلامی ممالک کو ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے کہ: "مسلمان کو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ پر امن انداز سے رہنے میں دشواری پیش آتی رہی ہے۔"[۹۳] اور وہ مستقبل کے بارے میں کہتا ہے کہ:

> "عالمِ اسلام کی سرحدیں خون آلود ہیں۔۔۔۔۔ مغرب کے لیے بنیادی مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں بلکہ بذات خود اسلام ہے جو کہ خود ایک مکمل تہذیب ہے۔"[۹۴]

مسلم ممالک میں تیزی سے آبادی کی بڑھتی ہوئی شرح اور مشرقی ایشیا کی تیز رفتار معاشی ترقی سے مغرب کی اجارہ داری کو خطرہ درپیش ہے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی یوریشیا میں جنگوں کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس تہذیبی جنگ میں چین پیش پیش ہو گا سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے نزدیک:

"اگر مغرب اسلام سے خوف زدہ ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ڈبل اسٹینڈرڈ اور منافقت کو اپنائے ہوئے ہے۔ اس تہذیبی تصادم سے بچنے کے لیے یک رنگی Mono Culturalism یا Multi Culturalism کو فروغ دیا جارہا ہے۔ "یہ یک رنگی ثقافت دراصل وہ ابلیسی تہذیب ہے جو مسلمانوں کو طعنہ دیتی ہے کہ تم ایک کم ترین تہذیب ہو۔ ہماری تہذیب اپنالو۔ یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ اور ہالینڈ میں یہ تہذیبی تعصب (Polarization) بہت زیادہ ہے۔"(۹۵)

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کی اس تصنیف کا نچوڑ یہ نکات ہیں۔ ۱۔ مغربی تہذیب کا استحکام اور اس کی راہ میں آنے والی ہر مزاحمت کا خاتمہ۔ ۲۔ غیر مغربی تہذیبیں بالخصوص اسلام اور چینی تہذیبیں مغرب کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ چین کے میزائیلوں سے زیادہ خطرناک اسلام کا احیا ہے۔ اس کے نزدیک :

"اسلام ہی وہ واحد تہذیب ہے جس نے مغرب کی بقا کو غیر یقینی بنا کر رکھا ہوا ہے اور اس نے یہ کام کم از کم دو بار کر دکھایا ہے۔"(۹۶)

تہذیب کا ایک اور اہم تشکیلی عنصر تہذیبوں کی آپس میں کشش ہے۔ جب دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں یا ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں تو نتیجہ میں لازماً ایک نئی تہذیب کا جنم ہوتا ہے۔ تہذیبیں کبھی جامد نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ متحرک رہتی ہیں، لیکن افراد کے قوموں کے باہم میل ملاپ اور مختلف تہذیبوں کے اشتراک یا کشمکش کے نتیجے میں کوئی تہذیب دوسری تہذیب کے رنگ اپنا لیتی ہے اور اپنی شکل بدلتی رہتی ہے بعض اوقات تو یہ بالکل نئی تہذیب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

مغربی تہذیب سے مراد وہ تہذیب ہے جو تقریباً گزشتہ تین چار سو سالوں کے دوران یورپ میں اُبھری۔ اس کا آغاز مشرقی یورپ پر ترکوں کے قبضے کے بعد سولہویں صدی کے بعد ہوتا ہے جب لاطینی اور یونانی علوم کے ماہر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف علاقوں کی طرف بھاگے، خصوصاً مغربی یورپ کی طرف جو اس وقت تک جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مشرقی علوم کے استفادہ نے وہاں ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ علوم، فلسفہ، سائنس اور مشینوں کی ترقی نے اس تہذیب کو بے انتہا طاقت ور بنا دیا کہ آج دنیا کی بیشتر تہذیبوں پر مغربی تہذیب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ جس طرح مشرقی تہذیب کی شناخت اس کی اخلاقیات،

مذہب اور روحانیت پر ہے اسی طرح مغربی تہذیب کی بنیاد سائنسی ترقی، عقلیت اور مادیت پر ہے اور یہی سب مغربی تہذیب کی شناخت کا سب سے اہم حصہ ہے۔ مغرب کی مادی ترقی اور کسبِ زر کو زندگی کی میراج سمجھا جاتا ہے۔

روحانی اقدار و روایات اور انسانی اخلاق کی مغربی تہذیب میں وہ جگہ نہیں جو مشرقی تہذیب میں ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو وہ ہر تہذیب میں ایک لازمی عنصر ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ مختلف تہذیبوں میں اس کی شمولیت زیادہ یا کم ہو سکتی ہے۔ مشرقی روایات و اقدار کی بنیاد ہی مذہب پر ہے اور مذہب ہی ہماری تہذیب کی شناخت کی بنیادی انفرادیت بھی ہے۔ لیکن مغرب میں یہ بات بالکل اُلٹ ہے۔ مغربی اقدار و روایات میں مذہبی، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی اقدار و روایات کی کمی یا نظر اندازی نے انسانی زندگی اور معاشرے کے اعتدال، توازن اور ہم آہنگی کو بڑی حد تک متاثر کر کے ان کو ایک مشینی زندگی میں داخل کر دیا ہے۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "مغرب ایسی واحد تہذیب ہے جس کو کسی خاص مذہب، جغرافیائی علاقے یا لوگوں کے نام کے بجائے "کتب نما کی سمت" کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ پہچان اس تہذیب کو تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی زاویوں سے ماورا کر دیتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب یورپی تہذیب ہے۔ جدید عہد میں مغربی تہذیب یورپی، امریکی یا شمالی اٹلانٹک تہذیب ہے۔ یورپ، امریکہ اور شمالی اٹلانٹک کو تو نقشے پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن مغرب کو نہیں اس نام "مغرب" نے مغربیت کے تصور کو پیدا کیا ہے۔"(۹۷)

مغربی مادہ پرست روایات و اقدار نے یورپ کو اخلاقی پستی سے دوچار کیا اور انہوں نے انسانی روح اور باطن کے بجائے ظاہر پر ہی توجہ دیتے رہے۔ جذباتی، روحانی، اخلاقی اور مذہبی اقدار و روایات سے دوری کا ایک بڑا سبب سائنس اور علوم پر حد سے زیادہ انحصار تھا۔ اس انحصار کی وجہ سے سائنسی انکشافات قدم قدم پر عقائد سے ٹکرانا شروع ہو گئے اور عقائد کو متزلزل کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں مغرب ان مذہبی، روحانی اور اخلاقی روایات و اقدار سے منکر ہو گیا۔ مادی اسباب کی فراوانی سے خود غرضی، تعیش اور ظاہر پرستی کو فروغ ملنے لگا۔ جس کا نتیجہ تہذیب کی بنیادوں کو کھوکھلا ہونے کی صورت میں سامنے آیا اور پورے معاشرے اور تہذیب کو انتشار کا شکار کرتا چلا گیا۔

مغرب کی تہذیب میں زندگی کو عقل اور مادہ تک محدود کر دیا گیا جس کے باعث انسانیت کے مفاد، روحانی اور جذباتی آسودگی اور خوشی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ فتورد کو آسودگی اور مادی خواہشات کا نظریہ دے کر مذہب اور روحانیت کو ثانوی درجے پر رکھ دیا گیا۔ مشرقی تہذیب کی مانند مغربی تہذیب روایات و اقدار بھی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں اور اپنا ایک خاص تشخص اور شناخت رکھتی ہے۔ مشرقی اور مغربی روایات و اقدار میں بے پناہ فرق کے ساتھ ساتھ تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد صرف جغرافیائی نہیں ہے بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اسی تضاد کی وجہ سے دو تہذیبوں کا جنم ہوا جن کی شناخت بالکل مختلف ہے اور ایک دوسرے پر انمٹ اور گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اکثر مقامات پر یہی تضادات دونوں تہذیبوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کھڑا کرتے ہیں اور آج دونوں تہذیبیں اپنی اپنی جگہ پر اپنے تشخص اور بقاء کی جنگ لڑ رہی ہیں۔

آلات کی ایجاد کے بعد انسانی تہذیب نے بڑی تیزی سے اپنی شکلیں بدلیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے آتے ہی انسانی سوچ کے زاویے اور نظریے بھی بدل گئے۔ فاصلے کم ہوئے، رابطوں، سوچوں اور نظریات میں وسعت آتی چلی گئی۔ انسانی اقدار اور رہن سہن کے انداز بدلے۔ یہ تمام تبدیلیاں تہذیب پر اثر انداز ہوتی رہیں، تہذیب کے رنگ بھی بدلتے گئے۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن اپنی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" میں لکھتے ہیں:

> " تہذیبیں فنا ہوتی ہیں وہ جامد نہیں متحرک ہوا کرتی ہیں، ان میں عروج و زوال رونما ہوتے رہتے ہیں وہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ ہر تہذیب کسی نہ کسی چیلنج کے جواب میں پیدا ہوتی ہے ،خوشحالی کے مرحلے سے گزرتی ہے اس کے بعد مسائل کا زمانہ آتا ہے یا پھر آفاقی حالت ظاہر ہوتی ہے اور اس کے بعد منتشر ہو جاتی ہے۔"(۹۸)

ہر شے پر زوال آنا لازم ہے، زوال کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں انہیں میں سے ایک صورت اشکال کا بدل جانا ہے۔ تہذیب خواہ کتنے بھی عروج پر پہنچ جائے ایک نہ ایک دن زوال پذیر ہوتی ہے۔ سید قاسم محمود لکھتے ہیں: "انسانی تاریخ میں کوئی ایسا خالی وقت نہیں آیا جب دو تہذیبیں ایک دوسرے کے متصادم نہ رہی ہوں اور طاقت ور تہذیب نے کمزور تہذیب کو ملیا میٹ نہ کیا ہو اور طاقتور سے طاقتور تہذیب خواہ کتنی بھی بلندی پر گئی ہو ایک نہ ایک دن گری ضرور ہے۔"(۹۹) کوئی چیز ہو یا نظریہ، ضرورت ہو یا قدر، تہذیب ہو یا ثقافت ایک عروج کے بعد زوال پزیر ہو جاتی ہے۔ ماہرین کے خیال میں جب کوئی تہذیب اپنے عروج تک پہنچ

جائے یا بعض صورتوں میں اپنی پست ترین حالت کو پہنچ جائے تو اُس وقت اِس میں تبدیلی یا بدلاؤ کا عمل ضروری ہوتا ہے۔ایسے میں تہذیب کی جگہ لینے کے لیے نئی تہذیب سامنے آکر پرانی تہذیب کو ایک نیا موڑ اور آغاز دے دیتی ہے چونکہ پہلی تہذیب پستی یا عروج پا چکی ہوتی ہے اِس لیے نئی تہذیب کے لیے اپنی جگہ بنانا آسان ہو جاتا ہے۔w.j.perry اپنی کتاب The revolations of civilization میں لکھتے ہیں:

"کسی بھی مستقل آبادی کی تہذیب اپنے نقطہ عروج کے بعد متواتر انحطاط کی جانب مائل ہوتی ہے اور یہ انحطاط ہوتے ہوتے آخر کار کسی بھی نئے اقدام کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے، تب کوئی تازہ نسل آتی اور خون وثقافت دونوں حوالوں سے پرانے فرسودہ ڈھانچے کو کام میں لاتی ہے۔یہ عمل شروع ہوتے ہی وہ تیزی سے ترقی کرتی اور تہذیب کی ایک نئی لہر کو جنم دیتی ہے۔"(۱۰۰)

ایڈورڈ سعید نے "اوریئنٹالزم" میں مشرق اور مغرب کے درمیان ثقافتی تصورات کے تصادم کی وضاحت کی ہے۔ان کے مطابق مغربی ثقافت نے مشرقی ثقافتوں کو غلط طریقے سے پیش کیا جس کے نتیجے میں ثقافتی بحران پیدا ہوا۔ایڈورڈ سعید کے نزدیک شرق شناسی ایک ایسا مربوط اور مقبول نظام ہے جسے مشرق کے بارے میں علم اور معلومات کو چھان پھٹک کر مغرب کے شعور میں پہنچایا جاتا ہے۔ایڈورڈ سعید بیسویں صدی کے عظیم مفکر، ماہر تعلیم، ادبی نقاد، انقلابی دانشور اور مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کے بنیاد گزار ہیں۔ایڈورڈ سعید کا شمار بیسویں صدی کے ان دانشوروں میں ہے جنہوں نے قلم کی طاقت کا بھرپور استعمال کر کے استحصال زدہ اقوام کو انقلابی شعور دینے کی کوشش کی۔ ایڈورڈ سعید کی سب سے اہم کتاب "Orientalism" ہے جو ۱۹۷۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔اس کا اردو ترجمہ پہلی بار ۲۰۰۵ء میں "شرق شناسی" کے نام سے مقتدرہ قومی زبان اسلام اباد سے شائع ہوا۔اس کتاب کے ذریعے ایڈورڈ سعید نے مابعد نوآبادیاتی مطالعات کی بنیاد کو مستحکم کیا۔سعید کی اس کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ مغربی مورخین نے مشرق کا علم حاصل کر کے مشرق کی جو تصویر پیش کی ہے وہ سامراجی سوچ اور نسلی امتیاز کے تابع ہے۔نوآبادیاتی ذہنیت سے مشرق کا مطالعہ اور پھر مشرق کی "اساطیری تصویر" بنائی گئی ہے جو سراسر سامراجی مفاد پر منحصر ہے۔مغربی مفکرین نے مشرق کا علم حاصل کر کے جو مفروضے قائم کیے اس میں مشرق کو مغرب سے ہر زاویے سے پسماندہ ثابت کیا گیا ہے۔مشرقی تہذیب وثقافت کی کوئی حیثیت نہیں، مشرق کی اپنی تاریخ نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ مشرقی ادب مغرب کی لائبریری کی ایک شیلف سے کمتر ہے۔مشرقی انسان کاہل، پسماندہ، سست، جاہل، وحشی، جنگلی

جانور کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشرقی آدمی خود پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس پر حکومت کرنے اور اسے کنٹرول کرنے، متمدن کرنے، مہذب بنانے اور تمیز سکھانے کا کام مغربی آدمی کے سپرد ہے۔ ایڈورڈ سعید نے مغربی مفکرین کے ان مفروضوں اور بیانات کا جو مشرق کے بارے میں تھے ان کا تجزیہ کیا اور مشرق کے بارے میں جو تصورات تھے ان کا جائزہ لے کر ایڈورڈ سعید نے یہ نتیجہ نکالا کہ مغرب کے یہ مفروضے سچ پر مبنی نہیں ہیں، ان مفروضوں کی حقیقت صرف اور صرف مغربی سیاست دانوں کی سیاسی چال ہے۔ مغرب ان مفروضوں اور بیانات کو بنیاد بنا کر مشرق پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے ان تمام امتیازات کا جائزہ لیا جو مستشرقین نے مغرب اور مشرق کے درمیان روا رکھ کر مغربی سامراجی مفادات حاصل کیے۔ سعید نے اپنی کتاب "شرق شناسی" میں کوشش کی ہے کہ کسی طرح مشرقی انفرادیت کی پہچان کی جائے اور یہ باور کروایا جائے کہ مغرب نے جو مشرق کے بارے میں تصورات قائم کیے ہیں وہ نو آبادیاتی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایڈورڈ سعید لکھتا ہے کہ:

> "مشرق شناسی کے عمومی معنی یہ ہیں کہ یہ انداز فکر کا نام ہے، جس کی بنیاد علم موجودات اور نظریہ علم کے مطابق اس امتیاز پر ہے جو خاص مشرق اور بسا اوقات خاص مغرب کے درمیان ہے۔"(۱۰۱)

ایڈورڈ سعید کی کتاب کے بعد تنقید میں مابعد نو آبادیاتی تھیوری شامل ہوئی جو باقاعدہ ادبی تنقیدی تھیوری کی صورت میں ۱۹۸۰ء میں ادبی تنقید کا حصہ بنی۔ اس کے بعد نو آبادیاتی ادب اور مابعد نو آبادیاتی عہد کے ادب کا مطالعہ ہونے لگا۔ نو آبادیاتی دور وہ ہوتا ہے جس میں براہ راست مقامی باشندوں اور آبادی کے بجائے کوئی غیر ملکی طاقت اقتدار پر براجمان ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک غیر ملکی تسلط ہوتا ہے جو کسی بھی خطے کے مظلوم عوام کو محکوم بنانے کے لیے ہوتا ہے جبکہ نو آبادیات سے مراد ایسی فتوحات ہوتی ہیں جو کوئی بھی طاقتور ملک اپنی سرحدوں سے باہر وسعت چاہنے کے لیے کرتا ہے اور وہاں پر مفتوحہ اقوام کی مرضی کے خلاف اپنا اقتدار قائم کرکے ان پر محسوس یا غیر محسوس طریقوں سے اپنی مرضی ٹھونستا ہے۔ اس میں فوجی طاقت کے استعمال سے ہٹ کر بعض اوقات طاقتور عوام ثقافتی اور اقتصادی طریقے سے کمزور اقوام کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ آج کے دور میں سماجی، معاشرتی، سیاسی، معاشی سطح پر کئی تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوتے ہیں اور انہی میں سے ایک تہذیبی آمیزش بھی شامل ہے۔ انگریزی اصطلاح Colonialism کے لیے اردو میں "نو آبادیات" استعمال کیا جاتا ہے۔ کشاف اصطلاحات تاریخ کے مطابق اس لفظ کا سب سے پہلے استعمال روم میں ہوا۔ Colonia کی وضاحت اس میں کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"Colonia" پرانے رومی فوجیوں کی شہری بستی۔ وہ رومی شہری جو قصبے میں رہتے تھے ان کے پاس وسیع زرعی زمین ہوتی اور کافی حد تک مقامی اُمور میں ان کو حکومت کے خود اختیاری حاصل ہوتی۔ اس میں اردگرد کا علاقہ بھی شامل ہوتا تھا۔"(۱۰۲)

نو آبادیات کے نظام میں علمی اور ثقافتی استحصال کا پہلو بھی مخفی ہوتا ہے یعنی نو آبادیاتی حکمرانوں کی مقامی آبادی کی ادبی، اخلاقی، ثقافتی اور علمی ترقی کے پیچھے خود ان حکمرانوں کی اپنی غرض وغایت بھی ہوتی ہے۔ اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ علمی میدان میں بھی ایسی ہی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی حکمرانی کو مزید استحکام دے۔ وہ عوام کے اذہان و قلوب کو بھی کچھ یوں متاثر کرتے ہیں کہ محکوم قومیں لازمی یہی تصور کرتی ہیں کہ حکمرانوں کے یہ سارے اقدامات ان کی ترقی اور بہتری کے لیے ہیں۔ ان سے الگ ہو کر ذہنی اور علمی سطح پر پسماندگی ان کا مقدر ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نو آبادیاتی حکمران اپنی حکمرانی کے خاتمے کے بعد کئی ایسے دیرپا اثرات چھوڑ جاتے ہیں جن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ یوں نسلی امتیازات کی لکیریں اتنی واضح طور پر کھینچ دی جاتی ہیں جو آج بھی ہمارے ذہنوں میں اسی طرح موجود ہیں۔ شرق شناسی سٹین فرڈ میں لکھی گئی تھی، اس کتاب کو لکھے جانے کی وجہ مارکس کا وہ مقولہ ہے جو ایک طرح سے مستشرقین کا لائحہ عمل بن چکا تھا۔ اس حوالے سے کتاب کے مترجم محمد عباس لکھتے ہیں کہ:

"چوں کہ وہ اپنی نمائندگی نہیں کر سکتے لہٰذا ان کی نمائندگی فرانسیسی اور برطانوی روایت کے مطابق "شرق شناسی" یا استشراق یورپیئن تہذیب اور ثقافت کا لازمی جز ہے۔"(۱۰۳)

"شرق شناسی" سے مراد نو آبادیوں کی نمائندگی نظریاتی اور ثقافتی طور پر کرنے کے لیے ایک خاص بیانیے کا استعمال ہے۔ جس کے لیے لغت، تمثال کاری، اداروں، اقوال، عالمانہ انداز اور یہاں تک کہ نو آبادیاتی اندازِ حکومت اور نو آبادیاتی نوکر شاہی وغیرہ سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ اکادمیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک اندازِ فکر ہے جس میں مشرق کے ساتھ کارپوریٹ مغرب کا رویہ مراد لیا جاتا ہے۔ جس طرح مشرق ایک انسان کا ساختہ تصور ہے بالکل اسی طرح مغرب بھی ایک انسان ساختہ اور فرضی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد بنیادی طور پر تسلط اور طاقت کا تعلق ہے۔ "شرق شناسی" سے متعلق تمام تر علم سامراجی مفادات اور بنیادی سیاسی حقائق میں ملا جلا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے پندرہ برسوں کے دوران پیش آنے والے حالات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے حکومتوں کی پالیسیوں پر تنقیدی بحث کی اور بتایا کہ مغرب میں ماہرین کی ایک ایسی فوج تیار ہو چکی ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ میڈیا پر اسلام اور مسلمانوں کو ذہنی، سیاسی، علمی اور

ثقافتی لحاظ سے دہشت گرد اور ہائی جیکر ثابت کریں۔ ایڈورڈ سعید نے کچھ واقعات کا ذکر کیا ہے جن میں ۱۹۸۲ء میں بیروت میں امریکی سفارت خانے پر ہونے والا حملہ، ۱۹۸۳ء میں بیروت کی فوجی بیرکوں میں ہونے والے بم دھماکے، ۱۹۸۸ء میں پین-ایم کی فلائٹ ۱۰۳سکاٹ لینڈ کے شہر لاکربی کے اوپر دوران پرواز اُڑا دینا، ۱۹۹۳ء ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہونے والا حملہ شامل ہیں۔ ان سب واقعات میں مسلمان ممالک ملوث تھے کیونکہ انہوں نے ہر واقعے کے بعد یا تو ذمہ داری قبول کی یا پھر تحقیقات میں ان کے سرے ان تک پہنچے۔

" شرق شناسی" دراصل مغرب کی تسلط پسندانہ سوچ کے تناظر میں وجود آنے والا تصور ہے۔ "شرق شناسی" کے مطابق انسانی حقیقت کو دو واضح حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ کیا انسانی حقیقت کو بانٹا جا سکتا ہے؟ کیوں کہ بظاہر تو انسانی روایات، تاریخ، ثقافت، معاشرے یہاں تک کہ نسلیں بھی تقسیم کر دی گئی ہیں۔ انسان ہی اس تقسیم کا خمیازہ بھگتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس تقسیم کی سفاکی سے بچنا ممکن ہے؟ ایڈورڈ سعید نے لکھا ہے کہ:

> "ایک طرف مغربی لوگ ہیں اور دوسری طرف مشرقی عرب ہیں۔ پہلے زمرے کے لوگ (کسی ترتیب کے لحاظ سے نہیں) منطقی، پر امن، وسیع النظر، استدلالی اور بغیر طبعی شک کے حقیقی اقدار کے علمبردار ہیں اور دوسرے زمرے کے لوگ ان میں سے کوئی بھی خاصیت نہیں رکھتے۔ کسی قسم کے اجتماعی مشرق کے بارے میں مخصوص نقطہ نظر سے یہ بیانات جنم لیتے ہیں، کون سی مہارت کی ہنر مندی ہے؟ کون سے خیالی دباؤ، کون سے ادارے اور روایات ہیں؟ کون سی تمدنی طاقتیں ہیں جو (مشرق کے بارے میں) بیانات اور نظریات میں ایسی یک رنگی پیدا کرتے ہیں جو کرومر، بالفور اور ہمارے ہمعصر سیاست دانوں کی باتوں میں پائی جاتی ہے؟"(۱۰۴)

مشرق میں قیام اور علمیت کے حوالے سے مشرق سے روا رکھے گئے رویے نسلی تعصب کو فروغ دیتے ہیں چاہے وہ براہ راست اس تعصب سے متاثر نہ بھی ہوئے ہوں۔ مشرق میں عالموں کے دوروں کے مختلف مقاصد ہیں مثلاً جدید مصریوں کے رواج اور رسوم پر مواد کی جمع آوری، اپنی تحقیق کے لیے مواد جمع کرنا، مکہ اور مدینہ کی ریاستیں، کسی ذاتی منصوبے کے سلسلے میں مشرق کا دورہ وغیرہ شامل ہیں۔ عصر حاضر میں شرق شناسی بیدار اور خوابیدہ ہے اس حوالے سے ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ شرق شناسی بنیادی طور پر ایک سیاسی تصور ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ مشرق مغرب سے کمزور تھا اور مغرب نے اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کی تصویر بنائی۔ ثقافتی سطح پر دیکھا جائے تو شرق شناسی کھلی اور واضح جارحیت ہے۔ عالمی سطح پر آنے والی

تبدیلیوں کے پیچھے بھی یہی شرق شناسی کار فرما ہے۔دراصل حالیہ شرق شناسی کا رویہ ایک ماچو مین کا سا ہے۔وہ مشرق کو کمزور ہی سمجھتا ہے۔کرزن اور کرومر کی تحریروں میں اس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ان کی تحریریں مشرق مغرب منتظمین کے سوچ اور رویے کی عکاس ہیں۔بیسویں صدی میں شرق شناسی نے مشرق کو مغرب تک پہنچایا۔گویا مشرق کو مغرب کی نظر نے شرق شناسی ہی کے ذریعے دیکھا۔شرق شناسی یا متشرقین بنیادی طور پر مغرب کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔لوگ ایشیا کو بطور خطرہ سمجھتے ہیں۔مغرب نے ہمیشہ معیشت کا سہارا لے کر مشرق کو کمزور کرنا چاہا۔

کسی معاشرے کے معاشی عوامل بھی اُس کی رسومات و روایات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔مثلاً زرعی معاشرے میں خوراک، لباس، رسومات، رہن سہن اور تہوار اُن کے معاشی حالات کے مطابق بنائے جاتے ہیں اِسی طرح ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ معاشرے کی اقدار و روایات میں واضح فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔اِس لیے کسی معاشرے کی تہذیبی زندگی میں معاشی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔معاشرے کی تہذیبی ترقی اور ارتقاء کا انحصار اُس کی سماجی اور اخلاقی اقدار پر بھی ہوتا ہے۔اگر ان قدروں کو نظر انداز کر دیا جائے یا اُن سے غفلت برتی جائے تو معاشرے کی تہذیبی زندگی جمود کا شکار ہو جائے گی۔ کیونکہ انہی سماجی و اخلاقی اقدار پر کسی معاشرے کی تہذیبی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے۔کسی معاشرے کی سماجی اقدار میں اُس معاشرے کے افراد کے باہمی روابط، اخلاق و عادات، طرزِ زندگی، آرٹ، رسم و رواج شامل ہوتے ہیں۔جو افراد کے رہن سہن اور عقائد کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں اور یہ اقدار اُس معاشرے کی شناخت ہوتے ہیں۔ اقدار و روایات انسانی ثقافت کا ایک لازمی جزو ہوتی ہیں جن کے بغیر افراد اپنی اجتماعی ضروریات اور تقاضوں کو پورا نہیں کر پاتے۔ثقافتی ڈھانچہ اپنے مخصوص روایتی ڈھانچے پر تشکیل پاتا ہے روایات ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔نسل در نسل منتقلی کے دوران یا وقت کے ساتھ ہونے والی ترقی اور تبدیلیاں روایات کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔لیکن شکلوں کی تبدیلی روایات کو مُردہ نہیں کرتی۔ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق: روایات کی تشکیل میں وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ ایک وقت میں ان کی ابتداء کو بالکل بھلا دیا جاتا ہے اور ان میں جو اضافے ہوتے ہیں انہیں اصلی اور حقیقی سمجھ لیا جاتا ہے۔[۱۰۵]

انسان نے زندگی گزارنے کے لیے کچھ اُصول بنائے، رہن سہن کے طریقوں میں کچھ وضع و اطوار سیکھے اور پھر سکھائے جن کی وجہ سے کچھ قوانین، عقائد، ریتیں اور رسمیں وضع ہوئیں جو نسل در نسل سفر طے کرتی رہیں جن میں کچھ عملی تھیں اور کچھ زبانی، جو آگے چل کر Oral folk literature اور oral

history کی صورت میں نمودار ہوئے۔ نظریات و تصورات نے فن اور آرٹ کو متصور کیا، ان تمام چیزوں نے نظریات و عقائد کو جنم دیا۔ ان سب چیزوں نے انسان اور سماج کے درمیان تنظیم کا ایسا رشتہ اور رابطہ تخلیق کیا جو ان میں یکسانیت کا مظہر بنا اور اسی کا نام ثقافت یا کلچر ہے۔ اس ثقافت میں ایک لچک ہے جو مزید نئے نظریات، عقائد، رسم ورواج، فن و آرٹ، دستکاریاں، رہن سہن کے طریقے وغیرہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انہی وجوہات نے دنیا کو یہ نعرہ دیا کہ "پوری دنیا ایک گلوبل ویلج کی مانند ہے" کسی بھی ملک میں آنے والی اقتصادی، سیاسی، سماجی تبدیلی غیر مشروط طور پر سماجیاتی بشریات پر اثر انداز ہوتی ہے اور بلاواسطہ اس کے کلچر یا ثقافت پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس بات کی کئی ایک مثالیں پاکستانی ثقافت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ علاقائی ثقافت میں ہمارے صوبوں میں شادی بیاہ کے موقع پر خواتین آپس میں شادی بیاہ کے گیت گاتی تھیں، جس سے اپنائیت کا ماحول پیدا ہوتا تھا۔ شادیاں گھروں میں ہی منعقد کی جاتی تھیں جس میں تمام افراد مل کر حصّہ لیتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شادیاں، شادی ہالوں میں ہوتی ہیں جہاں پر ڈیک پر موسیقی کی دُھنیں بجائی جاتی ہیں۔ یہ کلچر سندھ اور پنجاب کی ثقافت نے پڑوسی ملک سے لیا ہے جہاں پر ناچ گانے کا مقابلہ ایک عام سی بات ہے اس تبدیلی کو سماج نے قبول کر لیا ہے اور پرانی رسمیں ختم ہو گئیں ہیں۔ پہلے ذات برادری سے باہر شادیوں کا تصور بھی نہیں تھا مگر اب یہ ذات برادری کی جکڑ بندیاں بھی کمزور پڑ گئیں ہیں اور ثقافت تغیر پذیر نظر آتی ہے۔ سماجی اقتصادیات کا ایک اہم پہلو کھانے پینے کی عادات میں تبدیلی بھی ہے۔ وہاں ثقافت کا یہ دائرہ روبہ تغیر ہے لسی کی جگہ اب کولڈ ڈرنک نے لے لی ہے۔ سادہ غذاؤں کی جگہ پُر تعیش ضیافت نے لے لی ہے۔ ثقافت میں یہ تغیر پزیری دراصل یکسانیت کی متضاد کیفیت ہے اور انسانی جبلت کا پرتو ہے:

> "انسانوں، تمناؤں اور تقاضوں کی تکمیل کا دوسرا نام ثقافت ہے۔ ثقافت ہی انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تحرک اور رفتار مہیا کر کے، ان کو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کا سبق سکھاتی ہے۔ ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے لیے بنی نوع انسان نے کئی قسم کے وسائل ایجاد کیے اور انھیں استعمال کرنے کا ڈھنگ دوسروں کو بھی سکھایا۔"(۱۰۶)

ہماری ثقافت کی جڑیں اپنی توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اس سرزمین میں شامل ہیں جہاں ہم رہتے ہیں۔ اس میں بسنے والے علم و دانش، فکر و نظر، حکمت و دانش اور تمدن و ثقافت کے وارث ہیں۔ جو ناکامیوں، کامیابیوں، خوشیاں، دکھ درد، اپنے احساسات و جذبات، حسن و جمال کے ساتھ باوقار انداز سے

زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ تمام اُمور ثقافت کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ ثقافت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے اندر ہماری زندگی کے روزمرہ اُمور کے ساتھ ساتھ انسانی سوچ و فکر، تخیل اور روحانی زندگی جیسے اُمور بھی شامل ہیں۔ ہماری تباہ شدہ ثقافتیں بھی اس میں آتی ہیں۔ یہ وہ ثقافت ہے جس پر لوگ فخر کرتے ہیں۔ ثقافت تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے فخر کرنے کی چیز نہیں ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ القصص کی آیت نمبر ۵۸ میں آیا ہے:

"اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی عیش والی زندگی میں اِترا رہے تھے۔ سو یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد آباد ہی نہیں ہوئے مگر بہت کم۔ اور ان کے بعد ہم ہی وارث ہوئے۔ "(۱۰۷)

ہر شے جیسے کمزور ہوتی ہے تو دوسری کوئی شے اُس کی جگہ لینے آجاتی ہے۔ اِسی طرح ہر ثقافت کو بھی زوال ہے اسی لیے ان آیت مبارکہ میں تباہ شدہ بستیوں کے ذریعے ثقافتوں کے ناپید ہونے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ سورۃ القصص کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہے:

"اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک ان کے بڑے شہر میں پیغمبر نہ بھیج لے جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے، اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس حالت میں کہ وہاں کے باشندے ظالم ہوں۔ "(۱۰۸)

سورۃ الکھف کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہے:

"اور یہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کیا ہے جب انہوں نے ظلم کیا تھا اور ہم نے ان کی ہلاکت کا بھی ایک وقت مقرر کیا تھا۔ "(۱۰۹)

انسانی حیات کی ابتداء اور ارتقاء کے لیے زمین کے ساتھ تعلق مضبوط ہونا چاہیئے جب انسان زمین پر ظلم و ستم کی انتہا کر دیتا ہے تو خالقِ کائنات ایسے لوگوں اور بستیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے جس کے ساتھ ہی اُن کی ثقافت بھی دفن ہو جاتی ہے۔ ثقافت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی تہذیب و تمدن کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر غلام علی الانا نے بشریات کے مختلف ماہرین کے حوالے سے لکھا ہے: ثقافت ہماری تہذیب اور تمدن کی اعلیٰ ترقی ہے۔ اس ترقی میں طبعی، ذہنی اور روحانی ترقی آجاتی ہے۔ یہ ترقی تربیت اور تجربے پر منحصر ہوتی ہے۔(۱۱۰)

معاشرے کی ترقی کے ساتھ ہی ثقافت بھی ترقی کرتی گئی، ثقافت انسان کو اُس کی مادی زندگی سے وابستہ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ غیر مادی زندگی سے بھی نسبت رکھتی ہے۔ ثقافت کسی قوم کی پہچان کے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر کسی قوم میں لاقانونیت ہوگی تو وہاں گمراہی پرورش پائے گی، ایسی قومیں صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ لوگوں کی زندگیوں میں پھلنے پھولنے والی لوک ریت ہی لوک ثقافت ہے۔ خوشیوں کے موقعوں پر صدیوں پر سنتے چلے آنے والے لوک گیت انسانوں کے اعضاء پر تھرتھراہٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح داستانیں، لوک کھیل: کبڈی، گلّی ڈنڈا، کُشتی اور اس جیسی بہت سی روایات صدیوں سے دیہی لوگوں کے ساتھ منسوب ہیں۔ پھر میلے ٹھیلے، عُرس، عید، شب رات یہ بھی ہماری لوک ثقافت کا حصّہ ہیں۔ اسی طرح موسموں کے تہوار بیساکھی، بسنت وغیرہ، لوک تماشے، مداری، بازی گری، کشیدہ کاری، کڑھائی اور ایسے تمام ہنر جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔

کسی معاشرے میں موجود روابط و سلوک، اخلاق و عادات، طرزِ بود و باش، رسم و رواج، حُسن و جمال اور فن و اظہار کو معاشرے کی ثقافت کہتے ہیں۔ یہ ثقافت نہ تو کسی مجلسِ شوریٰ میں وضع ہوتی ہے اور نہ کسی پارلیمنٹ کی ضرورت پڑتی ہے اس کے پیچھے صدیوں کی روایات ہوتی ہیں۔ مسلمان ایک الگ قوم ہونے کی حیثیت سے اپنی الگ ثقافت رکھتے ہیں لیکن ہندوستان میں اکھٹے رہنے کی وجہ سے ہندوستانی ثقافت کا بھی اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ جن کا اظہار شادی بیاہ کی رُسومات میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو اسلامی ثقافت اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت پہلو دار ہے، جو کہ صوفیاء کرام کے عُرس اور مذہبی تہوار کے موقع پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں ذات پات کا نظام تھا برہمن کی مذہب پر اجارہ داری تھی۔ ذات پات کی اُونچ نیچ نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا سب سے بڑھ کر دُکھ کی بات یہ تھی کہ نچلے درجے کی ذاتوں کے لیے علم کے دروازے بند تھے اُن کو خوشی غمی کے موقع پر شریک نہ کیا جاتا تھا۔ جبکہ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق متعین کیے گئے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کو اپنی آغوش میں لے کر مساوی درجے پر معاشی و اقتصادی ترقی کے مواقع فراہم کیے۔

ہماری ثقافت کے اندر اجتماعی زندگی کے خارجی اُمور بھی شامل ہیں۔ ثقافت کی حدیں انسان کے خیال و عمل کی حد تک وسیع ہیں۔ ثقافت نسل در نسل چلتی ہے یہاں تک کہ اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے۔ ہر وہ عمل جو کسی فرد یا قوم کو وراثت کے طور پر نسل در نسل ملتا رہے وہ ثقافت کے دائرے میں آتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا سے پہلے پاکستانی ثقافت سادگی کا پیکر تھی۔ گاؤں کے ساتھ ساتھ شہروں میں بھی سادگی

تھی ایک دوسرے کی خوشی، غمی پر شریک ہوا جاتا تھا۔ مہمان نوازی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے پاکستانی ثقافت پر ہندوستانی ثقافت کا رنگ چڑھنے لگا ہے۔ شادی بیاہ سے ایک دو ماہ پہلے دیہات کی خواتین دن بھر کے کام کاج ختم کرنے کے بعد رات کو جمع ہو کر شادی بیاہ کے گیت گایا کرتی تھی۔ یہ گیت جوانی سے سفر کرتے کرتے بڑھاپے تک جاتے اور گیتوں کے اختتام پر گُڑ تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی ثقافت کے آنے سے اب شادی بیاہ کی تقریبات کئی دنوں تک جاری رہتی ہیں جن میں ناچ، گانا ایک عام بات ہے۔ لباس کو بھی دیکھا جائے تو نئی نسل ہندوستانی اداکاروں کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ثقافت تو درکنار ہم لوگ اپنی شناخت کو گم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

بیسویں صدی میں نئے سماجی و معاشی مسائل پیدا ہوئے جنہوں نے گاؤں کی اکائی کو کمزور کیا اور وہاں کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ دیہی صنعتوں کے زوال کے ساتھ اُن پر انحصار کرنے والے معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کاشت کاروں نے روزگار کی تلاش میں مشینی صنعت کے مرکزوں کی طرف کوچ کرنا شروع کیا۔ آبادی کے اچانک بڑھنے اور مختلف الخیال لوگوں کے ایک جگہ جمع ہونے اور تہذیبی اقدار میں فرق ہونے کی وجہ سے لوگوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی تعلیم عام ہونے سے وسیع النظری پیدا ہوئی لیکن تعلیم یافتہ لوگوں کے اعتقادات بھی مجروح ہوئے۔ انگریزی تعلیم ہی کی وجہ سے معاشرے میں موجود بہت سی برائیوں کو دور کرنے کے لیے لوگوں میں شعور بیدار ہوا۔ ڈاکٹر ارشد اقبال یوں کہتے ہیں کہ:

> "انگریزی دورِ حکومت سے قبل ذات پات کی بنیاد پر اور تقسیم کی بناء پر ہندوؤں میں محض برہمن ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جن کا ذریعہ تعلیم سنسکرت زبان تھی ان کی تعلیم عام طور پر مذہبی کتب تک محدود رہتی تھی۔ کیونکہ برہمنوں کا پیشہ مذہبی رسوم کی نگرانی یا انھیں انجام تک پہنچانا ہوتا تھا۔"(۱۱۱)

مسلمانوں میں تعلیم صرف مذہبی کُتب تک ہی محدود تھی لیکن انگریز حکومت قائم ہونے کے بعد ملازمتوں کی ضرورت کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف زور دیا گیا۔ اس کے ساتھ لوگوں میں نئے نئے خیالات نے بھی جنم لیا۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق درس گاہیں قائم کیں۔ جہاں انگریزی تعلیم دی جا سکے چنانچہ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ہندوستانی تہذیب و تمدن کا پاس رکھتے ہوئے عمل میں آیا۔

مشینی صنعتوں کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہو چکا تھا مگر بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی یہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ نئی نئی صنعتیں وجود میں آئیں۔ دستکاروں کے پاس جب دیہاتوں میں ذریعہ معاش نہ رہا تو انھوں نے شہروں اور صنعتی مراکز کا رُخ کیا۔ شہری صنعتوں نے دیہی صنعتوں کو مفلوج کر دیا۔ مشین سے تیار کیے گئے کپڑے کم قیمت ہونے کے ساتھ ساتھ جاذبِ نظر بھی ہوتے۔ دیہات کے کارپینٹری کے کام پر بھی اثر پڑا وہ شہروں میں فرنیچر بنانے کا کام کرنے لگے اور اُن میں سے بیشتر لوگ کھیتوں میں مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لوہاروں پر نسبتاً کم اثر پڑا کافی لوگوں نے شہر آکر انجنیئرنگ فیکٹریوں میں کام شروع کر دیا اس تبدیلی کا نمایاں اثر چمڑے کا کام کرنے والوں پر بھی پڑا۔ چمڑے کے کارخانے کُھل جانے کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے کھیتوں پر مزدوری کرنا بہتر سمجھا اور رنگریزے بے کار ہو گئے۔ اپنا پیٹ پالنے والے اپنے نسلی پیشے کو چھوڑ کر شہروں کی طرف ہجرت کر آئے۔ دستکاری کی مانگ کم ہونے کی وجہ سے دستکاروں نے شہروں کا رُخ کیا۔ جہاں وہ فیکٹریوں میں ملازمت کرنے لگے یا کسی دوسرے پیشے سے وابستہ ہو گئے کیونکہ فیکٹریاں تعداد میں اتنی زیادہ نہ تھی کہ روزگار فراہم کر سکیں۔ انہی دشواریوں کی وجہ سے دستکاروں نے اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔

ہمارے عوام کی ثقافت کی بنیادی اور مخصوص صورتیں فطری طور پر بڑے شہروں کی نسبت مختلف علاقوں کے دیہاتوں میں زیادہ محفوظ ہیں۔ بڑے شہروں میں بین الاقوامی سی فضا ہوتی ہے، وہاں پر غیر ملکی اثرات زیادہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ پنجابی اذہان کے لیے زندگی کا مقصد لطف اُٹھا کر، اس کا شکر ادا کر کے، خوشی اور جشن منانا تھا۔ اسی لیے پنجاب کے لوگ میلے ٹھیلوں کا انعقاد کرتے اور ناچنے گانے لگتے یہاں تک کہ موسم کے بدلنے پر بھی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ یہاں پر موسم بھی کافی ہیں، بہار کے بعد گرمی، گرمی ختم ہوئی تو برسات پھر خزاں اور آخر میں سردی۔ اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ پنجاب میں پانچ موسم ہیں، یعنی ہر ستر دن بعد موسم بدل جاتا ہے۔ مخدوم ٹیپو سلمان لکھتے ہیں کہ: ہر موسم کی آمد پر خوشیاں منائی جاتی ہیں، گیت گائے جاتے ہیں۔ ہر بات کو بہانہ بنا کر خوشی منانا پنجاب کی روایت ہے۔ (۱۱۲)

سرحد اور بلوچستان میں رہنے والے لوگ بھی ناچ گانے سے کافی شغف رکھتے ہیں، مختلف تہواروں پر وہ اپنے روایتی کھانوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع چترال میں موسم بہار میں "چلم جوش" کا تہوار منایا جاتا ہے، جسے مذہبی تقریب بھی کہا جاتا ہے۔ اس تہوار پر مخصوص کھانے تیار کیے جاتے ہیں اور آپس میں بکری کا دودھ بانٹا جاتا ہے۔ تہوار کے تینوں دن رقص و موسیقی کا انعقاد کیا جاتا

ہے۔ تقریب میں لڑکا لڑکی اپنی محبت کا اقرار کرتے ہوئے شادی کا اعلان کرتے ہیں۔ بہار میں گلگت بلتستان اور خیبر پختونخواہ کے ضلع چترال میں شندور پولو میلہ لگتا ہے۔ یہ دُنیا کے بلند ترین پولو میدان میں منایا جاتا ہے جس میں ملک کے مایہ ناز کھلاڑی شرکت کرتے ہیں۔ پاکستانی علاقوں کی ثقافت کے لحاظ سے اُن کے ہاں کھانوں میں بھی تنوع ہے اور یہ پاکستان کی خوبصورتی کا ایک منظر ہے۔ پنجاب اور سندھ میں زیادہ تر نمکین اور مصالحہ دار کھانوں کا رواج ہے۔ بلوچستان میں سجی اور دم پخت رغبت سے کھائے جانے والے پکوان ہیں۔ پنجاب میں مُرغن کھانے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ سندھ میں سندھی بریانی، پلا مچھلی اور بھی کی سبزی شوق سے کھائی جاتی ہے۔ کشمیر کی گلابی چائے اور رُوغن جوش مشہور ہیں۔

پنجاب میں نئے سال کے پہلے دن بیساکھی کا میلہ لگتا ہے جو اپریل کے وسط میں ہوتا ہے۔ اس دن سال کی پہلی کٹائی ہوتی ہے، لوگ نئے کپڑے پہن کر بھنگڑے ڈال کر خوشیاں مناتے ہیں۔ اگست کے وسط میں تیان کا میلہ لگتا ہے اور یہ پہلی بھادوں کو منایا جاتا ہے۔ عورتیں نئے کپڑے پہن کر گِدھا ڈالتی اور جھولتی ہیں اور ملن کے گیت گاتی ہیں۔ لوہڑی کا میلہ پہلی ماگھ کو منایا جاتا ہے جو جنوری کے وسط میں ہوتا ہے یہ سال کا سب سے ٹھنڈا دن ہوتا ہے اور اس کے بعد سال کے بڑے دنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر آگ لگا کر اُس میں اناج پھینکا جاتا ہے اور اُس کے گرد ناچ گانا ہوتا ہے:

> " یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دن دُلے بھٹی نے دو ہندو لڑکیوں، سندری اور مندری کو مغل فوج سے بچایا تھا، آگ میں سردیوں کا اناج جیسے گڑ، گچک اور تِل وغیرہ بھی ڈالے جاتے ہیں۔ یہی اناج لوگ آپس میں بانٹتے بھی ہیں۔ مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ وغیرہ بھی کھایا جاتا ہے۔"(۱۱۳)

بسنت کا میلہ پھکن بہار کے موسم میں فروری کے وسط میں لگتا ہے، پیلے کپڑے پہن کر ناچ گانا ہوتا ہے اور پتنگیں اُڑائی جاتی ہیں۔ مخصوص پکوانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عورتوں کا مخصوص لباس شلوار، قمیض اور دوپٹہ ہے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر غرارہ بھی پہنا جاتا ہے۔ شلوار یا سُتھن پنجابی عورت کا روایتی پہناوا ہے۔ خاص موقعوں پر گھاگرا پہنا جاتا ہے اور دوپٹے کی جگہ پھلکاری لی جاتی ہے، جس پر کڑھائی کی گئی ہوتی ہے اُس پر چھوٹی کُرتی پہنی جاتی ہے، جدت آنے سے مرد اب شلوار قمیض پہننا چھوڑ رہے ہیں:

> "گلوبائزیشن کا زمانہ ہے۔ ویسے مرد دھوتی کُرتا پہنتے تھے۔ ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے اور بدلتی رہنی چاہیئے لیکن یہ بدلاؤ اپنی پرانی ثقافت میں ہونا چاہیئے۔ اپنی ثقافت کو چھوڑ کر

کوئی دوسری ثقافت اپنالیناز ندہ اقوام کا شیوہ نہیں۔" (۱۱۴)

ڈھول کی تھاپ پر تھر کنا پنجابیوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، فصل کی کٹائی یا شادی بیاہ کا موقع ہو ڈھول لازم وملزوم ہے۔ مخدوم ٹیپو سلمان پاکستانی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"دھمال اور گیت پنجاب کی روح ہے۔ سنگیت کے بغیر پنجابی کی زندگی بے رنگ ہے۔ پنجابی جتنا دلیر ہے اتنا ہی نرم دل ہے۔ جبکہ دوسرے لوگ خدا کو جانوروں کی قربانی دے کر خوش کرتے ہیں، پنجابی خدا کو ناچ کر منانا چاہتا ہے۔ کبھی باجوں پر قوالیاں گاتا ہے اور کبھی پاؤں میں گھنگرو باندھ کر دھمال ڈالتا ہے۔"(۱۱۵)

ڈاکٹر عارفہ اس سلسلے میں لکھتی ہیں کہ:

"شہر سے لے کر گاؤں اور قصبوں تک شادی اور دیگر تقریبات کے موقعوں پر لوگوں کا رقص وموسیقی کے ذریعے جذبات کا اظہار ایک عام سی بات ہے۔ دیہاتوں میں فصل بونے، کٹنے اور پکنے کے موقعوں پر لوک رقص وموسیقی کی محفلیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ انفرادی سطح پر موسیقی کا شوق ہر خاص وعام کی زندگی میں نظر آتا ہے۔"(۱۱۶)

قوموں کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ قوموں کی ثقافت بھی بدلتی رہتی ہے: ثقافت زمین کی آب وہوا، سماج میں سیاسی قوت، معاشی نظام، مذہب اور علم وادب کی جڑوں سے پنپتی ہے۔ دوسری قوموں کے ساتھ میل جول رکھنا بھی ثقافت کی ترقی کے لیے بہتر ہوتا ہے۔"(۱۱۷) لوگوں کے آباؤاجداد ایک ہوں تو قبیلہ بن جاتا ہے اور بہت سے قبائل مل کر قوم بناتے ہیں اس کے لیے اُن کے درمیان ایک ثقافت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ثقافت میں لوگوں کی بود وباش بھی ایک ہوتی ہے اور سوچنے کا انداز بھی۔ دنیا میں اپنی شناخت کروانے کے لیے ثقافت کی پہچان ضروری ہے جس طرح ایک بچے کی شناخت اُس کا خاندان ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کی شناخت اُس کا ورثہ ہوتا ہے:

"ورثہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جو قوم کی ایک نسل، آگے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ کر جاتی ہیں۔ جو وراثت قدرت سے ملتی ہے جیسے میدان، پہاڑ، دریا یا سمندر یا ریگستان وغیرہ انہیں قدرتی ورثہ کہتے ہیں اور جو ثقافت ہمارے آباء ہمارے لیے چھوڑ کر جاتے ہیں وہ ثقافتی ورثہ کہلاتا ہے۔" (۱۱۸)

ثقافتی ورثہ کوئی عمارت، خیال، کپڑے کا ڈیزائن یا غیرت کا معیار، روایتیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک قوم کی معاشرتی اقدار بھی اس کی ثقافت کا حصّہ ہوتی ہیں۔ روایات کے ساتھ تاریخ بھی قوم کے ثقافتی ورثے کا حصّہ ہے۔ جب کوئی قوم اپنی غیر حقیقی شناخت بنانے کی کوشش کرتی ہے تو اُسے اپنی تاریخ بدلنی پڑتی ہے۔ کئی ہاری ہوئی جنگوں کو تاریخ اور جھوٹی روایات کے ملاپ سے اپنی جیت میں بدلنا پڑتا ہے۔ ورثہ اور ثقافت قوم کو شناخت دیتے ہیں۔ قوم اور قبائل میں واضح فرق یہی ہوتا ہے کہ قوم میں کئی نسلیں، کئی بولیاں اور مذاہب ہوتے ہیں جبکہ قبیلے میں ایک ہی مذہب، نسل اور بولی ہوتی ہے: قبیلے کا ورثہ اور ثقافت ایک ہی ہوتی ہے جبکہ قوم کا ورثہ اور ثقافت مختلف گروہوں کے ورثوں اور ثقافتوں کا ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ [۱۱۹]

ہر قوم میں بیک وقت امراء، غرباء، شہروں، دیہاتوں، بیوپاریوں، پروفیشنلز، جُدا جُدا مذاہب کے ماننے والوں، علیحٰدہ جگہوں پر رہنے والوں کی ثقافتیں چل رہی ہوتی ہیں۔ کسی بھی ایک جماعت کی ثقافت کو پوری قوم پر نہیں تھوپا جاسکتا۔ دھوتی کُرتا شہر میں تو کیا دیہات میں بھی نظر نہیں آتا۔ ساگ، مِسی روٹی اور چاٹی کی لسی نہ تو گھروں میں بنتی ہے اور نہ ہی کسی ہوٹل پر ملتی ہے۔ اسکول میں بچوں پر پنجابی بولنے کی پابندی ہے۔ لوگ پنجابی ثقافت کو چھوڑ کر ولایتی فیشن اور مادری بولی چھوڑ کر انٹرنیشنل زبان کو اپنارہے ہیں۔ دوسرے صوبوں کی ثقافتوں میں بھی مادری زبان کی جگہ بین الاقوامی زبان لے رہی ہے، جس کی وجہ سے نئی نسل کا اپنی ثقافت سے تعلق کمزور ہوتا جارہاہے۔

موجودہ پاکستان میں چار صوبے ہیں، خیبر پختونخواہ، سندھ، پنجاب اور بلوچستان، رقبے کے لحاظ سے بلوچستان سب سے بڑا صوبہ ہے اور آبادی کے لحاظ سے پنجاب۔ سندھ میں سندھی، پنجابی، گجراتی اور پشتو بولی جاتی ہے۔ کراچی میں اسماعیلیٰ، پارسی، بوہری، عیسائی اپنی اپنی مادری زبانوں کے علاوہ انگریزی اور اُردو بھی بولتے ہیں۔ بلوچستان میں بلوچ، پشتون اور پنجابی آباد ہیں، زبانوں میں براہوی، بلوچی، پنجابی اور پشتو بولی جاتی ہیں۔ خیبر پختونخوا میں لاکھوں افغان مہاجرین کی موجودگی کے باوجود پشتو اور دری زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پنجاب میں پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری اور ہندکو بولی جاتی ہیں۔ دیہات اور شہر میں شام کو اکٹھے ہو کر بیٹھنے کا رواج تھا، کہیں قصّہ خوانی ہوتی تو کہیں ہیر وارث شاہ پڑھی جاتی، کہیں مست توکلی اور کہیں شاہ لطیف، کہیں شاہ حسین اور کہیں غلام فرید۔ ان دیہاتوں میں لوگ زیادہ تر پڑھے لکھے نہیں تھے، نسل در نسل زبانی یہ گویائی چلتی تھی۔ محفل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ باری باری حقہ پیتے رہتے تھے، یہ پاکستان کے دیہاتوں کا منظر نامہ ہے۔ قبائلی سردار سالم بکرا آگ پر بُھون کر بکثرت کھاتے ہیں۔ مُرغی اور دُنبے کے گوشت سے بنی ہوئی سجی

پورے ملک میں رغبت سے کھائی جاتی ہے۔ چمن کے علاقے میں سالم دُنبے کو نمک ڈال کر زمین میں گڑھی ہوئی مُنھ بند دیگوں میں پکایا جاتا جسے خمیری نانوں کے ساتھ لُطف لے کر کھاتے ہیں۔

گزشتہ تیس برسوں میں افغان مہاجرین کی پاکستان آمد کے باعث نیلا، سفید اور کالا برقع بھی عام ہوا جو افغان خواتین پہنتی ہیں۔ افغان مہاجرین کی ثقافت کا اثر بلوچ، پشتون اور پنجابی آباد کاروں کی روزمرہ زندگی پر پڑا ہے۔ بلوچ خواتین اور بچیاں کڑھا ہوا بلوچی لباس پہنتی ہیں۔ کھلا دوپٹہ ، فراک نما کُرتا اور کڑھے ہوئے شلوار کے پائنچے شہر اور دیہات دونوں میں مقبول ہیں۔ بلوچ مردوں کے لباس میں چوڑے پائنچوں کی کھلی شلوار، لمبی قمیض، بلوچی کڑھائی کی واسکٹ اور تین سے پانچ گز کی پگڑی شامل ہے۔ بلوچی مردانہ چپل پر بھی پشاوری چپل کی طرح مقامی کڑھائی کی جاتی ہے۔

علاقائی گیتوں میں ماہی گیروں، کسانوں، شادی بیاہ، ماہیا، ڈھولا، سوہنی مہیوال، ہیر رانجھا، سسی پنوں، مرزا صاحباں ان سب کو ابرار الحق، جواد احمد، صنم ماروی، ہانیہ اور زیب نے اپنے گانوں میں پیش کیا ہے۔ پشتو گائیکی میں معشوق سلطان اور بلوچی اختر چنال سندھ میں مائی دھائی اور شازیہ خشک کو لوگ خوش ہو کر سنتے ہیں۔ لوک میلوں میں پتلی تماشا بہت مقبول ہے، چینی پتلی گروں نے اس فن کو عروج پر پہنچادیا ہے۔ پاکستان کے فنکار وہاں تربیت کے لیے جاتے ہیں۔ دیہی فنون و ثقافت میں ہماری دیہی عورتوں کا کردار نمایاں رہا ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے کپڑے پر کروشیے کی بیل کاڑھ کر اُسے آتش دان پر پھیلاتیں اور اُس کے اُوپر برتن سجاتی ہیں جو ہر گھر میں نظر آتے ہیں۔ دو تین گھر مل کر ایک تندور لگالیتے جس پر محلے کی عورتیں روٹیاں لگاتی ہیں، مٹی کی ہانڈیاں، کونڈے ، دیے، صراحیاں، پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے گھڑے، گندم ذخیرہ کرنے کے لیے ناندیں بھی بنائی جاتی۔ پاکستان کے بیشتر علاقوں میں گیس آجانے کے باعث اب ان برتنوں کا استعمال نہیں رہا، اس لیے اب یہ سجاوٹ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

پرانے زمانے میں پاکستان کے سارے صوبوں میں رات کی بچی ہوئی روٹی، سالن صبح ناشتے میں شوق سے کھائی جاتی تھی۔ سندھ میں سکھر سے گوادر تک کے علاقوں میں پلا مچھلی، مچھلی مسالہ اور موسم کی سبزیاں رغبت سے کھائی جاتی ہیں۔ پنجاب کا سرسوں، چولائی اور بتھوے کا ساگ پورے ملک میں مشہور ہے۔ پنجاب میں یہ ساگ رات اور دوپہر کے کھانے یا صبح کے ناشتے کے طور پر مکئی کی روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ گھروں پر دعوتوں پر کڑھی چاول، مسالے والے کوفتے، سبزی پلاؤ، حلیم، دہی پھلکیاں یا دہی بڑے، نہاری، پائے، کنا گوشت، قیمہ بھرے کریلے یا قیمہ بھری شملہ مرچ، ٹماٹر کٹ کے علاوہ چینی کھانے بھی بنائے جاتے ہیں اور

ہوٹلوں میں بھی کھانا کھایا جاتا ہے۔ پاکستان کے ہر شہر میں بہت سے چینی کھانوں کے ریسٹورنٹ مل جائیں گے جبکہ پہلے وقتوں میں باہر کھانے کا رواج نہ تھا۔ زمین پر دستر خوان بچھا کر گھر کے چھوٹے بڑے مل بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ فرش پر دستر خوان کی جگہ میز، کرسیوں نے لے لی۔ مزید جدت آنے سے مہمانوں کو بھی گھر کی بجائے ہوٹلوں میں کھانا کھلایا جانے لگا:

"اب تو گھروں میں ناشتے کے طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ پراٹھا، دہی یا رات کے سالن کے ساتھ اور اُمراء کے علاوہ پڑھے لکھے لوگ توس، انڈا اور دلیہ استعمال کرتے ہیں۔ البتہ، چھٹی کے دن گھر پر یا بازار سے پوری حلوہ اور چنے کا ناشتہ منگوا کر کیا جاتا ہے۔"(۱۲۰)

پہلے وقتوں میں عورتیں گھروں میں کام کرنے کی عادی تھیں، آٹا پیسنے کی چکیاں گھروں میں لگی ہوئی تھیں۔ گھر کی خواتین اور کام کرنے والیاں گھر پر ہی آٹا پیستی تھیں۔ اب تو بازار میں پسا ہوا آٹا عام ملتا ہے۔ ہر علاقے کے مخصوص کھانے مشہور تھے جو اُسی علاقے میں بنتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اب وہ کھانے ہوٹلوں میں ہر جگہ مل جاتے ہیں مثلاً کشمیر کا روغنِ جوش، گوشت کشتابہ، شب دیگ، ساگ کی کوئی ساتھ قسمیں ہوتی ہیں۔ ساگ کی یہی قسمیں خیبر پختونخوا میں دیسی گھی اور لہسن کے تڑکے کے ساتھ پکائی جاتی ہیں۔ کشمیر کے کلچے، روغنی نان، باقر خانیاں، قیمے اور سبزی کے نان اب پورے پاکستان میں ملتے ہیں۔ کشمیری چائے بھی ہر شہر میں اسٹالز پر بنائی جاتی ہیں۔

عیدین کے تہوار کا انتظار بچے بڑے سارا سال کرتے ہیں، ساری مسلم دنیا میں یہ تہوار شان و شوکت سے منائے جاتے ہیں۔ عید الفطر کے لیے تیس چالیس سال پہلے سویاں گھروں میں ہی توڑی جاتی تھیں۔ گھر کی عورتیں کئی دن لگا کر سویاں بناتی اور پھر اُن کو سُکھاتی تھیں۔ اب یہ رواج بھی ختم ہو گیا ہے اور پیکٹ کا شیر خورمہ بنا لیا جاتا ہے۔ بقر عید پر مختلف نوعیت کی رونق ہوتی ہے۔ خاندان میں حج سے واپس آنے والوں کے لیے دعوتوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ ایک اور عید جو دنیا کے کئی ممالک میں منائی جاتی ہے وہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ولادت مبارک کے حوالے سے عید میلاد النبی ﷺ ہے جو ۱۲ ربیع الاول کو منائی جاتی ہے۔ گلی گلی سبیلیں لگتی ہیں، دیگیں پکا کر کھانا غربا میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شب برأت پر حلوے بنائے اور تقسیم کیے جاتے ہیں۔ پہلے یہ کام گھر پر ہی کیا جاتا تھا، لیکن آج کل کے لوگ تن آسان ہو گئے ہیں۔ حلوائیوں سے تیار حلوئے اور پوریاں لا کر تقسیم کر دیتے ہیں۔ رجب کے کونڈے ۱۸ رجب سے ۲۷ رجب تک بطورِ نیاز کھلائے

جاتے ہیں۔ ماہِ محرم سے اسلامی سال کا آغاز ہوتا ہے اس مہینے میں اہلِ تشیع میں ملال کے ساتھ ذکرِ امام حسین کرنے، واقعاتِ کربلا کو دہرانے، ماتم کرنے، گریہ وزاری کرنے اور اُن دس دنوں کی تفصیلات بیان کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پاکستان میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم اقلیتیں بھی آباد ہیں جن کو اپنی عبادت ادا کرنے کی آزادی ہے۔ ہندو برادری شوراتری، ہولی، رکھشا بندھن، دسہرہ اور دیوالی مناتی ہے۔ سب لوگ مٹھائیاں اور تحفے رشتے داروں اور دوستوں کے گھر بھیجتے ہیں۔ عیسائی چالیس روزے رکھ کر ایسٹر کی خوشی مناتے ہیں، ۲۵ دسمبر کو کرسمس کرتے ہیں۔ اُس دن ہم یومِ قائد اعظم بھی مناتے ہیں، عمارتوں کو برقی قمقموں سے سجاتے ہیں اور چراغاں بھی کرتے ہیں۔ ۱۴ اگست کو یوم آزادی مناتے ہیں، عمارتیں سبز ہلالی پرچم سے سج جاتی ہیں۔ ۲۳ مارچ کو یومِ قرار دادِ پاکستان منایا جاتا ہے۔

ہر صوبے میں موجود لباس اُس کی ثقافت کے مطابق ہوتا تھا۔ سندھ میں بوہری خواتین الگ طرز کا برقع اوڑھتی ہیں۔ پنجاب کے دیہاتوں میں بزرگ خواتین کالی دھوتی، سفید کرتا اور دوپٹہ استعمال کرتی تھی۔ زمانہ اور حالات کے بدلنے سے اب زیادہ تر خواتین شلوار، کُرتا اور دوپٹہ استعمال کرتی ہیں۔ بنوں، کرک اور مردان کے علاقوں میں نیلے اور سفید برقعے میں افغان خواتین نظر آتی ہیں۔ میڈیا اور فیشن ڈیزائنرز نے لباس پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ ریڈی میڈ کپڑے بوتیک سے مل جاتے ہیں۔ اپنے من پسند کپڑے سلوانے کے لیے درزی کے پاس خواتین لباس کے رسالے لے جاکر ایسے ڈیزائن بتاتی ہیں: فیشن بھی عجب چیز ہے۔ جو بیل باٹم پاجامے، ہائی ہیل کے جوتے، سلیولیس شرٹس ۱۹۶۰ء میں مقبول تھے، اب وہی ڈیزائن اور جوتے، دوبارہ فیشن میں آگئے ہیں۔ [۱۲۱]

شادی بیاہ کے معاملات میں بھی تبدیلی آتی جارہی ہے، پہلے دلہن گھر سے ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہوتی تھی لیکن اب کار میں ہوٹل سے یا شادی ہال سے رُخصتی ہوتی ہے۔ دولہا گھوڑے پر آتا ہے، دوست آگے آگے بھنگڑا ڈالتے ہوئے چلتے ہیں۔ فوجی بینڈ پر فلمی گانوں کی دُھنیں بجتی ہیں۔ اِسی طرح ذرائعِ آمدورفت میں بھی تبدیلیاں آئیں ہیں، تانگہ پاکستان کی قدیم ترین سواری ہے۔ کوئٹہ کی تاریخ پڑھیں یا پشاور کی یا پھر حیدر آباد، سندھ کی سب جگہ تانگے چلا کرتے تھے۔ پھر رکشے، بسیں، کاریں آگئیں۔ پاکستان کی تہذیب سات ہزار سالہ پرانی ہے، ہماری تاریخ میں وادی سندھ، ہڑپہ، بدھ مت، مسلم تہذیب کے بعد مغلوں کی تہذیب اور انگریزوں کی تہذیب کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان تمام زمانوں کے اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اثرات کے علاوہ ہمسایہ ممالک ایران، افغانستان، ہندوستان اور وسطی ایشیا کے ممالک کے رسم ورواج، موت اور

حیات کے علاوہ خوشی و غمی کی رسمیں اور تقریبات آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ غرض پردہ کسی بھی صورت میں ہو ہماری ثقافت کی پہچان ہے۔اب دعوتوں میں چمچوں سے کھانا مغرب کی نقالی کی وجہ سے ہے، ہر چند لباس کے معاملے میں دفتروں، پارٹیوں میں سوٹ اور ٹائی کا رواج عام ہے۔ مگر شادیوں کے موقعے پر مقامی خوبصورت لباس اور رسوم کو اولیت دی جاتی ہے:

> "میڈیا نے ہماری زبانوں کے ادب اور ذائقوں کو بھی فروغ دیا ہے۔اب جبکہ دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے۔پاکستان کی ثقافت میں انگریزی تو داخل ہی تھی اب دوسری زبانیں اور دوسرے ملکوں کے ذائقے بھی شامل ہونے لگے ہیں۔ ہر شہر میں افغانی روٹی اور ہندوستانی تھالی نے بھی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ عربی شاورما اور جاپانی سوشی بھی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔رہا چینی کھانوں کا ذائقہ وہ تو اس قدر مقبول ہے کہ اب تو خواتین گھروں میں عام بناتی ہیں۔ البتہ سردیوں میں مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ، ساری دنیا میں تہذیب کا حصہ بن گیا ہے۔"(۱۲۲)

برصغیر کے موسموں کا اثر یہاں کی تہذیب، پکوان، کھیلوں، گیتوں، دستکاریوں اور پھولوں پر بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ زمین پر پڑتی بوندوں کے باعث مٹی کی خوشبو کا مزہ ہمیں یہاں کے لوک گیتوں میں ملتا ہے۔پاکستان کی تہذیب و ثقافت ہماری مٹی سے وابستہ ہے جس میں کہیں ریت تو کہیں کنکر اور کہیں پانی کے ٹوبے ہیں۔ جہاں ایک کنارے پر عورت پانی کا مٹکا بھرتی نظر آتی ہے اور دوسرے کنارے پر بھینس پانی پیتی ہوئی نظر آتی ہے۔یہی پانی اب ہمیں بوتلوں میں بھر کر انگریزی طریقے سے پلا دیا جاتا ہے یہی تہذیب و ثقافت کے اوراق ہیں کہیں املتاس اور کہیں کچنار کی کلیاں، کہیں موتیے کے پھول نظر آئیں گے۔ سوندھی مٹی سے جب برسات کے پانی کی خوشبو آتی ہے تو سب خوش ہو جاتے ہیں یہی تہذیب و تمدن ہے:

> "مرد پہلے سائیکل چلاتا تھا پھر موٹر سائیکل پر آیا اور اب گاڑیوں میں جس میں سی ڈی پلیئر اور ریڈیو بھی نصب ہوتا ہے۔کھیتوں میں کام کرتی عورتیں اور مرد ریڈیو پر گانوں کے علاوہ بی بی سی کی خبریں بھی سنتے ہیں۔برانڈیڈ ڈیزائن کی نقل اگلے دن ہی ایسے موجود ہوتی ہے جیسے کسی مقبول ڈرامے یا فلم کی سی ڈی دبئی سے چھوٹے شہروں تک میں دستیاب ہے۔" (۱۲۳)

اسی تہذیب و ثقافت کو ناول میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ناول کا تعلق انسانی زندگی، سماج اور معاشرت سے ہوتا ہے یہ ہمارے نظام سے وابستہ اقدار و تصورات کے اظہار کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ناول کا موضوع انسانی رشتے ہیں۔ناولوں کے مطالعے سے ہم مختلف مقامات کی سماجی تبدیلیوں، انقلابات، شہری و

دیہی امتیاز کو بہ آسانی محسوس کر سکتے ہیں۔ ادب کی دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں ناول کی فضا زیادہ کُشادہ ہوتی ہے۔ قصّے کہانیاں انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک جاری رہتی ہیں۔ اپنے اس سفر کے دوران انسان بڑے شوق سے کہانیاں سُنتا ہے اور آخر کار وہ بھی اس کہانی کا حصّہ بن کر رہ جاتا ہے جسے آنے والی نسل اِسی طرح سماعت کرتی ہے یہی زندگی کی کہانی کا پلاٹ ہوتا ہے۔ کہانی اسی طرح اپنا سفر جاری رکھتی ہے، کہانی نے جب اپنا رُخ ناول کی طرف موڑا تو یہ زندگی سے مزید قریب ہو گئی۔ ناول عصری تبدیلیوں کو من و عن پیش کرنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تخیل کی موجودگی بھی ہوتی ہے اور وہ زندگی سے جُڑے تہذیبی و ثقافتی مسائل کا ادراک بھی پیش کرتا ہے زندگی کی تیز رفتاری، نت نئے مسائل اور مباحث کے ساتھ ناول کے سانچے میں بڑی خوبصورتی سے ڈھلتی رہتی ہے۔ ناول کی روایت اور اس کا منصب یہ ہے کہ زندگی کے مسائل کی ترجمانی اور عکاسی بھرپور، متوازن، پُر اثر اور خوبصورت انداز میں کرے۔ انگریزی کی مصنفہ کلارا ریوز نے نسبتاً ناول کی زیادہ بہتر تعریف کی ہے وہ لکھتی ہے کہ:"ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرے کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔"(۱۲۴) یعنی ناول اپنی عصری زندگی اور معاشرہ کی سچی پیش کش کا نام ہے۔ فرانس کے فطرت نگار ایملی زولا ناول کی تعریف اس انداز میں کرتا ہے:"ناول خیالاتِ انسانی کا تجزیہ ہے اور ان کے مظاہر کا ایک ریکارڈ۔"(۱۲۵) بہ الفاظ دیگر ناول انسانی تجربات و احساسات کے تجزیے اور ان کے مظاہر و آثار کی دستاویز ہے۔ ہنری جیمس نے اپنے مشہور مقالہ "ناول کا فن" میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:ناول زندگی کا ذاتی اور براہِ راست تاثر ہے۔(۱۲۶) رالف فاکس کے مطابق":ناول فطرت سے بحث کرتا ہے۔یہ سوسائٹی اور فطرت کے خلاف جدوجہد کا رزمیہ ہے۔"(۱۲۷) فیلڈنگ کے نزدیک:"ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔ وہ اسے تفریح و تفنن کا آلہ اور ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔"(۱۲۸) ناول کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:"ناول دراصل طویل دورانیے کے ایک ایسے قصے کو کہتے ہیں جس میں پورا عہد سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اس کے کردار حقیقی ہوتے ہیں نیز یہ کہ اس میں پلاٹ کا خمیر اصل زندگی سے اٹھایا جاتا ہے۔"(۱۲۹) ناول کی کسی بھی تعریف کو حتمی نہیں کہا جا سکتا مگر یہ مختلف تعریفیں ناول کی مختلف صورتوں کی نشاندہی ضرور کرتی ہیں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ناول کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی کے توسط سے اردو میں رائج ہوا۔ اس کے معنی ہیں انوکھا، نرالہ اور عجیب۔(۱۳۰)

مذکورۂ بالا فنکاروں نے ناول کی جو مختلف تعریفیں کی ہیں اُن کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں تخیل اور تصور کو ایک پلاٹ مختلف واقعات اور چند کرداروں کی مدد سے زندگی کے بعض اہم حقائق کو صنعتی اور سائنسی عہد کے پس منظر میں رقم کیا جاتا ہے۔ناول میں چونکہ حقیقی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے اس لیے جلد ہی ناول متحرک زندگی کی تصویر کشی کا فن بن گیا اور اس کو سماجی زندگی کا آئینہ دار کہا گیا۔ناول کی اولین خصوصیت حقیقت نگاری ہے جس سے ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ناول کسی عہد کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ناول انسانی زندگی کا ترجمان ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں: ناول کا موضوع فرد ہے جو سماج کے پس منظر میں ہمارے سامنے آتا ہے اس میں ڈراما بھی ہوتا ہے۔مصوری بھی۔۔۔۔ ناول موجودہ زمانے کا رزمیہ ہے۔[۱۳۱] بیسویں صدی میں اُردو ناول موضوع، اسلوب اور فن کے لحاظ سے زندگی سے جتنا قریب ہو گیا اس سے پہلے کے دور میں اتنا قریب کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ قربت ذہنی اور طبعی دونوں طرح کی ہے، بیسویں صدی کا ادبی ذہن زندگی کی تبدیلیوں سے براہِ راست اس لئے متاثر ہوا کہ سائنس کی نئی ایجادوں نے خلوت کو بھی انجمن میں تبدیل کر دیا تھا جیسا کہ اسکاٹ جیمز نے کہا ہے کہ:

> "ریڈیو، ٹیلی فون، موٹر کار، ہوائی جہاز اور دوسری تمام ایجادوں نے نہ صرف لوگوں کی عادتوں کو تبدیل کر دیا تھا بلکہ اب ان کے لئے ناممکن تھا کہ وہ زندگی کی تبدیلیوں سے غافل رہ سکیں۔"[۱۳۲]

اس سلسلے میں قمر رئیس اور علی فاطمی اپنی کتاب "ہم عصر اردو ناول (ایک مطالعہ) میں لکھتے ہیں کہ:

> "ناول کے متعلق یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بغیر تہذیبی و سماجی سروکار کے ناول کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ناول اپنے آغاز سے ہی انسانی تہذیب و معاشرت کے مشاہدہ ترجمان کی حیثیت سے دیگر اصناف پر فوقیت رکھتا ہے۔" [۱۳۳]

ناول کا پھیلاؤ اس قدر وسیع ہے کہ سبھی کچھ اس میں سما جاتا ہے، ناول نگار کا یہی فن ہے کہ وہ اپنے ناول میں تمام کرداروں، سماجی رویے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کرے۔ناول کا پھیلاؤ ہی اُس کا فن ہے جس کے نتیجے میں اُردو ناول علاقے سے نکل کر شہر، شہر سے نکل کر ملک اور ملک سے نکل کر بین الاقوامی سطح تک پھیل گیا ہے۔ جس طرح پوری دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے تو اُس گلوبل ویلج کو دیکھنے والی آنکھ ناول نگار کی ہے:

"اکیسویں صدی کا ناول اس سبب سے بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اس میں مروّج علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون کا احاطہ بھی کیا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ، موبائل فون، سٹیلائٹ، سیّاروں اور ان پر بسنے والی مخلوق پر بھی ناول لکھے جا رہے ہیں۔ آج کا ناول محدود نہیں بلکہ اس کی وسعت لا محدود ہوتی جا رہی ہے۔" (۱۳۴)

اکیسویں صدی کے ناولوں کو نئے ناول کہا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اِن میں ناول نگار نے نہ صرف اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے بلکہ اپنے معاشرے کی عکاسی بھی کی ہے۔ یہ نیا اُردو ناول مغربی ناول کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی شان رکھتا ہے ہم ان نئے اُردو ناولوں کو دیگر زبانوں میں ترجمہ ہونے کی صلاحیت سے مالا مال پاتے ہیں۔ انہی خصوصیات کی بناء پر ہندوستان کے معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا ہے کہ:

"اکیسویں صدی کو "ناول صدی" کا نام دیا ہے۔ "نیا اردو ناول" اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں نئے مفاہیم و معانی کی معلومات بھی ہے اور نئے انکشافات بھی۔ حقائق کو انشا بھی کیا گیا ہے اور مستقبل کے عرفان کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ حقیقتیں کھل کر بیان کی گئی ہیں اور سب سے بڑھ کر ان میں زمانے کے عروج و زوال، نشیب و فراز اور محاسن و مصائب کا کھل کر بیان ملتا ہے۔" (۱۳۵)

اکیسویں صدی کے تیئیس برس گزرنے کے بعد ناولوں کی حیران کُن تعداد منظرِ عام پر آئی ہے جن کے تجزیے سے ہمیں خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ ناول نگار اپنے ملک و معاشرے میں موجود سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات اور ادبیات کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں ایک مثبت تبدیلی یہ ہے کہ سائنسی ایجادات کے بھرپور استعمال کا اظہار کیا گیا ہے جن کی وجہ سے نئی کہانیوں نے جنم لیا اور ایک جدید انداز سامنے آیا ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہی بنتا ہے کہ ادب اور ثقافت کا رشتہ نہ صرف استوار اور مضبوط ہے بلکہ ہمارا ادب یومِ ولادت سے ہی تہذیب و ثقافت کی آغوش میں پلا بڑا ہے۔ جیسے جیسے انسان جدت کو اپناتا چلا گیا ویسے ہی اُس کا تعلق اپنے گزرے ہوئے کل سے کمزور ہوتا چلا گیا جو کہ ثقافتی بحران کا سبب بنا جس کو میں نے مختلف پہلوؤں سے اپنے مقالے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، طبع پنجم، ص ۴۲،۴۱

۲۔ محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۷ء)، کتاب محل لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۸

۳۔ ایضاً، ص ۸

۴۔ ایضاً، ص ۹

۵۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۶۶

۶۔ حسنین کاظمی، اوراقِ فیض، مشمولہ: ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸

۷۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص ۹۰

۸۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۴۸

۹۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، سنگِ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۹

۱۰۔ انوار ہاشمی، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۴۶

۱۱۔ ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۸

۱۲۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ: عبدالمجید طاہر، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۱

۱۳۔ نوشی انجم، مرتب، سوال یہ ہے، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۴ء، ص ۴۵۹۔۴۵۸

۱۴۔ ریاض انور، اُصول تمدن، مکتبہ نظامیہ، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۳۱۸

۱۵۔ عابد حسین، سیّد، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ، ۱۹۵۵ء، ص ۱۵۔۱۴

۱۶۔ فاروق احمد ڈاکٹر، علم بشریات کیا ہے؟، (مضمون) Thesouthpress.com، ۲۵ دسمبر ۲۰۲۳، 3pm

۱۷۔ http://ur.m.wikipedia.org/wiki

۱۸۔ http//rekhtadictionary.com/urdu-meaning-of-anthropology

۱۹۔ نورالحسن نیر، مولوی، نُور الغات، جلد اوّل، نیلاب پرنٹرز، راولپنڈی، طبع سوم، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲۱

۲۰۔ اردو لغت (تاریخی اُصول پر) جلد پنجم، اُردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء

۲۱۔ سجاد باقر رضوی، تہذیب و تخلیق، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۶۶

۲۲۔ ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، ادارہ نقدِ ادب، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۸۹

۲۳۔ روتھ بنی ڈکٹ، ڈاکٹر، قدیم تہذیب و جدید انسان، دوست پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۸۶

۲۴۔ نوشی انجم، مرتب، سوال یہ ہے، ص ۴۷۵

۲۵۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۴۴، ص ۳۴۴

۲۶۔ عابد حسین، سیّد، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۱۵۔ ۱۴

۲۷۔ نوشی انجم، مرتب، سوال یہ ہے، ص ۴۶۶

۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کلچر اور ادب، مکتبہ عالیہ، لاہور، س۔ن، ص ۲۰۰

۲۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع ششم، ۱۹۹۷ء، ص ۴۲

۳۰۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص ۱۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۷

۳۲۔ عارفہ فرید، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر کی روایات، رائل بک کمپنی، صدر کراچی، اشاعت اوّل ۱۹۹۳ء، ص ۲۳

۳۳۔ عبد اللہ، سیّد، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، ص ۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۵

۳۶۔ غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب، شیخ غلام اینڈ سنز، ۱۹۷۱ء، ص ۱۹

۳۷۔ حسن ریاض، اسلامی تاریخ کے بعض اہم اور امتیازی پہلو، جمیعتہ الفلاح، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۵

۳۸۔ محمد حسن عسکری، کلچر کیا ہے، کلچر منتخب تنقیدی مضامین، مرتبہ اشتیاق احمد، میٹرو پولیٹن لاہور، بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳

۳۹۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی، بارھویں بار، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷

۴۰۔ کرار حسین پروفیسر، کلچر کا مسئلہ، کلچر منتخب مضامین، حصّہ دوم، مرتبہ اشتیاق احمد، میٹرو پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۸۶

۴۱۔ نور الحسن نیر، مولوی، نُور الغات، جلد اوّل، ص ۱۰۸۸

۴۲۔ اُردو لغت (تاریخی اُصول پر) جلد پنجم

۴۳۔ محمد ارشد بھٹی، مطالعہ تہذیب اسلامی، اصباح الادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵

۴۴۔ خلیفہ عبد الحکیم، ثقافت، (مضمون) مشمولہ: کلچر۔ منتخب تنقیدی مضامین، مرتب: اشتیاق احمد، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۲

۴۵۔ عابد حسین، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۹

۴۶۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰

۴۷۔ غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب، ص۱۹

۴۸عبد السلام خورشید،ڈاکٹر،پاکستانی ثقافت، مشمولہ:پاکستانی ثقافت، مرتبہ:ڈاکٹر رشید امجد،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۱۹۹۹ء، ص۱۲۴

۴۹۔ عماد الحسن فاروقی، اسلامی تہذیب و تمدن، نگارشاتِ لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲

۵۰۔ ممتاز حسین،ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت کی میراث، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ،ڈاکٹر رشید امجد، ص ۱۲۱

۵۱۔ عطش دُرّانی، اسلامی فکر و ثقافت، مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۷ء، ص ۷۵

۵۲۔ عکسی مفتی، پاکستانی ثقافت، الفصیل ناشران و تاجرانِ کتب، لاہور، جون ۲۰۱۴ء، ص ۲۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۵۴۔ عبد السلام خورشید،ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت، (مضمون)، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ رشید امجد، ص ۲۱۷

۵۵۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵

۵۶۔ ساجد امجد،ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۲۰

۵۷۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص ۲۶

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۷۔۲۶

۵۹۔ عابد حسین،ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۸

۶۰۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا مسئلہ، ص ۴۷

۶۱۔ اشفاق بیگ، مرزا (مترجم)، مارکسی فکر و فلسفہ کے خدوخال، غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، س۔ن، ص ۳۹۴

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۶۳۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۶۴۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقاتِ لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۳

۶۵۔ ایضاً، ص ۴۳

۶۶۔ اشفاق بیگ، مرزا (مترجم)، مارکسی فکر و فلسفہ کے خدوخال، ص ۳

۶۷۔ مظفر حسن ملک،ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۶۰

۶۸۔ زبیر رانا، پاکستان تہذیب کا بحران، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۱۔ ایضاً، ص ۲۰

۷۲۔ فیروزُ اللّغات اُردو، مرتبہ: الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، بار اوّل، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۴

۷۳۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۶

۷۴۔ منیب الرحمٰن مفتی، بحران در بحران (مضمون)، dunya.com.pk، ۲۵ دسمبر، 5 Pm

۷۵۔ http://www.rekhtadictionary.com/meaning-of-bohran

۷۶۔ http://www.rekhtadictionary.com

۷۷۔ علی عباس جلالپوری، سیّد، روحِ عصر، روہتاس بکس لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۷۹۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص ۲۷

۸۰۔ وارث سرہندی، علمی اُردو لغت جامع، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۹

۸۱۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ: عبد المجید طاہر، ص ۱۳

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۸۳۔ القرآن، سورۃ الرعد، آیت: ۱۱

۸۴۔ ایضا، آیت: ۱۷

۸۵۔ القرآن، سورۃ البروج، آیت: ۲۰ تا ۱

۸۶۔ عبد المجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۵۰۔۴۹

۸۷۔ Fukuyama,Francis,"The end of history and the lastman" The hearst corporation,New York,1992, Pg 288,125.

۸۸۔ شاہ نواز فاروقی، آلون ٹوفلر کا تہذیبی تصادم کا نظریہ، سہ روزہ دعوت، ۷ ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۸

۸۹۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ص ۳۵ تا ۳۰

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۹۱۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو، مترجم: سہیل انجم، آکسفورڈ پریس، کراچی، ص ۱۸۵

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۹۳۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ: عبد المجید طاہر، ص ۱۴۳۔۱۴۲

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۶۲
۹۵۔ کاشف صدیقی، دجالی تہذیب، بیت الحکمت، لاہور، ص ۵۵
۹۶۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ: عبد المجید طاہر، ص ۱۴۵
۹۷۔ ایضاً، ص ۳۹
۹۸۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ: عبد المجید طاہر، ص ۳۴
۹۹۔ قاسم یعقوب، مدیر، ماہنامہ، نقاط، ۲۰۰۹ء، ص ۸۹
۱۰۰۔ جان جی جیکسن، انسان، خدا اور تہذیب، مترجم یاسر جواد، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۴۱
۱۰۱۔ ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، مترجم: محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۳
۱۰۲۔ صدیق قریشی، محمد، مرتب، کشافِ اصطلاحات تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷
۱۰۳۔ ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، ترجمہ: محمد عباس، ص ۳
۱۰۴۔ ایضاً، ص ۵۸۔۵۷
۱۰۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، المیہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۷
۱۰۶۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، ص ۴۸
۱۰۷۔ القرآن، سورۃ القصص، آیت: ۵۸
۱۰۸۔ ایضاً، آیت ۵۹
۱۰۹۔ القرآن، سورۃ کہف، آیت ۵۹
۱۱۰۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، ص ۴۷
۱۱۱۔ ارشد اقبال، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ میں سماجی عناصر، بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۶۲
۱۱۲۔ مخدوم ٹیپو سلمان، تاریخِ پنجاب کے متنازعہ پہلو (سیاسی، ثقافتی اور علمی زاویے)، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۸۷
۱۱۳۔ ایضاً، ص ۸۸
۱۱۴۔ ایضاً، ص ۸۹۔۸۸
۱۱۵۔ ایضاً، ص ۹۴۔۹۳
۱۱۶۔ عارفہ فرید، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر کی روایات، ص ۶۹
۱۱۷۔ مخدوم ٹیپو سلمان، تاریخِ پنجاب کے متنازعہ پہلو (سیاسی، ثقافتی اور علمی زاویے)، ص ۹۵

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۹۹۔۹۸

۱۲۰۔ کشور ناہید، پاکستان، کی تہذیب و ثقافت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۴۲

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۲۴۔ علی عباس حسینی، اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸، ص ۳۷

۱۲۵۔ ایضاً ص ۳۸

۱۲۶۔ محمد یسیٰن، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، فضلی بک سپر مارکیٹ اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۵

۱۲۷۔ صغیر افراھیم، اُردو ناول تعریف، تاریخ اور تجزیہ، براؤن بُک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۰ء، ص ۱۸

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۲۹۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو ادب، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹

۱۳۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۴

۱۳۱۔ خورشید اسلام، ڈاکٹر، بحوالہ، ناول کا فن، محمد عارف، ڈاکٹر، پروفیسر، ص ۲۶

۱۳۲۔ یوسف سرمت، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۲۱

۱۳۳۔ قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ہم عصر اردو ناول (ایک مطالعہ)، نیو انڈیا آفیسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴

۱۳۴۔ شاعر علی شاعر، جدید اردو ناول اسلوب و فن، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۵

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۸

باب دوم:

پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران کے سماجی پہلو

پاکستانی اُردو ناول جہاں ایک طرف فنی خوبیوں کا حامل ہے تو وہاں دوسری طرف منفرد اسلوب کے حامل ناول نگار موضوعاتی لحاظ سے بھی انسانی زندگی کی مختلف جہتوں کو موضوع بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اُردو ناول میں سماجی و معاشی ناہمواری، خوشی، غمی، ظلم اور جبر، ثقافتی بحران سمیت تمام موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ پاکستانی اُردو ناول کا ایک اہم موضوع ثقافتی بحران ہے، مگر اس موضوع کو سمجھنے اور اس پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پاکستانی سماج پر بحث کی جائے اور دیکھا جائے کہ سماج کیا ہے ؟سماج کے قیام میں کون سے عناصر کار فرما ہیں؟ ادب کا سماج سے کیا رشتہ ہے:لفظ سماج کے لغوی معنی معاشرہ سوسائٹی، انجمن، حلقہ، ٹولا یا صف کے ہیں اور یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔[۱]

معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں اُردو زبان میں بھی یہ لفظ رائج ہے، ہندی زبان میں اِس کے لیے لفظ "سماج" مستعمل ہے اور اِس کا انگریزی مترادف سوسائٹی ہے۔ "سماج" لفظ سنسکرت زبان کے دو لفظوں "سم" اور "آج" سے مل کر بنا ہے۔ سم کے معنی ہیں اکٹھا یا ایک ساتھ اور آج کے معنی ہیں رہنا، یعنی سماج کے لغوی معنی ہیں ایک ساتھ رہنا۔[۲] اِس کا سادہ مطلب "مل جُل کر رہنا" ہے۔ انسان ایک دوسرے کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی جُڑے رہتے ہیں۔ جس سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ محمد عبداللہ خان خویشگی معاشرت کے معنی کچھ یوں بیان کرتے ہیں :"باہم زندگی بسر کرنا۔"[۳] درسی اُردو لغت میں معاشرہ کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے: مل جُل کر رہنا، میل جُول، زندگی گزارنا۔[۴] شان الحق حقی نے "فرہنگِ تلفظ" میں درج ذیل الفاظ میں معاشرے کی وضاحت کی ہے:"طریقِ زندگی، ساتھ مل کر رہنا۔"[۵] استاد شہید مرتضیٰ مطہری سماج کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "انسانی افراد پر مشتمل وہ جماعت جو خاص قوانین، خاص آداب و رسوم اور خاص نظام کی حامل ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک ہے اور ایک ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ سماج کی تشکیل کرتی ہے۔"[۶]

سماجیات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی سماج سکونی نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ کہیں تبدیلی کی رفتار سست ہوتی ہے تو کہیں طوفانی۔ تغیرات کا یہ سلسلہ روز اول سے جاری ہے لیکن علم اور ادراک کا سرمایہ جیسے جیسے بڑھتا جارہا ہے تبدیلی کی رفتار اسی تناسب سے تہلکہ انگیز ہے۔ آج کے دور میں دیکھا جائے تو سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ خود انسان کے تخلیق کردہ مہلک ہتھیاروں نے اس کی اجتماعی زندگی کے وجود کے لیے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔اس مرحلے پر سماجی تعلقات کا آہنگ ہی جوہری توانائی کا موثر جواب ہو سکتا ہے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ جو انسانی وجود کو درپیش ہے وہ سماجی تعلقات کی کشیدگی کو دور کرنا ہے۔ مشرق کا غریب پریشان ہے، مغرب کا امیر بے چین ہے اس کا سبب سماجی خامی ہے۔ سماجی سطح پر تبدیلی ہورہی ہے لیکن تبدیلیوں کی راہ کا تعین کرنا، اس کی نہج کو سمجھنا، مضمرات پر نظر رکھنا یہ سب سماجی باریکیوں کی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ اگرچہ سماجیات کا یہ دعویٰ نہیں لیکن کم سے کم ارادہ ضرور ہے کہ سماجی کشیدگی کے اسباب کا پتہ لگائے تاکہ پیچیدہ مسائل کا انسداد ممکن ہو سکے۔ تاریخ اور سماجیات کا علم ان الجھنوں کو سلجھانے میں مدد دے سکتا ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کا نتیجہ ہیں۔ ایک اجمال ہے تو دوسری اس کی تفصیل۔

سماجیات کی تعریف اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کا ماضی طویل ہے، یہ انسانی گروہوں کے درمیان عمل کا علم ہے۔ گروہوں کے درمیان عمل کا آغاز بنی نوع آدم کی آمد اور زوال سے شروع ہوتا ہے لیکن علمی حیثیت سے سماجیات کے مضمون پر توجہ بہت دیر بعد دی گئی۔ سماجیات کے آغاز اور اس کی تاریخ پر غور کرنے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تقریباً ہر زمانہ میں بڑے بڑے مفکرین اور اصحابِ فکر و نظر نے کسی نہ کسی اعتبار سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے آخری زمانہ میں مشہور فرانسیسی مفکر اگست کونت نے سماجیات کی بناء ڈالی۔ کونت نے محسوس کیا کہ انسانی زندگی مربوط اور منظم حقیقت ہے اور اس کے مختلف ادارے انسانی مقاصد کی تکمیل کے لیے خاص شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ سماج کی تصویر جتنی سادہ نظر آتی ہے حقیقت میں اتنی سادہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بہت پیچیدہ تنظیم ہے جس پر کبھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ لہٰذا کونت نے سماج کے علیحدہ علم کی داغ بیل ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے باقاعدہ مطالعہ پر زور دیا۔ اگست کونت کو سماجیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ اگست کونت نے ۱۸۳۹ء میں سب سے پہلے سماجیات کی اصطلاح وضع کی، سماجیات دو الفاظ سے مرکب ہے:

"پہلا Societus جو ایک لاطینی لفظ ہے جس کے معنی ہیں سماج یا گروہ۔ دوسرا لفظ Logos

ہے۔ یہ لفظ یونانی ہے جس کے معنی ہیں مطالعہ یا علم۔ درحقیقت یہی سماجیات کی سہل ترین تعریف بھی ہے۔ یعنی سماجیات وہ علم ہے جس میں سماج کے مختلف اجزاء اور افراد کے بین عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔"(۷)

کونت کے بعد سماجیات کے حوالے سے ڈارون کا نام آتا ہے، انیسویں صدی کے نصف آخر میں ڈارون کی تہلکہ خیز تصنیف "حیاتیاتی اقسام کی ابتدا" منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب نے تاریخِ حیاتیات میں ایک نئے اضافے کے ساتھ سماجی نظریات پر گہرا اثر بھی مرتب کیا۔ بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ سماجی ارتقاء پر نئے انداز سے غور کرنے کا آغاز اسی زمانہ سے ہوا۔ چنانچہ ڈارون کے نزدیک:

"انسان عالم حیوانات کی ایک شاخ ہے جو ارتقا کی بے شمار منزلوں سے گزرتے ہوئے حال تک پہنچتی ہے، نیز یہ کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کو بھی جہد للبقا کے معرکہ میں ہمیشہ سرگرم رہنا پڑا ہے۔ بقائے حیات کی ضمانت کے لیے مختلف انسانی گروہوں یا سماجوں نے جدا جدا طریقے اختیار کیے ہیں اور زندگی کے یہ طریقے اس سماج کا تمدن کہلاتے ہیں۔"(۸)

یہی وجہ ہے کہ اگر کہیں پر انسانی تمدن سادہ اور غیر ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے تو کہیں انتہائی عمدہ ثقافتیں ملتی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی سماج ترقی یافتہ اور دوسرا پس ماندہ نہ ہوتا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سماجی حقیقتیں سماجی راہ بناتی ہیں لہٰذا سماجی حقائق کا مطالعہ اور سماجی مطابقت کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ سماجی نظام اور اس کی کارکردگی کو سمجھا جاسکے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں مشہور برطانوی مفکر ہربرٹ اسپنسر کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی ضخیم کتاب اُصولِ سماجیات ہے۔ اس موضوع پر یہ سب سے پہلی بڑی کتاب ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اسپنسر نے اگست کونت کے خیال کو عملی جامہ پہنایا اور اس علم کو علیٰحدہ مکمل حیثیت دی۔ اسپنسر اپنے ہمعصروں کی تحقیقات سے بڑی حد تک متاثر ہوا تھا۔ اسپنسر کا خیال تھا کہ:

"جس طرح حیات کی مختلف شکلیں ارتقا کی منزلوں سے گزرتی ہیں اسی طرح انسانی سماج بھی خاندانی اور سادہ سماج سے شروع ہو کر پیچیدہ منزلوں تک پہنچا ہے۔ جس طرح ایک بیج سے تناور درخت نشوونما پاتا ہے اسی طرح ایک چھوٹے خاندان سے ایک بڑا قبیلہ یا سماج بن جاتا ہے۔"(۹)

انیسویں صدی میں اسپنسر کے نقطہ نظر کو انتہائی مقبولیت حاصل ہوئی، اگرچہ بعد میں آنے والے مفکرین نے اس نظریہ پر کافی اعتراضات اُٹھائے۔ ان اعتراضات کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسپنسر نے سماجی ارتقاء کے جن جہتوں کی جانب رہنمائی کی ہے وہ ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

چونکہ انسان فطری طور پر معاشرتی حیوان ہے وہ تنہا رہنے سے خوفزدہ ہوتا ہے اور تنہائی اُسے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ وہ دوسرے انسانوں اور جانداروں کے ساتھ مل جُل کر رہنا پسند کرتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ مل جُل کر رہنا اور باہم مربوط زندگی گزارنا اِس کا شوق ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی مجبوری بھی ہے۔ انسان اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، دونوں ایک دوسرے کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ہر انسان کی پہچان اِس کا معاشرہ ہوتا ہے۔ انسان معاشرے کو بدل سکتا ہے اور معاشرہ انسانوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یعنی انسان اور معاشرہ ایک دوسرے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے سماج یا معاشرہ کی تعریف یوں کی ہے:

> "سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام بالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول، ہمارے اوہام وعقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل وتعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔"[۱۰]

معاشرے کی تعریف کرتے ہوئے استاد مُرتضیٰ مطہری لکھتے ہیں کہ: انسانی افراد پر مشتمل وہ جماعت جو خاص قوانین، خاص آداب ورسوم اور خاص نظام کی حامل ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک ہے اور ایک ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ سماج کی تشکیل کرتی ہے۔[۱۱] انسان فطری طور پر سماجی ہے، اکھٹے رہ کر زندگی گزارنا اور دوسروں سے تعلقات وابستہ رکھنا اُس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ اِس طرح کہہ سکتے ہیں کی انسان کی مادی ضروریات کی بناء پر سماج کا وجود ہوا۔ انسان نے سماج کو تشکیل دے کر زندگی بسر کرنے میں آسانی حاصل کی۔ سماج کی بدولت ہی انسان کی پہچان ہونے لگی، سماج کے ذریعہ ہی انسان نے زندگی گزارنے کے مختلف ذرائع تلاش کیے۔ سماج کے قیام میں خاندان، قبیلہ اور قوم تین اہم عناصر ہیں جو بالترتیب باپ، ماں، بھائی، بہن، عزیز واقارب اور اس سے آگے بڑھ کر رسم ورواج، تاریخ، سیاست اور معیشت پر مشتمل ہیں۔ معاشرے کے بغیر انسان بے معنی ہوتا ہے اور معاشرہ انسان پر بے شمار طریقوں سے اثرانداز ہوتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرے کی تہذیب وثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو ایسے ہی انسان خود بھی

تبدیلی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ جس طرح معاشرے کے بناء انسان کی کوئی اہمیت نہیں اسی طرح انسان کے بغیر سماج کا بھی کوئی وجود نہیں۔ اس سلسلے میں ضیاء الحسن کہتے ہیں کہ:

"فرد معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ انسان ایک یکتا وجود ہے جو دوسرے افراد کے ساتھ مل کر گروہ تشکیل دیتا ہے۔ مختلف انسانی گروہ مل کر معاشرہ بناتے ہیں۔ انسان معاشرے کے لیے اور معاشرہ انسان کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اس لیے ارسطو نے انسان کو سماجی حیوان قرار دیا تھا کہ کوئی بھی انسان دوسرے انسانوں سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔"(۱۲)

کسی گروہ، قبیلے یا معاشرے کی روایات و اقدار اور رسوم ورواج اس کے مذہبی عقائد کے تابع ہوتے ہیں۔ مغربی تہذیب جس کی بنیاد ہی مادیت پرستی پر ہے وہاں بھی مذہبی اقدار و روایات اور تعلیمات کو وہاں کی تہذیب و ثقافت اور زندگی میں اہمیت حاصل ہے۔ کوئی بھی تہذیب و ثقافت کسی قبیلے، گروہ اور فرد کے مذہب کے دائرے میں پرورش پاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ تہذیب و ثقافت میں مذہبی اقدار اس قدر حاوی نہیں رہے لیکن ان کی الگ اہمیت اور حیثیت اپنی جگہ آج بھی قائم ہے۔ سائنسی علوم، سائنسی ایجادات، باہمی رابطوں، علوم و فنون کی ترقی اور دیگر تہذیبوں کے ساتھ رابطے کے باعث جہاں بہت ساری ایسی چیزیں اور روایات ہمارے تہذیبی تشخص میں شامل ہو چکی ہیں جن سے مذہب منع کرتا ہے یا ان کو پسند نہیں کرتا لیکن اس سب کے باوجود ہماری تہذیبی زندگی کی جڑیں ہمارے مذہب میں ہی ہیں۔ خوشی، غمی کی رسومات ہوں یا ہماری خوراک ہو یا میلے ٹھیلے یا لباس غرض کہ ہر چیز مذہبی اقدار کے دائرے میں ہی تشکیل پاتے ہیں۔ دراصل مذہب تہذیب و ثقافت کی اساس ہوتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی کے لیے رہنما اُصول مرتب کرتا ہے اور اگر یہ اُصول و قواعد موجود نہ ہوں تو انسان اپنے لئے درست سمت کا انتخاب نہیں کر پائے گا۔ مذہب انسانی معاشرے کو ایک پروگرام دے دیتا ہے جس کے مطابق معاشرت اپنی سرگرمیوں کا تانا بانا تیار کرتے ہیں: "ہر تمدن کا آغاز مذہب اور انجام سائنس پر ہوتا ہے۔"(۱۳)

معاشرہ مختلف افراد کا مجموعہ ہوتا ہے اور معاشرے میں موجود ہر فرد ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی اپنی خواہشات، پسند ناپسند اور نظریات ہوتے ہیں۔ اگر معاشرہ ان تمام نظریات کو سامنے رکھے تو انتشار کا شکار ہو جائے جبکہ مذہب ایک ایسی مشترکہ طاقت کے طور پر سامنے آتا ہے جو افراد کے مابین یکجہتی، یکساں سوچ، ہم آہنگی اور نظریے کو فروغ دیتی ہے اس لئے مذہب کو کسی معاشرے اور تہذیب و ثقافت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کے لیے مذہب ایک بہت ہی جذباتی اہمیت کی حامل شے ہے اور وہ چاہ کر بھی

مذہب اور عقائد سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ چونکہ مذہب کا تعلق براہِ راست انسانی زندگی سے ہوتا ہے اس لیے پیدائش سے لے کر موت تک انسان کسی نہ کسی حد تک مذہب کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ اسی لیے مذہب کی قدروں کی بنیاد پر سماج اور زندگی کی قدریں تشکیل پاتی ہیں اور کوئی بھی فرد مذہب اور سماج یا زندگی کے درمیان خط کھینچ کر ان کو خانوں میں نہیں بانٹ سکتا۔ ہمارے رسم و رواج، عقائد، رہن سہن، خیالات و نظریات، جذبات، جمالیات اور اچھائی برائی کے معیار سبھی مذہب کے زیرِ اثر تشکیل پاتے ہیں۔ منیر احمد شیخ کے نزدیک: "معاشرے کی تاریخ روحانی اقدار سے وجود میں آتی ہیں اور جو کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے بلند ہوتی ہے۔"(۱۴) مذہب اقدار کا بنیادی عنصر ہوتا ہے کیونکہ کوئی بھی ایسی قدر جو مذہب یا عقائد سے متصادم ہو معاشرے یا سماج میں فروغ پا سکتی اور ایسے تمام خیالات و رسومات و عقائد کے لیے معاشرے میں شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ انسانی سماج اور زندگی میں اچھائی، برائی اور خیر و شر کی دوڑ ایک بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اچھائی اور برائی، خیر اور شر کی تعریف کا معیار یہ سب مذہب کی بنیاد پر طے پاتے ہیں اور انہی بنیادوں پر انسانی سماج کی اقدار طے پاتی ہیں۔ زندگی اور سماج کی ہر قدر کا مذہب سے بہت گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے اور اقدار مذہب کے اثر سے الگ کچھ بھی نہیں۔

انسان زندگی میں بہتری کے لیے جو اچھے اُصول اپناتا ہے، اُن میں سب سے زیادہ عمل دخل تہذیب و ثقافت اور مذہبی روایات کو ہوتا ہے جن کی بدولت وہ سماج میں اچھی راہ پر چلنا سیکھ سکتا ہے۔ سچائی، ایمانداری اور خلوصِ نیت سے دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا وہ عناصر ہیں جو انسان کے کردار کو اچھا بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سماجی شعور ہی انسان میں آگاہی کو جنم دیتا ہے اور اس پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے:

> "جس طرح انسان مختلف عقائد و نظریات کا مالک ہوتا ہے اسی طرح سماج میں سانس لینے والے افراد مختلف مزاج و مذاق کے مالک ہوتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے طور طریقے انسان اور انسانی فطرت کے رائج ہونے کے طریقوں سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت کا یہ ایک المیہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسرے انسانوں کی نظر میں طاقت کے بل بوتے پر معزز اور ممتاز کہلوانے کا خواہش مند ہوتا ہے اس طرح کے جذبوں میں سرشار سماج کے افراد نامناسب اور غیر اخلاقی عمل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔"(۱۵)

انسان کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کا دل کش پیرائے سے اظہار ادب کہلاتا ہے۔ ادب انسانی زندگی میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اور ہر ادیب کا تعلق کسی نہ کسی معاشرے سے ہوتا ہے اس لیے ادب اور معاشرے کو جُدا جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر افضال بٹ اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اِن الفاظ میں کرتے ہیں: "ادیب اپنے سماج اور اِس کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہر ادب اپنے عہد کے سماجی اُتار چڑھاؤ سے ہر حالت میں کسی نہ کسی شکل میں منسلک رہتا ہے۔"[۱۶] ادب، سماج اور ادیب کی فکری صلاحیتوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ تخلیقی ہو یا تنقیدی، ادب ہر صورت میں ایک بڑی حد تک سماج کی پیداوار ہوتا ہے اور سماج کو متاثر کرتا ہے: "تخلیقی ادیب سماجی حقائق سے تاثرات حاصل کر کے اور ان تاثرات میں اپنے مخصوص ذہنی عمل سے اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر انہیں زبان کے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اس کا نقطہ آغاز زندگی اور سماج ہے اور منتہا تخلیق ادب۔"[۱۷]

ادب سماج کا ایک حصہ ہے سماج کی ترقی میں ادب نمایاں رول ادا کرتا ہے۔ جب سے سماج کا وجود ہوا تب سے لیکر آج تک ادب نے سماج کی بہتری کا کام کیا ہے۔ جہاں سماج ہے وہاں ادب ہے، یعنی سماج کے وجود سے ہی ادب کا وجود ہوا۔ افسانوی ادب عصری تبدیلیوں اور ترقیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے، افسانوی ادب سے ہی کرداروں کے حوالے سے کسی معاشرہ اور ثقافت کے بدلتے ہوئے مزاج، معیار، سوچ اور فکر کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُردو ناول کی کردار نگاری کا مطالعہ ایک اعتبار سے کسی معاشرہ کی ثقافت کا ہی مطالعہ ہوتا ہے۔ دراصل ناول یا افسانہ میں حقائق اور واقعات ہی نہیں جذبات و احساسات، تصورات و نظریات کے حوالے سے کہانی کا مرکز و محور انسان یعنی کردار ہی ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر معاشرہ میں انسان کا مقصد، کسی نہ کسی زاویئے سے ایک اہم اور قابلِ توجہ آدمی بننا رہا ہے۔ لیکن انسان سے آدمی بننے کی راہ میں ہزاروں دُشواریاں اور رُکاوٹیں کبھی زمانہ کی پیدا کردہ ہوتی ہیں اور کبھی خود اپنی ذات کی پیدا کردہ بھی ہوتی ہیں اور حقیقت، خارجی حقائق اور داخلی کیفیات کے درمیان تصادم اور کشمکش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اِسی تصادم اور کشمکش سے انسان یعنی کردار کی شخصیت کی تعمیر بھی ہوتی ہے اور تخریب بھی۔ افسانوی ادب میں، چاہے وہ داستان ہو یا ناول یا افسانہ کرداروں کی پیش کش انھیں باتوں کو ذہن میں رکھ کر کی جاتی ہے۔ ناول، افسانہ اور ڈراما ہی ایسی نثری اصناف ہیں جن میں انسانی کرداروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ گو ہر صنف میں انسانی کرداروں کی پیشکش الگ الگ تقاضوں کی حامل ہے۔ اس لیے ناول نگار کرداروں کو عام انسانی معاشرت سے زیادہ قریب کر کے پیش کرتا ہے تاہم وہ بالکل ویسے نہیں

ہوتے جنھیں ہم روزمرہ زندگی میں اپنے گردوپیش دیکھتے ہیں، ان میں اچھے کردار بھی ہوتے ہیں اور برے کردار بھی۔ لیکن جس طرح کوئی شخص عام زندگی میں نہ مجسم فرشتہ ہوتا ہے نہ مجسم شیطان۔ انسان مجموعہ اضداد ہے، وہ خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے:"مختصر اردو لغت"میں کردار نگاری کے لغوی معنی"کام"، "شغل"، "فعل"، "چلن"، "خصلت"، "عادات" بیان کیے گئے ہیں۔"(۱۸)

جبکہ اصطلاح میں کردار ان نفوس یا ہستیوں کو کہتے ہیں جو ناول میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ان ہستیوں کی عمدہ پیش کش ہی کردار نگاری کا فن کہلاتی ہے۔ ناول میں کرداروں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، ان کے بغیر ناول کا وجود ممکن نہیں ہے۔ کردار ظاہری اور باطنی دونوں خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے، بغیر کردار کے ناول لکھنا ایسا ہے جیسے بغیر رنگوں کے پینٹ کرنا۔ پریم چند کے خیال میں تو ناول نگار کا مطمحِ نظر ہی کرداروں کے اسرار کھولنا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:"میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔"(۱۹)

کردار نگاری میں حلیہ نگاری کی خاص اہمیت ہے، مغربی کرداروں کی حلیہ نگاری تو اور بھی ضروری ہے کہ اس سے ہمیں مغربی اور مشرقی معاشرت کا فرق صاف انداز میں الگ الگ نظر آتا ہے۔ اس سے کردار کے کئی اوصاف بھی سامنے آتے ہیں۔ کردار آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں، اسے فنی زبان میں مکالمہ کہتے ہیں۔ ناول کے کرداروں کی گفتگو، مکالمہ ہی کے ذریعے قاری تک رسائی کرتی ہے اور ناول نگار اپنا مدعا اِسی کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ مکالمہ جتنا جاندار ہو گا، اس کا تاثر قاری پر اتنا ہی گہرا مرتب ہو گا۔ مکالمہ کردار کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے، اس لیے ناول نگار کو مکالمہ کی طرف بھی اتنی ہی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے جس قدر کردار نگاری کی طرف۔ مکالمہ کردار کی عمدگی اور کامیابی کی دلیل ہے، ایک اچھا ناول نگار کردار کی شخصیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اس کے منہ میں وہ زبان دے دیتا ہے جس طبقے کا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔

مکالمہ لکھتے وقت ناول نگار کو تقریر اور مکالمہ کا فرق ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ مکالمہ جامع، پُر اثر اور مختصر ہو گا جبکہ تقریر طویل ہو گی۔ دونوں کا اپنا اپنا مقام اور دائرہ اثر ہے، تقریر کی جگہ مکالمہ نہیں لے سکتا اور مکالمہ کی جگہ تقریر نہیں لے سکتی۔ مکالمہ کو گفتگو ہی رہنا چاہیے، تقریر نہیں بننا چاہیے۔ مکالمہ نگاری کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ مکالمہ پڑھ کر افرادِ قصہ کی شخصیت، ان کی خوبیاں اور خامیاں، خصلتیں اور صلاحیتیں واضح ہوں۔ گویا مکالمہ صرف مصنف کے ذہن کا ترجمان ہی نہیں، اس مجموعی معاشرتی و سماجی تمدن کا بھی

عکاس ہوتا ہے۔ اچھاناول نگار وہی ہے جو مکالمہ لکھتے وقت کسی کردار کی ذہنی کیفیت، طبقاتی حیثیت، رسوم و رواج، عام بول چال کی زبان، روزمرہ اور محاورہ سے اچھی طرح آگاہ ہو۔

ثقافتی بحران کی بڑی وجہ عالمگیریت ہے کیونکہ عالمگیریت مقامی شناختوں کے خاتمے کا نام ہے۔ جس میں پوری دنیا کی تہذیبوں اور ثقافتوں میں فرق پوری طرح ختم ہو رہا ہے اور ایک ہی تہذیب غالب آرہی ہے جس کے اثرات پوری دنیا پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اُردو اصطلاح "عالمگیریت" لفظ عالمگیر سے ماخوذ ہے، یہ بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی طور پر اُس سے مراد ہے علاقائی یا مقامی رسم ورواج کو عالمگیر بنانا یعنی پوری دنیا میں ایک جیسے رسم ورواج اور مظاہر موجود ہوں۔ گلوبلائزیشن کو دراصل گلوب سے اخذ کیا گیا ہے جو کسی بھی گول کرۂ زمین، جسم یا کروی شکل اور گیند وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا اور دنیا کے لیے بھی گلوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ دنیا کو بالکل گول سمجھا جاتا ہے۔ گلوبائزیشن یا عالمگیریت ایک کثیر الجہتی لفظ ہے جس کی تعریف مختلف علوم کے ماہرین اپنے اپنے نقطہ نظر کے تحت کرتے ہیں۔ ماہرینِ اقتصادات عالمگیریت کو معیشت کا عالمی پھیلاؤ قرار دیتے ہیں۔ ماہرینِ عمرانیات اسے کلچر کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور گلوبلائزیشن کی ثقافتی تبدیلیوں اور اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ سیاسی نقطہ نظر رکھنے والوں کے نزدیک سیاسی تنظیمات وانتظامات میں تبدیلیاں اہمیت کی حامل ہیں۔ کچھ ماہرین نے مواصلاتی انقلاب اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کو عالمگیریت سے منسلک کیا ہے۔

گلوبائزیشن ایک ایسا تصور ہے جو جغرافیائی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ معیشت کے میدان میں یہ آزاد تجارت کی تحریک ہے جو دنیا کے کسی بھی شخص کو دنیا کے کسی کونے میں تجارت کی اجازت دیتی ہے۔ سیاست کے میدان میں یہ سرحدوں اور مقامی حکومتوں کا خاتمہ کرتی ہے، تہذیب وثقافت کے میدان میں عالمگیریت ایک ہی ثقافت کے غلبے کی دعویدار نظر آتی ہے۔ عالمگیریت دنیا میں موجود طبقاتی فرق کا خاتمہ کر کے تمام بنی نوع انسان کے درمیان مساوات اور یگانگت پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے تاکہ امیر وغریب کا فرق ختم کیا جا سکے۔ دنیا کے تمام لوگ معاشی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے برابر کا حصہ وصول کریں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقی نے عالمگیریت کے عمل کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلم مفکرین اور دانشوروں نے گلوبلائزیشن کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اصل چہرے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور عصرِ حاضر کی عالمگیریت کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ عالمگیریت حاکموں کی طرف سے محکوموں کے لیے بنائے گئے قوانین کی مانند ہے جس سے ہمیشہ غریبوں کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ عالمگیریت کے

علمبر داروں نے جہاں ایک طرف سیاست کو امریکی مفاد کے مطابق ڈھالا، اقتصادیات کو ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خواہشات کے مطابق تشکیل دیا تو دوسری طرف تہذیب و ثقافت کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ معیشت اور سیاست کے بعد اب ان کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کی تہذیب، ثقافت اور تمدن کو ختم کر کے پوری دنیا میں ایک ہی تہذیب کو رائج کیا جائے، لوگوں میں نسل و رنگ کا اختلاف تو پایا جائے لیکن معیارِ زندگی، رہن سہن اور زبان حتیٰ کہ فکر و نظر میں ہم آہنگی اور یگانگت قائم ہو جائے، ان کے نظریات و احساسات ایک طرح کے ہوں اس کے ساتھ ہی ان کا طرزِ زندگی بھی ایک ہو تا کہ زندگی کی روزمرہ اشیاء کو بنانے اور فروخت کرنے والی کمپنیوں کو کبھی کساد بازاری کی شکایت یہ نہ ہو سکے۔ Golobalization کو اردو میں عالمگیریت کہا جاتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق یہ لفظ پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں منظرِ عام پر آیا اور ۱۹۵۱ء میں ڈکشنری میں شامل ہوا۔ مارشل میکلعن نے گلوبل ولیج کی اصطلاح ۱۹۶۲ء میں تراشی اور اس کے بعد اس لفظ کا استعمال شروع ہوا۔ اس لفظ کو جتنا ہم سادہ سمجھتے ہیں اتنا سادہ نہیں ہے کیونکہ اس نے مختلف رنگ اختیار کیے۔ گلوبلائزیشن کی اصطلاح ان تعلقات کی طرف اشارہ ہے جو جدید قوموں کے مابین پیدا ہو رہے ہیں۔ قوموں کی سماجی، معاشی اور سیاسی ضرورتیں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس طرح ان قوموں کے درمیان رابطہ شروع ہو جاتا ہے اور اس تعلق کو گلوبائزیشن کی ایک جہت سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ عالمگیریت ایک سوچی سمجھی چال ہے جس کے تحت کمزور اور غریب ممالک کو ترقی یافتہ اور مغربی ممالک بطور منڈی استعمال کر کے ان کے وسائل کو چرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عالمگیریت میں مزید ترقی آتی گئی۔ مختلف ممالک کے افراد کا آپس کا میل جول مزید بڑھا، ٹیلی فون کی ایجاد نے انسان کو مزید ایک قدم آگے بڑھایا پھر ذرائعِ مواصلات کی ترقی نے عالمگیریت کے سلسلے میں انقلاب برپا کیا۔ اب جہاز، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ کی موجودگی میں رابطہ سہل ترین، سفر آسان اور افراد کا ملاپ آسان ہو گیا ہے۔ اب تو دنیا کی حالت ایسے ہے: "ہماری دنیا بین الاقوامی ہے۔ ہستی کی existence فضاء سے نکل کر بین الاقوامی طاقتوں کی مرہونِ منت ہو گئی ہے۔"(۲۰) عالمگیریت دراصل معاشی مفادات کی آڑ میں چند یورپی ممالک اور امریکہ کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے۔ عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ دو ایسے جال ہیں جو غریب ملکوں پر پھینکے جاتے ہیں۔

عالمگیریت دراصل اُس طوفان کا نام ہے جس میں مقامیت یا کسی علاقے کے مخصوص کلچر، وہاں کے رسم و رواج اور روایات ساتھ ساتھ اقدار بھی اِس طوفان کے نیچے دب کے رہ جاتے ہیں۔ عالمگیریت آسان

اصطلاح نہیں ہے یہ بہت پیچیدہ ہے، تجارت سے لے کر معاشرت تک یہ مختلف معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ مبین مرزا عالمگیریت کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> "عالمگیریت دراصل وہ ایجنڈا ہے جو کہ رنگوں، نسلوں، زبانوں اور عقیدوں کی اس دنیا کی نئی تشکیل سے عبارت ہے۔ ایسی نئی تشکیل جس میں دنیا کی سب اقوام اور سارے افراد ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی زندگی گزارتے نظر آئیں۔"(۲۱)

عالمگیریت کے پسِ پشت مخصوص سیاسی، سماجی اور تجارتی مقاصد کار فرما ہیں اسی وجہ سے اسے عالمی سازش کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ مقامیت کو ختم کرنا، علاقائیت سے جان چھڑانا اور مغربی تہذیب کا غلبہ ہی دراصل عالمگیریت کے عزائم ہیں۔ عالمگیریت اپنے پہلو میں مثبت کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ عالمگیریت نے انسان کو بے شمار فوائد سے نوازا ہے، ان میں سر فہرست افراد کا آپس میں تیز ترین اور سہل رابطہ ہے۔ اب جدید عہد کا فرد دنیا کے ایک کُونے سے دوسرے کونے تک پیغام آسانی سے، جلدی اور سستے ذرائع کے ذریعے پہنچا سکتا ہے۔ حالات ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے بلکہ ابھی ماضی قریب کی بات ہے: "نیو یارک سے لندن تین منٹ کی کال ایک ڈالر میں پڑتی ہے جبکہ انیس سو تیس میں یہ کال تین سو ڈالر میں پڑتی تھی۔"(۲۲) اس طرح دیکھا جائے تو سہل رابطوں کی وجہ سے انسانی تعلقات میں مزید ترقی آئی ہے۔ آج کا انسان دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ویڈیو کال کے ذریعے بھی بات کر سکتا ہے۔ عالمگیریت کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اب انسانوں کے لیے خوراک کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے اب دنیا کے ایک کونے میں اگر خوراک کم ہے تو دوسرے کونے میں آسانی سے خوراک پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہی فرد کو دوسری تہذیبوں کو سمجھنے کا موقع بھی ملا ہے۔ اب ہم انٹرنیٹ کے ذریعے دوسرے ممالک اور اُن کے افراد کے بارے میں آسانی سے جان سکتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر آسانی سے کُتب حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عالمگیریت کے فوائد سے زیادہ نقصانات ہیں۔

عالمگیریت کی وجہ سے ہی دنیا کے دور دراز ملکوں میں پیدا ہونے والی بیماریاں دوسرے ملکوں میں منتقل ہو جاتی ہیں جیسا کہ: "ایڈز کی بیماری کا آغاز افریقہ اور جنوبی امریکہ سے ہوا اور اب پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ہر روز چودہ ہزار افراد اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔"(۲۳) عالمگیریت کی دوسری جہت یہ ہے کہ اس کے درپردہ دراصل مغربی ممالک کی تہذیب، ثقافت اور زبان کو مشرقی ممالک میں رائج کرنے کی کوشش ہے۔ اس وجہ سے قومی تہذیبیں جو کسی ملک کی پہچان ہوا کرتی تھیں اب بالکل معدوم ہو رہی ہیں، ایسا نظر آرہا

ہے کہ آئندہ ادوار میں پوری دنیا میں صرف امریکیت اور مغربیت ہی غالب تہذیبیں ہوں گی۔ فرد نے سائنسی طور پر حیران کُن ترقی کی ہے لیکن جو انسان ستاروں کی گزر گاہوں کو تلاش کر کے اور سیاروں پر کمندیں ڈال چکا ہے وہ انسانیت کے بنیادی رُموز کو فراموش کر چکا ہے۔ اب تمام اخلاقی، دینی اور معاشرتی اقدار عالمگیریت کے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ چکی ہیں۔ مبین مرزا نے اپنے ایک مضمون میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

> "غور کیجئے کہ اِس عہد میں انسانی معاشرت اور تمدن کے بہت سے بنیادی تصورات میں تبدیلی آچکی ہے۔ مساوات، بھائی چارہ، ہم آہنگی، رواداری، روشن خیالی، وابستگی اور مصالحت کے آج وہ معنی نہیں ہیں جو اس سے پہلے رائج رہے ہیں۔"[۲۴]

عالمگیریت نے ہمارے ہاں پُرانی تہذیب کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں، اب تہذیبی اقدار قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ عالمی منظرنامے پر اس قدر تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں تو انسانی تہذیب، ثقافت اور سوچوں کا آئینہ جو کہ ادب ہے متاثر ضرور ہوا ہے۔ اب جدید تہذیبی اقدار فروغ پا رہی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے حالات کو بدل کر رکھ دیا ہے، اب پُرانی تہذیب قصّہ پارینہ بن چکی ہے۔ اِن تمام عوامل کے اثرات ادب پر بھی پڑے ہیں۔ ان تبدیلیوں کو محمد حمید شاید نے بھی محسوس کیا ہے:

> "معاشرہ جو پہلے بہت پھیلا ہوا تھا۔ بس ملکوں اور قوموں کی سرحدیں اور لکیریں ان معاشروں کو شناخت عطا کرتی تھیں۔ تب دُکھ سُکھ ان معاشروں کے اندر سے پھوٹتے تھے۔ مگر پچھلے کچھ عرصے سے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے دنیا یکدم سُکڑ گئی ہے۔ ساری لکیریں مٹ گئی ہیں۔ ساری شناختیں معدوم ہو گئی ہیں۔ گلوبل ویلج بنتی اس دنیا میں اب اندر کے دُکھوں سے کہیں بڑے دُکھ باہر سے آتے ہیں۔"[۲۵]

اس طرح عالمگیر معاشرہ دراصل کئی تبدیلیوں کا باعث بنا ہے۔ اب ایک سال کے بعد دوسرا سال جب آتا ہے تو گزرا ہوا سال موجودہ ترقی دیکھ کر قصہ پارینہ معلوم ہوتا ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج معاشرے کی تمام جہات کی عکاسی کرتا ہوا اُردو ادب کا ادیب عالمی گاؤں کا رُکن نظر آتا ہے۔ تہذیب کے اپنے خدوخال ہیں جن کے اثرات ادب پر بھی نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں، آج جب ہر پل ہر لمحہ نئے حالات جنم لے رہے ہیں اور پرانی اقدار کا خاتمہ ہو رہا ہے، نئی تہذیب جنم لے رہی ہے۔ اقدار کے زوال کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب جو مشرقی تہذیب پر غالب آتی جا رہی ہے اس کا گہرا شعور ناول

نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ اقدار کا زوال بھی ہمارے عہد کا ایک بہت بڑا المیہ ہے، ان تمام عوامل کو ناول کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب سے سائنسی ترقی میں تیز رفتاری آئی ہے ہر چیز بدل رہی ہے، پرانی تہذیب و ثقافت پوری طرح ختم ہو رہی ہے۔ مٹی کے دیے کی جگہ اب بجلی کے بڑے بڑے قمقموں اور مختلف قسم کے بلبوں نے لے لی ہے۔ دوسری طرف ٹی وی نے دادی اماں کے قصوں کے دور کا بھی خاتمہ کر دیا ہے، ایسی کئی چیزیں جو ہماری مشرقی تہذیب کا خاصہ تھیں اب ماضی کی یادگار بن چکی ہیں۔ اب شہر اور گاؤں میں فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں، دیہات کے ساتھ جو فطرت نگاری مخصوص تھی اب اس کا آہستہ آہستہ خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ شہر کی مصنوعی زندگی نے لے لی ہے۔ ڈاکٹر علی کی رائے سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتے: "موجودہ دور میں دیہی ترقی ناقابل تردید حقیقت ہے مگر جو گاؤں کی تہذیب اور کلچر ہے وہ معدوم ہو رہا ہے۔ اس درد کو دیسی باشندے شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔"[۲۶]

اب شہروں کو پھیلنے کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے، اس تیزی کے ساتھ سادگی اور فطری ثقافت کے خاتمے پر معاصر ناول نگار نوحہ کناں نظر آتے ہیں اور بدلتی ہوئی اقدار پر مایوس دکھائی دیتا ہے۔ شہروں کے اطراف جو گاؤں تھے اب وہ شہر کے مرکز میں آ چکے ہیں۔ شہروں کے اس طرح پھیلنے کا احساس معاصر ادیبوں کے ہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ آج کا فرد دراصل سیلفی کلچر میں پوری طرح گرفتار ہو چکا ہے۔ سیلفی کلچر سے مراد ہے سمارٹ فون یا کیمرہ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تصاویر لینا اور انھیں سوشل میڈیا پر استعمال کرنا۔ سیلفی سے مراد کسی بھی شخص کی ایسی تصویر جو وہ خود لیتا ہے یہ تصویر عام طور پر اسمارٹ فون یا ویب کیم کے ذریعے سوشل میڈیا پر پوسٹ کرنے کی غرض سے بنائی جاتی ہے۔ عام خیال ہے کہ سیلفی ابھی آج کل کی بات ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے ماضی میں دیکھنے پر سولہویں صدی کی دوسری دہائی میں سیلفی کا ذکر ملتا ہے۔ ذاتی پورٹریٹس کا تصور فوٹو گرافی کے جدید آلات کی ایجاد سے بہت پہلے کا ہے یونیورسٹی آف کولمبو کی اکتوبر ۲۰۱۴ء میں کی گئی تحقیق کے مطابق سیلفی کے سب سے پہلی شکل اس پورٹریٹ کو قرار دیا گیا جو ۱۵۲۴ء میں اطالوی آرٹسٹ پارمگیانینو نے بنائی تھی۔ اور پہلا باقاعدہ فوٹو گراف جسے سیلفی کہا گیا ہے وہ تصویر تھی جو فلاڈلفیا کے شوقیہ فوٹو گرافر رابرٹ نے ۱۸۳۹ء میں اپنی بنائی تھی۔

سیلفی کے متعلق گفت و شنید میں تیزی سال ۲۰۰۵ء کے بعد آئی کیونکہ یہ سماجی رابطوں کی ویب سائٹس فیس بک، انسٹاگرام وغیرہ کی مقبولیت کا زمانہ تھا یہ طریقہ نوجوانوں میں بہت مقبول ہوا اور ۱۸ سے

۳۵سال کے لوگوں میں یہ رجحان زیادہ مقبولیت حاصل کرتا گیا۔ سیلفی صرف ایک شخص کی تصویر نہیں بلکہ گروپ سیلفیاں بھی آج کل کافی معروف چیز ہے۔لوگوں کا سیلفیوں میں پرفیکٹ دکھائی دینے کا جنون سرجری کے کاروبار کو بھی وسعت دے رہا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں یونیورسٹی آف ہائفا میں ۱۲ سے ۱۹ سال کی ۲۴۸ لڑکیوں پر ایک تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ جو لڑکیاں زیادہ فیس بک استعمال کرتی ہیں وہ کھانے پینے میں بے اعتدالی، بھوک کی کمی، دبلے پن کا شکار ہیں۔

سیلفی کلچر کئی مثبت پہلوؤں کے ساتھ بھی آتا ہے جو انفرادی اظہار، تخلیقی صلاحیتوں اور سماجی تعلقات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سیلفی کلچر کے ذریعے سالگرہ کی خصوصی تقریب ہو یا شادی کی تقریب، ایوارڈ پیش کرنا ہو یا ریٹائرمنٹ، دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ ایک سادہ لمحہ یادوں کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ سیلفی کلچر افراد کے درمیان سماجی تعلق کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ سیلفی کلچر کے ذریعے دوستوں اور خاندان والوں کو ایک دوسرے کی زندگیوں کے بارے میں اپ ڈیٹ رہنے کے ساتھ ساتھ ان کی خوشیوں اور تجربات میں شریک ہونے کی اجازت ملتی ہے۔

سیلفیز ذاتی تشہیر اور مارکیٹنگ کے لیے ایک مقبول اوزار ہیں۔لوگ سیلفیز اس لیے کلک کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں سے جڑے رہنے کے لیے، بوریت سے چھٹکارا حاصل کرنا، خوداعتمادی کو بڑھانا، سوشل میڈیا پر توجہ حاصل کرنا اور عام توجہ کا مرکز حاصل کرنا شامل ہیں۔ سیلفی کلچر کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ منفی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتے لوگ سیلفی کلچر کے نتیجے میں اپنی ذات کا ارد گرد کے افراد اور فیس بک کے دوستوں سے موازنہ کرتے ہیں جو کہ کسی طور سے صحت مند نہیں ہے۔ سیلفی لینے کی عادت ان کے حقیقی رشتوں اور سماجی تعلقات کو بری طرح متاثر کر سکتی ہے۔ سیلفیوں کی ایک قسم "سیلفی اولمپکس" یا "ٹرک شوٹ سیلفی" ہے اور یہ غیر معمولی اور پر خطر حالات میں لی جاتی ہے۔ ۲۰۱۴ء کے شروع میں اس طرح کی سیلفیوں کے رجحان نے ٹوئیٹر پر زور پکڑا۔ سوشل میڈیا پر اگر لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق ردعمل نہ ملے تو وہ اپنی خود اعتمادی کی دولت کھو بیٹھتے ہیں۔ سیلفی لینے کا شوق بعض اوقات خطرے میں بھی ڈال سکتا ہے۔ مشہور شخصیات سے لے کر عام افراد تک اپنی تصویر کھینچنے کا عمل روزمرہ کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔

جدید معاشرے نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سیلفی کلچر کے حوالے کر دیا ہے اور افراد خود نمائی کا شکار ہوگئے ہیں۔ سیلفی کلچر کے عروج میں کئی عوامل کار فرما ہیں، جس میں سب سے پہلے اعلیٰ معیار کے کیمروں

کے فونز کی وسیع پیمانے پر دستیابی شامل ہے۔ سیلفی کلچر کے مثبت اور منفی دونوں طرح سے ہماری زندگی پر اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، مثبت طور پر دیکھا جائے تو افراد اپنے خیالات کا بہتر طور پر اظہار کر سکتے ہیں۔خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔اپنی تصویر لے کر آپ دوسروں کی رائے اپنے بارے میں جان سکتے ہیں۔ سیلفیز کی مدد سے اپنی زندگی کے لمحات کو قید کرسکتے ہیں۔اس کے ساتھ منفی پہلو سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

سادگی کی جگہ آج نمود و نمائش نے لے لی ہے، ہر چیز میں نمود و نمائش کا رجحان بڑھ رہا ہے۔لوگوں کے درمیان مقابلے کی فضا نے جنم لے لیا ہے۔ فیشن والا لباس ہو یا کہ خوبصورت گھر، زندگی کے ہر میدان میں دکھاوا واضح نظر آتا ہے ۔وہ لباس نمود و نمائش کے لئے پہنتا ہے، وہ اچھا کھانا بھی کھاتا ہے تو لازمی طور پر کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کو دکھایا جائے وہ موبائل کے ذریعے فوراً تصویر لے کر سوشل میڈیا پر ڈال دیتا ہے۔اس کا مقصد صرف اور صرف دوسروں پر رعب جمانا اور اپنے آپ کو بہتر زندگی گزارنے والا بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے، اس سے کئی منفی اثرات جنم لیتے ہیں۔ غریب افراد میں احساس کمتری کا رجحان بھی اسی نئی قدر کا نتیجہ ہے آج کے فرد نے اپنے آپ کو آسائشات کا بہت زیادہ اسیر کر لیا ہے۔اور انسان میں سطحی پن غالب آگیا ہے لوگ ظاہری شکل اور خود کو پیش کرنے پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ سیلفی کلچر ٹیکنالوجی، سوشل میڈیا اور انسانی نفسیات کے باہمی ربط کی عکاسی کرتا ہے۔

مغرب سے آنے والی سائنسی ایجادات نے انسان کو تن آسان بنا دیا ہے جب اس قدر آسائش ہو، دکھاوا ہو، جھوٹی شان و شوکت ہو تو معاشرے سے مثبت اور بڑی اقدار ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام نحوستیں دراصل مغرب کے ذریعے ہی مشرق میں آتی ہیں اور ادیب کے ہاں اس کا گہرا شعور موجود ہے۔انسان کا دنیا کے دوسرے علاقوں میں بسنے والے انسان سے کچھ تعلق پہلے بھی تھا، انسان دوسرے علاقوں کا رُخ کرتا تھا۔یہ اسفار دراصل خوراک کے حصول کے لئے کئے جاتے تھے ان سفروں کے پیچھے کوئی مہماتی مقاصد یا تفریح کی غرض و غایت شامل نہ ہوتی تھی۔ آج حالات یکسر بدل گئے ہیں زندگی بہت تیز رفتار ہو چکی ہے، ہر گزرتا سال ماضی بعید کی طرح پرانا دکھائی دیتا ہے۔ آج انسانوں کے مابین رابطہ تیز تر ہو گیا ہے ،انسان نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والے آلات دریافت کر لئے ہیں۔اب انسان عالمی گاؤں کا حصہ ہے جسے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک رونما ہونے والے واقعات کی خبر حاصل ہوتی ہے۔ سفری حالات یا سفری داستانیں سنانے کا رجحان کم ہو گیا ہے، اب لوگ خود انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔

آج کے ناول نگار بھی اس گزرتی ہوئی زندگی کے بارے میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بہت سے ناولوں میں ماضی پرستی کا رجحان نمایاں ہے۔

اس زمانے میں ماضی کی معاشرت کو بھرپور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔دراصل اس وقت ماحول پرُسکون تھا، آبادی کم ہونے کی وجہ سے شور کی آلودگی کم تھی لیکن آج کے دور میں آبادی بڑھ گئی ہے۔شہر بہت گنجان ہو چکے ہیں، ان حالات میں عصر حاضر کا فرد سکون کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے۔دیہاتی تہذیب جس میں بڑے بڑے کچے مکانات ہوا کرتے تھے اب بالکل بدل چکی ہے، اس پر بھی شہری زندگی غالب آتی جارہی ہے۔شہری زندگی کا شور، مصروفیت اور بے سکونی نے دیہاتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔رہن سہن کے طریقے پوری طرح بدل چکے ہیں، انسان آسائش کا گرویدہ ہو گیا ہے، گاؤں کی سخت زندگی کی بجائے تن آسانی عام ہوگئی ہے، مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کی جانب ڈاکٹر نذیر تبسم نے اپنے ایک مضمون میں بھی اشارہ کیا ہے:

> "ساری دنیا کے ایک عالمی گاؤں میں سمٹنے کے تصور نے مختلف اقوام کی تہذیبی شناخت پر کاری ضرب لگانا شروع کر دیا ہے۔انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔سٹیلائٹ کی سہولت اور سینکڑوں چینلز کی دستیابی نے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کی مخصوص مہکار کو مجروح کر دیا ہے۔"(۲۷)

آج جبکہ دنیا عالمگیریت کے باعث عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے تو اس سیلاب نے دوسرے ممالک کی مقامی تہذیب اور شناختوں پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں بلکہ عالمگیریت کے درِ پردہ مغربی تہذیب اور امریکیت غالب آتی جارہی ہے۔مقامی تہذیبوں کی کئی قدریں عالمگیریت کے اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی ہیں، اس دور میں بیماریوں کی کثرت ہے۔اب بڑی بڑی بیماریاں معمولی معلوم ہوتی ہیں، آج سے کچھ عرصہ پہلے آپریشن ایک بہت بڑی بلا سمجھی جاتی تھی۔

پرانی مگر سادہ تہذیب کو عمدہ الفاظ میں یاد کیا گیا ہے، آج جب حالات بہت خراب ہو چکے ہیں، نفسا نفسی نے ہر طرف ڈیرے ڈال لئے ہیں۔ڈاکٹر علاج کے نام پر غریب عوام کا خون چوستے ہیں، آج کا طبیب ڈاکٹر ہی ہے انسان تو بہت کم ہیں اسی طرح آج کے دور میں بیماریوں کی کثرت ہے۔آپریشن تو اب بہت معمولی کام ہے، لیکن کچھ عرصہ پہلے آپریشن ایک بڑی آفت کا نام ہوا کرتا تھا۔لوگ آپریشن کا نام سن کر گھبراتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بیماریوں میں اضافہ ہوتا گیا جبکہ پرانے وقتوں میں لوگ علاج کرتے

تھے اور شفا بھی مل جاتی تھی۔ آج انسان نے اپنے لئے جتنی بھی سہولیات تلاش کی ہیں زندگی جس قدر سہل بنائی ہے لوگوں کی اوسط عمر اسی نسبت سے کم ہوئی ہے۔ اُس عہد کا فرد آج کے پیچیدہ اور نفسیاتی مسائل سے بہت دور رہتے ہوئے زندگی بسر کرتا تھا۔ آج فرد طرح طرح کے مسائل میں الجھا ہوا نظر آتا ہے، زمانہ نہیں بدلا بلکہ ہمارے عہد کے لوگ بدل چکے ہیں۔ زمانہ اگر بدلا ہوتا تو وہی صبح اور شام آج نہ ہوتے:

"ہر چند آدمی کی زندگی اس وقت بھی ایک جیسی صبحوں اور شاموں سے ہو کر گزر رہی تھی، مگر سماجی اور معاشی مسائل چونکہ اس وقت اتنے پیچیدہ نہیں ہوئے تھے، اور نہ ہر وقت اس کے سر پر خود اپنے ہاتھوں بڑھائی ہوئی ضرورتوں کا بوجھ رکھا ہوتا تھا، لہٰذا کم از کم اپنے فرصت کے اوقات کو وہ اپنے یاروں، دوستوں سے خوش گپیوں، یا رشتہ داروں سے ملنے ملانے یا پھر بیوی بچوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں گزار کر اپنی شاموں کو بوجھل ہونے سے بچا لیتا تھا۔"(۲۸)

اس اقتباس میں بھی ماضی کو یاد کر کے دورِ حاضر میں انسان کو در پیش مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اگرچہ قدیم انسان کی زندگی میں وقت آج ہی کی طرح تھا لیکن اُس عہد کا فرد فرصت کے لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج کا فرد جو کہ گلوبل ویلج کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس کی زندگی مشکلات سے بھری پڑی ہے۔ فرد نے آسائش کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا ہے جس کی وجہ سے ضرورتوں کے پہاڑ منہ کھولے ہر وقت معاصر انسان کو ڈراتے ہیں۔ ان تمام معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے معاصر انسان صبح سے شام تک اس قدر سرگرداں نظر آتا ہے کہ اس کے پاس آرام کرنے اور ستانے کا وقت بالکل بھی نہیں ہے۔ جب سے موبائل ایجاد ہوا ہے اس نے فرصت کے لمحات چھین لئے ہیں، بلکہ اب دوستوں یاروں سے بالمشافہ ملاقات کی بجائے فون پر ہی بات کر لی جاتی ہے۔ مشاعروں والا زمانہ گیا اب شعراء حضرات بھی زیادہ تر شاعری سوشل میڈیا کے ذریعے ہی عوام تک پہنچاتے ہیں۔ اب فرد معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دو دو نوکریاں کرتا ہے جس سے اس کے اعضاء جلدی تھک جاتے ہیں۔ آج کے دور کا ایک اور بڑا مسئلہ ہمارے سامنے آیا ہے کہ انسان کتاب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

اب ٹیکنالوجی میں اس حد تک ترقی ہو گئی ہے کہ ٹی وی بھی ماضی کی یادگار معلوم ہوتا ہے۔ جتنا انسان نے سائنسی ترقی کر کے سہولت کے لئے اشیاء ایجاد کی ہیں وہ مثبت سے زیادہ منفی اثرات انسانی زندگی پر مرتب کر رہی ہیں، جیسا کہ موبائل نے انسان کی زندگی پر اَن مٹ نقوش مرتب کئے ہیں۔ عالمگیریت کا ایک سب سے بڑا نمائندہ موبائل ہے جس کے ذریعے ہماری مقامی اقدار معدوم ہو رہی ہیں جبکہ مغربی تہذیب غالب آتی

جا رہی ہے۔ شہروں کے پھیلنے اور دیہات سے نقل مکانی نے بھی حالات کو بہت حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ صبا اکرام نے جدید تہذیب کے اس مسئلے کو بھی واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے:

"دیہاتوں سے نقل مکانی کر کے شہروں میں آباد ہونے والوں کے درمیان آپس میں ویسا رشتہ قائم نہ ہو سکا جیسا کہ دیہاتوں میں تھا کیونکہ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کو ان کے پرکھوں کے حوالے سے جانتے تھے اور ان کی عزت و آبرو کو اپنی عزت اور آبرو سمجھتے تھے جبکہ صنعتی شہروں میں ایسا نہیں۔"(۲۹)

دیہاتوں سے نقل مکانی کی صورت میں کئی نئے مسائل نے جنم لیا ہے۔ اب جب شہروں میں لوگ منتقل ہوئے تو یہاں کے رواجات کے مطابق ایک کمرے والا اپنے ساتھ والے کمرے میں رہتے ہوئے فرد کو نہیں جانتا۔ گاؤں پورا ایک خاندان کی طرح ہوتا ہے، جہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن اب گاؤں میں بھی حالات تبدیل ہو گئے ہیں اور عالمگیریت کی لپیٹ نے وہاں بھی افراد کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا ہے۔ گاؤں میں رہنے والے جب اپنے آپ کو ایک خاندان سمجھتے تھے تو ایسے میں ہر فرد دوسرے کی عزت، آبرو، جان اور مال کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شہر کی ہوس پرستانہ زندگی میں متذکرہ بالا ایک بھی چیز دوسروں سے محفوظ نہیں ہے۔ اب تو مفکروں، افسانہ نگاروں کے ہاں یہ سوال جنم لے رہا ہے:

"اس وقت ہمارا سارا معاشرہ شہر اور دیہات کی آویزش سے گزر رہا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے چل کر وہ کیا شکل اختیار کرے گا؟ یعنی کیا دیہاتی کلچر نابود ہو جائے گا یا شہری تہذیب کی بے پناہ یلغار کے باوجود خود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو سکے گا۔"(۳۰)

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شہری کلچر دیہاتی کلچر پر غالب آ چکا ہے، شہری ہی کیا بلکہ مخصوص تہذیبیں اور ان کی ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو رہی ہیں۔ اس لئے عالمگیریت نے زندگی پوری طرح تبدیل کر دی ہے، اب گزرا ہوا ماضی ہمیں حسین معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر ناول نگاروں کے دل میں ایک خلش سی باقی ہے جو بار بار انہیں ماضی کو یاد کرنے پر اکساتی ہے۔ اُس دور میں اگر انسانی زندگی میں سہولیات کم تھیں لیکن زندگی پرسکون تھی، لوگ ضرورتوں کے اس قدر دیوانہ نہ تھے جنہوں نے آج معاصر انسان کو مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔ ماضی کی اچھی اقدار کی بجائے اب مادیت پرستی نے لے لی ہے اور آج کے ناول نگار کو اس کا گہرا شعور ہے۔

الف۔ پاکستانی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات:

سائنسی ترقی نے گاؤں کی پرسکون فضاء کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ وہاں پر بھی ہمیں جدید اشیاء کا استعمال نظر آتا تھا، پچاس کی دہائی یا اس سے قبل جو ناول نگار تھے انہوں نے اپنی تحریروں میں دیہی معاشرت کے خوبصورت مرقعے پیش کئے۔ بعد میں اس جہت پر تنقیدی و تحقیقی کام بھی ہوا، اس طرح اب تو اس ذیل میں بہت زیادہ کام ہو چکا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاصر ناول نگاروں کے ہاں بھی دیہات کے وہی فطری مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں یا ان میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ اب معاصر عہد میں مواصلات کے نظام نے اس قدر ترقی کی ہے کہ موبائل کا استعمال دور افتادہ دیہاتوں میں بھی عام ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اب موبائل فون نے بہت سی چیزوں کی جگہ لے لی ہے پہلے لوگ سورج کے طلوع و غروب وغیرہ سے وقت کا اندازہ لگاتے تھے لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ مختلف چیزوں نے وہ فطرت وہ ثقافت اور اقدار ہم سے چھین لیں۔

موبائل کے ساتھ ساتھ دوسری جدید ٹیکنالوجی سے دیہاتی لوگ فائدہ اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، دور کے دیہات میں بیٹھا ہوا شخص انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا سے رابطے میں رہتا ہے۔ اب گاؤں برائے نام دیہات رہ گیا ہے، عملی طور پر وہ بھی عالمی گاؤں کا حصہ بن چکا ہے۔ اب دور دیہاتوں میں بھی مشکل حالات میں جہاز دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک امداد لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ پاکستان میں آنے والی قدرتی آفات کے نتیجے میں پوری دنیا سے امداد آئی اور ساتھ دنیا کے کونے کونے سے ہیلی کاپٹر بھی آئے۔ ذرائع آمد و رفت کی اس برق رفتار اشیاء نے دنیا کو گلوبل ویلج بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے نذیر تبسم لکھتے ہیں کہ:

> "پوری دنیا مواصلاتی و اطلاعاتی انقلاب کی بناء پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس لئے پوری دنیا کی ثقافت اور تمدن بھی یکساں ہونا چاہیے۔ دنیا میں پائے جانے والی تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا جائے۔ ہر تہذیب کے ماننے والے دوسری تہذیبوں سے اچھی باتیں اخذ کریں اور انہیں اپنی زندگی میں جگہ دیں۔"(۳۱)

مواصلات اور اطلاعات میں ترقی نے پوری دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے، اب دور دراز کے علاقوں میں بھی جدید اشیاء اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال نظر آتا ہے۔ اب دنیا کے زیادہ تر علاقے گلوبل ویلج کا حصہ ہیں، بذریعہ انٹرنیٹ یہ علاقے بھی دنیا کے ترقی یافتہ علاقوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جب جو معلومات درکار

ہوں آسانی کے ساتھ حاصل کی جاسکتی ہیں، علم تک رسائی بہت آسان ہو چکی ہے اب یہ فرد پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر مثبت انداز سے کام لیتا ہے: "سائنسی ترقی نے زمینی فاصلوں کو مٹا دیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتاری نے ذہنی اور جسمانی فاصلے کم کر دیئے ہیں۔"(۳۲)

معاشرتی سطح پر ہونے والی ان تبدیلیوں کا بہترین عکاس ہمارے عہد کا ناول ہے۔ ہمارے ناول نگاروں نے جدید تہذیب کے نشانات کو اپنے ناولوں میں پرو دیا ہے۔ سوشل میڈیا اور دوسرے تمام ذرائع سے آج بہت زیادہ لوگوں کی رسائی ہے یہ سہولتیں اب زیادہ تر دیہاتوں میں بھی میسر ہیں۔ لوگ براہ راست کسی بھی جگہ پر بیٹھ کر دنیا کے دوسرے کونے میں کال کر سکتے ہیں۔ بات کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، معاصر ناول نگاروں کے ہاں اس کا گہرا شعور ملتا ہے کہ اس کے عہد میں پرانی قدریں مٹ رہی ہیں اور نئی تہذیب جنم لے رہی ہے۔ جس میں فرد کو سہولتیں تو بہت حاصل ہیں لیکن ان کے نقصانات بھی بہت ہیں۔ آج سائنسی میدان میں انسان ترقی کے بڑے بڑے قدم اٹھا رہا ہے، گزرا ہوا کل ٹیکنالوجی کے لحاظ سے آج کے مقابلے میں ماضی بعید نظر آتا ہے۔ کوئی نئی چیز ایجاد ہونے کے بعد سائنسدان ایجادات میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ تبدیلیاں بڑی تیزی کے ساتھ رونما ہو رہی ہیں۔ پرانی تہذیب کے نشانات آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں اور ان کی جگہ نئی تہذیب لے رہی ہے۔ اس کے بھرپور عکاس حمید شاہد کے ناول ہیں، حمید شاہد کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> "اکیسویں صدی کی چھوٹی قوموں کے افراد جو اپنے گرد وپیش کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت، لسانی و علاقائی شناخت، مخصوص روایات و اقدار کو ایک بے ہنگم اور بے شکل و صورت منصوبے کے بلیک ہول میں گرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔"(۳۳)

اس اقتباس میں ایک بڑے اہم نکتے کی طرف اشارہ موجود ہے کہ مقامی تہذیبیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں، ان کی اقدار مٹ رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی اقدار نے لے لی ہے۔ اس المناک صورتحال کو عصرِ حاضر کے ناول نگار نے محسوس کرتے ہوئے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا مٹی کا دیا اور لکڑی سے چراغ بنا کر کام لیا جاتا تھا، اب شہروں میں ہی کیا دور دیہاتوں میں بھی بجلی کی سہولت میسر ہے۔ وہاں پر مواصلات کا نظام بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے اس طرح ہر لحاظ سے دیہاتی علاقے بھی دنیا کے دوسرے کونوں سے انٹرنیٹ کے طفیل مل چکے ہیں اور یہ دنیا واقعی گلوبل ویلج نظر آتی ہے۔ اب بلوچستان کے متعلق ہی کچھ عرصہ پہلے فردوس انور قاضی کی رائے تو یہ تھی:

"اگر غور کیا جائے تو ادب کے حوالے سے نہ صرف بلوچستان بلکہ قومی سطح پر بھی بعض پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو قومی زندگی سے بے خبر ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اندھا دھند دوڑ نے اس بے خبری کو چار چاند لگانے کا کام کیا ہے۔"(۳۴)

فردوس انور قاضی نے بلوچستان کے دیہاتوں میں ہونے والی تبدیلی کی تائید کی ہے اور معاصر ناول نگار بھی اب اپنے آپ کو عالمی گاؤں کا حصہ تصور کرتے ہوئے عالمی موضوعات کو ناول کا موضوع بناتے ہیں۔ سماج کی سطح پر ہونے والی تمام تبدیلیوں کا اس کو بھرپور احساس ہوتا ہے پھر وہ ان تبدیلیوں کو اپنے ناول میں برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب ناول نگاروں کے ہاں یہ بات نظر آتی ہے کہ شہر اور دیہات کا فرق مٹ رہا ہے شہری تہذیب دیہات پر بھی غالب آتی جا رہی ہے۔ شہری زندگی جو کہ مصنوعی ہے اس کے اثرات نے دیہاتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس لئے ناول نگار کے لئے اب دیہات کی فطرت نگاری سے دیہی معاشرت پر جدید تہذیب کے ذریعے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی نظر آتی ہے۔ آج کا انسان اگرچہ سفر نہ بھی کرے تو اس کے پاس دور دراز ملکوں کی معلومات موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح ناول نگاروں نے گاؤں کی تہذیب پر جدید معاشرت کے اثرات کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کی سطح اور زندگی پر اثرات مرتب کرتی ہوئی جدید ٹیکنالوجی کے بیان سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیہات کی زندگی اب برائے نام دیہات رہ گئی ہے۔ آج زیادہ تر گاؤں گلوبل ویلج کا حصہ بن چکے ہیں، اس دعویٰ کے شواہد مندرجہ بالا بحث میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

کاروانِ وجود:

کاروانِ وجود نثار عزیز بٹ کا ناول ہے جو احمر اشر پبلشرز کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ کاروانِ وجود ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے، کاروانِ وجود بھی نثار عزیز بٹ کے گزشتہ ناولوں کی طرح تقسیمِ ہند کے تناظر میں آگے بڑھتا ہے۔ نثار عزیز بٹ کے ناول کاروانِ وجود میں ہمیں کہانی کہنے کی کوشش نظر آتی ہے، جبکہ دوسری طرف علمی مباحث سے گریز ناول میں دلچسپی پیدا کرتی ہے۔ ناول میں سارہ کا کردار ثمر کی دوست کا ہے اور یہ کردار ناول میں مختلف مقامات پر ثمر کے ساتھ دکھائی دیتا ہے کیونکہ ثمر چوری چھپے سارہ کے شوہر سے نکاح کر لیتی ہے اور دونوں یہ بات سارہ سے مخفی رکھتے ہیں۔ ناول میں سارہ کا کردار ایک بھولی بھالی لڑکی کا ہے جو ذہنی کُرب میں مبتلا نسل کی عکاسی کرتی ہے وہ روحانی سکون کے لیے مذہب کی طرف رُجوع کرتی ہے اور وہ انگلینڈ میں مختلف کانفرنسز میں جاتی ہے۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد وہ کراچی واپس آنے کے لیے ایئر

پورٹ آتی ہے مگر اُسے پتہ چلتا ہے کہ لندن کے علاوہ اور کہیں سے ہوائی جہاز نہیں آئیں گے سب راستے بند ہیں تو وہ متبادل راستے کا انتخاب کرتی ہے:

"لندن پہنچنے پر اسے پی آئی اے کا دفتر بند ملا۔ اس لئے اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ دوسرے روز کے جہاز پر بھی جا سکے گی کہ نہیں۔ رات بھر لندن کے ایک ہوٹل میں برطانوی خزاں کی سردی میں بجلی کے ہیٹر کی روشنی، میں سارہ بیداری اور غنودگی کی سرحد پر منڈلاتی رہی۔"(۳۵)

عالمگیریت کے زیرِ اثر آجانے سے آمدورفت میں بھی بہتری آنے لگی، فاصلے سمٹ کر دنوں سے گھنٹوں میں بدل گئے۔ سارہ میلوں دور ہونے کے باوجود اپنے گھر والوں کی خیریت سے آگاہ رہتی ہے اور اس کے ساتھ جدید تہذیب کے نشانات میں ہوائی سفر بھی ہے کہ کیسے پہلے وقتوں میں لوگ میلوں پیدل یا بیل گاڑیوں پر سفر کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میلوں کا سفر منٹوں میں طے ہونے لگا۔

دھنی بخش کے بیٹے:

دھنی بخش کے بیٹے حسن منظر کا دوسرا ناول ہے جو ان کے پہلے ناول العاصفہ کے دو سال بعد ۲۰۰۸ء میں شہرزاد پبلی کیشنز کراچی سے شائع ہوا۔ یہ ناول کل ۵۷۹ صفحات پر مشتمل ہے، یہ ناول اپنے وسیع کینوس، موضوعاتی تنوع، جدید وقت کے مسائل سے آگاہی دیتا ہے۔ یہ پسیتے طبقوں کی آواز بنتا اور بڑھتی تہذیبی کشمکش کو عیاں کرتا مصنف کا نمائندہ ناول ہے۔ دھنی بخش کے بیٹے کے مصنف حسن منظر نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں ناول کی کہانی بیان کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار دھنی بخش کا چھوٹا بیٹا ہے، جو کہ حساس طبیعت کا مالک ہے لیکن عملی طور پر ایک کمزور کردار ہے جو اپنے اِرد گرد کے حالات کو بدلنا چاہتا ہے مگر گھر کے باقی معاملات کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں۔ اپنے ماحول سے بھاگ کر وہ امریکہ چلا جاتا ہے اور ایک غیر مذہب لڑکی اولا سے شادی کر لیتا ہے بچوں کے بڑے ہونے پر وہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے اور وطن واپس آجاتا ہے۔ علی بخش دھنی بخش کا دوسرا بیٹا ہے، اُس میں جاگیر داروں والی تمام برائیاں موجود ہیں وہ شراب اور عورتوں کا شوقین ہے۔ اُس نے بہت سی شادیاں کی ہوئی ہیں۔ احمد بخش جب واپس اپنے گاؤں لوٹتا ہے تو وہ اپنے لیے حویلی میں کچھ انتظامات کرتا ہے کیونکہ باہر جانے کی وجہ سے وہ کچھ آسائشات کا عادی ہو چکا ہے۔ شہروں کی دیکھا دیکھی گاؤں میں بھی لوگوں نے جدید سہولیاتِ زندگی کو اپنانا شروع کر دیا ناول میں اس کی مثال حویلی میں جدید طرز پر مشتمل غسل خانہ ہے جو کہ احمد بخش نے اپنے لیے حویلی میں بنایا:

"قصبے میں ڈرینج سسٹم کے نہ ہونے کے باوجود اس میں احمد بخش نے فلش لگوا رکھا تھا جس کا پانی نیچے soak pit میں مرتا ہوگا۔ ویسے غسل خانہ موڈرن تھا۔ اس کی ہوا صاف رکھنے کے لیے باہر کی اتنی کھلی زمین کی فیاضی، دیکھنے والا کہتا، صرف دیہات ہی میں ممکن تھی اور وہ بھی ایک زمیندار کے گھر میں۔"(۳۶)

احمد بخش امریکہ میں رہنے کی وجہ سے اپنے علاقے میں بھی کچھ بنیادی سہولتوں کو لانا چاہتا ہے اِس اقتباس میں مصنف نے اُس کے جدید سہولتوں کا عادی ہونے کی وجہ سے گاؤں میں ڈرینج سسٹم کو متعارف کروانے کی وضاحت کی ہے۔ یہاں پر طبقاتی تقسیم بھی واضح نظر آتی ہے۔ دیہاتی حوائجِ ضروریہ کے لیے کھیتوں کا رُخ کرتے ہیں اور احمد بخش نے اپنے گھر میں فلش لگوا رکھا ہے جس میں ہوا کا نظام بھی موجود ہے۔

روشن اندھیرے:

روشن اندھیرے امجد جاوید کا ناول ہے جو ۲۰۱۰ء میں علم و عرفان پبلشرز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ یہ ناول کل ۴۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ امجد جاوید نے اپنے ناولوں میں معاشرے کی اصل تصاویر پیش کی اور برائیوں کو بے نقاب کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ انہوں نے ایک جرأت مند اور بہادر عورت کو متعارف کرایا، جو اس وقت کی آواز ہے۔ امجد جاوید نے تاریخ، رومانس، حب الوطنی اور موجودہ اُمور پر لکھا، جس نے ان کی کتابوں کو زیادہ کارآمد بنا دیا۔ ناول کا مرکزی کردار شجاع ہے جو پیشے کے حساب سے صحافی ہے ناول میں موجود تمام کردار اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ شجاع کا کردار ناول میں ہر جگہ موجود رہتا ہے، وہ ایک نیوز کے ادارے میں کام کرتا ہے جہاں اس کی ساتھی ماریہ ہے جس سے اس کی ہمیشہ اَن بن رہتی ہے۔ دونوں کسی نہ کسی بات پر ناول میں لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، ماریہ دل ہی دل میں شجاع کو پسند بھی کرتی ہے۔ شہروں میں لوگ آفس اور گھروں میں گرمی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایئر کنڈیشنز کا استعمال کرتے ہیں۔ شہروں کی طرز پر دیہاتوں میں بھی جہاں جہاں بجلی موجود ہے وہاں پر لوگوں نے جدید طرز سہولت کو اپنایا۔ جدید سہولت کے باعث جہاں ایک طرف زندگی تن آسان ہوگئی تو دوسری طرف کافی پیچیدگیاں بھی جنم لینے لگی۔ جس کی وجہ سے ہماری ثقافت میں بحران آنے لگا کیونکہ جو اقدار ہماری ثقافت کا حصہ تھیں وہ مٹنے لگیں یا اُن میں بھی زوال آنے لگا:

"ایئر کنڈیشنر سے کمرے کا ماحول خاص یخ ہو رہا تھا۔ میں سلام میں پہل کرتا ہوا اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

" فرمایئے۔!۔"

ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ریسور اُٹھالیا۔" (۳۷)

جدید تہذیب میں سہولتوں سے فائدہ اُٹھانا ایک عام بات ہے، ائیر کنڈیشنر کی موجودگی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ عام شخص زندگی کی سہولتوں سے واقف نہیں ہے جب اُسے کوئی شخص جدید سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا نظر آتا ہے تو یہ اُس کے لئے حیران کُن بات ہے۔

صفر سے ایک تک:

صفر سے ایک تک مرزا اطہر بیگ کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ "صفر سے ایک تک میں "مرزا اطہر بیگ نے سائبر سپیس کے منشی کی سرگزشت بیان کی ہے۔ کمپیوٹر کو ایک زندہ کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی کہانی کا مرکزی کردار ذکی ہے، جو کہ کمپیوٹر جینئس ہے اور گاؤں میں موجود اپنے والد کو بھی کمپیوٹر لے دیتا ہے تا کہ وہ اپنا تمام کام آسانی سے کر سکے۔ منشی کے چھوٹے بیٹے ذکی کے گرد ناول کی تمام کہانی گھومتی ہوئی نظر آتی ہے ناول کا مرکزی کردار ذکی ہے اور ناول کی ہیروئن زلیخا جو ناول میں مخصوص منظر پر نمودار ہوتی ہے اور اُس کے بعد تمام کہانی میں ذکی اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو بذریعہ انٹرنیٹ ہی ہوتی ہے۔ ناول میں جدید تہذیب کی مثال گاؤں میں موجود ذکی کا باپ ہے جو کہ منشی کے پیشے سے منسلک ہے اور وہ اپنی تمام فائلوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ذکی کے لائے ہوئے کمپیوٹر کی مدد لیتا ہے۔ صفر سے ایک تک منشی کی سرگزشت ہے جس کے دو بیٹے ہیں۔ منشی کا چھوٹا بیٹا ذکی جو کہ سالار فیملی کے بیٹے فیضان کے ساتھ پڑھائی کے لیے شہر چلا جاتا ہے اور وہاں پر ایک طرح سے وہ اپنے باپ کے کام کو ہی آگے چلاتا ہے۔ ذکی کو چونکہ کمپیوٹر میں دلچسپی ہے اس لیے وہ اپنے باپ کو گاؤں میں بھی منشی گیری کا تمام کھاتہ کمپیوٹر پر منتقل کرنے کے لیے کمپیوٹر لا دیتا ہے۔ چونکہ گاؤں کی زندگی سادہ ہوتی ہے اس لیے وہاں پر ذکی کے باپ کے لیے کمپیوٹر بالکل ایک نئی چیز تھا جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

"اسی موقع پر انہوں نے بیسویں صدی کے نصف آخر کی حیرت انگیز ایجاد کا ذکر کیا اور یوں پہلی دفعہ ہمارے گھر میں باقاعدہ کمپیوٹر کا نام لیا گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ والد صاحب کمپیوٹر کے نام سے ہی ناآشنا تھے وہ جانتے تھے کہ بجلی سے چلنے والی ایک ایسی مشین ہے جو کروڑوں اربوں کی رقموں کے حساب کتاب چٹکیوں میں کر دیتی ہے اور بڑے شہروں میں واپڈا

والے بجلی کے بل اِس مشین سے بنواتے ہیں لیکن اتنی معلومات کی بنیاد پر اُن کے ذہن
میں یہ عجیب ساتصور بناہوا تھا کہ دراصل یہ مشین ہڈ حرام لوگوں نے ایجاد کروائی ہے
اور جو کام انسانوں کے کرنے کے ہیں وہ مشین کے سر ڈال کر خود عیش کرتے پھر رہے
ہیں۔" (۳۸)

گلوبائزیشن کے زیرِ اثر تمام ممالک میں کمپیوٹر سے استفادہ حاصل کرنا ایک عام سی بات ہے۔لیکن زیرِ مطالعہ ناول میں اس کا استعمال ہڈ حرام ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ذکی کے باپ کا خیال ہے کہ وہ کام جو انسان اپنی عقل اور محنت کے بل بوتے پر کرلیتا تھا اُس کے لیے وہ مشین کا محتاج ہو کر رہ گیاہے اور اپنے کام مشین سے لے کر وہ عیش کر رہاہے۔ذکی کے باپ کو کمپیوٹر سے کافی حد تک واقفیت ہے، وہ سمجھتاہے کہ یہ مشین کروڑوں، اربوں کی رقموں کے حساب جلد کر دیتی ہے اس لیے یہ انسان کو عیش پسند بنا دیتی ہے۔اس سوچ کے باوجود وہ کمپیوٹر میں اپنا تمام کام کرتا ہے۔

نولکھی کوٹھی:

نولکھی کوٹھی علی اکبر ناطق کا پہلا ناول ہے جو ۲۰۱۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۴۳۲ صفحات پر مشتمل اس ناول میں وسطی پنجاب کی تہذیب و ثقافت بہت باریک بینی سے بیان کی گئی ہے۔منظر کشی اتنی باریک ہے کہ قاری اپنے آپ کو ان جگہوں پر گُھومتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔"نولکھی کوٹھی" کا مرکزی کردار انگریز افسر ولیم ہے جس نے انگریز افسروں کے اندازِ حکمرانی کو پیش کیاہے۔ولیم دیسی لوگوں کی اصلاحات کے لیے مختلف کام کرتا ہے جس کی وجہ سے اِس کے افسر اُس سے نالاں رہتے ہیں۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی انگلینڈ جانے سے انکار کر دیتاہے۔کیونکہ اُسے نولکھی کوٹھی سے پیار ہوتا ہے، مگر اُس کی نولکھی کوٹھی ایک پیر کو الاٹ کر دی جاتی ہے۔ناول میں ولیم کا کردار ایک اثر ورسوخ رکھنے والے انگریز افسر کا ہے، جس کی تعیناتی ہندوستان میں ہوتی ہے۔اُس کا کردار ناول میں ایک جاندار کردار کے طور پر سامنے آتا ہے اور وہ انگلینڈ سے پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن اور اپنی نولکھی کوٹھی میں واپس آتا ہے۔نولکھی کوٹھی جدید تہذیب کی عمدہ عکاسی کرتی ہے:

"چھت پر لٹکے ہوئے فانوس اور اُن کے درمیان بجلی کے پنکھے ڈائننگ ہال کو ایک نوابی شان
سے دوچار کرتے تھے، بجلی رینالہ بجلی گھر بن جانے سے کافی مقدار میں دستیاب تھی۔اِس
لیے بعض اور بھی چیزیں بجلی پر چلنے والی مہیا کی گئیں۔جن میں سے اکثر اِسی ڈائننگ ہال اور

ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔ مثلاً گراموں فون، ریکارڈر سسٹم، بھاپ دان، کھانا پکانے کے لیے ہیٹر اور اِسی کی بیشتر چیزیں۔ ڈائنگ ہال میں بچھا ہوا قالین بھی اپنی مثال آپ تھا، جو سپیشل نواب صاحب آف بہاولپور نے جانسن صاحب کو اُن کی بہاولپور ریاست میں تعیناتی پر تحفہ دیا تھا۔"(۳۹)

جدید تہذیب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ولیم کی کوٹھی اِس کی نمایاں مثال ہے جہاں پر موجود ہر چیز اِس بات کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ بجلی کافی مقدار میں دستیاب ہونے کی وجہ سے بجلی کی ہر چیز جن میں گراموں فون، ریکارڈ سسٹم، بھاپ دان اور کھانا پکانے کے لیے ہیٹر اس میں شامل ہیں۔ نواب آف بہاولپور کی طرف سے دیا ہوا قالین بھی اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن گاؤں میں موجود باقی لوگوں تک ان سہولتوں کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی ہے۔

ناتمام:

عاصم بٹ کا ناول ناتمام سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا، جو کل ۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناتمام ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے جہاں مردوں کو غیر معمولی اور بے جا بالادستی حاصل ہے، اور جہاں بے سہارا عورتوں کی روداد درد انگیز ہے۔ ناتمام ناول عاصم بٹ کی کاوش ہے جس میں انھوں نے ایک عورت کی اُن تمام ناتمام آرزوں کا ذکر کیا ہے، جس کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ اپنی اقدار کو بھی بھول جاتی ہے مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا اور آخر میں وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں اندرونِ لاہور کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ صائمہ ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے گرد تمام کہانی اور کردار گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ صائمہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنی تمام محرمیوں سے سمجھوتہ نہیں کر پاتی اور ایک محلے کے لڑکے سے دوستی کر لیتی ہے۔ دوسروں کو عیش کی زندگی بسر کرتے دیکھ کر وہ بھی اپنی زندگی عیش سے گزارنا چاہتی ہے۔ صائمہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں ناجائز تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ شہری زندگی پر جدید تہذیب کی بہت سی مثالیں بآسانی ناول میں دیکھی جاسکتی ہیں، پہلے لوگ گھروں میں گرمی سے بچنے کے لیے ہاتھ سے بنے پنکھے کا استعمال کرتے تھے لیکن جیسے جیسے ٹیکنالوجی کا استعمال عام ہونے لگا شہروں کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی بجلی کی باآسانی دستیابی نے لوگوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی زندگی کو آرام دہ بنا سکیں۔ اور ہر گھر میں پنکھا عام سی بات ہونے لگا اب تو لوگوں کے گھروں میں اے سی بھی موجود ہیں اور یہ تمام چیزوں کے

اثرات ہماری ثقافت پر بھی پڑے۔ ناول میں جدید تہذیب کی مثال کلینک کی ہے جہاں بچے سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ اپنی دوست نسرین کا سہارا لیتی ہے:

"کچھ دیر کی خاموشی نے جیسے تینوں کو اس ماحول سے موافق ہو جانے پر آمادہ کر لیا۔ نرس اپنی جگہ سے اٹھی اور ریگولیٹر کا سوئچ گھما کر پنکھے کی رفتار تیز کی۔ وہ گھوں گھوں کی بھاری آواز سے زیادہ ہوا پھینکنے لگا لیکن ساون کے حبس کا علاج پنکھے کے بس میں نہیں تھا۔"(۴۰)

گاؤں کے کچھ گھروں میں بجلی موجود ہے، زیادہ تر لوگ ہاتھ سے بنے پنکھے کا استعمال کرتے تھے۔ بجلی کے آجانے سے لوگوں کی زندگی میں آسانی آگئی ہے۔ پہلے بچے گھر میں دائیوں کے ہاتھوں میں پیدا ہوتے تھے لیکن اب کلینک بن جانے سے یہ کام ڈاکٹر اور نرسیں کر رہی ہیں۔

میر واہ کی راتیں:

میر واہ کی راتیں کراچی کے معروف قلم کار رفاقت حیات کا یہ پہلا شاہکار ناول ہے، یہ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ میر واہ کی راتیں موضوع اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے دلچسپ اور لطف کا حامل ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے سندھ کے قصبے کا منظر بیان کیا ہے اور اپنے قاری کو ایک ایسے نوجوان کی کہانی سنائی ہے جس کے گھر والے اُس کی حرکتوں سے تنگ آکر اُس کو چچا کے گھر بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے چچا سے درزی کا کام سیکھ سکے، لیکن وہاں جا کر بھی اُس کی حالت میں کوئی سُدھار نہیں آتا۔ نذیر اپنی جنسی تسکین کے لیے گاؤں میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے جس دوران قاری کو گاؤں کی زندگی کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ دیہات میں جہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں ذرائع آمدورفت میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں جن کی وجہ سے اب دیہات کی آب وہوا میں وہ صفائی باقی نہیں رہی۔ رفاقت حیات نے دیہات کی آب وہوا یا زندگی کا منظر کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو وہاں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ گاؤں کے گھروں اور بسوں کے ڈیزل کے دھوئیں نے مل کر گاؤں کی فضا کو آلودہ کر دیا ہے۔ ناول "میر واہ کی راتیں" میں دیہات کا تصور آتے ہی ایک ایسا تخیلی خاکہ ذہن میں آتا ہے جہاں سادگی ہے اور ریاکاری کا دور تک گزر نہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور جدید تہذیب کے رجحانات کی وجہ سے یہاں بھی بہت سی برائیوں نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں جن میں ایک وہاں پر موجود مے خانہ ہے جس کی جانب مصنف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تاریک گلیوں میں چلتے ہوئے قصبے کے شمال میں واقع ایک مے خانے میں پہنچے۔ نذیر اچھی طرح جانتا تھا کہ اندرونِ سندھ کے بیشتر گوٹھوں اور قصبوں میں ایسے مے خانے عموماً مزاروں اور در

گاہوں کا حصہ ہوتے ہیں، مگر اس کے علاوہ بھی کئی جگھوں پر قابلِ تعظیم سادات گھرانے کے متعقدین کی بڑی تعداد نے پنجتن پاک سے منسوب مخصوص نشان سے آراستہ بڑے بڑے سیاہ علم لگا کر ایسے مے خانے قائم کر رکھے ہیں۔"(۴۱)

جدید تہذیب کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی بدولت ہمارے معاشرے میں بہت سی برائیوں نے جنم لیا ہے جن میں ایک قابلِ ذکر مے خانوں کا قیام ہے۔ اندرونِ سندھ کے گوٹھوں اور قصبوں میں چھوٹے چھوٹے مے خانے موجود ہیں۔ اس اقتباس میں گاؤں میں کھلے مے خانوں کا ذکر ہے جو کہ جدید تہذیب کی پیداوار ہیں۔ دیکھا جائے تو گاؤں کے ماحول میں مے خانے کا تصور موجود نہیں ہے، مگر ناول میں گاؤں کے بااثر لوگوں نے مذہب کی آڑ لیتے ہوئے مے خانے بنا لیے ہیں۔

کوہِ گراں:

کوہِ گراں خالد فتح محمد کا ناول ہے جو ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا، جس کا بنیادی موضوع ایک گاؤں ہے جو قحط سالی کی وجہ سے اُجڑ چکا ہے۔ جہاں دور دور تک پانی ملنے کے امکانات نہیں ہیں۔ اپنے ناول "کوہِ گراں" میں خالد فتح محمد نے اُجڑے ہوئے گاؤں کی منظر کشی کی ہے اور ساتھ ہی اُس کی آبادکاری کا بھی تفصیل سے بتایا ہے۔ مرکزی کردار حلیم قحط سالی سے گاؤں کی تباہ کاری سے دوبارہ آبادکاری کا ذکر کرتا ہے حلیم کا گاؤں میں لوٹنے کا واحد مقصد گاؤں آباد کرنا ہے۔ چودھری حلیم ناول کا نمائندہ کردار ہے جس کا وجود ناول میں جگہ جگہ ملتا ہے، اس کا گھرانہ گاؤں میں اپنا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ گاؤں کے اُجڑنے کے بعد چودھری گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے گاؤں میں آتا ہے، اور وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرتا ہے کہ کس طرح گاؤں کو دوبارہ آباد کیا جائے۔ گاؤں میں سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بہتر سہولیات کے لیے شہروں کا رخ کرتے تھے۔ شہروں سے جب لوگ واپس اپنے بزرگوں کے پاس آتے تھے تو ایسے گاؤں میں بھی شہروں سے آنے والے لوگوں کی دیکھا دیکھی بہتر سہولیات کا رجحان بڑھا اور لوگوں نے اپنے رہن سہن میں تبدیلیاں لانی شروع کی۔ چودھری حفیظ نے جب گاؤں کو دوبارہ سے آباد کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی تو اس میں یہ طے پایا کہ لوگ مویشی اپنی زمینوں پر لے جائیں گے۔ ایسے بے مالکی والے لوگ جو مویشی پالتے ہیں وہ بھی کسی کے ساتھ رکھ لیں گے۔ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہو گا اس کے لیے صرف لوگوں کو سمجھانا پڑے گا۔ باقی رہ گیا فضلہ، تو ہر گھر میں غسل خانہ ہو گا جہاں ڈبلیو سی بھی ہو گی۔ یہاں بھی لوگوں کو تربیت دینا ہو گی۔ ناول میں اس کی مثال یا عکاسی کچھ یوں ملتی ہے:

"وقت گزرنے کے بعد گھروں میں غسل خانے اور ڈبلیو سی متعارف ہو گئے لیکن باہر فارغ ہونے والے ختم نہیں ہوئے، اُن کی تعداد میں کچھ کمی ضرور آئی۔ گاؤں کو فضلے سے پاک رکھنے کے لیے ہر گھر میں ڈبلیو سی اور نکاس کا زیر زمین بندوبست کرنا ہو گا۔ گلیوں میں نالیاں ختم کر دی جائیں گی تاکہ لوگ صحن دھو کر پانی گلیوں میں نہ نکال سکیں۔ بارش کے پانی کے لیے ایک نالہ تعمیر کیا جائے گا جو پانی کو گاؤں سے باہر لے جائے۔" (۴۲)

زیرِ مطالعہ اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ گاؤں کی بہتری کے لیے غُسل خانے بنانے ہوں گے۔ گندے پانی کے نکاس کے لیے نالے کی تعمیر اور گاؤں کو فضلے سے پاک رکھنے کے لیے زیرِ زمین بندوبست یہ سب کچھ پہلے سے نہ تھا جو کہ جدید تہذیب ہی کی بدولت ہے۔ شہروں سے گاؤں منتقل ہونے کی وجہ سے لوگ وہاں کی سہولتوں کو گاؤں میں لانے کے خواہاں ہیں تاکہ وہ بہتر زندگی گزار سکیں۔

دشتِ وفا:

بلوچستان سے تعلق رکھنے والے معروف ناول نگار اور افسانہ نگار آغا گل کا ناول "دشتِ وفا" ۲۰۱۷ء میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوا۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ناول کی کہانی کے آغاز میں ہماری ملاقات چند ایسے ہم جماعت و ہم خیال نوجوانوں سے ہوتی ہے، جن کے روشن مستقبل کے خواب صوبہ بلوچستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی ابتری کے سبب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ "دشتِ وفا" پہلے "دشت میں سفر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اولین اشاعت میں یہ رومانوی المیے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جب اس کا دوسرا ایڈیشن آیا تو رومانوی کہانی سے ہٹ کر اس کہانی کے اندر بلوچستان میں سن ستر کی دہائی میں اُٹھنے والی بغاوت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ آغا گل کے ناول دشت وفا میں جدید تہذیب کے واضح نشانات ملتے ہیں کہ کس طرح پاکستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کی نمایاں چھاپ نظر آتی ہے۔ ہمارے معاشرے پر جدید تہذیب کا بہت گہرا اثر ہے۔ عورت جس کو ہمیشہ وفا کی دیوی دکھایا گیا ہے، اس ناول میں ہر حد کو پار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناول میں رُخسانہ اور نجیب کا کردار ہیرو، ہیروئن کا ہے جو کہ ناول کے بنیادی کردار ہیں۔ قاضی نجیب کا دوست ہے، نجیب سے پہلے رخسانہ اس کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے اور بہتر مستقبل کی لالچ میں وہ قاضی کو چھوڑ کر نجیب کی محبت کا دم بھرتی نظر آتی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا اثر ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے رہنے کے انداز، ہمارے ملبوسات، کھانے پینے کے طور اطوار پر بھی پڑا ہے اور ناول میں رخسانہ، قاضی اور خورشید اس کی عمدہ مثالیں ہیں جو اکثر مقامات پر رات گئے پارٹیوں میں شراب پیتے ہوئے نظر آتے ہیں جو کہ ہماری ثقافت کا حصہ نہیں اور اس کے

ساتھ ساتھ رخسانہ اور اس کے دوستوں کے کپڑے بھی اس کی عمدہ مثال ہیں جو کہ ہماری ثقافت میں بحران کا سبب بنتے ہیں۔ دوستوں کی پارٹیاں اور اس میں لڑکے، لڑکیوں کے کھلے عام رات گئے تک ملاقاتیں اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکے لڑکیوں کا شراب پینا یہ تمام چیزیں جدید تہذیب کی نمایاں مثالیں ہیں:

> "قاضی اور نجیب نے ڈغڈغا کے پی تھی۔ سلور کی چھوٹی بوتل نجیب نے جیکٹ کے اندر رکھی ہوئی تھی۔ قاضی نے ہوش وحواس سنبھال رکھے تھے۔ ساتھ ہی ادرک کا قتلہ منہ میں رکھ لیا تھا۔ مبادا اس کے سانس ہی نے رخسانہ کو سب کچھ بتا دے۔"(۴۳)

زیرِ مطالعہ اقتباس میں قاضی اور نجیب کو شراب نوشی کرتا ہوا دکھایا گیا ہے جو کہ ہمارے معاشرے میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ شراب نوشی مغربی تہذیب کا خاصہ ہے اور ہماری ثقافت بھی مغربیت سے متاثر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مخلوط پارٹیوں میں جدید تہذیب کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے ہماری تہذیب زوال پذیر ہے۔ ہر شے تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے وقت کے ساتھ جدت کو اپناتی نظر آتی ہے۔ ہر معاشرے کی کچھ اقدار ہوتی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے جدت کو اپنایا جاتا ہے۔ شرم وحیا ہمارے معاشرے کی ایک اہم قدر ہے لیکن رخسانہ کا کردار اس قدر کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

محمد حفیظ کا ناول ادھ ادھورے لوگ پہلے سرائیکی میں لکھا گیا اور پھر بعد میں شہرت اور پسندیدگی کی وجہ سے خود اس کا اردو زبان میں ترجمہ شائع کیا، یہ ناول ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ ناول کا موضوع ریاست بہاول پور ہے۔ محمد حفیظ خان نے اس ناول میں معاشرتی جبر، فرقہ واریت، عورتوں کے حقوق کی پامالی، انتہا پسندی، تقسیم کے بعد ہونے والے فسادات اور ون یونٹ کے قیام کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا ہے۔ محمد حفیظ خان نے ادھ ادھورے لوگ میں سرزمین بہاول پور کی صدیوں سے پسی ہوئی عوام کے کرب اور درد کو زبان دی۔ وہاں کا متروک کلچر، زبان، محاورہ، تہذیب وثقافت، رسم ورواج انہوں نے سرائیکی ناول میں زندہ کر دیئے، یہ بہت بڑی بات ہے اور ایک بڑے ناول کی صورت میں سامنے آئے۔ محمد حفیظ خان نے اپنے ناول "ادھ ادھورے لوگ" میں قارئین کو ریاست بہاولپور کے مکینوں کی قیامِ پاکستان کے بعد بنی ادھ ادھوری شناخت سے روشناس کروایا ہے۔ کردار نہایت خوبصورت انداز سے کہانی کا تانہ بانہ بُنتے نظر آتے ہیں۔ حکیم صاحب کی بیٹی تُلسی فیاض کو پسند کرتی ہے، لیکن تُلسی، وشنو کی منگیتر ہے۔ فیاض کا باپ نواب آف بہاولپور کا باڈی گارڈ ہے اور اُسے بھی گارڈ بنانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ حکیم رام لعل کی دُکان پر حکمت سیکھنے چلا جاتا

ہے۔ تقسیم کے وقت حکیم صاحب اپنی جائیداد کے کاغذات فیاض کو دے کر چلے جاتے ہیں جو بعد میں فیاض اور اُس کے چچا کے درمیان وجہ تنازعہ بن جاتی ہے اور وہ دونوں اپنے مقدمے کے اندراج کے لیے وکیل کے پاس جاتے ہیں۔ پہلے تمام مقدمات پنچایتوں میں حل ہوتے تھے، مگر جدید تہذیب کے معاشرے پر اثر کا ایک پہلو یہ ہے کہ اب مقدمات عدالتوں میں حل ہوتے ہیں۔ پہلے لوگ اپنے گھروں کے مسائل گھروں میں ہی سلجھا لیتے تھے یا پنچائت میں مسائل حل کر لیے جاتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے لوگوں نے پڑھنا شروع کیا اور تعلیم کے لیے شہروں کا رُخ کیا تو ان کی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں، مسائل کو حل کرنے کے لیے کورٹوں، وکیلوں کا رُخ کیا اور پہلے جو اپنائیت ہوتی تھی اس کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اس کی مثال ناول میں حکیم صاحب کی دکان اور گھر کے لیے ہونے والے تنازعہ کے لیے وکیل کے پاس مقدمہ دائر کرنا ہے۔ جس میں جائیداد کے لیے خونی رشتے ہی آمنے سامنے ہیں، فیاض کا چچا جائیداد کے حصول کے لیے اُس کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے:

> "شروع شروع میں تو وادھو اور اِمام صاحب، دونوں نے دوکان کے لیے بہت جتن کئے کہ کسی طور فیاض کمزور پڑ جائے یا کسی لالچ میں آ جائے مگر جب کچھ بھی نہ بنا تو اُس پر مقدمے ٹھوک دیئے گئے۔ اُن دنوں احمد پور میں انور نام کے ایک نوجوان وکیل نے نیا نیا پھٹا لگایا تھا۔ جمعدار صاحب نے دونوں دعویٰ جات اُس کے ذمے لگا دیے۔"[۴۴]

یہاں پر رشتوں کے لالچ کا ذکر کرتے ہوئے محمد حفیظ نے قاری کی توجہ نہایت خوش اسلوبی سے پنچائیت کے نظام سے عدالتی نظام کی طرف موڑی ہے۔ مغربی ممالک میں خاندانی رشتوں کا کوئی تصور نظر نہیں آتا، ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے، جدیدیت نے ہمارے خاندانی نظام کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

سیّد کاشف رضا کا پہلا ناول چار درویش اور ایک کچھوا ۲۰۱۸ء میں مقصود دانش پریس کراچی سے شائع ہوا۔ سیّد کاشف رضا کا ناول چار درویش اور ایک کچھوا ممنوعات کا ناول ہے جس میں ایسے موضوعات کو کہانی کا حصّہ بنایا گیا ہے جن پر ہمارے معاشرے میں کھل کر بات کرنا ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ ناول ہمارے منافقانہ معاشرتی رویوں پر کھلے لفظوں میں تنقید کے تیر برساتا ہے۔ جنس اور جنسی عمل، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے تانے بانے، پاکستان میں بسنے والی ایک غیر مسلم اقلیت کے احساسات اور چند دیگر ایسے ہی موضوعات جن پر لب کشائی اب جان سے جانے کی انتہا تک لے جا سکتی ہے، ان پر مصنف نے بڑے واضح اور

دلچسپ انداز میں گفتگو کی ہے۔ یہ ناول چھ ابواب میں لکھا گیا ہے ،جو اقبال محمد خان اور اِس کے بیٹوں جاوید، آفتاب اور بالے کی زندگیوں کے گرد گھومتی ہے۔ جاوید اقبال صحافی ہے اور اپنے فلیٹ میں اپنے پالتو کچھوے کے ساتھ رہتا ہے اور وہ جنسی بُھوک کا مارا ہوا ہے ۔ آفتاب کا کردار ناول میں ہیرو کے بھائی کا ہے، جاوید ناول کا مرکزی کردار ہے۔ آفتاب پیشے کے اعتبار سے پروفیسر ہے بعد میں وکیل بن جاتا ہے مذہب سے وہ قادیانی ہے۔ سلمیٰ کا کردار ناول میں ایک طالبہ کا ہے جو کہ اپنے سر کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ دونوں کا تعلق مختلف مذاہب سے ہونے کی وجہ سے آفتاب اسے سمجھاتا ہے کہ ایک تو ہم دونوں میں استاد، شاگرد کا رشتہ ہے اور ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ وہ بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں مذہب کی تفریق کی وجہ سے مذہبی شدت پسند اُن پر حملہ کرتے ہیں اور صوبہ سندھ میں بھاگ کر وہ اپنی جان بچاتے ہیں۔ بالا، محمد اقبال کی ناجائز اُولاد ہے ،اور سارے گاؤں کے لوگوں کی گالیاں کھاتا جوان ہوا ہے۔ بالا، رفیق نامی نوجوان سے نفرت کرتا ہے۔ رفیق، بالے کی بہن نسرین کا بازاری انداز میں گاؤں میں تذکرہ کرتا ہے۔ بالا، رفیق کو قتل کر دیتا ہے اور وہاں سے فرار ہو جاتا ہے اور جہادیوں کے ساتھ شامل ہو کر خود کش بمبار بن جاتا ہے۔ بالے کو بے نظیر پر خود کش حملہ کرنے کی ذمہ داری ملتی ہے جس کے بعد وہ بم سے خود کو اُڑا لیتا ہے۔ اقبال محمد خان سلطانہ کو یاد کرتے ہوئے جھیل میں اُترتا ہے ، پیچھے سے کوئی کلہاڑی کے وار کر کے اُسے مار دیتا ہے۔ سلمیٰ اخبار میں آفتاب کا سلیمان تاثیر کے قتل پر مضمون پڑھتی ہے اور اسے میل کرتی ہے جسے پڑھ کر آفتاب خوش ہو جاتا ہے:

> "میرے اس مضمون کے بعد میرے ای میل ایڈریس پر ان ای میلز کا سیلاب آ گیا تھا جن میں کوئی گالی ایسی نہیں تھی جو مجھے نہ دی گئی ہو۔ میرے وہ وکیل دوست جن کے ساتھ مل کر ابھی تین سال پہلے میں پرویز مشرف کے خلاف جلوس نکالا کرتا تھا، مجھے دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔"(۴۵)

انٹرنیٹ کا استعمال جدید تہذیب کے نشانات میں شامل ہے کہ کیسے پہلے انسان اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کبوتر اور خط اور اس جیسے دوسرے ذرائع کا استعمال کرتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ٹیکنالوجی میں ترقی ہوتی گئی تو انسان نے جدید طریقوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا۔ جیسے انٹرنیٹ کی مدد سے کیسے میلوں کے فاصلے کو ہم سمیٹ لیتے ہیں اور سات سمندر پار بیٹھا ایک شخص ہم سامنے دیکھ لیتے ہیں۔ انٹرنیٹ نے جہاں رابطوں کو بحال کیا ہے وہیں محفلوں کی ملاقاتیں ختم کر دی ہیں پہلے لوگ ایک دوسرے سے مل کر اپنے حالات

کے بارے میں آگاہ کرتے تھے۔ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے لیکن جدیدیت نے رابطے محدود کر دیئے ہیں۔

پانی مر رہا ہے:

پانی مر رہا ہے آمنہ مفتی کا ناول ہے جو ۲۰۱۸ء میں الفصیل ناشران و تاجران کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔آمنہ مفتی کا ناول پانی مر رہا ہے میں قدرتی ماحول، غیر فطری اور مصنوعی ماحول کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں انسانی اور غیر انسانی مخلوق کی فطرت کے ساتھ ایک پُر اسرار داستان بیان کی گئی ہے۔"پانی مر رہا ہے"کی مصنفہ آمنہ مفتی نے بڑی خوش اُسلوبی سے اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ نازنین اور اسرار کا کردار ناول میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے، جس کے گرد تمام کہانی گردش کرتی نظر آتی ہے۔ کہانی کا آغاز اسرار کی گاؤں آمد سے شروع ہوتا ہے اس ناول میں کافی پُر سراریت ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ جدید سہولیات کا استعمال گاؤں کے لوگوں کے لیے ایک ہیبت ناک چیز ہے کیونکہ گاؤں کی زندگی شہر کے مقابلے میں سادہ ہوتی ہے اور وہاں لوگ دیسی طریقوں سے علاج کیا کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ہماری زندگی میں تبدیلیاں آتی گئی ایسے ہی ہماری زندگی سادگی سے دور ہوتی گئی اور مشینی زندگی کے قریب تر ہوتی گئی۔ناول کا ہیرو اسرار جسے بیمار ہونے پر گاؤں میں موجود ہسپتال لے جایا جاتا ہے،اس اقتباس سے اس بات کی واضح عکاسی ملتی ہے کہ کس طرح ایک سادہ لوح انسان ہسپتال میں لگے آلات سے پریشان ہو کر آئندہ ڈاکٹر کے پاس جانے سے توبہ کرتا ہے:

> "مریض بے چارہ اپنے سر سے چند فٹ کے فاصلے پر لگے عجیب ہیئت کے بلبوں اور دیگر آلات سے اتنا دہشت زدہ ہوتا، جیسے بڑے بڑے سیاستدان اور صحافی شاہی قلعے کے ٹارچر سیل کو دیکھ کر ہوتے تھے۔ فوراً ہی بیماری سے مکر جاتا اور ڈاکٹر کی ایک ہی دوا اسے بھلا چنگا ہونے کی نوید سنا کے آئندہ اس مذبح خانے میں جانے سے توبہ پکڑ تا۔"(۴۶)

گاؤں آمد کے ساتھ ہی اسرار کو پاؤں پر سانپ کاٹ لیتا ہے اور اُس کو ہسپتال لے جاتے ہیں۔ ہسپتال میں لگے آلات کو دیکھ کر اسرار پریشان ہو جاتا ہے۔بڑے بڑے بلبوں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور فوراً ہی اپنے ٹھیک ہونے کا کہہ دیتا ہے۔عام آدمی اپنے ماحول میں مکمل طور پر رچ بس جانے کی وجہ سے جدت کو مشکل سے اپناتا ہے۔

گُل مینہ:

گُل مینہ زیف سیّد کا دوسرا ناول ہے جو جنوری ۲۰۱۹ء میں رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل گُل مینہ صرف ایک قبائلی لڑکی کی کہانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعات در واقعات اور حادثات کے ذریعے بُنی گئی ایک ایسی کہانی ہے جو حسن بن الصباح کی جنت، ابدالی کی لوٹ مار، برطانوی سپاہ کا وانا قلعہ سے انخلا، طالبان کے عروج وزوال سے ہوتی ہوئی ۲۰۰۷ء میں بینظیر بھٹو کے قتل تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر اب تک تقسیم کا موضوع اُردو ادب پر چھایا رہا۔ دہشت گردی پوری دنیا کے فکشن نگاروں کے لیے ایک بہت بڑا موضوع بن کر سامنے آیا ہے۔ گُل مینہ زیف سیّد کا ناول ہے جو اپنے اندر کئی ادوار کو سموئے ہوئے ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کا ذکر بہت تفصیل سے ہوا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار گُل مینہ کا ہے جو اپنے دادا کے تعاون سے اپنے نظام سے بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنی محبت کو پانے کے لیے وہ پاکستان کو چھوڑ کر افغانستان چلی جاتی ہے، جہاں اُس کا شوہر جہادی بن جاتا ہے۔ شفیق پینٹر کا کردار بھی بہت جاندار ہے جس کی وجہ سے ناول میں رنگ ہیں، یہ ناول موجودہ عہد میں ناول نگاری کی جہت میں ایک انتہائی عُمدہ فن پارہ ہے۔ گُل مینہ اور زرجان کا کردار ناول میں ہیرو ہیروئن کا ہے، گل مینہ کا رشتہ اُس کا دادا اپنی زندگی میں ہی زرجان سے کر جاتا ہے۔ دادا کے انتقال کے بعد اس کے بھائی اس کا رشتہ چند پیسوں کے عوض اپنے علاقے کے بارُسوخ شخص سے کر دیتے ہیں جس کی خبر گل مینہ کو اس کی دوست سے ملتی ہے اور وہ زرجان کے ساتھ گھر سے رات کی تاریکی میں بھاگ نکلتی ہے۔ گل مینہ اور زرجان نے گھر سے بھاگنے کے بعد رات گنگے کوٹ میں گزاری، یہ گاؤں کچھ گھروں پر مشتمل تھا۔ سنگین خان کا خاندان بیوی اور دو بچوں پر مشتمل تھا۔ گھر کے صحن میں بھیڑ بکریوں کا باڑا بنا تھا۔ وہاں مہمانوں کے لیے جگہ نہیں تھی اس لیے سنگین خان زرجان کو کھانا کھانے کے بعد حجرے میں لے گیا۔ قبائل میں عورتیں بھی اپنی حفاظت کے لیے بندوق کا استعمال کرتی ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں پاکستانی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات کی عکاسی کرتی ہیں:

> "اسے گل مینہ کی تھری ناٹ تھری رائفل دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے آج تک کسی عورت کو رائفل لے کر پھرتے نہیں دیکھا تھا۔ گل مینہ نے اسے بتایا کہ یہ رائفل اس کے دادا کی نشانی ہے اور وہ کسی صورت اسے خود سے جُدا نہیں کر سکتی۔"(۴۷)

ناول میں گُل مینہ کا کردار اپنے ماحول سے بغاوت کرتی نظر آتی ہے اُس کے دادا اُسے رائفل چلانا بھی سکھاتے ہیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے وہ اپنے دادا کی رائفل بھی ساتھ رکھ لیتی ہے۔ سنگین خان کی بیوی، گل مینہ

کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل دیکھ کر بہت حیران ہوتی ہے۔کچھ قبائلی علاقوں میں عورتوں کو مردوں سے مقابلہ کرنے کے لیے رائفل چلانا سکھایا جاتا ہے تا کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے اپنی حفاظت خود کر سکیں۔

گراں:

طاہرہ اقبال کا ناول گراں دوست پبلی کیشن اسلام آباد سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا جو کل ۲۶۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔ ناول کا موضوع ایک پوٹھوہاری پہاڑی گاؤں کا یورپ کی طرف نقل مکانی اور اس کا ان کے عمرانی معاملات میں تنوع، تفریق اور تبدیلی کے اثرات کا جائزہ ہے۔طاہرہ اقبال کا ناول "گراں" پوٹھوہاری تہذیب و ثقافت کا عکاس ہے۔اس میں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی تہذیب اور پھر اسی کی دہائی کے بعد کی تہذیب میں واضح فرق موجود ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ جدید تہذیب اپنے پنجے گاڑھ رہی ہے۔"گراں" کی تہذیب ایک بند تہذیب ہے۔سماج کی عورت معاشرتی جبر کا شکار نظر آتی ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے فیصلے کے خلاف نہیں جاسکتی۔گاؤں کے مرد کمانے کے لیے باہر ملکوں میں چلے گئے ہیں۔کچے مکانوں کی جگہ پکے مکانوں نے لے لی ہے اور تیزی سے گاؤں میں تبدیلیاں آرہی ہیں۔غزل جان کا کردار ناول میں مرکزی کردار ہے جو کہ مختلف مقامات پر اُبھرتا ہوا نظر آتا ہے۔گاؤں میں چند مخصوص گھر تھے جہاں کے لوگ کمانے کے لیے باہر ملکوں کا رُخ کرنے لگے۔اس طرح گاؤں میں موجود لوگوں کو اُن کے اپنوں نے پیسے بھیجنا شروع کر دیئے جس سے انھوں نے بہتر ضروریات زندگی کو اپنانا شروع کر دیا۔جیسے جیسے گاؤں سے لوگ بہتر تعلیم اور روزگار کے لیے شہروں اور باہر ممالک کی طرف ہجرت کرتے گئے ایسے ہی گاؤں کے لوگوں نے بہتر ضروریاتِ زندگی کو اپنانا شروع کر دیا۔ہر گھر میں جدید سہولیات زندگی کو اپنایا جانے لگا۔ہر گھر میں فریج کولر وغیرہ موجود تھے، پہلے جیسے لوگ پانی کے لیے گھڑوں وغیرہ کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے تھے ۔زندگی سادگی کی طرف مائل تھی ایسے ہی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں بہتر سہولیات کی خواہشات کو اپنانے کی وجہ سے پیچیدگیاں آتی گئیں اور زندگی سادگی سے دور ہوتی گئی۔ناول میں اس کی مثال خالہ اور غزل جان کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے:

> "خالہ !سارے گراں میں ٹونٹیاں اور ٹینکیاں بھری ہیں فریج اور کولر کو آگ لگائے ختم نہیں ہوتے تم یہ گھڑا اُٹھا کر کہاں چل پڑتی ہو۔۔۔"

غزل جان نے گھڑے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اپنے سر پر رکھ لیا۔بوجھ سے گردن جھک گئی۔

"نہ جھلی! اکیلی جان بھلا کیوں موٹر چلاؤں۔ دو دو موٹریں جیون جوگے لگوا گئے ہیں، پر بجلی کا بل کہیں تھوڑا، یقین کر بلب بھی نہیں جلاتی، دیوا بالی کننی آں (دیا جلا لیتی ہوں)۔ سو سو بار مظفر جیون جوگا تاکیدیں کر گیا بھئی آپاں جی بالی کنیا کرو۔"(۴۸)

اس اقتباس میں دونوں دہائیوں کی تہذیب کے کردار موجود ہیں۔ غزل جان چاہتی ہے کہ جدید سہولتوں سے استفادہ اٹھایا جائے مگر خالہ آج بھی پرانے طریقوں کو استعمال کر رہی ہے۔ بوڑھے لوگ جدت کو مشکل سے اپناتے ہیں وہ اپنی پرانی اقدار سے جڑے رہتے ہیں ناول میں اس کی مثال خالہ کا کردار ہے۔

ب۔ مغربی کلچر کا فروغ:

عالمگیریت کا تذکرہ جب معاصر ناول میں کیا جاتا ہے تو اس کے عملی مظاہر ہمارے کلچر میں دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل عالمگیریت کے پردے میں امریکیت اور مغربیت کو فروغ دینے کے لئے عملی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ان تہذیبوں کو پھیلانے کا اثر سب سے زیادہ عورت نے قبول کیا ہے اور ہمارے لئے مغربی کلچر کے عملی مظاہر ان کے ہاں دکھائی دیتے ہیں "ماڈرن" ہونے کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ دراصل اغیار کے جال میں ہمارے بری طرح پھنس جانے کا ثبوت ہے۔ اگر دیکھا جائے تو دیہاتوں میں پردے کا بہت خیال کیا جاتا تھا عورت اپنے سسرال میں ہر رشتے سے پردہ کرتی تھی اور اس بات کا بہت خیال کیا جاتا تھا کہ بے دھیانی میں بھی اس کا پردہ نہ ہٹے۔ ہمارے ناولوں میں مغرب پرستی کو خوبصورت انداز میں دکھایا گیا ہے، یورپ سے آنے والے نئے افکار کو ہمارے لوگ ماڈرن سمجھ کر اپنا لیتے ہیں لیکن ان کے نتائج مثبت سے زیادہ منفی مرتب ہوتے ہیں۔ مشرق کی عورت کی زندگی بھی پوری طرح بدل چکی ہے، اب مشرقی عورت نے بھی مغربی عورت کی طرز پر زندگی گزارنی شروع کر دی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"تقسیم کے بعد ہمارے یہاں بھی حالات ایسی ہی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ معاشی بدحالی، مصارفِ زیست میں اضافہ اور موزوں رشتوں کی کمیابی کے باعث لڑکیاں اب تعلیم سے زیور کا کام نہیں لے رہیں بلکہ استانیوں، نرسوں جیسے زنانہ پیشوں سے ہٹ کر زیادہ تنخواہوں کے لئے بینکوں، فرموں، دفتروں اور دکانوں میں پہنچ چکی ہیں۔ اب وہ برقعہ میں بند چلنا پھرنا پسند نہیں کرتیں۔"(۴۹)

ڈاکٹر سیلم اختر کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ آج عورت کی چار دیواری والی روایت دم توڑ چکی ہے، اب مشرقی عورت نے بھی بازو میں قوت دکھاتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لیا ہے۔ دن

بدن بڑھتی ہوئی مہنگائی اور معاشی ضرورتوں میں ہوشربا اضافے نے معاصر عورتوں پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔اب عورتوں کے اندر پردے کا رجحان بھی کم ہو رہا ہے، مغرب سے آنے والے فیشن کے بے لگام طوفان نے عورتوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔اس لئے اب وہ پردے کو خاطر میں نہیں لاتیں بلکہ کھلے بالوں اور چست لباس پہن کر چلنے پھرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔دوسری بات جو ہمارے نوجوان طبقے میں بھی مغرب پرستی فروغ پارہی ہے وہ غیر ممالک میں جا کر کمانے اور وہاں رہائش اختیار کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔

معاصر ناول نگار نے ہمارے عہد کے نوجوان کے اس رجحان کو بھی اپنے ناولوں میں بیان کیا ہے۔آج کا نوجوان اچھی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زیادہ پیسے کمانے کے لئے مغربی ممالک کا رُخ کرتا ہے، چلو وہاں پر ملازمت کے سلسلے میں جانا عیب نہیں لیکن وہاں جا کر مستقل سکونت اختیار کرنا کوئی فخریہ عمل نہیں ہے۔ہمارے عہد کے ایک اور بڑے ناول نگار حسن منظر ہیں جنہوں نے بیرون ممالک میں ملازمت بھی کی اور وہاں کے حالات کو پوری طرح سمجھ کر بیان بھی کیا۔ان کے متعلق ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"انہوں نے دنیا کے کئی ملک اور ان کے لوگوں کو سیاح کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انہی کے بیچ بسنے والے ایک ذہنی معالج اور ان کے خوش خیال ساتھی کی طرح محسوس کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس تفاصیل اور بیانات وافر ہیں۔" (۵۰)

مغرب میں جنسی و جسمانی اختلاط کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں اور آئے روز کچھ نیا دیکھنے کو مل جاتا ہے۔وہاں پر ایک عورت کئی مردوں سے بیک وقت رشتہ رکھے ہوئے ہوتی ہے اور مرد بھی کئی عورتوں کے ساتھ عشق کا دم بھرتا ہے۔عشق کے نام پر یہ سب اٹھتے قدم دراصل ہوس ہیں، مغرب کی دیکھا دیکھی یہ رجحان ہم میں بھی فروغ پا چکا ہے۔ناولوں میں ہمارے معاشرے میں بڑھتے ہوئے مغربی رجحان کو تلخ الفاظ میں کرداروں کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔منکوحہ عورت بیک وقت دو مردوں سے تعلقات استوار کئے ہوئے ہے جبکہ مشرقی تہذیب کا سب سے بڑا اثاثہ عورت کی شرم اور حیا ہوا کرتا تھا۔ویسے بھی عالمگیریت کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ مغربیت کا پیدا کیا ہوا نظریہ ہے۔اس کے اثرات ہماری ثقافت پر بھی پڑتے ہیں کیونکہ:"عالمگیریت کے حوالے سے جس تہذیب کا نقشہ ابھارا جا رہا ہے اس میں مغربی تہذیب نمایاں ہے۔"(۵۱)

اس بات میں شک نہیں ہے کہ مغربیت کو ہماری ثقافت میں پھیلایا جارہا ہے، مغربی تہذیب خوب پھل پھول رہی ہے۔ اپنی چکاچوند اور مصنوعی ہیت کی بدولت اس تہذیب نے مشرقی تہذیب کو بہت متاثر کیا ہے اور جو بڑے بچوں میں ایک لحاظ ہوا کرتا تھاوہ بھی ختم ہو تا جارہا ہے۔ معاصر نوجوان جب سکول کی دہلیز پار کر کے کالج کی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو وہ یکدم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اکثر نوجوان مغرب پرستی اور فیشن پرستی کے گرویدہ نظر آتے ہیں اور وہ درسگاہوں میں جاکر اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ اب نوجوان کالج میں جاکر جو زندگی اختیار کرتے ہیں وہ سراسر مشرقی اقدار کے خلاف ہے۔ مغرب کی زندگی نے نوجوانوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ محققین نے عالمگیریت کو امریکیت کا لقب دیا ہے:

> "مسلم دانشور معتبر حوالوں سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ عالمگیریت پوری دنیا میں سراسر امریکیت اور صیہونیت کے نفاذ کی عملی کوشش ہے جس کی منصوبہ بندی کئی برسوں سے کی جارہی ہے۔"(۵۲)

اس اقتباس سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالمگیریت کے درپردہ امریکی کلچر دنیا بھر میں پھیلانے کی ایک سازش کی جارہی ہے۔ امریکہ نے غریب ممالک کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے عالمی بینک آئی ایم ایف جیسے خود ساختہ جال تیار کئے ہیں۔ ان اداروں پر مکمل طور پر امریکہ کا قبضہ ہے، امریکہ کی حمایت ہی سے کوئی بل منظور یا مسترد ہوتا ہے۔ ایک اور رجحان جو ہمارے ہاں فروغ پارہا ہے کہ اعلیٰ شخصیات اپنے علاج معالجے کے لئے مغربی ممالک کا رخ کرتی ہیں، حکمرانوں نے بالخصوص ایسا ہی وتیرہ اپنا رکھا ہے۔ ہمارے خیال میں دور حاضر میں ہمارے ہاں بھی علاج معالجے کی بہترین سہولیات میسر ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے حکمران اگر کسی معمولی سی بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو وہ لندن کا رخ کرتے ہیں۔ بیوروکریسی بھی حکومتی خرچے پر باہر علاج کے بہانے جاتی ہے اور وہاں پر عیاشی کرتی ہے، مغربی کلچر کے فروغ نے دراصل وہاں کی طرزِ زندگی اور کلچر کو ہمارے اندر بھی پختہ کر دیا ہے۔ وہاں کی طرح نفسا نفسی نے ہمارے ہاں بھی ڈیرے ڈال لئے ہیں۔ اس طرح یہاں پر بھی ہم ماڈرن اور آزاد خیال بننے کی کوشش میں مغربی کلچر کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، اپنی مشرقی اقدار جو کہ ہماری خوبصورت تہذیب کا حصہ ہیں ان کو فراموش کر دیتے ہیں۔

کاروانِ وجود:

ثمر کا کردار ناول میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ ثمر اپنی ماں کی زندگی میں شادی کے لیے تیار نہیں ہوتی مگر ماں کے مرنے کے بعد وہ سارہ اور دوسری دوستوں کے کہنے کے بعد شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

وہ اپنی ہی معصوم دوست سارہ کے شوہر سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے اور نکاح ختم کرنے کا حق اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ سارہ کے ساتھ اِس کی دوست دھوکا کرتی ہے اور ساتھ ہی شوہر بھی خفیہ نکاح کر کے اُس سے بے وفائی کرتا ہے۔ ثمر کے ساتھ رہنے کے لیے وہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، سارہ کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ گھر آتے ہی سارہ کو کہیں بھی لے جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ رات جلدی سونے پر سارہ کو اس پر ترس آتا ہے۔ مغربی کلچر میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنا اور شرائط طے کرنا عام سی بات ہے:

> "شہر کی ایک دور افتادہ مسجد کے سادہ لوح مولوی کے پاس جا کر اس نے دو گواہوں کے سامنے رضا کے ساتھ نکاح پڑھوایا۔ اور نکاح نامے میں یہ شق لکھوائی کہ جب وہ کہے گی نکاح ختم ہو جائے گا، پھر رضا سے اصرار کیا کہ اس کے اور رضا کے علاوہ اس بات کا کسی کو علم نہ ہو۔"(۵۳)

زیرِ نظر اقتباس میں نکاح نامے میں شرط رکھنا ٹھیک نہیں کیونکہ نکاح کرتے وقت ہی اُس کو نہ نباہنے کی شرط رکھنا غلط ہے۔ یہ لفظ استعمال کرنا کہ "جب وہ کہے گی نکاح ختم ہو جائے گا" غور طلب بات ہے۔ ثمر اور رضا کے ہونے والے نکاح میں ہمیں مغربی کلچر کی واضح تصویر نظر آتی ہے جہاں کاغذی شادی کا رواج ہے۔ اس کلچر نے ہمارے معاشرے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

علی بخش اور احمد بخش سگے بھائی تھے لیکن دونوں کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک اخلاقی طور پر ہر چیز کے معاملے میں سمجھدار تھا لیکن علی بخش گاؤں کے ماحول اور آوارہ دوستوں کی صحبت میں اخلاقی پستی کا شکار ہو گیا تھا۔ علی بخش میں ہر طرح کی بُرائی موجود تھی اور اپنی تمام سرگرمیوں کے لیے وہ اپنی حویلی کے دوسرے حصّے کا اِنتخاب کرتا اور گھر کی عورتوں کو وہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ احمد بخش کے گھر واپس آنے پر علی بخش نے وسکی کا اہتمام کیا۔ رات کے وقت عورتوں کا ناچنے آنا عام سی بات تھی، زنانہ حصّے میں سب کو اِس بات کا پتہ تھا لیکن کسی کی اِتنی جرأت نہیں تھی کہ علی بخش کو کچھ کہہ سکے۔ کوہلی وسکی، اسکوچ، بھنگ، چرس، افیون، ہیروئن اور مختلف گولیاں ہر چیز اس کی ساتھی تھی اور یہ تمام چیزیں ہماری ثقافت میں تنزّلی کا باعث ہیں:

> "پھر کاہے کا انتظار کر رہا ہے۔ لے آ" علی بخش نے بے تکلفی کی ہنسی سے کہا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہمیشہ سے بنگلے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ گھر کی عورتیں بھی بنگلے کو آؤٹ اوف باؤنڈز سمجھتی تھیں۔ شاید وہاں کوئی ڈانس (ڈانس) کرنے والی ہو، شاید کوئی کبوتری۔ کوئی

اور ایسی عورتوں سے بھی زیادہ گندی ہستی۔ اس وقت بنگلہ علی بخش کا رنگ محل بن جاتا تھا اور رنگ محل میں گھریلو عورت کا کیا کام۔" (۵۴)

ناچ گانا غرض ہر بُرائی علی بخش میں موجود ہے یہ تمام بُرائیاں ہماری اقدار کا حصّہ نہیں ہیں مگر کچھ علاقوں میں یہ برائیاں بہت عام ہو گئی ہیں جو ثقافت میں تنزلی کا باعث ہیں۔ مغربی کلچر کی یلغار زیرِ نظر اقتباس میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے جہاں پر عورت کو شمع محفل سمجھا جاتا ہے۔

روشن اندھیرے:

ناول میں بیگم شہوانی کا کردار ایک امیر اور با اثر گھرانے سے تعلق رکھنے والی عورت کا ہے۔ وہ کہانی میں مختلف مردوں کے ساتھ پارٹیوں کی رونق بنی نظر آتی ہے۔ شہوانی کا کردار ناول میں ایک طلاق یافتہ خاتون کے طور پر اُبھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مغربی کلچر کی دین ہے کہ عورت اور مرد کے تعلقات کو شہروں میں بُرا تصور نہیں کیا جاتا۔ ناول میں اس کی عمدہ مثال بیگم شہوانی کا کردار ہے جس کے گھر اکثر مواقع پر شجاع کو دیکھا جاتا ہے، حالانکہ بیگم شہوانی ایک طلاق یافتہ خاتون ہے۔ شجاع بیگم شہوانی کے گھر ہونے والی پارٹی میں جاتا ہے، تو وہ شراب نوشی کر رہی ہوتی ہے۔ اِس کی نظر شجاع پر پڑتی ہے وہ اُس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ شجاع بُھرپور طریقے سے اُس کا جائزہ لیتا ہے وہ اُس کو پینتیس سال کے لگ بھگ لگتی ہے۔ وہ شجاع سے اپنا تعارف کرواتی ہے، کچھ دن بعد شجاع اپنے اُوپر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد بیگم شہوانی سے ملتا ہے۔ وہ اُس کو اپنے پہلے شوہر کے بارے میں بتاتی ہے کہ اُس کی طلاق کیسے ہوئی اور وہ اپنے شوہر سے ایک بار بھی نہیں ملی:

"شجاع! میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔ میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ میرا سابقہ شوہر کون ہے، اسے چھوڑو۔ وہ جاگیر دار ہے اور خاصا مشہور آدمی ہے۔ ہمارے درمیان محبت پروان چڑھی، ہم نے خفیہ شادی کی اور اس نے مجھے اپنے خاندان سے الگ رکھا۔ میرا ایک بیٹا بھی ہے جو اس وقت امریکہ میں ہے، اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ انتہائی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ میرے اور شوہر کے درمیان ایک ایسا وقت آیا جب میرا شوہر مجبور ہو گیا کہ مجھے طلاق دے دے۔" (۵۵)

بیگم شہوانی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی خفیہ شادی کا بتاتی ہے جو کہ مغرب میں ایک عام سی بات ہے۔ جبکہ ہمارے معاشرے میں اس کو پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مغربی کلچر میں ایک سے زیادہ عورتوں سے مراسم رکھنا عام سی بات ہے۔ اس ناول میں جابجا مخلوط محفلوں اور عورتوں سے مراسم کا ذکر ہے۔ مغربی کلچر کا تیزی سے تسلط ہمارے ہاں ثقافتی بحران کو پروان چڑھا رہا ہے۔

صفر سے ایک تک:

ذکی ناول کا ہیرو ہے اور تعلیم کے حصول کے لیے وہ دیہات سے لاہور شہر کا رُخ کرتا ہے وہاں پر اس کے ساتھ سالاروں کا بیٹا بھی ہوتا ہے۔ذکی کو کمپیوٹر کا بہت شوق ہے وہ اپنے باپ کو بھی کہتا ہے کہ مُنشی گیری کا تمام کام وہ کمپیوٹر پر کرے۔باپ بھی اُس کی مدد سے اپنا تمام کام کمپیوٹر پر کرتا ہے۔ذکی گھر آنے کے بعد ماں کے پاس بیٹھا ہوتا ہے کہ باپ کے بلانے پر ماں کو غصّہ آجاتا ہے کہ بیٹے کو ماں کے ساتھ وقت نہیں گزارنے دیتے اور ماں غصّے میں کمپیوٹر کے لیے لفظ کمپوٹنے استعمال کرتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ کمپیوٹر بھی ٹی وی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔اماں جب ذکی کی گھسی ہوئی جین دیکھتی ہیں تو رونے لگتی ہیں کہ میرے بیٹے کا بُرا حال ہو گیا ہے، بہنیں ہنسنے لگتیں ہیں کہ یہ مغربی فیشن ہے جہاں پر اس قسم کے لباس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا:

> "ابا جی میں آتا ہوں"۔میں نے کہا اور والدہ کے پاس بیٹھ گیا۔اچانک اُن کے منہ سے چیخ سی نکلی انہوں نے میری آگے پیچھے سے بُری طرح گھسی ہوئی جین دیکھ لی تھی۔اور پھر جو آہ وزاری انہوں نے شروع کی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں میری حالت اتنی تباہ ہو چکی ہے کہ "لیریں" پہننے پر مجبور ہو چکا ہوں۔بہنیں ہنستی تھیں کہ بہر حال وہ اس انوکھے مغربی فیشن کو سمجھتی تھیں۔" (۵۶)

زیرِ نظر اقتباس میں ماں جی کی حیرت میں مزاح کا پہلو ہے کیونکہ اپنے بیٹے کی گھسی ہوئی جین دیکھ کر وہ سمجھی کہ میرے بیٹے کی حالت اِس قدر خراب ہے کہ وہ لیریں پہن رہا ہے۔بیٹے نے ماں کو سمجھایا کہ مغرب میں یہ فیشن ہے اور اس لباس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ہمارا نوجوان مغربی کلچر سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے مغربی ممالک میں جو فیشن متعارف ہوتا ہے ہمارے ملک میں بہت جلد وہ فیشن اپنالیا جاتا ہے۔

نو لکھی کوٹھی:

کرامت کا کردار ناول میں ایک مولوی کا ہے، کرامت ایک ہوشیار اور چالاک قسم کا آدمی ہے۔ولیم سے پہلی بار اس کی ملاقات تحصیل جلال آباد میں کسی رشتے دار کی فوتگی کے بعد ہوتی ہے۔مولوی کرامت چاپلوسی کرنے میں کافی مہارت رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ولیم کے ذریعے جلال آباد میں معززین میں شمار ہونے لگتا ہے اور لوگ اپنے کام کروانے کے لیے اس کی چاپلوسی کرتے نظر آتے ہیں تاکہ وہ ولیم سے کہہ کر ان کا کام کروادے۔مولوی کرامت ایک نادار امام مسجد ہے، مگر ولیم کی نظرِ کرم سے ایک منشی یعنی استاد کے رتبے پر فائز ہو جاتا ہے وہ زندگی میں بہت محنت کرتا ہے۔اوپر نیچے کی کمائی سے اپنے اکلوتے بیٹے فضل دین کو

معقول تعلیم دلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کرامت ولیم کی مدد سے اپنے بیٹے کو لاہور میں بابو بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر اپنی تیز طراری اور چاپلوسی کی مدد سے ایک بڑے عہدے تک جا پہنچتا ہے۔ مولوی کرامت نے ولیم کو خوش کرنے کے لیے جس قدر محنت اور تندہی سے کام کیا تھا، اُس کے عوض ولیم نے ذاتی دلچسپی لے کر اُس کی مالی اور سماجی حیثیت میں اتنا اضافہ کر دیا کہ اب وہ تحصیل جلال آباد کے معززین میں شمار ہونے لگا۔ بلکہ اُس کے بیٹے کو میٹرک میں اچھے نمبر آنے پر ذاتی خرچ پر اور کچھ وظیفہ دے کر لاہور ایف سی کالج میں پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ ان تمام باتوں کے بعد مولوی کے اتنے پر نکل آئے تھے کہ کئی دفعہ صاحب بہادر سے خود ملاقات نکال کر اُن کی شکایات بھی کی۔ جس کے بعد کافی لوگ بابوؤں سمیت مولوی کرامت کی چاپلوسی پر اُتر آئے تھے۔ ہماری ثقافت میں بحران کی ایک وجہ چاپلوسی یا رشوت خوری بھی ہے:

> "کئی بابو اپنی سفارشیں بھی لے کر آتے، جنہیں مولوی کرامت ولیم تک پہنچانے کی جرأت تو نہ کر سکتا تھا، لیکن وہ اُن سفارشی لوگوں کو کام ہونے کی اس طرح تسلی کروا دیتا جیسے یہ اُس کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ اِن سفارشوں کے عوض مولوی صاحب نے کسی سے پیسے تو نہیں پکڑے تھے، جس کا اُس وقت رواج بھی کم تھا۔" (۵۷)

چاپلوسی اور رشوت ایک ایسی دیمک ہے جس نے ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کر دیا ہے، اس نے بھی ہماری ثقافت کو متاثر کیا۔ مغربی کلچر کے فروغ نے ہماری اقدار کو متاثر کرنے کی وجہ سے ہماری تہذیب روبہ زوال ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اپنی اقدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور بہت سی برائیاں ہمارے معاشرے میں پھیلتی جا رہی ہیں۔

ناتمام:

صائمہ ناول کا مرکزی کردار ہے جو ناول میں شروع سے آخر تک ہر کردار کے ساتھ دکھائی دیتا ہے، جس کا اختتام خودکشی کی صورت میں ہوتا ہے۔ ناول میں صائمہ کی بہن جو کہ ایک مظلوم کردار کی صورت میں سامنے آتی ہے، جو کہ شادی کے کچھ ماہ بعد ہی گھر آ جاتی ہے کیونکہ اس کے سسرال والے کافی ظالم ہیں۔ اس کا شوہر بھی ماں کی بات مانتے ہوئے بیوی کو طلاق دینے کے لیے تیار ہے پر صائمہ کی ماں بدنامی کے ڈر سے ایسا نہیں چاہتی۔ صائمہ کی باجی کی شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ صائمہ کی ماں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس کی بیٹی کا گھر بسا رہے لیکن باجی کا شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کا سسرال یہ بھی چاہتا تھا کہ باجی کوئی بات نہ کریں۔ باجی نے ایک سال کے عرصہ میں ماں کی بات کو پلے سے باندھ کر گھر کا منہ بھی نہیں دیکھا یہاں

تک کہ ایک دن اطلاع ملی کہ باجی میو ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبہ میں داخل تھیں۔ باجی کے شوہر نے ہسپتال سے فارغ ہونے سے پہلے انھیں اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ وہ اپنی ماں، باپ اور دو ایک لوگوں کے ساتھ وہاں آیا، اور تین بار طلاق دے کر چلا گیا۔ مغربی کلچر میں طلاق معمولی سی بات ہے کیونکہ وہاں عورت اور مرد کا زیادہ شادیاں کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن مشرقی معاشرے میں یہ بات بالکل مختلف ہے یہاں پر عورت کو طلاق ملنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے اور تمام قصور کا حق دار اسی کو ٹھہرایا جاتا ہے:

"لیکن باجی نے جیسے دماغ، دل، کان، منہ سبھی دروازے کھڑکیاں بند کر لیے تھے۔ نہ کچھ سنتی تھیں، نہ محسوس کرتی، نہ سوچتی اور نہ ہی کچھ بولتی تھیں۔ صرف دیکھتی تھیں، بٹر بٹر، بہن کی ہر پکار اور ماں کی ہر پھٹکار کے جواب میں۔ طلاق کی کاروائی نو ماہ میں مکمل ہوئی لیکن اس سے بہت پہلے انھوں نے سچے پیر کی گلی میں واقع لٹل برڈرز سکول میں نوکری تلاش کر لی۔ شادی سے پہلے ٹیوشنیں پڑھانے کے تجربے کی بنا پر۔"(۵۸)

مغربی معاشرے میں عورت زیادہ وقت تک کسی چیز کا غم نہیں مناتی، اس ناول میں صائمہ کی باجی بھی ایک ایسا ہی کردار ہیں جو طلاق کی کاروائی مکمل ہونے کا انتظار نہیں کرتی اور اپنے لیے نوکری تلاش کر لیتی ہے۔ مغربی معاشرے میں عورت خود کو خود مختار تصور کرتی ہے اور کسی کے دستِ نگر رہنا پسند نہیں کرتی۔

میر واہ کی راتیں:

یعقوب ایک درزی ہے جس کو ناول میں ایک بڑی عمر کا آدمی دکھایا گیا ہے جو چاچا غفور کے ساتھ کام کرتا ہے۔ چاچا جو کہ اپنی جوانی کے وقت میں کافی شوقین مزاج انسان رہا ہے اور اُس کے کافی عورتوں سے مَراسِم رہے ہیں۔ گاؤں میں سب سے بہتر کاریگر یعقوب ہے اور عورتوں میں کافی دلعزیز بھی۔ شہروں کے ساتھ ساتھ ماڈرن ہونے کا شوق دیہات کے لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہاں پر بھی عورتیں جدید فیشن کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو تبدیل کر رہی ہیں اور وہ شہروں کی عورتوں کے مقابلے میں ماڈرن نظر آنا چاہتی ہیں۔ اس کی عمدہ مثال یعقوب کاریگر کی دکان میں آنے والی عورتیں ہیں جو اپنے ساتھ مختلف قسم کے ڈیزائن لے کر آتی ہیں تاکہ یعقوب کاریگر ان کے من پسند ڈیزائن کے کپڑے بنا کے دے اس اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

"لوگوں کی نظر میں دکان کا مالک چاچا غفور نہیں بلکہ یعقوب کاریگر تھا۔ کئی بہت پرانے گاہکوں کے ناپ اسے زبانی یاد تھے۔ جب انھیں ردوبدل کروانا ہوتا یا وہ نئے فیشن کا ڈیزائن بنواتے تو

اپنی فرمائشیں اِسی کو بتاتے۔وہ دھاگوں، بٹنوں اور بکرم کی خریداری میں خود مختار تھا۔"(۵۹)

نذیر ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے گرد تمام کہانی کے کردار گردش کرتے نظر آتے ہیں۔نذیر ایک لااُبالی طبیعت کا نوجوان ہے، جس کو گھر سے دور اس کے چاچے کے پاس اسی لیے بھیج دیا جاتا ہے کہ یہاں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے وہ کچھ سیکھے۔چاچے کے پاس جاکر وہ وہاں ایک لڑکی شمیم جو کہ شادی شدہ ہے اُس سے تعلقات استوار کرلیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی چاچی کے ساتھ بھی مختلف مقامات پر چھیڑ خانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔مغربی کلچر کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی بعض ایسی برائیوں نے جنم لیا ہے جن کی وجہ سے ہماری اقدار میں نمایاں زوال نظر آتا ہے۔پہلے خونی رشتوں کے ساتھ ساتھ لوگ اپنے آس پاس رہنے والوں کی عزت کا بھی خیال رکھا کرتے تھے لیکن اب وہ حیا اور عفت برائے نام بھی باقی نہیں ہے، یہ تلخ حقیقت ہے اور اس سے انکار کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔اس کی نمایاں مثال " میر واہ کی راتیں " میں شمیم کا کردار ہے جو کہ اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ نذیر سے بھی تعلقات استوار کیے ہوئے ہے اور نذیر سے ملنے وہ راتوں کو کھیتوں میں آتی ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نذیر کے پیار میں اس حد تک اندھی ہو چکی ہے کہ اس ایک رات گھر ہی بلا لیتی ہے:

> "شمیم نے اسے بتایا کہ آئندہ اس کے لیے رات کے وقت کھیتوں میں آنا ممکن نہیں ہو گا۔وہ خوفزدہ تھی۔اس نے کہا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے کوئی اور بندوبست کرے گی۔اس نے اپنے دل میں اُمڈتی ہوئی محبت کا اظہار کیا اور نذیر کی تعریفیں کرنے لگی۔وہ مسکرایا اور اس نے موج میں آکر، آگے بڑھ کر شمیم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔" (۶۰)

زیرِ مطالعہ اقتباس میں شمیم اور نذیر کی ملاقات کا احوال ہے جو وہ سب سے چھپ کر رات کے اندھیرے میں کر رہے ہیں۔ہمارا معاشرہ اور مذہب اس طرح کی ملاقاتوں کو پسند نہیں کرتا، عورت اور مرد کا اختلاط مغربی معاشرے میں عام سی بات ہے۔جس کی تصویر اس ناول میں نظر آتی ہے۔مغربی معاشرے میں عورت اور مرد کی دوستی کوئی معیوب بات نہیں ہے۔لیکن ہمارا اسلامی معاشرہ عورت کو ایک خاص مقام دیتا ہے۔

کوہِ گراں:

چودھری ناول کا نمائندہ کردار ہے اور وہ گاؤں کی بحالی کے لیے مختلف کام کرنا چاہتا ہے اور وہ گاؤں کی بحالی کے منصوبے میں گڈو کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے۔وہ مغرب کی ترقی سے بہت متاثر ہے اور وہ سوچتا ہے

کہ مرد وعورت شانہ بشانہ ہر شعبے میں کام کرے تو مغربی معاشرے کی طرح ہم بھی ترقی کرسکتے ہیں۔ بہت سے لوگ اُس کے ساتھ شامل نہیں تھے کیونکہ وہ عورت کے گھر کی چار دیواری میں رہنے کے حق میں ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک اہم معاشرتی تبدیلی آئی تھی۔ مردوں کے جنگ میں جانے کی وجہ سے عورتوں نے فیکٹریوں، دفاتر، ہسپتالوں، سکولوں میں کام شروع کردیا۔ معاشی مجبوری نے عورت کو گھر سے باہر نکالا، جس دن وہ گھر سے نکلی ترقی کی راہ پر چل پڑی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغربی کلچر کی ترقی میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت کا بھی ہاتھ ہے اور وہاں کی دیکھا دیکھی ہمارے معاشرے میں بھی عورت کو ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ شامل کیا گیا:

> "ہم عورت کو جب تک ایک دماغ تصور نہیں کریں گے ہم کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔ یہی ہم میں اور مغرب میں فرق ہے۔ ہم عورت کو آدھا سمجھتے ہیں جب کہ وہ مکمل ہے اور بعض اوقات۔۔۔ "وہ ہنسا،" مکمل سے بھی زیادہ ہے۔ اگر غور کریں تو ہم جتنی بھی ترقی کریں، اس میں عورت کا ہاتھ ہو گا۔ سعودی عرب نے معاشرتی طور پر قطعاً ترقی نہیں کی اور اس کی وجہ بیرون از خانہ عورت کا ناپید ہونا ہے۔"[۶۱]

زیرِ نظر اقتباس میں مصنف نے عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے کے لیے اُبھارا ہے اور عورت کی تعریف کی ہے۔ مغرب کی ترقی دیکھتے ہوئے جب تک ہم عورت کو مکمل نہیں سمجھے گے ترقی ایک خواب ہی رہے گی۔ مغربی معاشرے میں عورت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہمارا اسلامی معاشرہ ہونے کے باوجود عورت کو معاشرے کا ایک فعال رُکن تصور نہیں کیا جاتا۔

دشتِ وفا:

خورشید ہاؤس میں رُخسانہ کے ملنے کی خوشی میں دوستوں نے خوب ڈرنک پارٹیاں لیں۔ جن میں ان کی گرل فرینڈز بھی پی پی کر قہقہے لگانے میں شامل رہیں۔ دوستوں کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ وہی قاضی والی رخسانہ ہے، ورنہ شاید وہ رخسانہ کو اپنے گروپ میں قبول ہی نہ کرتے۔ ناول میں رخسانہ کا کردار ایک بولڈ لڑکی کا ہے جو کہ پہلے قاضی کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کی نظر نجیب پر پڑتی ہے تو دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ رخسانہ اس کے اچھے دوست کی محبت ہے۔ یہ مغربی کلچر کی دین ہے جہاں پر لڑکی لڑکے کے ایک سے زیادہ لوگوں سے تعلقات استوار کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ جب قاضی کو رخسانہ کی بے وفائی کا علم ہوتا ہے تو نجیب اس کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اور قاضی مل کے

رخسانہ کے ساتھ تعلقات استوار رکھتے ہیں۔ جو کہ نجیب کو کسی صورت گوارہ نہیں کیونکہ وہ رخسانہ سے شادی کرنا چاہتا ہے نہ کہ ٹائم پاس کہ ایک وقت میں وہ دو لوگوں کی محبوبہ رہے۔ قاضی کی یہ بات سن کر اُسے دھچکا سا لگتا ہے:

> "شراب'عورت اور اسلحہ کبھی جوٹھا نہیں ہوتا۔ دیکھو حقیقت پسند بنو۔ یہ کمرشل دور ہے۔ نہیں چلے گی تمہارے شاہ مرید اور طوکلی مست والی آفاقی محبت۔ بیل گاڑی والا عشق۔ لڑکیاں اب دل سے نہیں ذہن سے سوچتی ہیں۔ کیلکولیٹر پر محبت کرتی ہیں۔ مرد کے لیے یہی ذلت کیا کم ہے کہ عورت اسے ٹھکرا جائے۔ ساتھی بدل لے۔ عورت یا کرائے کی بس کے پیچھے بھاگنے میں تو بڑی تذلیل ہوتی، منہ پر ڈیزل کا دھواں گرتا ہے۔ ویسے میں تمہارے لیے اتنی قربانی دے سکتا ہوں کہ وہ بیک وقت ہم دونوں کے ساتھ رہے۔"(۶۲)

اِس اقتباس میں نجیب کو قاضی سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ عورت کے پیچھے بھاگنا ہم مردوں کی تذلیل ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا ایک خاص مقام ہے کہ وہ غیرت کی پہچان ہے مگر مغربی معاشرے کی اقدار کو اپنا کر عورت نے اپنی تذلیل خود کروائی ہے اور وہ خود بھی بے سُکونی کا شکار ہے۔ ایک وقت میں کئی مردوں سے مراسم مغربی عورت کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ ہمارے ہاں کی عورت کو یکساں حقوق نہ ملنے کے باوجود وہ مردوں کے ساتھ مراسم نہیں بڑھاتی تھی جبکہ اب مشرقی عورت بھی مغربی عورت کی دیکھا دیکھی اپنی عزت کا خیال نہیں رکھتی اور مردوں کے ساتھ مراسم بڑھاتے ہوئے نظر آتی ہے۔ جہاں مغربی کلچر نے ہماری ثقافت کو بحران سے دوچار کیا ہے تو وہیں اُس نے ہماری عورت کو شمع محفل بنا دیا ہے۔ جدت پسند بننے کے چکر میں ہم اپنی روایات سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مخلوط محفلوں کا اہتمام بڑے شوق سے کیا جاتا ہے۔ حقوق کے نام پر عورت آزادی مارچ کا حصہ بنتی نظر آتی ہے۔ اسلام نے چودہ سو سال پہلے جو عورت کو حقوق دیئے تھے آزادی کے نام پر وہ خود اپنے حقوق کا استحصال کرتی نظر آتی ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

ناول میں تُلسی اور فیاض کا تعلق الگ مذاہب سے دکھایا گیا ہے وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ فیاض جانتا ہے کہ ایک تو وہ حکیم صاحب کا ملازم ہے اور الگ مذاہب سے تعلق کی وجہ سے بھی وہ ایک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ قبیلے والے بھی اِس بات کو قبول نہیں کریں گے۔ فیاض ناول کا مرکزی کردار ہے، تُلسی کی منگنی بچپن میں ہی اُس کے کزن وُشنو سے ہو جاتی ہے اور شادی سے پہلے وہ فیاض سے ملنے کا آخری موقع تلاش

کرتی ہے۔ قدرت تُلسی کو موقع دے دیتی ہے، فیاض ڈیوڑھی میں سورہا ہوتا ہے کہ تُلسی اُس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اُس کو اُٹھانے کا طریقہ سوچتی ہے اور اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہے وہ فیاض کے جاگنے کے ڈر سے ہاتھ اُٹھا لیتی ہے۔ فیاض سونے کا ڈرامہ کرتا ہے کیونکہ اُس کو ڈر ہے کہ کہیں اُس کی وجہ سے بلوچ قوم پر حرف نہ آئے۔ یہ مغربی کلچر کی دین ہے کہ کس طرح ایک لڑکی اپنی اقدار یا معاشرے کے خلاف جا کر والدین کی غیر موجودگی میں دوسرے مذہب کے لڑکے سے ملنے کے لیے اُس کے پاس چلی جاتی ہے:

"آخر کار جب ہمت جواب دے گئی تو تُلسی نے فیاض کی پائنتی کی جانب پکے فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ اُس کے دونوں پیروں پر رکھ دیے۔ فیاض کی آنکھ نہ کھلی تو تُلسی نے پاگلوں کی طرح اُس کے پاؤں چومنے شروع کر دیے۔ فیاض اب گہری نیند میں تھا۔ تُلسی پاؤں چوم چوم کر تھکی تو منہ اس کے پیروں پر رکھ دیا۔ مایوسی حد سے بڑھی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔" (۶۳)

ایک لڑکی کا چھپ کر اپنے والدین کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر اپنے عاشق سے ملنے آنا اپنی روایات سے بغاوت ہے، یہ بغاوت مغربی کلچر کی دین ہے۔ اسلامی معاشرے میں عورت اپنے گھر والوں کی عزت کا پاس رکھتی ہے۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ کوئی غیر شرعی کام نہ کرے لیکن مغربی کلچر کی یلغار سے زیرِ نظر ناول میں تلسی اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکتی نظر آتی ہے۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

جاوید ناول میں ہیرو کے طور پر سامنے آتا ہے اور ہر منظر پر اس کو کسی نہ کسی عورت میں جنسی حوالے سے مبتلا دکھایا گیا ہے۔ آفتاب اور جاوید دونوں بیٹوں میں زمین آسمان کا فرق تھا ایک انتہائی سلجھا ہوا اماں کا فرمانبردار اور دوسرا اخلاقی حوالے سے پستی کا شکار کردار نظر آتا ہے جاوید کے لڑکیوں سے ہٹ کر عورتوں سے بھی تعلقات ہیں۔ لیکن اُسے اُن سب کے ساتھ گنے چُنے ہی جنسی قسم کے ایڈونچر کا موقع ملا۔ جاوید کے ماں، باپ میں علیحدگی کا سبب بھی یہی تھا کہ اُس کا باپ بھی دوسری عورتوں سے راہ و رسم بڑھاتا تھا اور جنسی تعلق قائم کرتا تھا جب اُس کے اپنے بیٹے نے یہی کام دہرایا تو اُس کا دل کیا کہ اُسے ڈانٹے اُس نے ڈانٹا بھی لیکن اپنے بیٹے کے کارنامے پر دل خوش بھی تھا کہ وہ باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ہماری ثقافت کے بحران کا ایک تاریک پہلو بھی ہے:

"جاوید کی کلاس ٹیچر نے انھیں فون کر کے بلایا تھا اور پھر یہ بتایا تھا کہ جاوید میاں بریک ٹائم میں اپنی کلاس کے اندر موجود تھے اور ایک لڑکی کو کس کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ سلطانہ بیگم

> نے اس ٹیچر سے احتجاج بھی کیا کہ میرے بیٹے نے کوئی زبردستی تھوڑا ہی کی ہو گی۔اس نے جو کچھ بھی کیا ہو گا وہ اس کے تعاون سے ہی ممکن ہوا ہو گا۔" (۶۴)

گھر کا ماحول خراب ہونے کی وجہ سے جاوید بھی نوجوانی کی ابتداء ہی سے بُرائیوں کا شکار ہے۔والدین کے لیے اپنے بچے کی غلطی کی اہمیت نہیں ہے، بلکہ وہ اُن میں سے ہیں جو دوسروں کو الزام دیتے ہیں۔جاوید کی والدہ بھی اُستانی سے یہی احتجاج کرتی نظر آتی ہے اور ایسی پشت پناہی ہی ثقافتی تنزلی کی راہ ہموار کرتی ہیں۔یہ بھی مغربی کلچر ہی کی دین ہے کہ وہاں والدین اپنے بچوں کے غلط کو بھی صحیح ثابت کرتے ہیں۔

پانی مر رہا ہے:

ناول میں نازنین کا کردار ایک طالبہ کی صورت میں سامنے آتا ہے اور وہ اپنے ساتھ پڑھنے والے لڑکے اسرار کو جو کہ ناول کا ہیرو ہے اس کو پسند کرنے لگتی ہے۔نازنین اور اسرار کا کردار ناول میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے جس کے گرد تمام کہانی گردش کرتی نظر آتی ہے۔نازنین کا گھرانہ مغربی کلچر یا اقدار کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے یونیورسٹی میں اسرار سے بہتر کوئی شخص نازنین کو نظر نہیں آتا اور وہ اُس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔نازنین لاہور کی یونیورسٹی میں پہلی بار اسرار سے ملتی ہے اور وہ سب دوستوں کو اپنے گھر میں منعقد ہونے والی اپنی سالگرہ کی دعوت میں مدعو کرتی ہے۔تقریب کے بعد سب لڑکے، لڑکیاں مختلف کھیل کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے اور خوب شور مچاتے ہیں ۔ لڑکے، لڑکیوں کا آپس میں اتنی رات گئے تک شور شرابہ کرنا کسی بھی طرح ٹھیک نہیں ۔یہ پارٹیاں اور ان میں رات گئے تک لڑکے لڑکیوں کا ساتھ رہنا یہ سب مغربی کلچر کی دین ہے جس کے اثرات ہماری ثقافت پر بھی نمایاں ہیں جس کی مثال ناول میں نازنین اور اسرار کا کردار ہیں:

> "سامنے اسٹیج پہ گیندے کی لڑیوں سے آراستہ جھولے پہ حسبِ توقع نازنین بیٹھی تھی، اکیلی، تنہا اور منتظر۔
>
> اسرار خاموشی سے جاکے اس کے پاس فرش پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ہوا میں مرغن کھانوں اور پھولوں اور ولائتی عطر کی خوشبو ٹھہری ہوئی تھی۔نازنین نے کسی عجیب سے کپڑے کا لمبا سارو پہلی لہنگا اور اونچی چولی پہنی ہوئی تھی۔جس میں سے اس کے مرمریں پیٹ کا کچھ حصہ عیاں تھا اور سر پہ جالی کا مدار دوپٹہ ٹکا ہوا تھا۔" (۶۵)

شادی بیاہ کے مواقع پر مغرب میں لوگ اپنے کلچر کے مطابق کپڑے پہنتے ہیں لیکن اب ہمارے ہاں بھی اُسی کلچر کا رنگ نظر آتا ہے۔ ناول میں اس کی مثال نازنین کا کردار ہے جو کہ پارٹی میں ایسا لباس زیب تن کیے نظر آتی ہے جس سے اُس کے جسم کا کچھ حصہ عیاں ہے۔

گراں:

گراں سے لوگ باہر ممالک کی طرف جانے لگے ان کے باہر جانے سے گاؤں میں بہتر سہولیاتِ زندگی کو اپنایا جانے لگا۔ سادگی کی جگہ اب مصنوعی زندگی نے لے لی تھی، پوٹھوہار کے اِس گاؤں میں دس گھر شامل تھے۔ مرد باہر کے ملکوں میں کمانے چلے گئے تھے اور ماؤں نے بچوں کو روات، سہالے، گوجر خان اور راولپنڈی کے انگریزی سکولوں میں داخل کروادیا تھا۔ مردوں نے خوب کما کر پیسہ بھیجا جس کی وجہ سے نئی طرز کے باتھ روم اور گھر بن گئے تھے، پہلے مردوں اور عورتوں کے لیے قدرتی لیٹرینیں ہوتی تھیں۔ باتھ رومز بننے سے اب لڑی ویران ہو گئی تھی یہ قدرتی لیٹرینیں عورتوں اور مردوں کے لیے مخصوص ہوا کرتی تھیں اور عورتوں کی لڑی کی سمت کبھی کوئی مرد نہ پھٹکا تھا۔ گاؤں میں بھی شہروں کی طرز زندگی کو اپنایا جانے لگا کیونکہ گراں سے بہت سے لوگوں نے بہتر سہولیات زندگی کے لیے باہر ممالک کا رخ کرنا شروع کر دیا:

"پتھروں سے اسارے ہوئے مکانات شاندار کوٹھیوں میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ جن کی چھتوں پر پانی کے ٹینک رکھے تھے۔ ٹھنڈے گرم پانی کی ٹونٹیاں لگی تھیں۔ گیزر اور ہیٹر چلتے تھے۔ اب چوے کا پانی کناروں کناروں بہتا تھا لیکن اسے پینے والا کوئی نہ تھا۔ فریج اور کولر کے ٹھنڈے پانی گھروں کے اندر دستیاب تھے۔ کوئی گھڑے بھرنے کی مشقت کیوں کرتا۔ پہاڑوں سے اُترتی چٹانوں سے منہ زور ٹکراتی آبشار ندی بن نشیب پُر شور بہتی تھی لیکن کپڑے دھونے کو کوئی عورت سر پر پنڈ اُٹھا کر پگڈنڈی نہ اُترتی تھی کہ اب تو واشنگ مشین کا رواج ہو چلا تھا۔ دیسی صابن کی جگہ واشنگ پاؤڈر استعمال ہونے لگا تھا۔ مونگ پھلی کے کھیت پہلے بٹائی پر دیئے گئے پھر بٹائی کرنے والے بھی مسقط اور دبئی میں سیکڑوں منزلہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے سمگل ہو گئے۔"(۶۶)

مغربی کلچر میں مشینوں کا استعمال جا بجا ہے، ہمارے ہاں بھی زندگی سہل پسندی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ پیسے کی رِیل پیل سے مکانات شاندار کوٹھیوں کی شکل اختیار کر گئے تھے، ٹھنڈے گرم پانی کی ٹونٹیاں تھیں۔ غرض وہ تمام سہولتیں مہیا کرنے کی کوشش کی گئی جو مرد مغرب میں دیکھتے تھے۔ جدید مشینری سے

استفادہ کیا گیا اس سے پہلے عورتیں کپڑے دھونے کے لیے سر پر پنڈ اُٹھا کر پگڈنڈی سے ندی کی جانب جاتی تھیں اب اُس کی جگہ واشنگ مشین نے لے لی ہے۔

ج۔ اقدار کا زوال:

عالمگیریت کو ایک ایسا پوشیدہ طوفان کہا جاتا ہے کہ جس نے کئی ممالک کی تہذیبوں اور مقامی شناختوں کو معدوم کر دیا ہے، عالمگیریت نے امریکی تہذیب اور کلچر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشرقی تہذیب کی خوبصورت روایات اور دلکش اقدار جو ہماری تہذیب کا جھومر تھیں ان کو بھی عالمگیریت نے آہستہ آہستہ مٹا دیا۔ ہمارے ملک میں مغرب سے آنے والے رجحانات کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یہاں جو افسر شاہی کا رواج بہت زیادہ ہے، وہ دراصل مغرب ہی کی دین ہے۔ اسلامی لحاظ سے تو افسر قوم کا خادم ہے لیکن ہمارے آفیسر تمام اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ناولوں میں ہمارے عہد کی ایک اہم تصویر پیش کی ہے، خلوص اور خدمت کے جذبے جیسی صفات کو ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ ان کی جگہ لالچ، ہوس اور مادیت پرستی نے ہمیں جکڑ لیا ہے، اقدار کے زوال کے بارے میں صبا اکرام نے لکھا ہے:

> "صنعتی ترقی کے ساتھ مادیت پرستی کی جڑیں بھی مضبوط ہوتی گئیں اور آدمی ہوس زر میں مبتلا ہو کر اس پستی پر آ گیا، جہاں پہنچ کر جھوٹ، فریب، ہیرا پھیری اور بدکاری کوئی برائی، برائی نہیں رہ جاتی بلکہ حصولِ زر کی راہ میں کارآمد حربہ ثابت ہوتی ہے۔"(۶۷)

اب ہمارے ہاں بھی دولت کا حصول لوگوں کا سب سے بڑا مطمع نظر ہے، یہی وہ رجحان ہے جس پر معاصر ناول نگار نے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل مغرب کی صنعتی ترقی کے بعد حالات نے کروٹ لی ہے اور دولت کی ہوس افراد کے اندر سرایت کر گئی ہے۔ پیسے کے حصول کے لئے لوگ اقدار، اخلاقیات کو نظر انداز کرتے ہوئے پیسہ حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ لوگوں کے اندر اب برائی کو برائی نہ سمجھنے کے احساس نے ایک المناک صورتحال کو جنم دیا ہے۔ ایک اور رجحان مغرب کی دین ہے جس نے ہماری مشرقی تہذیب کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ مغرب میں والدین جب بوڑھے ہو جائیں تو ان کی خدمت کرنے کی بجائے یا خود ان کی نگہداشت کرنے کے لیے ان کو اولڈ ہاوسز میں بھیجا جاتا ہے۔ اب اس المناک صورتحال نے جنم لے لیا ہے والدین جو اپنی اولاد کو جوان کرتے ہیں لیکن اولاد جب اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے، والدین کی خدمت کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ ان کی خود خدمت کرنے کی بجائے اولڈ ہاؤس میں چھوڑ

آتے ہیں۔ اب وہاں پر والدین شدید کرب کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مختلف لوگوں کی ہمدردی بھری نظریں انہیں اور بھی جذباتی اور نفسیاتی طور پر مار دیتی ہیں۔ یہ حالات دراصل اکیسویں صدی کی پیداوار ہیں:

"بیسویں صدی سے اکیسویں صدی کے سفر میں جس انداز سے انسانی قدروں اور تہذیبوں کو شکست ہوئی ہے، وہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے تاریخ کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔"(۶۸)

نفسا نفسی کے اس عالم میں اب اولاد نے والدین کو بھی بوجھ تصور کر لیا ہے اور ان کی خدمت خود کرنے کی بجائے ان کو حکومت کے قائم کردہ اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ دیا جاتا ہے، جہاں وہ قابل رحم زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی اقدار زوال عالمگیریت کی دین ہے، کسی زمانے میں بچوں کے رشتے والدین خود کرواتے تھے اب یہاں بھی صورتحال پوری طرح بدل چکی ہے۔ اکثر اوقات ہمارے عہد کی نسل کے فیصلے وقت گزرنے کے ساتھ منفی نتائج لے کر آتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے مثبت اقدار کو گرہن لگا دیا ہے، ان ناولوں میں بھی بڑی المناک تصویریں موجود ہیں۔ ایک لڑکی ہے جو ایک لڑکے سے محبت کر بیٹھتی ہے، پھر وہ جسمانی طور پر بھی نزدیک آجاتے ہیں، اپنے افعال کو وہ معیوب نہیں سمجھتے۔ لڑکا شادی سے کتراتا ہے اور آخر کار پھر لڑکی ہی کہتی ہے کہ والدین سے شادی کی بات کرو لیکن لڑکا اب بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ معاصر ناول نگاروں نے ژرف نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے اہم موضوع پر ناول تخلیق کیے ہیں۔

نوجوان نسل اب گمراہ ہوتی جا رہی ہے، ان میں سے کچھ لوگ تو جرائم کے پیشوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں ان کو اقدار نام کی کسی چیز کی خبر نہیں ہوتی وہ تو بس حصولِ زر اور فیشن سمجھ کر اپنا کام کرتے ہیں۔ نوجوان نسل میں غنڈہ گردی کا رجحان بہت فروغ پا رہا ہے، لوٹ مار، چوری اور شریف لوگوں اور باعزت شہریوں کی آبرو، مال اور جان پر شب خون مارنا ان کا وتیرہ بن چکا ہے۔ اب ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کی فلموں کی طرز پر نوجوان نسل کے کچھ لوگ ان کو کاپی کرتے ہیں پھر وہ ایسے راستے پر چل نکلتے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے:

"اس دور میں لوگ ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے ان کی عزت کی حفاظت کرتے تھے، اب تو وہ اقدار ختم ہو چکی ہیں۔ آج یہ حال ہے کہ اگر ساتھ والے مکان میں کوئی وقوعہ ہو جائے تو ہمسائے کو اس کی خبر نہیں۔"(۶۹)

آج جب ہم اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں پہنچ چکے ہیں تو ہم پر بہت سی باتیں واضح ہو چکی ہیں ہمیں اپنی تہذیب کی اقدار مٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ آج کا ناول نگار بہت باشعور ہے، ظلم کے تمام ذرائع تک اس کی رسائی ہے اس نے جنوں، پریوں اور اڑن کھٹولے کی کہانیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ زندگی کی تقریباً تمام جہات پر ان کی نگاہیں موجود ہیں، عالمگیریت کے نام پر جو سیلاب بلاخیز مغرب نے ہم پر مسلط کیا ہے اس کے بھی کچھ لازمی نتائج نکلتے تھے جو کہ کثیر نفسیاتی مسائل اور جنسی مسائل کی صورت میں سامنے آ چکے ہیں۔ جنس اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یہی صورتحال آج بھی نظر آتی ہے کہ ناول نگاروں کے ہاں نفسیات اور جنس قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نوجوانوں کے ہاں جنسی لذت حاصل کرنے کا رجحان نمایاں ہے، اب نوجوان نسل اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرتی ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اس عہد کا فرد اپنے جنسی جذبات کو قابو میں نہیں رکھتا بلکہ وہ اخلاقیات کی تمام حدوں کو توڑ کر انسانیت کے درجے سے نیچے گر کر حیوانی طرز کا ردعمل اختیار کرتا ہے۔ ہم اپنے جنسی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اب لوگوں کی نظروں میں حیا ختم، شرم عنقا اور جنسی جذبات پر قابو کی صلاحیت دم توڑ چکی ہے۔ اس رویے کی عکاسی معاصر ناول میں موجود ہے، جنس اگر ایک اہمیت کا حامل جذبہ تھا لیکن اس کو منفی انداز سے استعمال کرنے کی نہ ہماری تہذیب اجازت دیتی ہے اور نہ ہی اخلاقیات۔ لیکن اب ہمارے سماج میں جنسی تسکین کے لئے سب ناجائز ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے اور ساتھ انسانیت کو پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے۔ ایسے کئی واقعات میڈیا پر آئے روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔

معاصر عہد کا ایک اور نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کی ایجاد نے نوجوانوں اور بچوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ موبائل فون کا کثرت سے استعمال اور بے شمار قسم کے کاموں میں آج کا نوجوان اس قدر کھو چکا ہے کہ وہ اصل مقصد سے بہت دور ہوتا جا رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے فرد کو فرد سے بیگانہ کر دیا ہے، گھر میں رہنے والے بھی ایک دوسرے کو کم وقت دیتے ہیں بلکہ وہ موبائل اور لیپ ٹاپ پر کوئی کام کر رہے ہوتے ہیں۔ آج کی نوجوان نسل جدید ایجادات اور ٹیکنالوجی میں اس قدر گھس گئی ہے کہ اس نے اپنے خون تک کے رشتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ بچے جسمانی طور پر تو گھر میں ہوتے ہیں لیکن وہ اس دوران فیس بک، میسنجر اور واٹس ایپ پر ہوتے ہیں۔ اب تو انواع واقسام کی ایپس آ چکی ہیں جن پر آپ کو اخلاقیات کی تمام دھجیاں اڑتی ہوئی نظر آئیں گی۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے کوئی بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن نوجوان کی توجہ صرف موبائل پر ہوتی ہے۔ والدین بچوں سے بات کرنے کے لئے ترس جاتے ہیں، بچوں کو ان

جدید آلات سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان آلات نے ہمیں نفسیاتی طور پر جکڑ لیا ہے اور ہم ان کے سحر سے باہر نہیں نکل سکتے۔ دوسری طرف ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ معاصر نقادوں نے بھی اس جہت کی طرف اشارہ کیا ہے:

"موبائل فون اور ٹی وی کا غلط استعمال جیسی ہیجان انگیزی، منشیات کی سودے بازی، بے حیائی اور حرام کاری کی طرف بڑھتے ہوئے قدم نمود و نمائش اور حرام خوری ایسے موضوعات ہمارے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں بڑی شدت اور حقیقت کے ساتھ برت رہے ہیں۔"(۷۰)

موبائل فون نے مرد اور عورت کے درمیان میں فاصلوں کو تقریباً مٹا کر رکھ دیا ہے، موبائل فون اور ٹی وی اپنے زمانے کی اہم ایجادات ہیں۔ ان سے جہاں انسانی زندگی کو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں نقصانات کا شمار نہیں ہے۔ اس بات میں قطعی شک نہیں کہ ان کے بغیر انسانی زندگی چل نہیں سکتی تھی، آخر اس دور میں بھی لوگ خوش رہتے تھے جب یہ آلات نہ تھے۔ اس کے آنے کے بعد عجیب طرح کی صورتحال نے جنم لیا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تمام ناول نگاروں نے ہمارے سماج کی بے رحم تصویر پیش کی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور ایک بڑی بیماری ہے جو مغرب سے آنے والی ایجادات کے طفیل ہمارے معاشرے میں سرایت کر چکی ہے اور ہم نے اس کو اپنے خیالات پر اس قدر سوار کر لیا ہے کہ اب عورت اور مرد کا ملنا جلنا ایک عام سی بات معلوم ہوتی ہے پھر اس اختلاط کو عیب بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ ہماری توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف دلائی گئی ہے کہ نوجوان نسل اپنے جنسی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ پاتی اور اس بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف اشیاء کی ایجادات کے بعد اس کی تشہیر کے لئے جس انداز میں مہم چلائی جاتی ہے وہ قابلِ مذمت ہے: "اب اشیاء پیدا کر کے اس کی فروخت کے لئے تشہیری مہم چلائی جاتی ہے اور صارف کی نفسیات اس مہم میں حدف بنائی جاتی ہے۔"(۷۱)

سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، کمپنیاں نیم عریاں خواتین کے ذریعے اپنی اشیاء کی تشہیر کرتے ہیں جس سے افراد کی نفسیات پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک اور بات مشاہدے میں آئی ہے کہ معاصر ناول نگار نے اس موضوع پر کھل کر اظہار کیا ہے کسی بھی جگہ لگی لپٹی بات نہیں کی۔ بغیر شادی اور نکاح کے مرد اور عورت کا اختلاط اس نسل کا المیہ ہے۔ شادی اور نکاح سے قبل مرد اور عورت کا جسمانی طور پر قریب آنا نہ دین کی رو سے جائز ہے اور نہ ہی اخلاقی نقطہ نظر سے ٹھیک ہے۔ لیکن ہم

اس بیماری میں پوری طرح گرفتار ہو چکے ہیں، اب اس سے باہر نکلنا ناممکن نظر آرہا ہے۔ احساسِ گناہ دم توڑ دے تو پھر گناہ گناہ نظر نہیں آتا۔

ہم عصر اردو ناول میں ہمارے سماج کے اندر پائی جانے والی بیماریوں کی بے رحم انداز سے عکاسی کی گئی ہے۔ ادیب کو دراصل معاشرے میں جو پھوڑے نظر آتے ہیں ان پر تیر برسا کر ناول نگاران سے فاسد مواد نکالنے کی سعی کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں نوجوان نسل مغرب زدہ ہو چکی ہے، ان پر کسی قسم کی اسلامی اور اخلاقی تعلیمات کا اثر نہیں ہوتا۔ ہمارے عہد کی نسل اپنے جنسی جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اپنا نقصان خود کر دیتی ہے۔ دوسری طرف آج کے فرد نے اپنی ضرورتوں کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ وہ ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ آسائشات بھری زندگی نے انسان کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ جب فرد کو تمام چیزیں حاصل نہ ہوں تو وہ نفسیاتی طور پر مایوس ہو جاتا ہے اور یہ صورتحال جنم لیتی ہے۔ آج کا فرد داخلی سطح پر تنہائی کا شکار ہے، اس نے اپنی ضرورتوں میں بے جا اضافہ کر کے اپنے لئے خود ہی مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ پھر انسان اپنے لیے بڑے بڑے سپنے دیکھتا ہے، پھر ان منزلوں کی جانب گامزن ہونا چاہتا ہے کہ وہ کسی اور کام میں الجھ جاتا ہے۔ آسائش کی زندگی گزارنا آج ہر کسی کا خواب ہے، کچھ اس کو پورا کر لیتے ہیں اور کچھ پورا نہیں کر سکتے وہ مایوس ہو کر زندگی سے ہی تنگ آجاتے ہیں۔ قناعت جو سب سے بڑی دولت ہے ہم اس کو چھوڑ چکے ہیں، ہم تو دن بدن اپنی زندگی کو تن آسان بنا رہے ہیں۔

اب نوجوان نسل نے عشق و محبت کے نام پر جو کھیل شروع کر دیا ہے اس کی عکاسی بھی معاصر ناول میں نظر آتی ہے، ہمارے معاشرے کی کڑوی سچائی کو آج کے ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ نوجوان نسل اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتی اور اس جذبے میں بہہ جاتی ہے اور اس سلسلے میں تمام دینی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتی ہے۔ اگرچہ جنسی جذبہ ایک طاقتور جذبہ ہے، اسلام نے اس کو پورا کرنے کے لئے واضح اصول بنائے ہیں۔ اگر ہماری نسل کا نوجوان ان پر عمل پیرا ہو تو یقیناً جنسی آسودگی بھی پائے گا اور دنیا و آخرت میں کامیاب بھی ٹھہرے گا۔ ورنہ یہ جذبہ جس قدر طاقتور ہے تو حالات سدھرنے کی بجائے جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے مزید بگڑنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاصر اردو ناول پر عالمگیریت کی گہری چھاپ دکھائی دے رہی ہے۔ دیہاتی زندگی کے بدلتے تناظر، وہاں پر ہونے والی تبدیلیاں اور شہر کی مصنوعی زندگی کی چھاپ نے دیہات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے افراد کو بہت قریب کر دیا ہے، وہ دنیا کے ایک کونے میں

بیٹھ کر دوسرے کونے میں بات کر سکتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔اس طرح دیہات بھی اب عالمی گاؤں کا حصہ بن چکے ہیں،دوسری طرف مغربی تہذیب کا سیلاب بلاخیز پورے جوبن پر ہے۔اس کی وجہ ان لوگوں نے سائنسی اعتبار سے ترقی کی ہے، جس کی وجہ سے ان کی تہذیب پوری دنیا میں عالمگیریت کے نام پر پھل پھول رہی ہے۔ ہمارے ہاں ان ایجادات کے منفی اثرات بھی دکھائی دے رہے ہیں جن پر سیر حاصل گفتگو ہوئی ہے۔ مغرب سے آنے والی اقدار کو ماڈرن کہہ کر اپنایا جارہاہے۔ جس سے ہماری مشرقی تہذیب کی حسین اور دلکش روایات اب ختم ہوتی جارہی ہیں،عالمگیریت کے نام پر ہم تن آسان ہوتے جارہے ہیں۔ سہولتوں بھری زندگی ہمارے اندر سے مجاہدانہ اور سپاہانہ شان ختم کر دے گی۔زیادہ تر نوجوان نسل ٹیکنالوجی کا استعمال کثرت سے کرتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے جنسی اور نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کی صحت پر برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔عالمگیریت کے نام پر اس وقت دنیا کا جو نقشہ تشکیل دیا جارہاہے اس کا احساس معاصر ناول نگار کو ہے یہی وجہ ہے جب وہ لکھنے پر بیٹھتا ہے تو اس کے سامنے اس کے دور کے بہت سے موضوعات ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے ناولوں میں برتتا ہے۔وہ کسی ایک ہی مقصد پر نظر مرکوز نہیں کرتا بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے ناول نگار کے ہاں موضوعات کی کثرت نے اس کو ہر قاری کے لئے دلچسپ بنادیا۔معاشرے کے ہر رنگ کو کسی نہ کسی صورت میں معاصر ناول نگار نے اپنے ناولوں میں دکھایاہے۔دراصل آج کا ناول نگار بھی اپنے آپ کو عالمی گاؤں کا حصہ سمجھتاہے، ژرف نگاہی اور گہرے مشاہدے سے اپنی تحریروں کو مزید شوخ اور رنگا رنگ بناتا ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

احمد بخش حساس طبیعت کا مالک ہے۔اپنے ارد گرد ہونے والے ظلم وجبر پر وہ کُڑھتا ہے لیکن وہ ایک کمزور کردار کا مالک ہے۔اپنے اِرد گرد کے وحشت زدہ اور ظالم سماج سے بھاگ کر وہ امریکہ چلا جاتا ہے۔احمد بخش کے بچے جیسے بڑے ہوتے ہیں، وہ عدم تشویش کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ امریکا جیسے جنسی بے حیائی والے ملک میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بچوں کے بڑے ہونے سے پہلے اپنے ملک واپس چلا جائے کیونکہ کسی دوسرے ملک کی ثقافت کو اپنانا بہت سے مسائل کو پیدا کرتا ہے۔پاکستان سے دور جانے کے بعد پردے کی اہمیت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔اس کی مثال احمد بخش کا کردار ہے اس اقتباس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

"اپنے یہاں کی ہر چیز سے اٹھنے والی فرسودگی کی بُو نے اتنے سال اسے واپس لوٹنے سے خاموشی

سے روکے رکھا تھا، ورنہ جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے جارہے تھے وہ اور اُولا دونوں امریکا کی جنسی بے حیائی اور دہشت کی زندگی سے برگشتہ خاطر ہوتے جارہے تھے۔ واپس جانا جب آسان رہتا جب ہومر چار سال کا تھا اور سیلی ایک کی۔ دونوں عرصے سے سوچتے تھے کہ بچوں کے پوری طرح جوان ہونے سے پہلے کہیں اور جا کر رہنا چاہیے۔" (۴۲)

وطن سے محبت ایک اہم قدر ہے، یہاں پر احمد بخش کا کردار اِس سے انصاف کرتا نظر آتا ہے۔ امریکا میں رہتے ہوئے وہ اپنے بچوں کے لیے عدم تحفظ کا شکار ہے اور جلد واپس وطن لوٹنا چاہتا ہے۔ لیکن بہت سی مجبوریوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوتا۔ وطن سے دوری اور باہر ملک شادی کی وجہ سے دھنی بخش اپنے بچوں کو اپنی اقدار منتقل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

روشن اندھیرے:

ناول میں شجاع کا کردار ایک شریف آدمی کا ہے جو کہ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی خود کو ہر قسم کی گندگی سے دور رکھتا ہے۔ شجاع کا تعلق ایک رپورٹر کمپنی سے ہے، اس کمپنی میں اس کے خلاف کافی حاسد بھی پیدا ہوگئے اور جلد ہی وہ رپورٹر کی جگہ شوبز کے حوالے سے خبریں لانے کے لیے چن لیا گیا۔ جہاں اس کا آمنا سامنا مختلف قسم کے لوگوں سے رہنے لگا۔ شجاع کو ایک پارٹی میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، جس میں اُس کی ملاقات بیگم شہوانی سے ہوتی ہے جو اکیلی بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے سیٹھ افراسیاب کو دیکھا جو ایک لڑکی کے ساتھ ڈانس میں مصروف تھا۔ اِن پارٹیوں میں رات گئے تک ناچ گانا اور شراب پینا بہت معمولی سی بات ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ تمام چیزیں ہمارے ہاں اقدار کی پستی کا باعث ہیں کیونکہ ہمارا مذہب بھی ہمیں ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتا:

"بڑی مہربانی۔" میں شاید کچھ اور کہتا کہ یکدم میوزک بدل گیا، اس کی آواز تیز ہوگئی اور روشنی مدہم کر دی گئی۔ تبھی ایک طرف سے کافی ساری لڑکیاں ہیجان خیز لباس میں آن وارد ہوئیں۔ وہ میوزک کے ساتھ تھرک رہی تھیں۔ ماحول یکدم ہی بدل گیا۔ عامر کی شاید کسی ماڈل سے دوستی چل رہی تھی، وہ اس کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنی میز پر جا بیٹھا۔" (۴۳)

مخلوط محفلوں کا انعقاد ہائی سوسائٹی میں عام سی بات ہے۔ اُس میں ناچ گانا، شراب اور عریانی معمولی بات ہے اور ان سب چیزوں نے ہماری اقدار کو بہت متاثر کیا ہے۔ مغربی کلچر کو اپناتے ہوئے ہم اپنی اقدار سے

دور ہو گئے ہیں۔ لبرل ازم کے نام پر فحاشی زندگیوں میں رچ بس گئی ہے۔ جس کو ہم شجاع اور بیگم شہوانی کے کرداروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

صفر سے ایک تک:

مرزا اطہر بیگ کے ناول کا مرکزی کردار "ذکی" ایک کمپیوٹر جنیئس ہے جس کا تعلق دیہات سے ہے۔ ذکی کے ساتھ ہی اُس کے بھائی ثناء اللہ کا بھی ذکر ہے جس کو ماں، باپ کی کم ہی توجہ ملتی ہے۔ ثناء اللہ گاؤں کی کسی لڑکی سے عشق کرتا ہے اور اُسے برادری میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اُس سے شادی کی ضد کرتا ہے مگر وہ مصّلیوں کی بیٹی تھی۔ والد صاحب ذات پات کے سخت قائل تھے وہ اپنی ذلت کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مصّلی کُنبے کو گاؤں بدر کروا دیا اور ثناء اللہ کی شادی کا بندوبست کر دیا۔ مگر ثناء اللہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اُس کے بھائی ثناء اللہ کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ فرار ہو جاتا ہے۔ ثناء اللہ ذات پات کی اِس تفریق کا بدلہ لینے کے لیے مختلف عورتوں سے شادیاں کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ ذات پات کو بہت اہمیت دیتے ہیں جس کی وجہ سے دیہاتوں میں لڑائی جھگڑا دیکھنے کو بھی ملتا ہے جو کہ خون خرابے کا باعث ہوتا ہے۔ ناول میں اس کی عمدہ مثال بھائی ثناء اللہ کا کردار ہے، جو کہ مصلیوں کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہو کر انتقام لیتے نظر آتے ہیں:

> "ہوا اصل میں یہ کہ۔۔۔ میں بات مختصر کروں گا۔۔۔ کہ بھائی ثنااللہ عنفوانِ شباب سے بھی کچھ پہلے ہی گاؤں کے مُصلی جاموں کی بیٹی سُگو کے عشق میں گرفتار ہو کر اُس سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی ضد کرنے لگے۔ والد صاحب سالار برادری کے منشی ہونے کے باوجود مُصلیوں کی بیٹی کو بہو بنانے کی ذلت کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔" (۴۷)

زیرِ نظر اقتباس میں ثناء اللہ کا کردار ہمیں مصلیوں کی لڑکی کے عشق میں گرفتار نظر آتا ہے اور عشق میں ناکامی کا بدلہ وہ مختلف عورتوں سے بے وفائی کی صورت میں لیتا ہے۔ عورت کی عزت ہمارے معاشرے کی اہم قدر ہے جس کو ثناء اللہ پامال کرتا نظر آتا ہے۔

نو لکھی کوٹھی:

ولیم کافی سالوں بعد ہندوستان لوٹتا ہے اور اُس کو بیورو کریسی کی نوکری ملتی ہے۔ وہ اپنے باپ، دادا کی طرح سول سروس کے لیے منتخب ہو جاتا ہے۔ وہ زرعی اصطلاحات اور تعلیم عام کرنے کے حوالے سے بہت سے کام کرواتا ہے۔ اُس نے تحصیل میں تعلیم، آب پاشی اور مالیات کے حوالے سے بہت کام کیا۔ وہ مختلف

عہدوں پر رہا اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی انگلینڈ جانے سے انکار کر دیتا ہے۔اِس کے بیوی ، بچے انگلینڈ چلے جاتے ہیں مگر وہ نو لکھی کو ٹھی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔وہ حکومتِ پاکستان کو درخواست دیتا ہے کہ پاکستانی شہری ہونے کے ناطے مجھے ملازمت دی جائے اُسے کہا جاتا ہے کہ وہ شہریت کے لیے وزارتِ داخلہ کو درخواست دے۔اُس سے بنگلہ چھین لیا جاتا ہے اور وہ کہیں اور چلا جاتا ہے اور مر جاتا ہے اور وہیں دفن ہو جاتا ہے۔اُس کے پاس عشاء کے بعد سب لوگ حویلی میں جمع ہوتے ہیں اور ولیم کے بارے میں باتیں کرتے ہیں یہ سب لوگ غریب، غرباء اور مزراع قسم کے تھے وہ ولیم کا احترام کرتے تھے۔امراء کو ولیم کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ولیم کے بیوی ، بچوں نے گھر بدل لیا اس لیے اُسے اُن کے بارے میں کچھ معلومات نہ تھیں۔ اُس نے دوستوں کی مدد سے بھی اُن کا پتہ کرایا مگر کچھ خبر نہ ملی۔ آخر کار ولیم کو محل سے بھی ہاتھ دھونا پڑا اور زندگی کے آخری ایام اُس نے ایک محل کے پاس جھونپڑی میں گزارے جو کہ ہمارے اقدار کا زوال ہے کہ کس طرح ہم کسی انسان کو اتنا حقیر خیال کرتے ہوئے بے بس چھوڑ دیتے ہیں:

> "اِس معاملے میں اشرافیہ تو ایک طرف، مدت ہوئی، اُس کے اپنے بیوی بچوں نے بھی اُسے بالکل بھلا دیا تھا۔پہلے پہل اُنہوں نے دو تین چکر لگائے اور ولیم کو بھی سرسری انگلستان جانے کا مشورہ دیا لیکن جب ولیم نے سختی سے اِس بات کو رد کر دیا تو وہ آہستہ آہستہ اُسے بھولنے لگے اور اب نوبت یہاں تک آگئی کہ ولیم کے خطوں کا جواب بھی نہیں دیتے تھے ایک آدھ بار جواب دیا بھی، تو وہ ایک دو سطر میں ایسا سرسری تھا، جسے خط کے نام پر مذاق کہہ لینا چاہیے۔" (۷۵)

زیرِ نظر اقتباس میں ولیم کے بیوی بچے اُسے انگلستان جانے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن اُسے نو لکھی کوٹھی سے محبت ایسا کرنے سے روکتی ہے۔اس کا خاندان اسے چھوڑ کر انگلستان چلا جاتا ہے جہاں پر جانے کے بعد اس کے بیوی بچے اُسے بھلا دیتے ہیں۔خاندان معاشرے کی ایک اہم اکائی ہے اور اُس سے محبت ایک اہم قدر ہے، ولیم کا خاندان اس قدر کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔

ناتمام:

ناول میں ڈاکٹر کا کردار ایک شریف آدمی کا ہے، اور یہ کردار جب صائمہ کلینک میں نوکری کے لیے جاتی ہے تو تب سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے۔ماں، باپ کی رضامندی سے اُن کی شادی ایک امیر آدمی کی بگڑی ہوئی بیٹی سے کروا دی جاتی ہے جس کا تاوان اُن کو ساری عمر دینا پڑتا ہے۔اُس

کی غلط ٹھیک تمام باتیں ماننی پڑتی ہیں۔ کیونکہ شروع ہی سے وہ اُکلوتی ہونے کی وجہ سے من مانی کرنے والی تھی۔ رات گئے مردوں کے ساتھ واپس آتے ہوئے گھر میں کام کرنے والوں نے بھی دیکھا لیکن کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر کی طرف سے ہونے والی معمولی سی غلطی سے بھی درگزر نہ کیا جاتا۔ ڈاکٹر شریف آدمی ہے مگر بیگم صاحبہ مادر پدر آزاد ہیں اور ابھی بچوں کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔ لالہ، ڈاکٹر کی دوسری شادی کروانا چاہتا ہے جب وہ گھر کی ایک پارٹی میں بیگم صاحبہ کو شراب پیتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ صاحب کی ہاں کے انتظار میں ہے کہ وہ شادی کی خوشخبری کب سناتے ہیں:

"مسٹر عیاش۔ ایک تم سے سنبھالی نہیں جاتی۔ سہیلیاں، رکھیلیں، ملنے جاتے ہو۔ راتیں وہاں گزارتے ہو۔ ہسپتال میں سارا حساب چیک کروں گی۔ کہاں ہوتی ہیں۔ ہر ہفتے کانفرنسیں۔ جھوٹے، مکار، فریبی اپنی اوقات دکھادی۔ گندی کلاس، مڈل، پنچ ذات سارے شہر میں تمہیں بدنام نہ کیا تو۔ جیسے تم نے مجھے بدنام کیا، میرے ممی پاپا کے سامنے۔ شہریار کی تمھیں بہت تکلیف تھی کہ اس سے کیوں ملتی ہوں۔ میرے افیئرز چبھتے تھے۔ بہت شور مچاتے تھے۔ شریف بنتے تھے۔ اس لیے کہ تم اندر سے غلیظ ہو تمھاری نیت بد ہے۔"(۷۶)

زیرِ نظر اقتباس میں جب ڈاکٹر کی بیوی کو صائمہ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ اُس کے ساتھ لڑتی ہے اور اُسے جھوٹا، مکار اور فریبی کہتی ہے۔ اُسے بدنام کرنے کی دھمکی بھی دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک عورت دوسری شادی کر کے کسی عورت کا گھر خراب کرنا چاہتی ہے جب کہ ڈاکٹر کی بیوی بھی اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے اپنا گھر خراب کرتی ہے۔ ہمارے ہاں اقدار کے زوال کا باعث ہے کہ ایک عورت جانتے ہوئے بھی کہ مرد شادی شدہ ہے پھر بھی اس سے شادی کی خواہشمند ہوتی ہے۔ عورت گھر کی ملکہ بننے کی بجائے شمع محفل بننے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔

میر واہ کی راتیں:

خیر النساء نذیر کی چاچی ہے جو اپنے شوہر سے کم عُمر ہے، کم عُمری ہی کی وجہ سے وہ احساسِ محرومی کا شکار رہی کہ اُس کو اپنے حصّے کی خوشیاں نہیں مل سکیں۔ وہ اُولاد جیسی نعمت سے بھی محروم رہی جس کی وجہ اُس کے شوہر کا عُمر میں اُس سے بڑا ہونا ہے۔ نذیر لاپرواہ اور لوفر سا ہے اُس کا باپ اُسے بھائی کے پاس بھیج دیتا ہے، جو پیشے کے اعتبار سے درزی ہے۔ جہاں پر جا کر نذیر کو چاچی میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، جس میں اقدار کا زوال دکھایا گیا۔ کیونکہ یہ رشتے احترام وعزت کے قابل ہوتے ہیں لیکن ناول میں اِس کے برعکس ہے۔ نذیر کی محبت

کو دیکھتے ہوئے چاچی بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی اور اپنے شوہر کو نیند کی گولیاں کھلا کر رات نذیر کے ساتھ گزارتی ہے۔ دونوں کو اگلی صبح اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اوراس کے بعد نذیر اپنے چاچے کے گھر کو چھوڑ جاتا ہے۔ ناول میں مختلف جگہ ہمیں اس طرح کے اقتباس ملتے ہیں:

"وہ سوچتا جارہا تھا کہ اسے چاچے کے پاس رہتے ہوئے چھ مہینے گزر گئے تھے۔ اس دوران اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی کہ چاچی خیر النسا اس کے بارے میں کسی بدگمانی میں مبتلا ہو جاتی۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی۔۔ بالکل جس طرح بھابی خدیجہ اسے اچھی لگتی تھی۔ چاچی کا جسم پرکشش تھا اور اسے چوری چھپے دیکھ کر وہ لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔" (۷۷)

نذیر کا اپنی چاچی کی طرف التفات اور اُس کے بارے میں بُرے خیالات اور اپنے چاچے کی امانت میں خیانت کرنا ہماری اقدار کے زوال پذیر ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کس طرح نذیر اور اُس کی چاچی اپنی نفسانی خواہشات سے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اس پر کوئی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتے اور رشتوں کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کوہِ گراں:

حلیم کی طرح دیسو بھی ناول کا مرکزی کردار ہے اگرچہ وہ ناول کا ہیرو نہیں ہے پر کہانی میں شروع سے آخر تک موجود رہتا ہے اور چودھری کے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ چودھری کو گاؤں سے بہت محبت ہے وہ گاؤں میں فلاحی کام کرنا چاہتا ہے۔ گاؤں واپس آنے کے بعد دیسو اُس کو سارے حالات بتاتا ہے۔ چودھری کے دماغ میں گاؤں کی حالت بہتر کرنا ہے وہ اُن لوگوں کے ساتھ بھی مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہے جن کو وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ حلیم اُصول پسند آدمی ہے اُس کی بے اُصولی صرف عورتوں سے تعلقات تک ہے۔ حلیم بھی موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اُن لوگوں کا ساتھ دینے کو تیار تھا جو اچھے نہیں تھے لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔ ناول میں اس کی مثال گڈو اور دیسو کے ساتھی ہیں:

"گڈو اُس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور اُس کے بدن کی متقاضی تھی کہ وہ اُس کے ساتھ جنسی رشتے میں منسلک ہو جائے اور شاید وہ خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن جسمانی لذت سے اُسے اپنے مقصد کا حصول زیادہ اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کا بدن ہمیشہ مرد کی منزل کی سمت پیش قدمی کو روک کر اسے ایک خواب میں لے جاتا ہے جس میں سے وہ تب ہی نکل پاتا ہے جب منزل کو کوئی اور سر کر چکا ہو۔" (۷۸)

گڈو اپنی جنسی تسکین کے لیے حلیم کے ساتھ لیٹ جاتی ہے حالانکہ وہ جانتی ہے کہ حلیم کے اُس کی ماں کے ساتھ بھی تعلقات ہیں لیکن اُس کا مقصد صرف جسمانی مقصد کا حصول ہے۔ اقدار کے زوال کی سب سے بڑی دلیل عورت کا اپنی نسوانیت کے درجے سے گر جانا ہے۔

دشتِ وفا:

رخسانہ کا تعلق ناول میں ایک غریب گھرانے سے ہے جہاں اس کا والد پیسوں کے لیے اس کی شادی کر دیتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد ہی وہ بیوہ ہو کر گھر لوٹ آتی ہے۔ اور پیسے کمانے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تلاش کرتی ہے اسی اثناء میں قاضی کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ کیونکہ رخسانہ کے ماں، باپ کے ساتھ اس کے بچے بھی ہیں جن کا پیٹ پالنے کے لیے اسے محنت کرنا پڑتی ہے۔ ناول میں اس کی پوشاک سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کا تعلق غریب گھرانے سے ہے۔ نجیب اور قاضی آپس میں گہرے دوست ہیں لیکن رُخسانہ کو پانے کے لیے نجیب اپنے دوست کو دھوکا دیتا ہے۔ رُخسانہ بھی اپنے مقصد کو پانے کے لیے دونوں کو دھوکا دیتی ہے۔ جب قاضی کو نجیب کی اس حرکت کا علم ہوتا ہے تو وہ اُسے منع کرتا ہے کہ رُخسانہ میری امانت ہے تم اُس کے ساتھ راہ و رسم نہ بڑھاؤ مگر نجیب پر کچھ اثر نہیں ہوتا ہے۔ رُخسانہ ایک کایاں لڑکی ہے وہ پہلے قاضی سے محبت کا دعویٰ کرتی ہے بعد میں جب نجیب اُس پر دل ہار بیٹھتا ہے تو رُخسانہ بھی اُس کے پیار کا جواب مثبت دیتی ہے۔ قاضی نجیب کو رُخسانہ کی اصلیت بتا دیتا ہے کہ اس کے تین بچے ہیں اور اُس نے اپنے شوہر کو زہر دے کر مارا تھا۔ جس پر رُخسانہ بتاتی ہے کہ میرے شوہر نے مجھے جسم فروشی پہ مائل کرنا چاہا اور بے زار آ کر ایک دن میں نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا۔ نجیب اُسے معاف کر دیتا ہے اور اُس کے اسلام آباد جانے کے بعد رُخسانہ ایک سیٹھ کو قتل کر دیتی ہے۔ نجیب کا انسپکٹر دوست اُسے بتاتا ہے کہ رُخسانہ ایک پیشہ ور عورت ہے۔ یہ ہمارے اقدار کا زوال ہے کہ انسان کسی چیز کو پانے میں اس حد تک اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قریبی رشتوں کو بھی دھوکا دینے سے بھی باز نہیں آتا:

> "نجیب مفت میں بلائینڈ کر رہا تھا۔ شاید قاضی کی خاطر یا شاید رخسانہ کے لیے، وہ فیصلہ نہ کر سکا، جو بھی فوٹوگرافی ہوتی۔ نجیب نہایت ہی خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈبل پرنٹ بنواتا۔ رخسانہ کی تصویریں رکھ کر باقی سبھی تصویریں اور نیگیٹو وہ قاضی کے حوالے کر دیا کرتا۔ ایک بار اس نے رخسانہ کی تصویر مانگی تو قاضی چونک اٹھا۔ "کیا کرو گے، بھابھی تو بہن سمان ہوا کرتی ہے۔

تمہارے پاس کیا البم ہیں۔ لالچ بری بلا ہے۔" (۷۹)

نجیب کا اپنے دوست قاضی کو دھوکا دینا معاشرے میں خرابی کا سبب بنتا ہے۔ دوستی بہت پاکیزہ جذبہ ہے جب نجیب قاضی سے رُخسانہ کی تصویر مانگتا ہے تو قاضی چونک کر اُسے کہتا ہے کہ بھابھی تو بہن کی طرح ہوتی ہے۔ جس کو سن کر نجیب کو پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا لیکن وہ رُخسانہ کو خود کی طرف مائل کرلیتا ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو مرد و عورت کی دوستی کو ہمارے معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے جو بذاتِ خود بہت سی برائیوں کی جڑ ہے۔ دشت وفا میں جہاں ایک طرف عورت کی مختلف مردوں سے دوستی اور اُن سے فائدہ اٹھانے کو بیان کیا ہے، وہیں مرد کی بے وفائی اور عورت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا دکھایا گیا ہے۔ رخسانہ کا شوہر اُسے جسم فروشی پر مجبور کرتا ہے جس کا بدلہ لینے کے لیے وہ اسے زہر دے کر مار دیتی ہے اور اس بعد میں وہ مختلف مردوں کے ساتھ اپنے بہتر مستقبل کے لیے تعلقات استوار کرتی نظر آتی ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

تُلسی ناول کا مرکزی کردار ہے۔ سوڈھی، تُلسی کا خالو ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا ہونے والا سسر بھی ہے جو کہ غلیظ خصلت کا شخص ہے۔ جس کے اپنی سالی کے ساتھ بھی تعلقات ہیں اور ہونے والی بہو پر بھی نظر ہے۔ تُلسی اپنی ماں کو ہر بار یہ بات سمجھاتی ہے مگر وہ کان نہیں دھرتی۔ سوڈھی ہمیشہ اِس کے باپ کی غیر موجودگی میں اُن کے گھر آتا ہے۔ اُس کے آتے ہی تُلسی کی ماں کا وہ غصّہ جو اپنے شوہر کے گھر آنے پر عروج پر ہوتا ہے، غائب ہو جاتا ہے اور اُس کی جگہ مسکراہٹ لے لیتی ہے۔ وہ سوڈھی کو لے کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ تُلسی اپنے باپ کے آنے کی دُعا کرتی ہے کہ وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور اپنی بیوی اور ہم زلف کے کارناموں سے آگاہ ہو جائے۔ یہ اقدار کا زوال ہی ہے کہ لوگ مقدس رشتوں کا بھی خیال نہیں کرتے:

"تُلسی کا ذہن شاید ابھی اور چکراتا، بھنوالیاں کھاتا اگر اُس کی ماں اور چاچا سوڈھی بے شرمی سے اس کے پاس آکر یہ نہ پوچھتے کہ کون آیا تھا۔ حکیم صاحب کے بے گاہ اور بے وقت آنے پر دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور آگے پیچھے حکیم کے کمرے میں چلے گئے۔ تُلسی ابھی تک وہیں کی وہیں دالان میں کھڑی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی سوچ کے کسی زاویے کا کہیں سے بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔ تُلسی کو رہ رہ کر غصہ آرہا تھا تو صرف اپنے باپ پر۔ کیا اُس کا کام صرف ایسی گائے پالنا رہ گیا ہے۔ جو دودھ کہیں اور جا کے دیتی ہے۔" (۸۰)

یہاں رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے سوڈھی بیک وقت بہت سے لوگوں کے ساتھ دھوکا کر رہا ہے۔ حکیم اپنی بیوی اور ہم زلف کے متعلق ایسا گمان بھی نہیں رکھتا۔ماں بیٹی کو دھوکا دے رہی ہے کہ اس کے ہونے والے سسر کے ساتھ غلط تعلق بنا کر بیٹھی ہے۔ تلسی ایک غیر مذہب لڑکے کی محبت میں گرفتار ہے اور اُس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

زرینہ ایک شادی شُدہ مگر نفس کی غلام عورت ہے، جس کو جاوید اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے اور اس کے دل میں زرینہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔وہ زرینہ کے گھر پہنچ جاتا ہے اور اس کا نمبر لے کر اُس سے فون پر باتیں کرتا ہے۔ زرینہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں جاوید کے فلیٹ میں چلی جاتی ہے اور اُس کی جنسی تسکین کا ذریعہ بنتی ہے۔اپنے گھر میں اِس کو بلاتی ہے اور فون پر بھی رابطہ رکھتی ہے۔وہ یہ سب کرتے ہوئے بھول جاتی ہے کہ عورت کی عزت کیا چیز ہے۔وہ جاوید کی چِکنی چپڑی باتوں میں آجاتی ہے اور اپنا سب کچھ بنا سوچے سمجھے اُس کے حوالے کر دیتی ہیں۔اس بات کا بھی لحاظ نہیں رکھتی کہ وہ پہلے سے شادی شُدہ ہے:

> "فرینڈشپ کرنا چاہتے ہو؟" زرینہ نے کہا اور جب دیکھا کہ کچھ لمحوں تک جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا تو اپنا رُخ اس کی طرف پھیر کر یہی سوال اپنی آنکھوں سے پوچھا۔جاوید سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ زرینہ نے یکایک اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔
>
> "چلو آج سے ہم تم فرینڈ۔ٹھیک ہے؟" وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی اور اس کے نرم ہاتھ کی ملائمت جاوید کے وجود میں سرایت کر گئی۔" (۸۱)

ہمارا معاشرہ عورت اور مرد کی دوستی کے خلاف ہے،ہماری اِقدار میں مرد عورت کی عزت کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اِس اقتباس میں زرینہ ،جاوید کو دوستی کا کہتی ہے،جاوید ابھی جواب دینے کا سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ زرینہ اُس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔یہاں دیکھا جائے تو عورت اپنے معیار سے گر کر حرکتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آگے چل کر زرینہ اور جاوید تمام حدود کو پھلانگ لیتے ہیں جو کہ ہماری اقدار کے زوال کا باعث ہے۔

پانی مر رہا ہے:

ناول میں اللہ یار کا کردار اسرار کے والد کا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ زمین پر عجیب الخلقت مخلوق کا بسیرا ہے، جہاں لوگ ڈر کے مارے دن کو بھی نہیں جاتے۔اسرار وہاں بھوریوں کو آباد کرنا چاہتا ہے۔اسرار کا بھائی محسن چاہتا ہے کہ اِس بات کا فائدہ اُٹھا کر وہ اسرار کو راستے سے ہٹا کر تمام جائیداد پر قابض ہو جائے۔اللہ

یار کی موت سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے اوراُس کے بعد سب نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر باؤاسرار ضد نہ کرتا تو یہ سب نہ ہوتا اسرار کی ضد سے ہر مصیبت آتی ہے۔ کچھ بوڑھوں کا خیال تھا کہ جب تک وہ گاؤں سے دور رہا سب کچھ ٹھیک تھا اُس کے آتے ہی آفتیں نازل ہونا شروع ہو گئی۔ دوسری طرف محسن کی سوچ سے بھی زیادہ بہتر طریقے سے اسرار راستے سے ہٹ گیا اب وہ آرام سے جائیداد پر قابض ہو سکتا تھا۔ یہ چیزیں ہمارے اقدار میں زوال کا باعث ہیں کہ انسان جائیداد کے حصول میں کس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے خونی رشتے بھی نظر نہیں آتے:

"وہ پلنگ پہ پڑا اپڑا قہقہے لگایا کرتا تھا اپنی فتح اور اسرار کے فرار پہ۔ اسے یہ سوچ کر بھی بہت خوشی ہوتی تھی کہ آج اسرار ان ہی بھوریوں میں پناہ گزین ہے، جن کو ختم کرنا اس کا منصوبہ تھا۔ یہاں آکر وہ پھر میاں اللہ یار کی ماں بہن کو چیدہ چیدہ گالیوں سے نوازتا کہ اتنا روپیہ ہونے کے بعد اسے بھوریوں کو آباد کرنے کی کیا موت پڑی تھی؟ پھر وہ مینے کی موت پہ کچھ افسردہ ہوتا، لیکن یہ سوچ کر صبر کر لیتا کہ اچھا ہوا، راہ کا ایک کانٹا اور کم ہوا۔ اس نے آگے نہ کبھی سوچا اور نہ وہ سوچنا چاہتا تھا۔"(۸۲)

بہن بھائیوں کی محبت جو ہماری ایک اہم قدر تھی وہ بھی یہاں پر زوال پذیر نظر آتی ہے۔ جائیداد کے لالچ میں محسن اِس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اُسے اپنے بھائی کی تکلیف بھی نظر نہیں آئی اور وہ مینے کی موت کا یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ اچھا ہوا جائیداد کا ایک اور وارث کم ہوا۔

گلُ مینہ:

آج اتنی ترقی ہو جانے کے بعد بھی کچھ قبائل میں ابھی تک پیسوں کے عوض لڑکیوں کو فروخت کیا جاتا ہے جبکہ اسلام آنے کے بعد اس طرح کی رسوم ورواج کا قلعہ قمع کر دیا گیا تھا یہ چیزیں ہماری اقدار کے زوال کا باعث ہیں ۔ گُل مینہ اپنے دادا کے دیئے ہوئے اعتماد کی وجہ سے اپنے نظام کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے۔ اُس کے بھائی اُسے پچاس ہزار کے عوض ایک بوڑھے ملک عطاءاللہ کے ساتھ باندھنا چاہتے تھے۔ تین دن پہلے دادا کی موت کی وجہ سے اُس کے گھر والوں نے زرجان کو رشتہ مانگنے پر صاف انکار کر کے گھر سے نکال دیا لیکن گُل مینہ زرجان سے بہت پیار کرتی ہے۔ یہ اُس کا پیار ہی تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ جاتی ہے، دل میں اُسے خوف بھی ہوتا ہے کہ اُس کی آنے والی زندگی کیسی ہو گی۔ ملک عطاءاللہ اچھا آدمی نہیں اُس نے مس فرزانہ کو بھی نوکری چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بعض قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ وہ

اپنی بیٹیوں کو پیسوں کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ ناول میں اس کی مثال گل مینہ کا گاؤں ہے جہاں پر ملک عطاء اپنے اثرورسوخ کی بناء پر لڑکیوں کو خریدتا ہے:

"پتہ نہیں قصور کس کا تھا۔ بڑے بھائی کا جو پچاس ہزار روپے لے کر اسے اگلے جمعے بڈھے کھوسٹ ملک عطااللہ جان کے کھونٹے سے باندھنا چاہ رہے تھے، جس کے چند بچے کھچے دانت نسوار کھا کھا پیلے پڑ گئے تھے، اور جو ہنستا تھا تو لگتا ہے کہ کھانس رہا ہے اور جب کھانستا تھا تو لگتا تھا ہنس رہا ہے۔ 'ساری زندگی ملکیانی بن کر راج کرے گی، راج،' سب یہی کہتے تھے۔ لیکن وہ خود سے بڑی عمر کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اماں بن کر راج نہیں کرنا چاہتی تھی۔" (۸۳)

زیرِ نظر اقتباس میں ایک قبائلی علاقے کی ثقافت کو پیش کیا گیا ہے، جہاں پر عورت کا استحصال شروع سے ہوتا آیا ہے۔ اُن پر زندگی کا دائرہ بہت تنگ کر دیا جاتا ہے۔ اسلام نے بہن، بیٹی کا بہت مقام رکھا ہے مگر اس اقتباس میں گُل مینہ کے بھائی اُسے پچاس ہزار کے عوض بیچ رہے ہیں جو کہ عورت کی بہت بڑی تذلیل ہے۔

گراں:

گاؤں سے لوگوں کے باہر جانے کے بعد وہاں کے لوگوں کی طرزِ زندگی میں تبدیلی آنے لگی۔ پتھروں کے بنے گھر عالی شان کوٹھیوں میں تبدیل ہونے لگے، ڈالروں کی رِیل پیل سے گاؤں میں رہنے والے ولائیتی کہلانے لگے۔ اپنی اُولاد کے ساتھ بھانجے، بھتیجوں نے بھی نئے ماڈل کی گاڑیاں خریدیں۔ امپورٹڈ گھڑیاں، عینکیں، بیگ، کپڑے اور جوتے خریدے جانے لگے۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر لمبی ڈرائیونگ کے ساتھ ریستورانوں سے کھانے کھائے جاتے۔ ایک شخص باہر جا کر محنت کرتا اور اس کا پورا خاندان دوسرے گراؤں میں رِشک سے دیکھا جاتا۔ وہ خود وہاں دن رات محنت کر کے پیسے جوڑتے اور خاندان والے جھوٹی شان و شوکت کی خاطر پیسہ اُڑاتے۔ یہ ہماری اقدار کا زوال ہے کہ ہم خود کو معاشرے میں اونچا ظاہر کرنے یا اپنی نمود و نمائش کے لئے یہ تک بھول جاتے ہیں کہ ہمارے رشتے دار یا عزیز جو باہر ہیں وہ کس مشکل سے زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ ہم پیسے پانی کی طرح بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کی مثال گراں میں موجود گھرانہ ہے:

"جس گھر کی تعمیر کے لیے اُس نے سالوں پٹرول پیا اور ٹیکسی کے ٹائروں سے چھٹتی دھول پھانکی ہو۔ اکلاپے کی راتوں کو اس شیش محل کے تصورات سے سجایا ہو۔ جس کے مکیں جدید آسائشوں کے عادی ہو چکے ہوں، جو نئی دولت کی خیرگی میں خود کو ایلیٹ کلاس کہتے ہوں۔ وہ اس مزدور شکل،

اَن پڑھ اُجڈ دیہاتی کو گھر کا سربراہ بنا کر کیسے متعارف کرواسکتے ہیں، جو اس گھرانے کا سودا سلف لانے والا بابا تو ہوسکتا ہے، فرد نہیں۔۔۔ وہ تو اسی سن میں اسی مالی حیثیت میں اُس ذہنی سماجی کیفیت کے قالب میں مقید ہوچکا تھا۔" (۸۴)

اِس اقتباس میں پردیس میں رہنے والے اُس شخص کے جذبات بیان کیے گئے ہیں جو بہت محنت سے پیسہ کماتا ہے اوراپنوں سے دوری بھی سہتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر واپس آتا ہے تو اپنے ہی اُس کو متعارف کرواتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ پردیس میں رہنے والے شخص کے دل میں وطن اور اپنوں کی محبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی تمام کمائی اپنے پیاروں پر خرچ کر کے خوش ہوتے ہیں لیکن ہماری اقدار کا زوال ہی ہے کہ وہی پیارے اُسے واپسی پر کوئی مقام نہیں دیتے۔

د۔ دیہی و شہری اسالیبِ زندگی:

جو لوگ دیہات میں رہائش پذیر ہیں یا چھوٹی چھوٹی بستیاں اور آبادیاں بنا کر رہتے ہیں انہیں دیہی سماج کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ دیہی معاشرہ بعض خصوصیات کی وجہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ دیہی معاشرے میں لوگوں کے گھر کُھلے کُھلے ہوتے ہیں ایسے معاشرے میں رہنے والوں کے مکانات اکثر کچے ہوتے ہیں البتہ اب پاکستان کے دیہی علاقوں میں بھی پکی اینٹوں کے مکانات تعمیر کرنے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ دیہی معاشرے میں لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جو لوگ کاشت کاری نہیں کرتے وہ لوگ بھی کاشتکار کے معاون کے طور پر کام کرتے ہیں جیسے ترکھان، لوہار اور کمہار وغیرہ۔ البتہ اب وقت بدلنے کے ساتھ گاؤں کے پیشوں میں بھی تبدیلی آرہی ہے اور لوگ پڑھ، لکھ کر ملازمت اور کاروبار کی جانب مائل ہونے لگے ہیں۔ دیہی معاشرے میں تعلیم کا معیار انتہائی پست ہے، اکثر لوگ اِن پڑھ ہیں اور جو پڑھے لکھے ہیں اُن کی تعلیم بھی پرائمری سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ دیہاتوں میں مڈل اور ہائی سکول دور ہونے کی وجہ سے لوگ بچوں کو پانچویں تک تعلیم دلوانے کے بعد اپنے ساتھ کام پر لگالیتے ہیں۔ دیہاتوں میں لوگوں کی بڑی تعداد آبائی پیشوں سے وابستہ ہے۔

دیہی معاشرے میں لوگ دکھاوے اور فضول رسموں پر بے تحاشا رقوم خرچ کرتے ہیں، موت ہونے کی صورت میں تیسرا، قل، ساتہ، اکیسواں، چالیسواں اور اس کے ساتھ اب سالانہ ختم کی رسومات پر نہ چاہتے ہوئے بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی حال شادی کے موقع پر بھی ہے ولیمہ کا کھانا اور جہیز دو ایسے کام ہیں جو ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر کرتا ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں میں عزت بنانے کی خاطر دیہاتی لوگ

ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ بے شک ان رُسومات کی ادائیگی پر لیا گیا قرض ادا کرتے کرتے قبروں میں چلے جائیں۔ دیہاتی لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مرغن غذاؤں کی بجائے دودھ، لسی سے روٹی کھاتے ہیں اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ تعلیم کی کمی کے سبب دیہی سماج کے لوگ سماجی تبدیلیوں کو تیزی سے قبول نہیں کرتے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اثرات اِن پر غالب آجاتے ہیں۔ چونکہ دیہی سماج ثقافتی اقدار کی حفاظت کرتا ہے اس وجہ سے اِن کی اقدار میں جلد تبدیلی نہیں آتی۔ قدیم رسم و رواج سے محبت اس معاشرے کی خصوصیت ہے۔ دیہی معاشرے کے باسی مذہبی اقدار سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور وہ اِن پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے۔ اِن کی بنیادی ضروریات کے لیے سکول، مسجد، مدرسہ، دکانیں، آٹا پیسنے کی چکی، حکیم، ڈاکٹر یا ڈسپنسر، مولوی، نمبردار، چوکیدار اور ڈاکخانہ کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود اب شہروں کی جانب نقل مکانی کا رُجحان بڑھ رہا ہے۔

شہری معاشرہ کو اگر دیہی معاشرے کی ترقی یافتہ شکل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، شہری معاشرے میں آبادی گنجان ہوتی ہے۔ لوگوں کے گھر ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مکانات پختہ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں جہاں پر گیس، بجلی اور پانی وغیرہ کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ کئی گھروں اور علاقوں میں ٹیلی فون کی سہولت بھی میسر ہوتی ہے اگرچہ موبائل فون کے آنے سے یہ سہولت دیہی معاشرے کے لوگوں کو بھی میسر ہو گئی ہے۔ شہری معاشرے میں ہر جگہ پختہ سڑکیں، سولنگ اور پکی نالیاں ہوتی ہیں جو نکاسی آب کی سہولت فراہم کرتی ہیں۔ شہری معاشرے میں لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور صرف ضروری کام یا مقصد کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس معاشرے میں رہنے والے لوگوں کا کسی ایک پیشے سے منسلک ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہاں لوگوں کے زیادہ تر پیشے کاروبار، تجارت، صنعتی پیداوار، سرکاری و نیم سرکاری ملازمت وغیرہ ہیں۔ دیہی طبقہ کی نقل مکانی کے باعث یہاں رہائشی مکانوں کی قلت ہے اور اکثر لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔

تعلم یافتہ اور ترقی پسند ہونے کے سبب شہری معاشرے کے لوگ معاشرتی تغیر کی نئی سکیموں کو جلدی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس معاشرے میں زندگی بہت تیز ہو چکی ہے، ٹیلی فون، انٹرنیٹ، موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں سے مستفید ہو کر یہ لوگ دنوں کا کام گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرتے ہیں۔ شہری معاشرے میں رہائش بھی سماجی درجہ بندی کے لحاظ سے اختیار کی جاتی ہے۔ اعلیٰ افرد کے لیے جدید طرزِ رہائش پر مبنی پلاٹوں والی کالونیاں ہوتی ہیں۔ اِسی طرح متوسط لوگوں کے لیے درمیانے درجے کی رہائشی

سکیمیں ہوتی ہیں اور ادنیٰ درجے کے لوگ تنگ گلیوں اور کم سہولتوں والی آبادیوں میں رہتے ہیں۔لوگ پُرانی اقدار کی بجائے جدت پسند ہوتے ہیں اور نئی اقدار کو جلد قبول کر لیتے ہیں جن میں مکانات اور بالوں کے نئے ڈیزائن، نئی طرز کے پہناوے اور لباس، سلائی کڑھائی کا نیا فیشن اور بناؤ سنگھار کی نئی نئی مصنوعات شامل ہیں۔ شہری سماج میں رہنے والے شادی بیاہ کے معاملے میں ذات برادری کی قدیم روایات کی پابندی نہیں کرتے بلکہ جہاں رشتہ مناسب ہو وہاں شادی کر دی جاتی ہے جبکہ دیہات میں یہ سب ممکن نہیں۔

سائنسی ترقی میں تیز رفتاری آنے کی وجہ سے ہر چیز میں تبدیلی ہوتی گئی ۔ جس کی بدولت شہروں اور گاؤں میں فاصلے کم ہوتے جارہے ہیں دیہات کے ساتھ جو فطرت نگاری مخصوص تھی اب آہستہ آہستہ وہ ختم ہوتی جارہی ہے اور اس کی جگہ شہر کی مصنوعی زندگی لیتی جارہی ہے۔ شہروں کو پھیلنے کا عارضہ لاحق ہونے کی وجہ سے شہروں کے اطراف میں جو گاؤں تھے اب وہ شہر کے مرکز میں آچکے ہیں۔ تیزی سے سادگی اور فطری ثقافت کے خاتمے اور بدلتی ہوئی اقدار پر معاصر ناول نگار بھی نوحہ کناں دکھائی دیتا ہے۔پہلے وقتوں میں ماحول پرُسکون تھا، آبادی کم ہونے کی وجہ سے شور کی آلودگی کم تھی لیکن آج کے دور میں آبادی بڑھنے کی وجہ سے شہر بہت گنجان ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں آج کا انسان سکون کی تلاش میں سر گرداں نظر آتا ہے۔ دیہاتی تہذیب جس میں بڑے بڑے کچے مکانات ہوا کرتے تھے اب بالکل بدل چکی ہے، اس پر بھی شہری زندگی غالب آتی جارہی ہے، شہری زندگی کا شور، مصروفیت اور بے سکونی نے دیہاتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ رہن سہن کے طریقے پوری طرح بدل چکے ہیں۔ گاؤں کی سخت زندگی کی بجائے تن آسانی عام ہو گئی ہے:

> "ادب کسی ایسے معاشرہ کے آغوش میں نموپذیر ہوتا ہے جو اپنی ایک ثقافت رکھتا ہے اور زندگی کے حسن وقبح کو پرکھنے کا ایک پیمانہ رکھتا ہے۔ادب کے ذریعے معاشرہ کے افراد اپنے احساسات وافکار کا اظہار کرتے ہیں۔"(۸۵)

دیہاتوں سے نقل مکانی کے باعث کئی نئے مسائل نے جنم لیا ہے، شہری کلچر دیہاتی کلچر پر غالب آچکا ہے۔ شہری ہی کیا بلکہ مخصوص تہذیبیں اور ان کی ثقافت وقت کے ساتھ ختم ہوتی جارہی ہیں۔ آج گاؤں تو برائے نام دیہات رہ گئے ہیں، وہاں بھی تمام جدید سہولیات میسر ہیں، سائنسی ترقی نے گاؤں کی پرسکون فضاء کو تو بہت متاثر کیا ہے۔ وہاں پر بھی ہمیں جدید اشیاء کا استعمال نظر آتا ہے، پچاس کی دہائی یا اس سے قبل جو ناول نگار ہمارے سامنے آئے تھے انہوں نے دیہی معاشرت کے خوبصورت مناظر پیش کئے۔ اب ناول نگاروں

کے ہاں یہ بات نظر آتی ہے کہ شہر اور دیہات کا فرق مٹ رہا ہے شہری تہذیب دیہات پر غالب آتی جا رہی ہے۔

معاشرہ کو بالعموم دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اوّل تو سر بر آوردہ طبقہ ہے جو آسائشوں کے حصار میں اپنی زندگی گزارتا ہے اور اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود شرافت اور بلندی کے مراتب کا ایک خوشنما لبادہ زیب تن کرلیتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو پس ماندہ، مفلس اور زندگی کی آسائشوں سے محروم ہوتا ہے انہیں ہم عوام یا جمہور کہتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں مگر طبقہ اولیٰ کے بالمقابل کم لیکن یہ طبقہ چمک دمک اور آب ورنگ سے یکسر محروم ہوتا ہے جو اعلیٰ طبقہ کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرہ ایک اور پہلو سے دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے:

> "پہلی جماعت شہری، دوسری جماعت دیہاتی علاقوں میں رہنے والے افراد کی ہوتی ہے۔ پہلے طبقہ میں رسوم ورواج، اقدار و معیار میں تیز رفتار تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شہری طبقہ میں انتقال مکانی کر کے آنے اور جانے والے لوگوں کا سلسلہ قائم رہتا ہے اوران کے اثرات معاشرہ کے مختلف ثقافتی پہلوؤں پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس دیہی طبقہ اپنے رسوم ورواج ،اعتقادات اور اقدار و معیار پر سختی سے قائم رہتا ہے اور اس میں فکر و خیال کی تبدیلیاں بے حد سست رفتار ہوتی ہے اور اس میں کسی ہیئتی و فکری تبدیلی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔"(۸۶)

کاروانِ وجود:

کاروانِ وجود میں سارہ کی استانی این اُس سے بہت لگاؤ رکھتی ہے اور اُس کو بہتر مشوروں سے نوازتی ہے۔ وہ سارہ کو ریڈیو میں کام کرنے کا کہتی ہے، جس پر سارہ گاؤں کے لوگوں کا سوچتی ہے کہ وہ پُرانے خیالات کے لوگ ہیں۔ جب اُن تک یہ خبر پہنچے گی کہ سارہ ریڈیو اسٹیشن میں کام کرتی ہے تو اُس کے متعلق مختلف باتیں ہوں گی۔ اور اُس میں یہ سب باتیں سُننے کی ہمت نہیں ہے۔ آگے چل کر سارہ محسوس کرتی ہے کہ اس میں اُس کا اپنا قصور ہے کہ اُس نے لوگوں کا خوف خود پر طاری کر دیا ہے۔ کیونکہ این کے کہنے پر اُسے احساس ہوا کہ ٹھہرے ہوئے جوہڑ جیسی زندگی کا انتخاب اُس نے خود کیا تھا اُس میں لوگوں کا کیا قصور تھا:

> "سارہ میں نے کل ٹام سے بات کی ہے کہ برٹش کونسل کے وظیفوں کے سلسلے میں تمہارا نام بھی لندن بھیج دیں۔ اور دوسری بات یہ کہ مجھے اپنے یونیورسٹی میگزین کے لئے ایک کمپیئر کی ضرورت

ہے کیا تم یہ کام سنبھال سکو گی؟ ہفتے میں ایک بار ریڈیو سٹیشن جانا پڑے گا۔"" ریڈیو سٹیشن؟" چلتے چلتے سارہ ٹھٹک گئی۔" دوست! ہمارے گاؤں میں کھلبلی مچ جائے گی۔لوگ باتیں بنائیں گے۔ " وہ خود ہی اپنے محفوظ خول سے نکلنے سے پہلے خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ پھر بہانہ بناتی تھی کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔" (۸۷)

اگرچہ دیکھا جائے تو سارہ کا تعلق شہر سے ہے لیکن اپنی اُستانی کے ریڈیو میں کام کرنے کے مشورے کو سُن کر وہ پریشان ہو جاتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ آگے چل کر وہ سوچتی ہے کہ جب تک وہ خود لوگوں کے ڈر کو دل سے نہیں نکالے گی وہ آگے نہیں بڑھ پائے گی۔اصل ڈر لوگوں کا نہیں بلکہ خود میں فیصلہ نہ لے سکنے کی کمی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ شہر میں زندگی گزارنے کے باوجود جب بیرونِ ملک جاتی ہے تو وہ فیصلہ کر سکنے کی صلاحیت سے نابلد ہوتی ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

احمد بخش گاؤں کا واحد لڑکا ہے جو پڑھائی کے لیے شہر گیا ہے، شہر کی زندگی اُس کو بھلی لگتی ہے۔شہر میں سیر بینی کے مزے ہیں، اُس نے وقت کا اندازہ ایک لڑکی کے سکول جانے اور واپس آنے پر رکھا۔جب وہ اپنے نوکر کے ساتھ ایک طرف جاتی تو آٹھ بجے ہوتے اور جب واپس آتی نظر آتی تو دو بج کے دس منٹ ہوتے۔سڑک پار سامنے گھر کے کرایہ دار بدلتے رہتے تھے، جس سے نئے چہرے دیکھنے کو ملتے۔شہر میں بہت سی سہولتیں تھیں جن میں ہوٹل، کلینک، سکول اور کالج تھے مگر اِن کا فائدہ معاشرے میں موجود اُن لوگوں کو تھا جو پیسے والے تھے۔احمد بخش کو اُن ہوٹلوں اور اسپتالوں میں جا کر تکلیف ہوتی تھی۔اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شہر اور دیہات میں کس طرح کی سہولیات ہوتی ہیں اور ناول میں احمد بخش کا واحد کردار ہے جو کہ اس صورتحال کو دیکھ کے دکھی ہوتا ہوا بھی نظر آتا ہے:

"فائیو اسٹار ہوٹل، ٹین اسٹار کلینک، ففٹین اسٹار اسکول اور کولج لیکن صرف سوسائٹی کے ہاف پرسنٹ افراد کے لیے۔مجھے ان اسپتالوں اور ہوٹلوں میں جا کر تکلیف ہوتی ہے اس لیے واپس جانے کو دل نہیں کرتا ہے۔کوئی اس ملک میں جادو کی چھڑی پھرا دے میں جانے کو تیار ہو جاؤں گا۔ ہاں تو کولج کے زمانے میں مجھے کچھ لوگ ایک بیمار عورت کو پلنگ پر ہسپتال لے جاتے نظر آئے تھے۔ پلنگ پر اس لیے کہ وہاں ہر جگہ ایمبولینس ہیں نہ لوگوں کے پاس ٹیلی فون کیا اور پندرہ منٹ میں ایئر کنڈیشنڈ ایمبولینس آگئی اور اسپتال کے دروازے پر ٹرولی لیے مریض کا انتظار کرنے والے مل گئے۔" (۸۸)

زیرِ نظر اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ شہروں میں سہولتیں تو بہت زیادہ ہیں مگر وہ صرف پیسے والوں کے لیے ہیں۔ احمد بخش جب اپنے وطن واپس جانے کا سوچتا ہے تو اُس کو اپنے ملک کے حالات یاد آتے ہیں جب وہ شہر پڑھنے گیا تھا، وہاں پر کچھ سہولتوں کا فقدان تھا۔ اُس کے گاؤں کے حالات تو ابتر تھے ایک عورت کے بیمار ہونے پر اُس کو پلنگ پر ڈال کر ہسپتال لے جایا گیا۔ اس لیے کہ وہاں ایمبولینس اور ٹیلی فون کی سہولت بھی نہیں تھی۔ احمد بخش گاؤں اور شہر کی زندگی میں ایک واضح فرق محسوس کرتا ہے۔

روشن اندھیرے:

شجاع کو اپنے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کی جلن کی وجہ سے شوبز کی خبروں کے لیے چُن لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب اُسے شوبز کے حوالے سے کام کرنا ہوگا۔ اِس کے لیے اسے ان لوگوں میں کام کرنا پڑا جس سے اِس کو جان کا خطرہ بھی ہوا۔ اب اِس کی مختلف پارٹیوں میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہونے لگی۔ کیونکہ شوبز کی دُنیا میں مخلوط پارٹیاں عام سی بات ہے، شہروں میں مرد اور عورتوں کا رات گئے تک ساتھ رہنا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ نیلم سب لوگوں کا آپس میں تعارف کرواتی ہے اور ان کو بوتلوں کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے کہ تمام برانڈ کی بوتلیں ہیں جو جتنا چاہے پی سکتا ہے۔ یہ بات کہہ کر وہ سیٹھ افراسیاب کے پاس چلی گئی اور وہاں پر ہی بیٹھ گئی۔ پارٹی میں موجود بڑے بڑے لوگ منعقد تھے جو شجاع کے لیے بالکل نئے تھے:

> "خواتین و حضرات! یو آر ویلکم۔۔۔ آپ میں میرے چند مہمان ایسے بھی ہیں جو پہلے ایک دوسرے سے متعارف نہیں۔ میں فرداً فرداً تعارف کرائے دیتی ہوں" یہ کہہ کر وہ میزوں کے قریب جاتی رہی اور وہاں پر موجود لوگوں کا تعارف کرواتی رہی۔ وہاں پر دو سیاست دان تھے جن میں ایک رکن اسمبلی بھی تھا، دو ہی بیورکریٹ تھے اور ان میں ایک سیٹھ افراسیاب کے ساتھ آیا تھا۔"[۸۹]

اِس اقتباس میں ہمارے سیاستدانوں اور بیوروکریٹ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ رنگ و سُرور کی محفل کے دلدادہ ہیں۔ اِن محفلوں میں پینے، پلانے کا عام رواج ہے، مخلوط محفلیں رات گئے تک جاری رہتی ہیں۔ مصنف اس ناول میں شہری زندگی کے ایک پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح اپنے شعبے میں نام کمانے کے لیے شجاع مخلوط محفلوں میں جاتا ہے اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں سے متعارف ہوتا ہے۔ جہاں پینے پلانے کا عام دور چلتا ہے جو ہمارے معاشرے کی ایک اہم برائی کی طرف قاری کی توجہ دلاتا ہے۔

صفر سے ایک تک:

گاؤں میں لوگوں نے گھروں میں ہی کیاریاں بنا کر وہاں ضرورت کی سبزیاں وغیرہ لگا رکھی تھی تا کہ ضرورت پڑنے پر وہاں سے ہی کاٹ لی جائیں ۔ گاؤں میں بھی شہروں کی دیکھا دیکھی جہاں اور بہت سے سہولیات آگئی تھیں وہاں انٹرنیٹ بھی تھا، لیکن گاؤں میں اتنی بہتر سروس نہیں تھی سرور خراب ہونے کی وجہ سے ذکی زلیخا سے رابطہ نہیں کر سکا۔ماں ذکی اور ابا جی کو چھوڑ کر صحن کے اُس کونے کی طرف چلی گئیں جہاں پر ذکی نے دھینے، پودینے، لہسن، پیاز تقریباً ہر قسم کی سبزیوں کی کیاری بنائی تھی جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور انگریزی کی کتاب میں آملیٹ کا لفظ پڑھ کر اُس کے ذہن میں کترے پیاز دھینہ ملے انڈوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جو ہمیشہ ہی اُس کے گھر میں پکتے تھے اور وہ اُس کو پکوانے اور کھانے سے ہمیشہ ہی لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ ابا جی اور ذکی ماں کو کیاری کے پاس بیٹھتے ہوئے دیکھنے لگے، ابا جی نے ذکی کو بتایا کہ انھوں نے گاؤں میں بھی نیٹ کی سہولت سے استفادہ کیا تھا۔ لیکن سرور خراب ہونے کی وجہ سے انٹرنیٹ کی سہولت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ذکی زلیخا سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بیرونِ ملک کال کافی مہنگی پڑتی تھی۔ ابا جی نے وار گیم کی سی ڈی لگائی قریب تھا کہ وہ اُس گیم میں گم ہو جاتے کہ والدہ کی آواز آئی کہ سب کے لیے کھانا تیار ہے:

> "پھر میں نے انہیں پوچھا کہ کیا ان کا نیٹ کام کر رہا ہے۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ اگر یہاں ممکن ہو تو اپنی میل چیک کر لوں۔ زلیخا کے الفاظ دیکھے جیسے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔ نیٹ کا سُن کر ابا جی بھالیکے کے کسی نورے چھڈی کو گالیاں دینے لگے جس نے چند مہینے Server شروع کر کے بند کر دیا تھا کہ گاہک کوئی نہیں۔ زلیخا سے رابطے کے لیے سیل فون ہی تھا لیکن انٹرنیشنل رابطوں کے لئے اچھا خاصا مہنگا تھا، لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ واپس بھائی جان کے ڈیرے پہنچ کر رابطے کی کوشش کروں گا۔"[۹۰]

اس میں مصنف گاؤں کی سادہ زندگی کو خوبصورت پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ ذکی کی ماں نے گھر میں صحن کے ایک حصے کو گھریلو ضرورت کی سبزیاں اُگانے کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ وہ ذکی کے بچپن کو یاد کرتی ہے کہ کس طرح وہ اپنی کیاری میں سے دھنیا، مرچیں توڑ کر اُسے آملیٹ بنا کر دیتی تھی دیکھا جائے تو گاؤں بھی شہر کی زندگی سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ابا جی اور ذکی بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا ستعال کرتے نظر آتے ہیں، ذکی کے ابا کمپیوٹر پر گیم بھی کھیلتے ہیں۔ جدت کے آنے سے بڑے، بوڑھوں کی محفلیں ختم ہو گئیں ہیں جو کہ دیہی زندگی کا خاصہ تھیں۔

نولکھی کوٹھی:

ولیم ایک انگریز نوجوان ہے جس کو اپنے باپ دادا کی طرح ہندوستان میں اعلیٰ عہدے کے لیے چُنا گیا تھا۔ ولیم کو ہندوستان کی ہریالی سے بہت لگاؤ تھا اُس کے باپ نے اُسے تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے وہ نولکھی کوٹھی کی محبت میں ہندوستان واپس آیا تھا۔ واپس آئے ہوئے اُسے وہ تمام لوگ یاد آتے ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ ولیم کے دادا کو بٹیر لڑانے کا بہت شوق تھا اور اس کے ساتھ ان کو حقے کا بھی شوق تھا، لوگ تحفے میں انہیں حقہ پیش کرتے تھے۔ لوگ تحفوں کے عوض اُن سے زمینیں الاٹ کروا لیتے تھے، خود انھیں بھی باغات لگانے کا شوق تھا اور انھوں نے بہت سے باغات بھی لگائے تھے۔ اس اقتباس سے گاؤں کے ماحول کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

> "ویسے یہ سب تو چھیڑ خانی تھی، ورنہ بابا ہندوستان کو کسی قیمت چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ خاص کر وسطی پنجاب کے سرسبز میدانوں کو۔ جہاں اُن کے نوابوں کے سے ٹھاٹ تھے۔ ہزاروں مرغ، بیٹر اور گھوڑے پال رکھے تھے۔ بیٹر لڑانے کا شوق تو دادا کو بھی بہت تھا۔ حقے کا لپکا بھی اُنہی سے لگا۔ لوگ بابا کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے ایک سے بڑھ کر ایک چاندی کا حقہ تحفہ میں لے کر آتے۔ کئی لوگوں نے اُسی تحفے کے عوض بابا سے کئی کئی زمینیں الاٹ کروالیں۔ خود اُنہیں بھی زمین خرید کر باغات لگوانے کا بے پناہ شوق ہے۔" (۹۱)

ولیم ایک انگریز نوجوان تھا، مصنف نے اُس کی ہندوستان سے محبت کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اُس کو سرسبز کھیتوں اور کھلی فضا سے بہت پیار تھا جس کی وجہ سے وہ ہندوستان کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کا خاندان اُسے چھوڑ کر انگلستان چلا جاتا ہے، اُسے نولکھی کوٹھی سے بہت محبت تھی۔ مصنف نے نولکھی کوٹھی کا خاکہ بہت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ بہت کوشش کرتا ہے کہ اسے نولکھی کوٹھی مل جائے اور پاکستانی شہریت بھی حاصل ہو جائے۔ مگر مولوی کرامت جن پر وہ احسان کرتا ہے اُن کا پوتا وہ کوٹھی ایک پیر کو الاٹ کر دیتا ہے۔ ولیم کو نقل مکانی کرنی پڑتی ہے اور وہ کسمپرسی کی حالت میں انتقال کر جاتا ہے۔

ناتمام:

اماں حاجن کا کردار ایک بوڑھی عورت کا ہے جو کہ بیوہ عورت ہے۔ اِس کے شوہر کو سپاہی ہونے کی وجہ سے پینشن ملتی ہے جو اِس کے گزارے کے لیے کافی ہے۔ اِس کی شادی شُدہ بیٹی گجرات میں رہتی ہے،

جب اماں حاجن اپنی بیٹی کے پاس گجرات جاتی ہیں تو پورے محلے میں سب عورتیں بے قرار ہو جاتی ہیں۔ اماں سب لوگوں کی جان ہیں یہی حال صائمہ کے ابو اور دوسرے گھروں کا بھی تھا۔ صائمہ کے ابو اُن کو "ماں جی" کہتے تھے، مختلف تہواروں پر اُن کے لیے خاص طور پر جوڑا سلواتے تھے۔ گھر میں جو خاص شے پکتی وہ اماں کو چکھائی جاتی، اماں حاجن کے جانے سے محلے کی رُونق چلی جاتی تھی۔ اماں حاجن کو یہ مکان فوج کی طرف سے الاٹ ہوا تھا۔ پینشن سے دونوں میاں بیوی کا گزارا ہو جاتا تھا، مگر وہ کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا۔ مالی حالات بہتر ہونے کے باوجود کریم احمد پر ایک ہی دُھن سُوار تھی کہ باہر کے ملک جانا ہے۔ پیسوں کا بندوبست کر کے وہ باہر کے ملک چلا جاتا ہے مگر اماں حاجن سے رابطہ نہیں رکھتا اور وہ انتظار کرتی رہتی ہے:

> "جس بات سے اماں حاجن نہال ہوئی جاتی تھیں، وہ کریم احمد کا ان پر اعتماد تھا کہ وہ اسی مکان میں رہ رہی ہوں گی جہاں وہ انھیں چھوڑ گیا تھا اور یہ کہ اب تک اس کی منتظر ہوں گی۔ کریم احمد کبھی واپس نہیں آیا۔ اماں حاجن کی وفات سے دو ایک سال پہلے ایک دن دو تین حکومتی کارندے اماں حاجن کو ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ انہوں نے کچھ کاغذات پر ان سے دستخط لئے اور چند روز بعد ڈرائی پورٹ آ کر کریم احمد کا تابوت لے جانے کا کہہ کر چلے گئے۔ مغربی جرمنی کے شہر میونخ سے یہ تابوت مرنے والے کی آخری وصیت کی تعمیل میں یہاں لایا گیا تھا۔ سارا محلہ اماں حاجن کے ساتھ تابوت لینے گیا۔ اس روز اماں واقعی بیوہ ہو گئیں۔" (۹۲)

ناتمام ناول میں مصنف نے اندرونِ لاہور کی کہانی بیان کی ہے کہ کس طرح تمام لوگوں کی خوشیاں اور غم ایک ہی ہوتے ہیں۔ اماں حاجن کا شوہر مالی حالات کی بہتری کے لیے باہر ملک چلا جاتا ہے۔ اماں حاجن اُن کا انتظار کرتی ہے اور اُس کا یہ انتظار اُس کے شوہر کا تابوت آنے کے بعد ختم ہوتا ہے جس کو پورا گاؤں لینے جاتا ہے۔ مصنف نے خوبصورت انداز میں بزرگوں کی عزت اور اُن کی چھوٹوں سے محبت کو بیان کیا ہے۔ اماں حاجن اکیلی ہونے کے باوجود سب کی ماں ہیں ہر گھر میں اُن کے لیے ایک خاص مقام ہے۔ اماں حاجن کا کردار آج کے دور میں کم نظر آتا ہے، اماں کے شوہر کو اِس بات کا پختہ یقین تھا کہ اُن کی بیوی اُسی گھر میں اُن کا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہ اپنی وصیت میں اپنا جسدِ خاکی اُسی پتے پر بھجواتے ہیں جہاں اماں حاجن رہتی ہیں۔ اماں کے ساتھ سارا محلہ اُن کے شوہر کے تابوت کو لینے جاتا ہے جو کہ آج کے دُور میں بہت کم نظر آتا ہے۔

میر واہ کی راتیں:

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں کی زندگی پر شہروں کے اثرات بھی رونما ہوئے کیونکہ انسان نے بہتر سہولیاتِ زندگی کے لیے شہروں کا رُخ کیا۔ جب وہ واپس اپنے بزرگوں یا عزیز و اقارب سے ملنے گاؤں آیا تو اُس کے رہنے سہنے، کھانے پینے غرض ہر طرح کے طریقوں سے اُس کے اپنے بھی متاثر ہوئے۔ جیسے پہلے گاؤں میں بہت کم سہولیات میسر تھیں پر شہروں کی دیکھا دیکھی یہاں بھی بہتر سہولیاتِ زندگی ملنے لگی۔ اس کی مثال ناول میں گاؤں میں موجود سکول، محکمہ بہبودِ آبادی کا دفتر اور ذرائعِ آمدورفت ہیں۔ کیونکہ گاؤں میں بھی لوگ پہلے تانگہ گاڑی وغیرہ پر آتے جاتے تھے لیکن پھر وہاں پر بھی گدھا گاڑیوں کے ساتھ ساتھ سوزکیوں اور بسوں پر لوگوں نے سفر شروع کر دیا۔ سڑک کے کنارے واقع پرائمری اسکول سے بچوں کا شُور سنائی دے رہا تھا۔ محکمہ بہبودِ آبادی کے دفتر کا بورڈ لگا ہوا تھا، سڑک پر کافی رونق تھی:

> "دکانداروں کے چھڑکاؤ کی وجہ سے سڑک کیچڑ آلود ہو گئی تھی۔ گردوپیش کے دیہات سے گدھا گاڑیوں، سوزکیوں اور بسوں کے ذریعے قصبے میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ چائے خانے بھرنے لگے تھے اور وہاں ٹیپ ریکارڈ پر مشہور گانے بجنے لگے تھے۔"(۹۳)

اِس اقتباس میں گاؤں کے ماحول کی منظر نگاری کی گئی ہے قاری اپنے آپ کو اِس منظر کا حصّہ سمجھتا ہے۔ دکانداروں نے اپنی دُکان کے سامنے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہے جس سے سڑک پر کیچڑ ہو گئی تھی۔ دیہات سے گدھا گاڑیوں، سوزکیوں اور بسوں کے ذریعے اِرد گرد کے قصّبے سے لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ چائے خانے بھرنے لگے تھے جو کہ گاؤں کے ماحول کی خاصیت ہے، لیکن اِس کے ساتھ اگر دیکھا جائے تو لوگ پہلے تانگے پر آتے تھے جس سے فضَا دھوئیں سے پاک تھی۔ بسوں اور سوزکیوں سے فضَا گرد آلود ہوئی۔ چائے خانے بھرنے سے لوگوں کا رش ہوا جس کی وجہ سے بے سُکونی بھی پیدا ہوئی۔ جہاں پر پرندوں کی چہچہاہٹ گونجتی تھی وہاں ٹیپ ریکارڈ پر گانے بجنے لگے۔ گاؤں میں سہولتوں کے فقدان کے باوجود ایک طلسم ہے جس کو بیان کر کے مصنف، قاری کو اس طلسم کے زیرِ اثر کر لیتا ہے۔

کوہِ گراں:

اپنے منصوبے کا آغاز کرنے کے لیے چودھری حلیم گاؤں کا جائزہ لیتا ہے کہ وہ اپنے منصوبے کا آغاز کہاں سے کرے وہ باقاعدہ حکمت عملی کے تحت اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ گاؤں کا جائزہ لینے کے بعد وہ تھکاوٹ سے نڈھال واپس گھر آتا ہے تو اُس کو بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی۔ صحن میں لپائی

برائے نام تھی، صحن میں بکائن کے درخت کی چھاؤں تلے گاؤں اور اِس کے آس پاس کی عورتیں دوپہر گزارا کرتیں تھیں۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے بکائن سوکھ گئی تھی۔ کیونکہ جب چودھری نے یہ علاقہ دیکھا تھا تو اُس وقت یہاں درخت ہی درخت تھے، کھیتوں کے کنارے، ٹیوب ویل، حویلیاں، کنوئیں، ڈیرے، صحن، کچے راستے غرض جہاں بھی جگہ ملتی درخت لگا دیا جاتا تھا۔ فصلیں لہلہاتی تھیں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ دیسو جیسے کمی کمین اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے، ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق کام کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جدید سہولیاتِ زندگی کے لیے لوگوں نے دوسرے جگہوں کا سفر کرنا شروع کر دیا:

"گاؤں میں ایک ہی کنواں تھا جس پر زندگی اپنا ہی رنگ لیے تھی۔ یہ سب کو سکون اور آرام مہیا کرتا تھا۔ گرمیوں میں رونق دیکھنے کے لیے گاؤں کے بوڑھے اپنے اپنے حقے لے کر خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ صبح سویرے جھیر مشکیں بھر کر اہم گھروں میں پانی پہنچا دیتے۔ عورتیں دودھ بلونا شروع کرنے سے پہلے پانی لینے پہنچ جاتیں۔ اُس وقت ٹونٹی میں نہانے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو جاتا۔ کنویں پر ایک ہنگامہ ہوتا۔ اپنی باری پر یا باری سے پہلے پانی لینے یا نہانے والوں کا ایک دوسرے کے ساتھ دل لگی میں جھگڑا رہتا۔ جیسے جیسے دن چڑھتا، کنویں پر لوگوں کا جمگھٹا کم ہوتا جاتا۔ لیکن پھر بھی اِکا دُکا عورتیں یا نہانے والے آتے رہتے۔ سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے ایک دم کنوئیں پر بھیڑ لگنا شروع ہو جاتی۔ جھیروں کو بھی پانی چاہیے ہوتا۔ عورتوں کو گھروں میں گھڑے بھرنے کے بعد نہانے کے لیے پانی رکھنا ہوتا، سارا دن کام کرنے والے آدمیوں کو نہانا ہوتا اور پھر تاری لگانے والے بچوں کی لمبی قطار۔ گالی گلوچ، ٹھٹھا مخول، دھکے اور ہلڑ بازی، معافی، دھونس اور منت۔۔۔ سب چل رہا ہوتا۔ کنوئیں کی چرغی گھوم رہی ہوتی اور بوکا لگاتار غوطے کھا رہا ہوتا۔۔۔" (۹۴)

مصنف ناول میں حلیم کے ذریعے سے اپنی جائے پیدائش سے محبت کو بیان کرتا ہے۔ پانی کی کمیابی کے باوجود حلیم پر عزم ہے کہ اُس کے گاؤں میں زندگی دوبارہ شروع ہو گی جس کے لیے وہ لائحہ عمل بھی مرتب کرتا ہے۔ دوسری طرف مصنف چاہتا ہے کہ قاری اس بڑی حقیقت کو بھی سمجھے کہ پانی بہت بڑی نعمت ہے جس کی عدم موجودگی کی بناء پر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پانی کی کمیابی ہونے سے وہ علاقہ جو درختوں سے سرسبز و شاداب تھا اب بنجر ہو چکا ہے۔ جو لکڑی بچی تھی اُس کو بھی لوگ چُرا کر لے گئے جب سہولیات کا فقدان ہو گیا تو لوگوں نے نقل مکانی شروع کر دی۔ چودھری نے اپنے وسائل کو استعمال میں لا کر

دوبارہ گاؤں کی بحالی کے کام کا آغاز کیا۔پانی بہت بڑی نعمت ہے جس کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں۔ گاؤں میں ایک ہی کنواں تھا جس پر پورے گاؤں کا انحصار تھا۔

دشتِ وفا:

ناول میں آغا گل نے کوئٹہ شہر کی زندگی کچھ ان الفاظ میں بیان کی ہے جس سے تمام کی تمام چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرتی نظر آتی ہیں۔ اور ہم اس میں اتنا محو ہو جاتے ہیں کہ خود کو کہانی کا کردار تصور کیے بناء نہیں رہ سکتے۔ جمعہ کی نماز پڑھنے آنے والوں کے سر پر سفید ٹوپیاں ہوتی تھیں۔ ہوٹلوں میں اور نائی کی دُکانوں میں قوالیاں گُونجتی تھیں۔اذان کے احترام میں ہوٹلوں کی ریکارڈنگ بند کر دی جاتی تھی۔ محرم کے احترام میں دس روز کے لیے سینما بند کر دیئے جاتے تھے۔ایک ہی شہر میں بہت سے شہر تھے، مذہبی لوگوں کی اپنی دُنیا، سیاست دانوں کی اپنی دنیا اور عاشقوں کی اپنی دنیا تھی۔ طوائفوں کا اپنا خیال تھا کہ پوری دُنیا ایک چکلہ ہے غرض کہ ہر شخص اپنے نقطہ نظر کے حساب سے دُنیا کو دیکھتا ہے۔سپاہی شہریوں کی تلاشیاں لے کر انقلابیوں کو گرفتار کر رہے تھے۔ تانگوں کا داخلہ ممنوع تھا رکشے آزادانہ گھوم رہے تھے۔ گاؤں کے مقابلے میں شہری زندگی زیادہ رنگین معلوم ہوتی ہے اس کی مثال یہ اقتباس ہے جس میں پورے شہر کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

> "نشاط میں تیز شرابوں جیسے بھرپور گیت تھے۔ محبت محبت محبت۔ فضا میں محبت ابل رہی تھی، محبت تیر رہی تھی۔ ہوٹل کے باہر وردیوں والے جگہ جگہ تلاشیاں لے رہے تھے۔ انقلابیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ بازار حسن کھلے تھے، شراب خانے کھلے تھے۔ رقص و سرور کی محفلیں گرم تھیں۔ سب کچھ آزاد تھا۔ صرف بنیادی انسانی حقوق طلب کرنے والوں پہ عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔"(۹۵)

زیرِ مطالعہ اقتباس میں دو الگ طبقوں کی عکاسی کی گئی ہے مذہبی اور سیاسی طور پر سب آزاد ہیں حتیٰ کہ عاشقوں کو بھی آزادی ہے کہ وہ محبت کے گیت گائیں۔ لیکن انقلاب کی آواز اُٹھانے والوں کے لیے پولیس نے زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا ہے۔ رقص و سُرور کی محفلیں عروج پر ہیں، سب کچھ آزاد ہے مگر اِنسانی حقوق مانگنے والوں کی زندگی مشکل میں ہے۔ آغا گل نے اپنے ناول میں انقلابیوں کی تحریک کو بیان کیا ہے کہ کس طرح اُن کو سپاہیوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک ہی شہر میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ آغا گل نے بہت خوبصورت پیرائے میں شہری زندگی اور وہاں موجود مشکلات کو اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

تلسی حکیم صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ شوخ طبیعت کی تھی۔ وہ ہر وقت اِترا کر چلتی رہتی جس کی وجہ سے ماں اُس سے نالاں رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب بھی تُلسی دروازے تک جائے تو اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھے، تا کہ بُری نظروں سے بچ سکے، وہ اپنے والدین کی لاڈلی بیٹی تھی۔ تُلسی اکیس برس کی نرم و نازک، صاف رنگت کی لڑکی تھی، ماں سمجھتی تھی کہ مرد ذات کی نگاہ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ تُلسی کے لیے ماں کی بات ماننا اِس لیے مشکل ہو رہا تھا کہ وہ جوانی کی اُس دہلیز پر تھی جہاں پیروں میں سپرنگ لگ جاتے ہیں۔ جب کہ یہ چیزیں اس کی ماں کو کسی صورت پسند نہیں تھیں:

> "تُلسی نے پانچ جماعتیں تو محلّہ بُھلو رام کے زنانے اسکول سے پڑھ لیں مگر ابھی چھٹی کا اَدھ ہی ہوا تھا کہ اسکول سے اُٹھالی گئی۔ بات یہ نہ تھی کہ کم عقل تھی، اعتراض اُس کے ہونے والے سُسر سوڈھی مل کو تھا کہ لڑکیوں کے لیے پانچ جماعتیں کافی ہوتی ہیں، اگر زیادہ لکھ پڑھ لے گی تو اُس کو سنبھالے گا کون کیونکہ اُس کا منگیتر وشنو داس تو انتہائی گیا گزرا، بالکل ہی للّن تھا۔ ہونے کی خبر اور نہ ہی نہ ہونے کی۔ منگنی بچپن میں اس لیے ہوگئی کہ سگا خالہ زاد تھا اور خالہ کو انکار کون کرے۔"(۹۶)

اس اقتباس میں مصنف نے شہر میں رہنے والے ایک متوسط طبقے کی کہانی بیان کی ہے جو کہ ہندو ہے اور اُن کے ہاں عورت کی تعلیم کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ شہر میں رہنے کے باوجود تُلسی کے سسر سوڈھی کی سوچ بہت محدود ہے وہ تُلسی کی پڑھائی کے اِس وجہ سے خلاف ہے کہ اِس کا بیٹا پڑھا ہوا نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میری بہو پڑھ کر میرے بیٹے پر حکومت کرے۔ خالہ زاد ہونے کی بنا پر بچپن میں ہی منگنی کر دی گئی اور اُس کے جوڑ کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ عورت کو جب بنیادی حقوق نہیں ملتے تو وہ چور راستے ڈھونڈ لیتی ہے جیسے تلسی کا کردار جس پر جوانی آتے ہی وہ اترا کر چلتی ہے جس کو ماں ناپسندیدگی سے دیکھتی ہے۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

جاوید جو کہ ناول کا ہیرو ہے اس کے باپ نے دو شادیاں کی ہوئیں ہیں جاوید کی ماں فیشن ایبل اور ہر محفل کی جان ہوتی ہے۔ آفتاب کی ماں باپردہ خاتون تھیں، دو شادیوں کے بعد گھر کا ماحول عجیب سا تھا۔ اقبال خان کا خوشگوار رویہ ہوتا مگر بچے ہمیشہ اُن سے ڈرتے رہتے، آفتاب تو اکثر غصّے میں رہتا۔ وہ باپ کا بازو بھی جھٹک دیتا، کیونکہ بچوں کے لیے اُن کے باپ کا کردار مثالی ہوتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو پرائی عورتوں میں دلچسپی

لیتا ہوا نہیں دیکھ سکتا جو ہر وقت اُن کے سروں پر پرائی امی مسلط کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔ آفتاب کو وہ عورتیں بھی احمق لگتی تھیں جو اُس کے باپ کی باتوں میں آجاتی تھیں:

"میں آج تک خود کو شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں کر سکا اور سلمیٰ سے پہلے کسی لڑکی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا بھی نہیں پڑا۔ امی اور بہنوں کے کہنے پر میں نے شادی کے معاملے پر جب بھی غور کیا، اس سے دور بھاگنے کی ایک ایسی وجہ معلوم ہوئی جو میں انھیں نہیں بتا سکتا تھا۔ میرے والد اقبال محمد خاں نے دو شادیاں کی تھیں۔ جن دنوں وہ دوسری شادی کے چکر میں تھے، گھر میں عجیب سا ماحول تھا، جیسے ہم سب کسی بڑی آفت کا انتظار کر رہے ہوں۔"(۹۷)

اس اقتباس میں مصنف نے قاری کی توجہ ایک انتہائی اہم مسئلے کی جانب دلوائی ہے اگر گھر میں ناچاقی ہو اور والدین کی ذات اولاد کے لیے مشعلِ راہ نہ ہو تو وہ برائیوں کی جانب چل پڑتے ہیں۔ جاوید جو کہ ناول کا ہیرو ہے اُس کا باپ دو بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی دوسری عورتوں کے چکر میں ہے۔ اُس کا بیٹا جاوید بھی غلط کاموں میں مشغول رہتا ہے اور اُس کی ماں اُسے ٹھیک خیال کرتی ہے۔ آفتاب کے خود کو شادی کے لیے تیار نہ کر سکنے کی وجہ اُس کا باپ تھا۔ باپ کی عورتوں میں دلچسپی اور اُن سے غلط تعلقات کی وجہ سے وہ شادی سے گھبرا رہا تھا۔ یہ معاشرے کے ایسے پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر ماں باپ کی ازدواجی زندگی کامیابی سے نہ چل رہی ہو تو اُولاد بھی اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے گھبراتی ہے۔

پانی مر رہا ہے:

میاں اللہ یار کے گھر کی صورتحال ناول نگار نے کچھ اس طرح بیان کی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ گاؤں میں اس کے گھرانے کے اثر و رُسوخ کو نمایاں کیا ہے۔ مکان کی عمارت زرد رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ برآمدے کی چھت نیچی تھی، پیچھے دالان اور کوٹھڑیاں تھیں۔ کوٹھڑیوں میں فرش پہ ریت کی موٹی تہہ بچھا کر اُس کے اُوپر پرالی کی موٹی تہہ جمائی گئی تھی۔ اِس پر پلنگڑیاں اور صندوق جوڑے جاتے تھے میاں اللہ یار کا معمول تھا کہ وہ پلنگ ڈلوا کر وہیں بیٹھا کرتے تھے۔ اُس کا گاؤں میں اثر و رُسوخ تھا اس لیے گاؤں اور آس پاس کے لوگ اور کامے سب اُس کے پاس جمع ہو جاتے۔ گاؤں میں یہ عام سی بات ہے کہ جو اثر و رسوخ رکھتا ہے گاؤں کے بیشتر معاملات میں اُس سے ہی مشورہ لیا جاتا ہے:

"میاں اللہ یار، ان دنوں شاملاتِ دیہہ میں کچھ لاٹوں پہ قابض تھا۔ اور پھر قبضے قائم رکھنے کے لئے معمولی قسم کی بدمعاشیاں، مثلاً ہوائی فائرنگ، بڑھکیں اور ناحق لوگوں پہ چوری کے پرچے کرا

کے ان کی چھتر ول کرانا وغیرہ اس کا معمول تھا۔ اپنی ان گونا گوں صفات کے باعث آس پاس کے علاقوں میں اس کی ٹھیک ٹھاک دہشت قائم ہو چکی تھی۔ اپنی کھلی جیپ میں جب وہ اپنے چھ جوان ہوتے، لڑکوں کے ساتھ نکلتا تو ان کے ہتھیاروں اور جوان خون سے چمکتے چہروں کی ڈلک راہ چلتوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتی تھیں۔"(۹۸)

دیہی زندگی میں آج بھی وڈیرے اپنا اثر و رُسوخ جمانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں جیسا کہ اقتباس میں میاں اللہ یار کا کردار ہے۔ جو قبضے قائم رکھنے کے لیے معمولی قسم کی بدمعاشیاں کرتا ہے اور اپنی دہشت قائم رکھتا ہے۔ اپنی ہیبت بٹھانے کے لیے وہ اپنے چھ جوان بیٹوں کے ساتھ اپنی جیپ میں نکلتا ہے۔

ناز نین کا شوہر پڑھا لکھا تھا لیکن اُس نے عجیب الخلقت بیٹی کے پیدا ہونے کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ وہ اپنے والدین کے گھر واپس پاکستان آگئی اور کچھ دن کے بعد اپنی بیٹی کو لے کر ایسی جگہ آباد ہو گئی جہاں کوئی اُس کی بیٹی کے بارے میں بات نہ کرے اور نہ ہی طلاق کی وجہ پوچھے۔ ناز نین کی طلاق کی وجہ اُس کی بیٹی تھی اِس بات کا ذکر اُس نے اپنے والدین سے بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کے والدین یہی سمجھ رہے تھے کہ اُن کی بیٹی ابھی صدمے میں ہے۔ اِس وجہ سے اُن کو کچھ بتا نہیں رہی مناسب وقت آنے پر وہ خود ہی سب کچھ بتا دے گی۔ ناز نین نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ عام سی بات اُس کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ ملنے جلنے والوں کو بھی اِس بات کا علم تھا کہ ناز نین واپس پاکستان آگئی ہے لیکن کبھی کسی نے اِس سے طلاق کی وجہ نہیں پوچھی۔ اگر کبھی کسی جاننے والے سے سامنا ہو بھی جاتا تو موسم، فلمیں، کپڑے اور نئے کھانوں کی تراکیب کو لے کر عام سی باتیں ہی ہوتی۔ کبھی کسی کو خیال نہ آیا کہ ناز نین کی بربادی کی وجہ سامنے والی کوٹھیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ اگر شادی شدہ زندگی میں کچھ بھی ہو جائے تو عورت کو ہی سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے:

"ناز نین نے اس شام ہی سے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آدھی رات کو جب سب سو جاتے ہیں، گھر چھوڑ دے گی۔ اپنی گاڑی میں پٹرول وہ دوپہر کو ہی بھروا آئی تھی، بچی کے اور اپنے کپڑے اس نے گاڑی میں رکھ لیے تھے۔ ضرورت کے لائق پیسے بھی تھے۔ ظاہر ہے گھر میں اس بات کا ذکر وہ کیسے کر سکتی تھی؟ اس نے تو اپنی ماں سے طلاق کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ یہ ہی سمجھ رہی تھی کہ ابھی صدمے میں ہے وقت کے ساتھ سب کچھ ہی بتا دے گی۔ یوں بھی بتانے کو رہ کیا گیا تھا؟ بیٹی ہونے کی پاداش میں اسے طلاق دی گئی تھی اور یہ ایک عام سی

بات تھی مگر وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ عام بات ان کے ساتھ ہو گی۔"(۹۹)

نازنین کا شوہر پڑھا لکھا ہونے کے باوجود عجیب الخلقت بیٹی ہونے پر اُسے طلاق دے دیتا ہے جو کہ نازنین کی مجبوری نہیں سمجھتا کہ اُولاد کو پالنے کی ذمہ داری دونوں پر ہے اکیلی نازنین پر نہیں۔ نازنین کسی کو بھی اپنی طلاق کے بارے میں نہیں بتاتی کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے کہ شادی شدہ عورت کو ہی قصوروار سمجھا جاتا ہے۔ نازنین ایک شہری لڑکی ہونے کی وجہ سے خود کو بااختیار تصور کرتی ہے اور وہ اپنی طلاق کا غم بھی زیادہ عرصہ نہیں مناتی۔ نازنین نہ ہی گھر میں کسی سے ذکر کرنا مناسب سمجھتی ہے اور باہر ہی باہر تیاری مکمل کر لیتی ہے کہ وہ اپنی عجیب الخلقت بیٹی کو لے کر کسی نئی جگہ چلی جائے گی تاکہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکے۔

گلِ مینہ:

دادا جان نے اپنی زندگی میں ہی گل مینہ کا رشتہ زرجان سے طے کر دیا تھا، لیکن دادا کی اچانک موت سے بھائیوں نے پچاس ہزار کے عوض اپنے علاقے کے ملک کے ساتھ اُس کا رشتہ طے کر دیا۔ زرجان جب گل مینہ کا ہاتھ مانگنے آتا ہے تو اُس کے بھائی زرجان کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ گُل مینہ کے دادا کے مرتے ہی سب کچھ بدل گیا اور اس کے بھائی کہتے ہیں کہ تم ایک ڈرائیور ہو اور تم ہماری بہن کا ہاتھ کیسے مانگ سکتے ہو۔ گُل مینہ کو اِن سب باتوں کا پتہ اپنی گہری سہیلی سے چلتا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ تمھارا رشتہ ملک عطااللہ سے کر دیا گیا ہے، اور تمھارے بھائی نے پچاس ہزار ولوار بھی طے کر دیا ہے۔ یہ تمام باتیں گُل مینہ کی بھابھی اُس کی سہیلی کی امی کو بتاتی ہے کہ گُل مینہ کا سب سے زیادہ ولوار طے ہوا ہے اور سارے گاؤں کو یہ بات معلوم ہے:

> "گل مینہ، یہ بات تمھارے علاوہ سارے گاؤں کو معلوم ہے، تم کسی سے بھی پوچھ لو۔ میں نے خود تمھاری بھابھی کے منہ سے سنا تھا جو میری امی سے بات کر رہی تھیں۔ بلکہ انھوں نے تو یہ بھی کہا کہ تمھارے بھائی نے ملک عطا سے پچاس ہزار ولوار بھی طے کر دیا ہے، جن میں سے وہ پچیس ہزار پیشگی دے چکا ہے اور پچیس ہزار اگلے مہینے شادی سے ایک ہفتہ پہلے دے گا۔ ساری عورتیں کہہ رہی ہیں کہ آج تک گاؤں میں کسی دلھن کا ولوار اتنا طے نہیں ہوا۔"(۱۰۰)

مصنف قبائلی علاقے میں پروان چڑھی ایک لڑکی کی محبت اور پھر بغاوت کی داستان بیان کرتا ہے، جس کو اُس کا دادا نہایت محبت سے پروان چڑھاتا ہے اور خوبصورت، مخلص لڑکے سے اُس کا رشتہ جوڑتا ہے۔

دادا کی موت کے بعد اُسے اس کے بھائی اپنے علاقے کے دستور کے مطابق ایک بڑی عمر کے مرد کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔ گل مینہ اس رسم کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں زرجان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ قبائلی علاقوں میں عورت کو بے زبان جانور سمجھا جاتا ہے۔ گھر کے مرد بھی اُس کو عزت نہیں دیتے بگڑے ہوئے وڈیروں کے لیے بھی وہ مفت کا مال ہوتی ہے ملک عطا اللہ کا کردار جس کی مثال ہے۔ اُس کی وجہ سے کوئی بھی استانی سکول میں زیادہ دیر پڑھا نہیں سکتی۔

گراں:

ناول میں غزل جان کے گراں کا ماحول کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے، خاص کر جب گاؤں میں شادی بیاہ کا موقع ہو۔ گاؤں میں بھی شہروں کی دیکھا دیکھی رسم ورواج بدل رہے ہیں۔ اب مہندی چوڑیوں سے سجے چنگیر اس کے ساتھ پھول، جھنڈیاں، گوٹے کناریاں لڈو مٹھائیوں کے ٹوکرے سامنے آگئے ہیں اور اب گُڑ، پتاشے بانٹنے اور مائیاں بنانے کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ گراں کی عورتیں مل کر کئی روز تک مائیاں یعنی میٹھی روٹیاں بناتی تھیں، پورے گراں کی عورتیں اکٹھی ہو کر پہلے گُڑ کا شربت بناتی اور کوئی اُس شربت سے سخت آٹا گوندھتی اور اِن کو ٹکیوں کی شکل میں بنا کر اسے کڑکتے ہوئے دیسی گھی میں تلتیں۔ اُن ٹکیوں کو مائیوں کی رسم میں عورتوں میں تقسیم کیا جاتا لیکن اب یہ سب قدیمی رسمیں ولایت کی دولت نے ہڑپ کر لیں ہیں۔ اور آج ولایت سے آئی دولت کے یہ سبھی امیرانہ اظہار یہ اُجڑی ہوئی اس محفل کا جیسے منہ چڑھاتے ہیں۔ جس سال گراں میں کوئی فوتگی ہو جاتی اُس سال وہاں کوئی شادی نہ ہوتی۔ مایوں کی رسم پر بننے والی میٹھی ٹکیوں کی جگہ شہر کے کیک، میٹھائیوں نے لے لی ہے، گاؤں کی نائین کی جگہ بیوٹیشن نے لے لی ہے۔ غرض گاؤں کی تہذیب پر شہر کی تہذیب غالب آگئی ہے:

> "شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ حالانکہ اس گراں کی ریت کے مطابق تو جس سال یہاں موت واقع ہو جاتی اُس سال شادی کی شہنائیاں یہاں کبھی نہ بجتی تھیں۔ پورے سال کے صبر اور انتظار کا بھاری پاٹ کنواریوں کے سینے پر دھر دیا جاتا تھا۔ ماتم چاہے روائتی نہ رہے ہوں لیکن شادیوں میں تو روائتی خرچوں پر کہیں غیر روائتی اضافہ ہو گیا تھا۔ مایوں کی رسم پر بٹنے والی میٹھی ٹکیاں کیک مٹھائیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اگلی کوٹھری میں فرش پر سونے والی دُلہن فوم کے گدے پر اب آرام کرتی تھی۔ مہندی لگانے اور دُلہن بنانے کو نائین کی جگہ بیوٹیشن سے بکنگ کروائی گئی تھی۔ صرف دُلہن کے لیے ہی نہیں ساتوں سہیلیوں کے لیے بھی دلہن جیسی تیاری

تھی۔ بوتیکس کے مہنگے ڈریسرز میں سے اِس برٹش نیشنل کے لیے عروسی ملبوسات منتخب ہو رہے تھے۔" (۱۰۱)

بڑے ہی اُچھوتے انداز میں مصنف نے دیہی زندگی کو بیان کیا ہے اور پھر اُس پر آہستہ آہستہ شہری تہذیب کے غلبے کو اُجاگر کیا ہے گو کہ شہری زندگی کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا معیوب نہیں ہے۔ مگر شہری رسموں اور آسائشوں نے ہماری سادہ اور ریاکاری سے پاک رسموں کو ختم کر دیا ہے وہ اپنائیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ شادی بیاہ اور غمی کے مواقع پر ایک دوسرے کی مدد اب برائے نام ہی رہ گئی ہے جہاں ہفتوں رونقیں لگتی تھیں اب وقت کے وقت شادی میں شرکت ہوتی ہے۔ ان اقتباسات کی مدد سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح جدید ٹیکنالوجی اور مغربی اثرات نے ہماری ثقافت پر اپنے نقوش مرتب کیئے، اور ہماری ثقافت میں یہ چیزیں بحران کا باعث بنی ہیں۔ میرے زیرِ تحقیق ناولوں میں ناول نگاروں نے پاکستانی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات کی نہایت عمدہ طریقے سے نشاندہی کی ہے کہ کس طرف ہماری ثقافت جدید تہذیب سے متاثر ہوتے ہوئے پرانی اقدار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی پرانی قدروں کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے جدت کو اپنایا جا سکتا ہے۔ جدید تہذیب نے دیہی و شہری دونوں اسالیبِ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ معاصر ناولوں میں پرانی تہذیب کا نوحہ پیش کیا گیا ہے۔ سادگی اب خواب و خیال ہو گئی ہے اور اس کی جگہ اب غیر فطری انداز نے لے لی ہے۔

اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاصر ناول نگاروں کے ہاں عالمگیریت اور جدید ٹیکنالوجی کی چھاپ واضع دکھائی دے رہی ہے۔ دیہاتی زندگی میں ہونے والی تبدیلیاں، دیہاتی زندگی بدلتے تناظر اور شہر کی مصنوعی زندگی کی چھاپ نے دیہات کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے افراد کو ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا ہے اب وہ دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں بات کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس طرح دیہات بھی اب عالمی گاؤں کا حصہ بن چکے ہیں۔ دوسری طرف مغربی تہذیب کا سیلاب پورے جوبن پر ہے اور اس کی وجہ مغربی ممالک کا سائنسی اعتبار سے ترقی کرنا ہے۔ جس وجہ سے ان کی تہذیب پوری دنیا میں عالمگیریت کے نام پر پھل پھول رہی ہے۔ ہمارے ہاں سائنسی ایجادات کے منفی اثرات بھی دکھائی دے رہے ہیں جن پر ناولوں میں موجود کرداروں کی مدد سے سیر حاصل گفتگو ہوئی ہے۔ مغرب سے آنے والی اقدار کو ماڈرن سمجھ کر اپنانے کی وجہ سے مشرقی تہذیب دلکش اور حسین روایات اب طاق نسیاں بنتی جا رہی ہیں۔ عالمگیریت کے نام پر ہم تن آسان ہو رہے ہیں اور سہولتوں

بھری زندگی گزارنے کی وجہ سے ہمارے اندر مجاہدانہ اور سپاہانہ شان ختم ہوتی جارہی ہے۔ آج کل نوجوان نسل ٹیکنالوجی کا استعمال کثرت سے کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے جنسی اور نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں اور اس کے اثرات صحت پر بھی برے مرتب ہو رہے ہیں۔ سائنسی ترقی اور عالمگیریت کے نام پر اس وقت دنیا کا جو نقشہ سامنے آرہا ہے اس کا احساس معاصر ناول نگار کو بھی ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ لکھنے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس کے سامنے معاصر عہد کے بہت سے موضوعات ہوتے ہیں جن کو ناولوں میں وہ برتتا ہے وہ زندگی کی کثیر الجہتی کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاصر ناول نگار کے ہاں موضوعات کی کثرت نے اس کو ہر قاری کے لیے دلچسپ بنا دیا ہے۔ معاشرے میں موجود ہر موضوع کو کسی نہ کسی صورت میں معاصر ناول نگار نے اپنے ناولوں میں دکھایا ہے۔ آج کا ناول نگار اپنے آپ کو عالمی گاؤں کا حصہ سمجھتے ہوئے اپنے گہرے مشاہدے سے اپنی ہی تحریروں کو رنگا رنگ اور مزید شوخ بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حقی، شان الحق، فرہنگِ تلفظ (طبع چہارم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۶۳۶

۲۔ نگینہ جبین، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۲

۳۔ محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۰۷ء، ص ۵۹۳

۴۔ درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۱۱

۵۔ حقی، شان الحق، فرہنگِ تلفظ، ص ۸۷۸

۶۔ شہید مرتضیٰ مطہری استاد، سماج اور تاریخ، سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل، ربیع الاوّل ۱۴۱۰ء، ص ۳

۷۔ عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۷ شک ۱۹۰۹، ص ۲۱

۸۔ ایضاً، ص ۲۲

۹۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۰۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ) کشافِ تنقیدی اصطلاحات (طبع دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۱

۱۱۔ شہید مرتضیٰ مطہری استاد، سماج اور تاریخ، ص ۳

۱۲۔ ضیاء الحسن، اردو تنقید کا عمرانی دبستان، پی ایچ ڈی اردو، مملوکہ: پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۱۰۔۹

۱۳۔ باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۹

۱۴۔ منیر احمد شیخ، تہذیبی رویے، لائلپور نفیس پرنٹنگ پریس، ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء، ص ۱۱

۱۵۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۷۔ راجیندر ناتھ شیدا، ادب فکر اور سماج، ایشیا پبلشرز، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۷

۱۸۔ مختصر اردو لغت، قومی کونسل برائے فروغِ زبان اُردو، دہلی، س۔ن، ص ۱۴۷

۱۹۔ عتیق احمد، پروفیسر، بحوالہ، ناول کا فن، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۹

۲۰۔ مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، بار اول، س ن، ص ۵۵۱

۲۱۔ مبین مرزا، عالمگیریت اور ہماری عصری و ادبی تناظر (مضمون) express.pk، ۷ نومبر ۲۰۲۳، 12:00 P.m

۲۲۔ عالمگیریت کیا ہے www.bbc.com/urdu، ۷ نومبر ۲۰۲۳، 7:00 Pm

۲۳۔ ایضاً
۲۴۔ مبین مرزا، عالمگیریت اور ہمارا عصری و ادبی تناظر، (مضمون) express.pk،۸ نومبر ۲۰۲۳، 10:00 P.m
۲۵۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ صورت و معنی، مرتبہ یسیٰن آفاقی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳۷
۲۶۔ صاحب علی، ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۷۶
۲۷۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات، (مضمون) مطبوعہ، ششماہی خیابان، شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۹
۲۸۔ صبا اکرام، جدید افسانہ چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۸۵
۲۹۔ ایضاً، ص ۷۷
۳۰۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی ادارہ پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۶۰۴
۳۱۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (مضمون) مطبوعہ ششماہی خیابان، ص ۴۳
۳۲۔ عشرت رحمانی، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، جاودان پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۹۲
۳۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، اُردو ادب کا منظر نامہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۵
۳۴۔ فردوس انور قاضی، اردو ادب کے مختلف زاویے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۰
۳۵۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۸۰۷
۳۶۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۸
۳۷۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار، لاہور، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۰
۳۸۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵
۳۹۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۳
۴۰۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۸۱
۴۱۔ رفاقت حیات، میر واہ کی راتیں، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۱۔ ۱۱۰
۴۲۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۶
۴۳۔ آغا گل، دشتِ وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۳۷
۴۴۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۲
۴۵۔ کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، مکتبہ دانیال پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۲۶۵

۴۶۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفصیل ناشران و تاجرانِ کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ص ۱۲
۴۷۔ زیف سیّد، گل مینہ، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۵۸
۴۸۔ طاہرہ اقبال، گراں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۶
۴۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، مکتبہ عالیہ، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۰
۵۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصّہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۹۱
۵۱۔ سید عامر سہیل، احمد عبد اللہ، ڈاکٹر، عالمگیریت: تناظرات اور امکانات (مضمون) مطبوعہ: معیار، شمارہ ۹، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۱
۵۲۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (مضمون) مطبوعہ ششماہی خیابان، ص ۳۹
۵۳۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود،، ص ۸۱۱
۵۴۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۳۰
۵۵۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۴۳
۵۶۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۲۰۴
۵۷۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۳۰۹
۵۸۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۳۶
۵۹۔ رفاقت حیات، میر واہ کی راتیں، ص ۱۸
۶۰۔ ایضاً، ص ۶۷
۶۱۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۲۲۱
۶۲۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۲۱
۶۳۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ،، ص ۱۰۵
۶۴۔ کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۱۵۸
۶۵۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۱۰۳۔۱۰۲
۶۶۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۸۰
۶۷۔ صبا اکرام، جدید اردو افسانہ، چند صورتیں، ص ۹۳
۶۸۔ عشرت رحمانی، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، ص ۹۲
۶۹۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانہ کے رجحانات، ص ۴۲۲

۷۰۔ شہاب ظفر اعظمی، ہم عصر افسانے کا فکری سروکار (مضمون)، مطبوعہ: اردو ریسرچ جنرل، شمارہ پانچ، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۲۰

۷۱۔ سیّد عامر سہیل، ڈاکٹر، احمد عبد اللہ، عالمگیریت: تناظرات و امکانات (مضمون)، مطبوعہ معیار، شمارہ ۹، ص ۱۲۳

۷۲۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۹

۷۳۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۳۶

۷۴۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۱۳

۷۵۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۳۹۱

۷۶۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۱۴۰۔۱۳۹

۷۷۔ رفاقت حیات، میرواہ کی راتیں، ص ۱۷

۷۸۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۲۳۶۔۲۳۵

۷۹۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۴۰

۸۰۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۷۷

۸۱۔ کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۶۲

۸۲۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۱۲۷

۸۳۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۸

۸۴۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۲۴۱

۸۵۔ سیّد عبد الباری، ڈاکٹر، لکھنو ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۶

۸۷۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، ص ۶۲۷۔۶۲۶

۸۸۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۴۱۵

۸۹۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۳۴

۹۰۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۲۰۹

۹۱۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۱۰

۹۲۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۲۷

۹۳۔ رفاقت حیات، میر واہ کی راتیں، ص ۱۸

۹۴۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۱۳

۹۵۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۵۴

۹۶۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۱۵

۹۷۔ کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۱۱۷

۹۸۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۸

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۱۰۰۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۹۳

۱۰۱۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۱۴۳

باب سوئم:

پاکستانی اُردوناولوں میں ثقافتی بحران کے معاشی پہلو

پاکستانی اردوناولوں میں ثقافتی بحران کے معاشی پہلو پر بحث سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ معیشت ہے کیا اور معاشرے میں معیشت کا وجود کیوں ضروری ہے چونکہ انسان بنیادی طور پر ایک سماجی حیوان ہے لہٰذا معاشرتی تقاضوں اور معاشی مسائل سے وہ کبھی الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔یہی وجہ ہے کہ اردو میں تقریباً تمام اہم ناول نگاروں نے معاشی و معاشرتی زاویوں سے بھی زندگی کی کہانی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقتصادات کو انگریزی میں اکنامکس کہتے ہیں یہ لفظ قدیم یونانی لفظ "آئی کونوموس" سے اخذ کیا گیا ہے۔اس زمانے میں اس کا مطلب تھا"گھر بار کا ضابطہ " یعنی وہ طریقہ کار جس کے تحت ایک گھرانے کے افراد پیداواری خدمات سر انجام دے کر آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ بعد میں آئی کونوموس کو ملک یا ریاست کی مجموعی معاشی سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا گیا۔یعنی اس سے مراد وہ طریقہ کار لیا گیا ہے جس کے تحت ایک ریاست کے لوگ بحیثیت مجموعی پیداواری خدمات سر انجام دے کر اشیاء وخدمات پیدا کرتے ہیں اور اپنے معاوضوں سے انہیں خرید کر ایک نسبتاً پر سکون زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔چونکہ اس زمانے میں ریاست کو پولس کہا جاتا تھا اس لئے ریاست کی معیشت کو پولیٹیکل اکانومی کہا گیا جو رفتہ رفتہ اکنامکس میں تبدیل ہو گیا۔اردو جامع انسائیکلو پیڈیا میں معاشیات کی تعریف کچھ ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:"انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کا علم۔"(۱)

معاشیات ایک ایسا علم ہے جس میں ہم مطالعہ کرتے ہیں کہ دولت کیسے پیدا کی جاتی ہے اور اس کا تبادلہ کیسے ہوتا ہے۔اس کی تقسیم کیسے عمل میں آتی ہے اس کو خرچ کیسے کیا جاتا ہے کیونکہ کسی قوم کی معاشی سرگرمیوں کا محور دولت ہوتی ہے۔کیونکہ زندہ رہنے اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے علم معاشیات کی افادیت بھرپور ہے۔ معاشیات کا مضمون اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔پیدا ہونے والے بچے کو جن مسائل سے واسطہ پڑتا ہے ان کا تعلق معاشیات سے ہے مثلاً سردی سے بچنے کے لیے کپڑے کی ضرورت ، بھوک کو ختم کرنے کی ضرورت وغیرہ۔ ہر شخص ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے معاشی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے۔اگر یہ سرگرمیاں نہ ہوں تو دنیا کی رونقیں ماند پڑ جائیں۔کسی بھی ملک و قوم کی معیشت کی ترقی کا تمام دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنے موجودہ وسائل کو کس طرح سے استعمال میں لاتی ہے۔وہ

ملک و قوم جو اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کی دستِ نگر ہوتی ہے اس کی معیشت بھی تقریباً دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ملک خسارے کی سمت روانہ ہوتا چلا جاتا ہے اور معاشی مسائل ایسی خوفناک شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ ملک و قوم کی سالمیت بھی خطرے سے دوچار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر مظفر حسن ملک اپنی کتاب "اقبال اور ثقافت" میں معاشیات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"معاشیات کا بنیادی تعلق پیداوار اور انسانی احتیاجات سے ہے۔ حقیقی احتیاجاتِ انسانی صرف خوراک، لباس اور رہائش تک محدود ہیں۔ مگر تہذیب و تمدن کی ترقی نے ان میں تعلیم، صحت تفریح، آسائش اور سکون وغیرہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔اس طرح معاشرے کے معاشی نظام کا اس کی ثقافت سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا ہے کیونکہ معاشی دباؤ کے تحت افراد اپنی عادات اور دستورِ حیات بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"(۲)

فنکاش پر علمِ معاشیات کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے:

"معاشیات سماجی سائنس کا ایک حصّہ ہے جو خدمات اور اچھی چیزوں کی پیداوار، تقسیم اور استعمال سے وابستہ ہے۔یہ مضمون اس بات کا مطالعہ کرتا ہے کہ کس طرح قومیں، حکومتیں ،کاروبار اور افراد اپنی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے مختص وسائل پر انتخاب کرتے ہیں۔"(۳)

علم معاشیات کی اہمیت و حیثیت ہر دور میں مسلم رہی ہے لیکن اس کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کوئی بھی نظام حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کا معاشی نظام اچھا نہ ہو۔ اس نظام کو کامیاب کرنے کے لیے مفکرین نے ہر دور میں اپنی عقلوں کے گھوڑے دوڑائے لیکن کوئی اسے انسانی ضروریات کے تقاضوں کے مطابق پورا نہ کر سکا اور افراط و تفریط کا شکار ہو گیا۔ کبھی سوشلزم اور کبھی کمیونزم نظام کیا گیا۔ لیکن ان میں سے ہر ایک نظام فیل ہوتا چلا گیا اور آج سائنسی ترقی کے باوجود دنیا کی سپر پاور کی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچی ہوئی ہے اور اس کے بڑے بڑے بینک دیوالیہ ہو رہے ہیں۔ دنیا میں ہر طرف غربت عام ہونے کی وجہ سے لوگ بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔غذائی اجناس کی قلت پیدا ہو رہی ہے اور کچھ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، آئے روز بے روزگاری کی وجہ سے خودکشی کے واقعات عام ہو رہے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ موجودہ نظاموں کا اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو ترک کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام خواہ مغربی ہو یا مشرقی، انسانی اقدار کی کلیتاً نفی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں غربت، افلاس اور

بے روزگاری کو ختم کرنے کے بلند بانگ دعوے تو کیے جاتے ہیں لیکن غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کو بے حال چھوڑ دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام میں خود غرضی اور طلب پرستی کا عنصر نمایاں ہے اور یہ نظام صرف دولت کے حصول تک محدود ہے۔

علم معاشیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ دولت کی پیدائش میں کس طرح اضافہ کیا جائے کہ معاشی خوشحالی اور معاشی استحکام حاصل ہو۔ معاشی مطالعہ کے دو اہم پہلو ہوتے ہیں ایک فطری اور دوسرا عملی پہلو ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں معاشی مسائل کی وضاحت اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے جیسے قومی آمدنی کی پیدائش اس کی تقسیم اور صرف وغیرہ۔ دوسری صورت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ معاشی مسائل سے متعلق حاصل کردہ معلومات کو کس طرح ان مسائل کے حل کے لیے عملی طور پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔

چونکہ انسانی فلاح کا دارومدار اس بات پر ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جائے اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے معاشی وسائل کا استعمال بہترین طریقے سے کیا جائے۔ معاشیات کے مطالعے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ پیدائشی وسائل محدود ہیں۔ اسی طرح معاشی فلاح کا دارومدار صرف پیدائشِ دولت یا آمدنی پر ہی نہیں بلکہ اس کی مناسب تقسیم پر بھی ہے کیونکہ اگر ملک کی آمدنی کے بیشتر حصے پر صرف چند صنعت کار اور تاجر قابض ہوں تو اس سے عوامی فلاح میں اضافہ نہیں ہوگا۔ معاشیات اس بات پر زور دیتا ہے کہ ٹیکس لگاتے وقت قیمتوں پر کنٹرول کرنے اور منصوبے کے مقاصد طے کرتے وقت یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ غریبوں اور امیروں کے درمیان فرق کم ہو۔ اس علم کے مطالعہ سے کئی مسائل کے حل تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے مثلاً بے روزگاری، معاشی بحران، قیمتوں کے اضافے کے مسائل، بیرونی چیزوں کے توازن میں خرابی، زرمبادلہ کی قوت، صنعتی مزدوروں کے مسائل وغیرہ۔ معاشیات سے مراد وہ سائنس ہے جو تبادلے سے متعلق قوانین کو کنٹرول کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ قوانین بنانے والے لین دین اور دولت کی منتقلی پر کنٹرول رکھتے ہیں۔

قدیم ادوار میں مالیاتی نظام حکومت کی ذمہ داریوں کی طرح سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ عام طور پر حکومت کی ذمہ داریاں محدود ہوتی تھیں، اس لیے محصولات میں کوئی پیچیدگیاں نہیں ہوتی تھیں۔ محصولات کا بڑا حصہ زمین کی لگان اور اس کے محصول پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جزیہ، تجارت اور وراثت پر بھی محصول لگائے جاتے تھے۔ قدیم زمانے میں ضرورتیں مختصر اور سادہ ہوا کرتی تھیں، لیکن تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ اور نیرنگی پیدا ہوتی گئی۔ بنیادی طور ہمیں بھوک مٹانے کے لیے غذا، تن ڈھانپنے کے لیے

کپڑا اور رہنے کے لیے مکان درکار ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کو بہت سی ایسی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو آرام و آسائش بہم پہنچاتی ہیں اور تفریح کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ ان حاجات کو پورا کرنے کے لیے انسان محنت کرتا ہے اور دولت کماتا ہے۔ انسان کی اس جدوجہد کا اور اس کی کوششوں کا تعلق معاشیات سے ہے۔ حاجات کی کثرت اور وسائل کی قلت کے باعث دنیا کی بیشتر آبادی مسائل سے دوچار ہے مثلاً غربت، جہالت، بیماری، قحط، بے روزگاری اور افراطِ زر وغیرہ ہیں۔ چنانچہ معاشی ماہرین ان مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں اور انہیں حل کرنے کے لیے معاشی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور معاشی ترقی پر زور دیتے ہیں۔ ایسی تجویزیں پیش کرتے ہیں جس سے ملک میں اشیاء کی پیداوار بڑھے، روزگار ملے اور لوگوں میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو، خوشحالی کا معیار بلند ہو اور ان کی ضرورتیں احسن طریقے سے پوری ہوں۔

جاگیر کے لغوی معنی ایسی زمین کے ہیں جو بادشاہ یا حکومت کی طرف سے انعام میں دی جائے۔ وہ شخص جاگیردار کہلاتا ہے جسے حکومت کی جانب سے جاگیر دی گئی ہو اور جاگیرداری نظام سے مُراد ہے: "سرمایہ داری کے دور سے پہلے کی معیشت جو بادشاہت کا لازمہ تھی۔"(۴) انگریزی میں جاگیرداری کے لیے فیوڈل ازم کا لفظ رائج ہے، اردو میں فیوڈل ازم کے لیے جاگیرداری کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جاگیرداری نظام میں شخصی ملکیت کے تحت بہت سی زمینوں پر ایک شخص اپنا قبضہ جماتا ہے اور کسانوں سے کم اُجرت پر کام کراتا ہے۔ اس نظام میں شخصی ملکیت کے تحت، کسانوں کی زمینوں پر فردِ واحد کا تسلط ہوتا ہے اور کسانوں کا استحصال ہوتا ہے۔ جاگیردار حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کے بعد من مانی کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ تاریخ دانوں نے اس نظام کو ایک ادارے کی بھی حیثیت دی ہے جس کے ذریعے زرعی پیداوار چھین کر حکومت کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> "فیوڈل ازم کی ایک شکل تو وہ تھی کہ جب بڑی بڑی امپائرز بنتی تھیں تو انہیں مختلف علاقوں میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے فوجی طاقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ شہنشاہ اور حکمران کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ مرکز میں رہتے ہوئے اور پھیلے ہوئے علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکے اس لیے وہ ان علاقوں کو تقسیم کر کے اپنے عہدے دار افسروں یا مقامی فوجی عاملوں کو دے دیتا جو جاگیردار آمدنی کے عوض اس کی فوجی خدمت ادا کرتے تھے اور اس سے وفادار رہتے تھے اس میں زمین حکومت کی ہوتی تھی۔ یہ بطورِ وراثت نہیں دی جاتی تھی۔"(۵)

جاگیر داری خاص طور سے مغربی یورپ میں وہاں کے معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کی پیداوار ہے اور انہی حالات و واقعات اور اقدار و روایات نے اس نظام کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ جدید سیاسی نظام کے فروغ سے قبل یورپ اور ایشیا کے بیشتر ممالک میں یہی نظام رائج تھا۔ تقریباً انیسویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب نے اس نظام کو زوال کی راہ دکھادی اور اس کی جگہ سرمایہ داری نظام نے جڑیں پکڑنا شروع کر دیں۔ لیکن اس زوال کا مطلب جاگیر داری نظام کا خاتمہ ہر گز نہیں تھا آج بھی بیشتر ممالک میں یہ نظام رائج ہے۔ آج بھی دنیا کے بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں جاگیر داری اور سرمایہ داری میں کشمکش جاری ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کا آغاز بادشاہ کی جانب سے مختلف افراد کو ریاست اور حکومت کے لیے ان کی خدمات کے صلے میں زمینوں کے وسیع رقبے بطورِ جاگیر عطا کرنے سے ہوا۔ جاگیروں کے ان مالکان نے جاگیروں پر کام کرنے، انہیں سنبھالنے اور اپنے مرتبے اور ٹھاٹھ کو قائم رکھنے کے لیے ان رقبوں پر مزارعین سے کاشت کروانے کے نظام کا آغاز کیا۔ جاگیر داروں کی حکم عدولی کی سزا قید کی صورت میں دی جاتی تھی۔ جاگیر دار کی زمین پر کاشت کاری کرنے والے کو سرف کہتے تھے۔ جاگیر دار کی مرضی ہوتی کہ وہ اپنی زمین پر اُس سے کام کروائے، وہ محنت بھی زیادہ کرتا اور اُس کو بہت سے ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے۔ سرف کے گھریلو معاملات کا فیصلہ بھی جاگیر دار ہی کرتا۔ فیوڈل ازم کلچر کسانوں ہی کی وجہ سے استوار تھا مگر ان کی حیثیت کیڑے مکوڑوں جتنی تھی۔ سرف کی موت کے بعد اگر لارڈ چاہتا تو اس کے بیٹوں کو کاشت کاری کے لیے زمین دیتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> "فرانس میں مالک اپنے سرف کو فروخت بھی کر سکتا تھا یا وقتی طور پر اس کی محنت کا معاوضہ اس کی خدمات دوسرے کے حوالے کر دیتا تھا اگر وہ آزادی کا خواہش مند ہوتا تو اسے اپنے تمام اثاثہ مالک کے حوالے کرنا پڑتے تھے روس میں جب جاگیر فروخت کی جاتی تھی تو اس کے ساتھ میں کسانوں کو بھی فروخت کیا جاتا تھا اس طرح انہیں زمین کا ایک حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان میں کسان پر پابندی تھی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اگر وہ فرار ہوتا تو ایسے ہی تعاقب کیا جاتا جیسے بھاگے ہوئے غلام کا۔"[۶]

درج بالا اقتباس سے کسان کی حیثیت جاگیر دارانہ نظام میں درست طور پر سامنے آتی ہے کسان کی حیثیت فقط ایک زر خرید غلام کی سی تھی زمین جس پر وہ اپنا خون پسینہ بہاتا کبھی بھی بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ کھیتوں میں کام کے ساتھ ساتھ بیگار کے طور پر اس سے دیگر کام کرائے جاتے مثلاً جنگل صاف کرانا، نہریں

کھدوانا، نہروں پر بند باندھنا، لارڈ کا اناج پیسنا، روٹی پکانا، شراب کشید کرنا۔ جب کبھی لارڈ خوش ہوتا تو وہ ان کاموں کے عوض اسے تھوڑا بہت معاوضہ ادا کر دیتا۔ جاگیر داری نظام کے باعث ذات پات کے نظام نے بھی فروغ پایا۔ جاگیر داری نظام کو شہنشاہت نے بڑی ترقی اور فروغ دیا کیونکہ یہ نظام بادشاہت کے لیے سہولت کا باعث تھا۔ بادشاہ کی جانب سے عطا کی جانے والی یہ زمینیں جنہوں نے جاگیر داری نظام کی بنیاد ڈالی تھی مالکانہ حقوق کے ساتھ بادشاہ کی جانب سے نہیں دی جاتی تھیں یعنی یہ بطورِ وراثت نہیں دی جاتی تھی۔ اسی لیے جب بھی کوئی نیا حکمران یا فاتح آتا تو اپنے وفادار جاگیر داروں کو دے دیتا جبکہ وہ جاگیر دار جو پرانے یا کسی دوسرے حکمران کے ساتھ وفاداری رکھتے تھے اس سے زمینیں چھین لی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق:

> "فاتحین جاگیریں اپنے وفادار ساتھیوں کو دیتے تھے یا ان قدیم جاگیر داروں کو جنہوں نے فاتحین کی شرائط کو تسلیم کر لیا ہو۔ مثلاً ہندوستان کی تاریخ میں جب ترک فاتحین آئے تو یہ اپنے ساتھ ترک اور ایرانی لوگ لے کر آئے جو ان کے عہد میں جاگیر دار بنے مغلوں نے ان کی جگہ اپنے وفادار ساتھیوں کو جاگیریں دیں اور وفادار راجپوت فیوڈل لارڈز کو باقی رکھا۔"(۷)

اسی طرح مراعات بھی جاگیر داروں کو ملا کرتی تھیں جبکہ نچلا طبقہ ان سے محروم رہتا تھا۔ جاگیر دارانہ روایات و اقدار کی ترقی اور نشو و نما ایک مخصوص طبقے کے مفادات اور ذہنیت کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے، جس میں ہمیں حقوق صرف اعلیٰ طبقے تک محدود نظر آتے ہیں۔ یہ روایات و اقدار صرف جاگیر دار طبقے کے مفاد میں تھیں جبکہ کسان، ملازم کے حقوق، خیالات، جذبات اور ضروریات وغیرہ کو اس میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ جاگیر دار کو یہ وسیع حقوق دے دیئے گئے تھے کہ وہ اپنے ملازم سے جیسا سلوک چاہے کر سکتا تھا۔ اس نظام نے محنت کش طبقے کو سماجی، معاشی اور معاشرتی بندھنوں میں جکڑ کر اتنا بے بس اور مجبور کر دیا تھا کہ انہیں فرار کا کوئی راستہ نہیں ملتا تھا کیونکہ سماجی تذلیل کو اگر کوئی قبول کر بھی لے تو بھوک اور ضروریاتِ زندگی کی مجبوریاں دامن گیر ہو کر راستہ روک لیتی تھی۔

جاگیر دارانہ نظام کا آغاز تو قرونِ وسطیٰ سے ہوا لیکن یہ ادارہ ہر ملک کے حالات، ضروریات اور تقاضوں کے تحت تغیر پذیر رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ تمام ممالک میں اس نظام کی بنیادی خصوصیات کم و بیش ایک جیسی تھی۔ جن میں جاگیر کی ملکیت، محنت کش طبقے کی محنت اور حقوق کا استحصال، اپنے ذاتی مفادات اور سہولیات تعیشات کے حصول کے پیشِ نظر اخلاقی، سماجی، معاشی اور مذہبی اقدار و روایات کی تشکیل اور محنت کش طبقے سے حاصل کی گئی دولت سے نام و نمود اور شان و شوکت کے اظہار کے لیے ادب، آرٹ اور تعمیر

وغیرہ کے ذریعے تہذیب و ثقافت کی تشکیل زیادہ اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی اس نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"ایک طویل عرصہ تک یہ نظام اپنی توانائی اور طاقت کے ساتھ رہااور اس نے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی کہ جس میں طبقاتی تقسیم کی مستقل حیثیت تھی۔ایک فرد کے لیے ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں جانا مشکل تھا۔پیدائش اور خاندان کا سماجی مرتبہ اس کی حیثیت کا تعین کر دیتا تھا اس لئے وہ اپنی پوزیشن پر مطمئن ہوتا تھا۔"(۸)

جاگیر داری نظام نے تمام مادی وسائل اور اقتدار کو ایک طبقہ تک محدود کر دیا تھا جس کی وجہ سے باقی طبقوں کو اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور معاشی، سیاسی یا سماجی طور پر سر اٹھانے کے مواقع اور وسائل ہی میسر نہ ہو سکے۔ذرائع پیداوار اور سماجی حیثیت پر قابض ہونے کے باعث ظالمانہ واستحصال پسندانہ رویوں نے جنم لیا جس سے محکوم طبقے کی حیثیت مزید کمزور پڑتی چلی گئی۔دنیا بھر میں سائنس اور تعلیم کی ترقی نے شعور کے نئے در وا کیے لیکن اس کے مواقع اعلیٰ طبقے تک محدود رہے۔رعیت کو اگر بنیادی ضروریاتِ زندگی میسر نہ تھیں تو ان تمام سہولیات کا تصور بھی محال تھا۔

قانونِ فطرت ہے کہ ہر شے کو زوال ہے، یورپ میں اٹھارہویں صدی تک راج کرنے والے کلچر کو سرمایہ دار طبقے نے آکر روند ڈالا۔اس کے ساتھ صنعتی ترقی نے بھی اس نظام کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔مشینی دور کے آغاز کے تحت پیداوار اور سامان وخدمات کی تقسیم نجی طور پر ہونے لگی۔اس نظام میں کمائی کا مالک ہر فرد خود تھا لیکن بے قاعدگیوں اور بے اُصولیوں کے تدارک کے لیے حکومت کو مداخلت کا حق دیا گیا لیکن یہ نظام بھی پائیدار ثابت نہ ہو سکا۔امیر طبقے کے ہاتھوں میں دولت جمع ہونے لگی اور غریب طبقہ غربت کی چکی میں پسنے لگا۔یورپ میں سرمایہ داری نظام نے اپنے پنجے گاڑھ دیئے، کیونکہ سازگار حالات کی وجہ سے اس نظام کو یہاں پھلنے کے مواقع ملے اور نت نئی ایجادات ہوئیں۔معاشی طور پر صنعتی انقلاب کی وجہ سے پیدائشِ دولت کے طریقے بدلے، ایک مشین نے کئی افراد کے کام کی جگہ لے لی۔جس سے غربت کی سطح میں اضافہ ہوا اور سرمایہ دار مزید مضبوط ہو گیا، انسان میں مادہ پرستی نے جنم لیا۔کارخانوں میں مخلوط کام کی وجہ سے بے راہ روی پیدا ہوئی۔جاگیر دارانہ سماج کو زوال سرمایہ دارانہ سماج کے ارتقاء کے باعث ہوا جب لوگوں کو روزگار کے وسیع مواقع میسر آئے اور انہوں نے دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرنا شروع کیا۔ترقی پذیر ممالک میں یہ نظام آج بھی موجود ہے اور اپنے اثرات رکھتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں معیشت، عوام اور تہذیب میں

بہت مضبوط ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس، مواصلات، نقل و حمل، تعلیم اور دیگر عوامل کے باعث اس کی گرفت میں خاصی کمی آچکی ہے لیکن ابھی جاگیر دارانہ روایات و اقدار معاشرے پر اپنی گہری چھاپ اور اثرات رکھتی ہیں۔ سید علی عباس جلالپوری کے مطابق:

"آغازِ تمدن سے لے کے انیسویں صدی تک کم و بیش دس ہزار برسوں تک انسانی معاشرہ زرعی تھا زرعی معاشرے کی اپنی مخصوص عمرانی، سیاسی اور اخلاقی قدریں تھیں صنعتی انقلاب نے زرعی معاشرے کی یہ قدریں بدل کرر کھ دی ہیں۔ مزید بر آں زرعی معاشرہ فردیت پر مبنی تھا۔ یعنی مقتدر افراد اپنے شخصی مفاد کو سیاسی، عمرانی اور اخلاقی حسن و قبح کا معیار سمجھتے تھے اور اجتماعی تقاضوں سے بے پرواہ تھے۔ صنعتی انقلاب کے بعد ہر کہیں اجتماعیت کا فروغ ہوا ہے اور اجتماعی بہبود، انفرادی بہبود کا معیار بنتی جارہی ہے۔ جس طرح زرعی معاشرے نے شکار کے عہد کی قدروں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی طرح صنعتی انقلاب کے ہاتھوں زرعی معاشرے کی قدروں کی نفی ہورہی ہے۔"(۹)

زرعی معاشرے کے اس زوال نے صنعتی معاشرے کی اقدار و روایات کو پنپنے کے مواقع فراہم کیے جس سے سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ انسانی حقوق کے شعور اور ذرائع مواصلات کی ترقی نے اس تبدیلی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جاگیر دارانہ نظام میں فرد کی شناخت اس کے خاندان سے ہوتی تھی اسی شناخت کے باعث اسے سماج میں مقام ملتا تھا اور قانونی و سماجی حیثیت رتبہ اور دیگر مراعات پر اس کے حقوق متعین کیے جاتے تھے۔ اسی لیے کہا جاتا تھا کہ اعلیٰ جاگیر دار طبقہ کے لوگ بنتے نہیں بلکہ پیدائشی ہوتے ہیں۔ خون کی پاکیزگی اس کلچر کا ایک بہت اہم جزو مانا جاتا تھا تاکہ خاندانی اوصاف باقی رہیں اور ملاوٹ نہ ہو۔ خون اور نسل کی اسی تقسیم کے باعث اس نظام میں خاندان برادری سے باہر شادی نہیں کی جاتی تھی۔ اسی طرح شمشیر زنی، نیزہ بازی، گھڑ سواری، علم و ادب، شجاعت وغیرہ جیسے اوصاف اسی طبقے کی جاگیر مانے جاتے تھے۔ یہ مہارتیں انہیں ممتاز حیثیت اور مقام دیتی تھی وہیں وجہ عزت بھی تھیں۔ ویسے بھی وہ محکوم طبقہ جو دو وقت کی روٹی کی مشقت میں ہو ان مہنگے اور وقت طلب کاموں سے دور ہی رہتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق:

"ملازموں اور خادموں کی ایک فوج ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتی تھی، اس لئے یہ تکلیف، غربت و مفلسی اور پریشانی سے واقف ہی نہیں ہوتے تھے اور یہی سمجھتے تھے کہ

یہ سہولتیں آسائشیں ان کا حق ہیں۔ان میں ابتداء ہی سے یہ بات آجاتی تھی کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کے ارد گرد کئی ملازم موجود ہیں جو ان کے اشارہ پر ان کا ہر کام کرنے کے لیے تیار ہیں اس وجہ سے ہاتھ سے کام کرنا ذلت کا باعث تھا کیونکہ یہ کام ملازم کرتے تھے لہٰذا خاندان کی ان روایات میں پرورش پاکر بچے ابتداء ہی سے خود کو دوسروں سے علیٰحدہ سمجھتے تھے اور یہ خاندانی تفاخر ان کے کردار کا ایک حصّہ بن جاتا تھا۔"(۱۰)

جس طرح اعلیٰ طبقے میں عزت و عصمت اور بڑائی کے جذبات پیدا کئے جاتے تھے اسی طرح نچلے طبقوں میں اطاعت و تابعداری اور فرمانبرداری کے تصورات اور جذبات کے فروغ کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ کوئی بھی محکوم امراء کی برابری نہ کر سکے۔ محنت کش طبقے کی آواز کو دبانے اور بغاوت وغیرہ جیسے خیالات کو جڑ سے نکال دینے کے لیے عموماً چھوٹی چھوٹی غلطیوں یا کوتاہیوں پر سخت سزائیں دی جاتی تھی تاکہ ماتحتوں کو یہ احساس رہے کہ وہ جاگیردار کے تابع ہیں اور جاگیرداران کا سرپرست اور محافظ ہے۔روایتی طور پر ایک جاگیر دار کو قانون سے بالا تصور کیا جاتا تھا کیونکہ اس معاشرے میں قانون صرف عام آدمی کے لیے تھے۔ قانون سے بالاتری کا یہ احساس جاگیردار کو وہ تمام مظالم کرنے کی کھلی چھٹی دے دیتا تھا جس نے کسانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "المیہ تاریخ" میں لکھتے ہیں:

"جاگیردارانہ نظام میں کہ جہاں جاگیردارانہ طبقات کی جڑیں انتہائی گہری ہیں وہاں جمہوری آزادی، حقوق، مساوات اور فرد کی عزت واحترام کی بجائے قوت اور طاقت، جبر اور تشدد پر اتھارٹی کو مضبوط اور عوام کو مسلسل کمزور کر رہی ہے۔"(۱۱)

اس جاگیردارانہ سماج میں طبقاتی کشمکش بہت نمایاں ہوتی تھی جسے مٹانا یا کم کرنا قریب قریب ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ اس طبقاتی کشمکش نے اس معاشرے میں ذات پات کے نظام کو مضبوط کیا۔ قانون، سماجی روایات اور معاشی پیداواری ذرائع پر قابض فردِ واحد کے قبضے کے باعث طبقاتی مفاد کے تحفظ کو ہمیشہ اولیت ملی جس نے جبر و استحصال کی روایت کو استحکام دیا۔ علی عباس جلالپوری اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس طبقاتی معاشرے میں جبر و استحصال کی روایت قائم ہوئی۔ قدیم شہنشاہت کے دور میں پیداوار ہر شخص میں مساویانہ تقسیم کی جاتی تھی لیکن اب اس روایت کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کھیت غلاموں کو کھانے پینے اور بڑھنے کے لیے وہی کچھ دیا جاتا تھا جس سے ان کا رشتہ جسم و جان قائم رہ سکے۔"(۱۲)

جاگیر دارانہ نظام نے معاشی ظلم اور استحصال کے علاوہ سیاسی ،روحانی اور معاشرتی جبر کے ذریعے مزاحمت کے راستوں کو حتیٰ الامکان بند کرنے کی کوشش کی۔ جاگیر دار طبقے نے نمود و نمائش اور ظاہر پرستی کی خاطر معاشرے میں جن روایات یا رسومات کو فروغ دیا تھا وہ کسی نہ کسی حد تک عام آدمی پر اثر انداز ہوتے تھے اس لئے ظاہر پرستی اور نمود و نمائش کی عوامی سطح پر حیثیت کے مطابق تقلید ہونے لگی۔ تہواروں، خوشی یا غمی کے مواقع پر ہونے والی رسومات اسی تقلید کا نتیجہ تھا، جب ان رسومات و رواجات نے عوامی سطح پر فروغ پایا تو اسے سماجی طور پر عزت اور مرتبہ پانے کے لیے پورا کرنا لازم ٹھہرا۔ اسی لیے تہواروں اور خوشی غمی کے مواقع پر قرض لے کر بھی ان رسومات کو ضرور پورا کیا جاتا ہے تاکہ سماجی طور پر باعزت رہ سکے چاہے پھر ساری زندگی قرض کی چکی میں پیستے گزر جائے۔ اس صورتحال کا فائدہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کے علاوہ جاگیر دار طبقے کو ہوا جو معمولی قرض کے بدلے نسلوں کو اپنا غلام بنالیتے تھے۔

جب جاگیر دارانہ نظام کمزور ہوا تو رفتہ رفتہ اس کی جگہ سرمایہ داری نظام نے لینی شروع کر دی اور جبر و استحصال سے گھبرائے ہوئے عوام کے لیے اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام مکمل طور پر مادیت پسند تھا، جاگیر داروں کی معاشی حالت پہلی سی نہ رہی تھی اس لیے رفتہ رفتہ جاگیر دارانہ نظام اور اس کی روایات و اقدار کی گرفت کمزور پڑنے لگی اور اس کی جگہ سرمایہ داری نظام نے لے لی۔ سرمایہ داری سے قبل دنیا بھر میں جاگیر دارانہ نظام رائج تھا جب سرمایہ دارانہ نظام متعارف ہوا تو جاگیر داری کا خاتمہ ہوا، سرمایہ دارانہ نظام صنعتی انقلاب آنے کے بعد آیا۔ صنعتی انقلاب سے مراد وہ معاشی اور اقتصادی تبدیلیاں ہیں جنہوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں رونما ہو کر انگلستان کو زرعی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل کیا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک صنعتی انقلاب یورپ کی تدریجی ترقی تصور کیا جانے لگا کیونکہ اس ترقی میں تقریباً ایک صدی کا عرصہ لگا اس انقلاب نے انگلستان میں صنعتی نظام کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ نئی ایجادات سے نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں، مشینی دور کے آغاز سے معاشی اور سماجی زندگی میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ پیدائشِ دولت کے طریقے بدلے اور سمجھا جانے لگا کہ اب جاگیر داری سے چھٹکارا ملا۔ اس مشینی ترقی نے یورپ کے سیاسی، معاشی اور سماجی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کی وجہ سے یورپ میں ایک ایسا سرمایہ دار طبقہ پیدا ہوا جو زندگی کے ہر شعبے پر چھا گیا۔ سرمایہ داری کو اصل شاہی نظام بھی کہا جانے لگا کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت پیداوار اور سامان کی تقسیم نجی طور پر آزاد تجارت یا کاروبار کی صورت میں

ہوتی ہے۔اردو جامع انسائیکلوپیڈیا میں سرمایہ داری نظام کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے:اس نظام کی خصوصیت میں نجی ملکیت کا حق پیدائش برائے منافع اور بنکوں سے قرضے کا حصول شامل ہے۔(۱۳)

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد جس نظریے پر رکھی گئی تھی وہ یہ تھا کہ ذرائع پیدائش عوام کے ہاتھ میں ہوں گے اور حکومت ان کی نگران و محافظ ہو گی ہر فرد اپنی کمائی کا مالک ہو گا اور کسی دوسرے کا اس پر حق نہیں ہو گا۔زراعت، صنعت، تجارت پرائیوٹ اداروں کی رہین منت ہوں گی۔لیکن دھاندلیوں، بے قاعدگیوں اور بے اُصولیوں کو روکنے کے لیے حکومت مداخلت کرے گی۔ہر شخص کا اپنے ماحول پر پورا حق ہو گا جس قدر وسائل دولت اس کے قبضے میں آئیں ان سے اپنا مفاد حاصل کرے۔یہیں سے غیر مساوی تقسیمِ دولت کی ابتداء ہوتی ہے، معاشرہ دو گروہوں میں بٹ جاتا ہے ایک نادار اور دوسرا مالدار اور اس طرح معاشی توازن بگڑنے لگتا ہے۔امیر طبقہ امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے اور غریبوں کی غربت انتہا تک پہنچتی ہے۔دولت چند مخصوص ہاتھوں میں جمع ہونے لگتی ہے۔ایک طرف صنعت کار اور سرمایہ دار اُبھرتے ہیں تو دوسری جانب مقروض محنت کش اور ایسے ایک طبقاتی کشمکش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

نئی ایجادات سے صنعت اور پیدائشِ دولت کے طریقوں میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔بجلی کی ایجاد نے صنعتی انقلاب کو اور بھی تیز تر کر دیا۔معاشی طور پر صنعتی انقلاب کا اثر یہ ہوا کہ پیدائشِ دولت کے طریقے بدل گئے سرمایہ دارانہ نظام کا آغاز ہوا۔ملک میں جگہ جگہ کارخانے قائم ہوئے چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے دستکار مشینی دور کا مقابلہ نہ کر سکے اور مجبور ہو کر کارخانوں میں ملازمت اختیار کی کیونکہ صنعتی انقلاب نے مزدوروں کی ایک کثیر تعداد کو بے روزگار کر دیا اور گھریلو دستکاروں کا جنازہ نکال دیا کیونکہ نئی صنعتی ایجادات سے دو سو جولاہوں کا کام ایک مشین کرنے لگی۔اس سے مزدور کی مفلسی اور بے روزگاری کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔غریب محنت کش کا گزارا مزید مشکل ہو گیا اور تنگ آ کر اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھی کام پر لگا دیا۔بھوک اور افلاس کا مارا ہوا غریب طبقہ حسرت سے صنعت کاروں کی فلک بوس عمارتوں کو دیکھتا دولت کی اس غلط تقسیم سے طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوا جو آج تک جاری ہے۔

صنعتی انقلاب سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں توازن نہیں تھا، امیر حد سے زیادہ امیر اور غریب حد سے زیادہ غریب ہوتا گیا۔جس سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس کا مذہب پیسہ تھا اور ظلم واستحصال اس کا شیوہ تھا۔صنعتی انقلاب نے انسانی ذہن کو تبدیل کر کے مادہ پرستی کو جنم دیا۔مفلسی اور بے روزگاری کی وجہ سے چوری چکاری اور گداگری میں اضافہ ہوا۔کارخانوں میں عورتوں اور مردوں کے اکٹھا کام کرنے سے بھی

متعدد سماجی برائیاں پیدا ہوئیں۔ صنعتی انقلاب نے نو آبادیاتی نظام کو جنم دیا۔ چونکہ ہر ملک کو اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیاں درکار تھیں اس لیے نو آبادیات کے حصول کی کشمکش نے فروغ پایا جس کے نتیجے میں دنیا میں کئی ہولناک جنگیں ہوئیں غربت کا نتیجہ زیادہ آبادی کی صورت میں نکلتا ہے اور یورپی آبادی میں بھی بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔

مارکس کی سرگرمیوں کے باعث مغربی ممالک کی حکومتیں اُن سے نالاں رہتی تھیں اور اُن کو مختلف جگہوں پر ہجرت کرنی پڑی۔ مارکس کی اس دربدری میں اس کی باوفا بیوی جینی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا، جینی جاگیرداروں کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور ناز و نعم میں پلنے کے باوجود شوہر کی محبت پر اس نے سب کچھ قربان کر دیا۔ مارکس اور اس کے خاندان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کی جھلکیاں جینی کے خطوط میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ غربت کے ہاتھوں اُس نے اپنے بچوں کو کھو دیا۔ جینی کے انتقال کے کچھ عرصے بعد مارکس کی بڑی بیٹی بھی فوت ہوگئی جس دکھ کی تاب نہ لاتے ہوئے ۱۸۸۳ء کو کارل مارکس بھی فوت ہو گیا۔ کارل مارکس اپنے اشتراکی نظریات اور خیالات کا پرچار کرنے سے باز نہ آیا، اُس نے بہت سی شہرہ آفاق کُتب لکھیں۔ اُس نے ۱۸۴۹ء میں اشتراکی منشور دیا جو سرمایہ دارانہ نظام کی ضد تھا۔ کارل مارکس کے فلسفے کے اہم نکات یہ ہیں:

ا۔ مارکس کہتا ہے کہ اِس کائنات میں مسلسل تبدیلیوں کا عمل جاری ہے، ہر شے تغیر پذیر ہے۔

۲۔ دنیا کے تمام معاشی نظام کچھ عرصے بعد کسی اور معاشی نظام میں ضم ہو جاتے ہیں، یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گا۔

۳۔ اُس وقت سرمایہ داری نظام رائج تھا، اُس کی ضد پر اشتراکیت کا نظام منظرِ عام پر آیا۔

اشتراکیت کے چند بنیادی اُصول

ا۔ اشتراکی نظام میں معاشرے کی بہت اہمیت تھی، اُس نے معاشرے کے مفادات کو انفرادی معاملات پر برتری دی۔

۲۔ اشتراکیت سرمایہ داروں کا خاتمہ چاہتی ہے اس نظام میں سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کو کمزوروں کا قدرتی دشمن سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ اشتراکیت نے مقابلے کی فضا کو ختم کر دیا اور اقتصادی ناہمواریوں کا قلع قمع کیا۔

۴۔ اشتراکیت نے زمین کو قدرت کا عطیہ قرار دیا اور اس سے فائدے کا حق سب کو ہے۔

۵۔اشتراکیت انفرادی ملکیت کے خلاف ہے اور سرمایہ داری کے خاتمے کے ساتھ انفرادی ملکیت کو بھی ختم کرنا چاہتی ہے۔

۶۔اشتراکیت ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کی حامی ہے یعنی پیداوار کے تمام عوامل پر ریاست کا کنٹرول ہونا چاہیئے۔

کارل مارکس نے اپنی کتاب داس کیپٹل میں سرمایہ دارانہ نظام کی کھل کر حقیقت بیان کی ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کا خواب لوگوں کو دکھایا جس میں ذرائع پیداوار ذاتی ملکیت کی بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں۔ ہر فرد اپنی طاقت کے مطابق جان مار کر محنت کرے اور اس کی محنت کا حاصل معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہے جہاں سے ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے اس طرح نہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم رہے گا نہ کسی کے پاس اس کی ضروریات سے زائد جمع ہو گا۔ کارل مارکس نہ خدا کا قائل تھا نہ روح کا اور نہ ہی مذہب کا وہ انیسویں صدی کے تصور حیات کا مکمل نمونہ تھا۔ کارل مارکس نظریہ بیگانگی کا قائل تھا کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ درسی اردو لغت کے مطابق بیگانگی سے مراد ہے: "غیر ہونا، تعلق نہ رکھنا۔"[۱۴] ڈاکٹر ساجد اللہ تفہیمی نے اپنی کتاب 'فرہنگِ علوم و ادبی اصطلاحات" میں بیگانگیت کے معنی ان الفاظ میں لکھے ہیں: "بے گانہ، ناشناس، اجنبی، آشنا۔"[۱۵] سبطِ حسن بیگانگیت کے حوالے سے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> "بیگانگی یا لاتعلقی نفسیات کی پرانی اصطلاح ہے۔ اس سے مُراد تشخصِ ذات کا زیاں ہے یعنی وہ ذہنی کیفیت جس کے باعث انسان اپنے معاشرے، اپنی تہذیب حتٰی کہ اپنی ذات سے بھی کٹ جاتا ہے۔ وہ ہزاروں لاکھوں کی بستی میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یارومددگار محسوس کرتا ہے۔ اس کو اپنے گردوپیش کی ہر شے اجنبی اور غیر نظر آتی ہے اور وہ معاشرے کی تمام قدروں، تمام سرگرمیوں کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ اس ذہنی بیماری کی دوسری علامت لاچاری اور بے بسی کا شدید احساس ہے۔ انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ مجھ کو اپنی زندگی پر بالکل قدرت حاصل نہیں ہے۔ میں نہ اپنے حالات کی اصطلاح کر سکتا ہوں نہ میرے عمل سے دنیا میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے، بے مقصدیت کا احساس اس کو سماجی قدروں سے اور بے بسی کا احساس اس کو اپنے کردار اور عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کھو دیتا ہے۔"[۱۶]

یہاں سبط حسن نے بیگانگی کی وضاحت عمدہ طریقے سے کی ہے۔بیگانگیت کو انگریزی میں Alienation کہا جاتا ہے یہ سماجی، فلسفیاتی اور نفسیاتی اصطلاح ہے جو کہ ادب کا بھی حصہ بن گئی، بیگانگیت کو اجنبیت،عدم مطابقیت،وجودیت یا موجودیت بھی کہا جاتا ہے۔بیگانگیت کے کئی زمرے ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی اپنی الگ پہچان ہے۔بیگانگیت کا تعلق ایک طرف تصوف کے نظریہ "وحدۃ الوجود" کے ساتھ ملتا ہے تو دوسرے کے ڈھانڈے کارل مارکس کے معاشی نظریہ اجنبیت تک جا پہنچتے ہیں تو تیسرے کا رشتہ فرانس کے مفکروں اور ادیبوں کے نظریہ وجودیت سے جاملتا ہے۔

قاضی جاوید کے نزدیک:"وجودیت "ہر قسم کے محض تجریدی ، منطقی و سائنسی فلسفہ کی نفی ہے"۔[۱۷] وجودیت میں انسان کا وجود اہم ٹھہرتا ہے یعنی انسان کی حقیقت کیا ہے؟ انسان تنہا کیوں ہے؟اس تنہائی سے نکلنے کے لیے کیا کرنا ہو گا؟اس کی منزل کیا ہے؟اور یہ کہ خوف،اور موت کا مداوا کیسے ممکن ہے؟ اس نوعیت کے سوال و جواب وجودیت میں کئے جاتے ہیں۔بیگانگیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص کا اپنے معاشرے کے مجموعی افکار سے مطابقت نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔

بیگانگیت کا ایک تناظر مذہبی بھی ہے۔انسان جب دنیا میں آتا ہے تو وہ یہ بات سوچتا ہے کہ کہاں سے آیا؟کہاں ہے اور کہاں جانا ہے؟اس حوالے سے کئی نظریات ملتے ہیں ان میں دو نظریے اہم ہیں ایک الہیٰ اور دوسرا مادی نظریہ۔الٰہی نظریے کے مطابق دیکھا جائے تو انسان اور کائنات اللہ کی تخلیق ہے،انسان زمین پر اللہ کا نائب ہے۔انسان کو دنیا میں کسی مقصد کے تحت بھیجا گیا،کائنات اور دنیا مقصد نہیں ہے بلکہ یہ دنیا اور کائنات ایک وسیلہ ہے جس کو استعمال میں لا کر ابدی زندگی یعنی آخرت میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔جب ہم مادی تصورِ کائنات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان تمام باتوں کے ساتھ مابعد الطبیعیات سے بھی انکار کا فلسفہ ملتا ہے۔ دیکھا جائے تو وجودی نظریہ بھی مادی تصورِ کائنات کا شاخسانہ ہے اور اس کے مطابق انسان کی کوئی پہچان اور شناخت نہیں ہے۔انسان کو کائنات میں بھیجا گیا لہٰذا انسان اپنے وجود کے اثبات کے لیے جدوجہد کرتا نظر آتا ہے اور اس کی یہ جدوجہد لایعنی اور لاحاصل ہے،نتیجے میں بیگانگیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں کہ:

> "بیگانگی و مغائرت کے معنی موجودیت ایک شدید اور کربناک احساس کے ہیں۔جو انسان کی ساری شخصیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔موجودیوں کا کہنا ہے کہ آدمی جب کسی غیر معمولی

صورت حال سے دوچار ہو کر اپنی داخلیت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے تو وہ بیگانگی اور مغائرت کا شکار ہو جاتا ہے وہ اپنی اس مغائرتی کیفیت میں اس اضطراب میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس کی فطرت بھی خارجی شے سے مماثلت نہیں رکھتی لہٰذا اس کی کیفیت لامکانیhome lessnessکی سی ہو جاتی ہے۔"(۱۸)

انسان جیسے جیسے آزاد ہوتا چلا گیا اسی اعتبار سے انسان اجنبیت کا شکار ہوتا گیا پہلے زمانوں میں انسان کو زیادہ آزادی میسر نہیں تھی تو بیگانگیت بھی اتنی نہیں تھی۔ جوں جوں انسان آزاد ہوتا گیا ویسے ویسے انسان کی بیگانگیت بڑھتی گئی۔ ارسطو کے نزدیک "انسان معاشرتی حیوان ہے "یعنی انسان کا اپنے معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنا بڑا مشکل کام ہے۔ پہلے وقتوں میں معاشرے میں موجود لوگ ایک دوسرے سے مختلف بہانوں اور موقعوں پر ایک دوسرے سے ملاقات اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی کہانی سناتا اور باقی لوگ کہانی سنتے تھے، کسی عالم کے پاس لوگ جاتے تو ایک علمی محفل سج جاتی تھی۔ مقامی تہوار پر، عید ملن پر لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن جب انسان ایک دوسرے سے بے محتاج ہونا شروع ہوا تو مشین کی طرف انسان کی ضرورت بڑھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے انسان اپنے جیسے انسانوں کی جگہ مشینوں سے مانوس ہونے لگے۔ اس کی وجہ سے انسان سماج سے رفتہ رفتہ جدا ہوتا گیا، جب سماج سے انسان الگ ہوا تو انسان کا تنہائی کی جانب سفر شروع ہوا اور اُس نے خود کو بیگانگی کی کیفیت میں مبتلا پایا۔ لہٰذا جب سماج سے انسان کی وابستگی ختم ہو جائے تو انسان کے وجود میں بیگانگیت سما جاتی ہے:

"احساسِ بیگانگی کو اپنے وسیع مفہوم میں کیا جائے تو مختصر الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ فرد کا اپنے سماجی وجود کے مختلف کلیدی پہلوؤں سے علیحدگی ہے۔"(۱۹)

پہلے پہل علمی اور فلسفیانہ مباحث میں وجودِ خداوندی موضوعِ بحث رہا جب انسان نے مادیت کا خول چڑھا لیا تو اللہ سے رشتہ توڑ دیا اور آسمانی باتوں کی جگہ زمین اور اُس سے جڑی چیزوں کی باتیں ہونے لگیں۔ توحید، نبوت، امامت اور قیامت کی بحثیں ثانوی قرار پائیں۔ انسان، روٹی، کپڑا اور مکان کی حد تک محدود ہو گئے جیسے جیسے انسان اللہ سے رشتہ توڑتا گیا اسے قلبی اور ذہنی سکون میسر نہیں آیا۔ انسان نیاز اور مناجات سے کوسوں دور ہو گئے، مشینوں سے انسان زیادہ مانوس ہو گئے تو روحانی غذا انسان کے لیے میسر نہیں آئے۔ نفسا نفسی کی اس دنیا میں آج کے انسانوں نے اللہ کو بھلا دیا تو نتیجے میں اللہ نے بھی انسان کو بھلا دیا اور انسان کو اس حال پر چھوڑ دیا۔ جب اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو انسان اپنی خواہشات کو بت بنا کر سجدہ ریز

ہوئے اور ایسے انسان کثرتِ گناہ میں پڑ کر اپنے وجدان اور نفسِ لوامہ کے حضور ندامت کے آنسو پونچھتے ہوئے نظر آئے۔ جب انسان برائی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا نفسِ لوامہ ملامت کرتا ہے تو انسان ایک کرب میں ہوتا ہے۔ جب تک وہ توبہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا تو ملامت اسے بے چین رکھتی ہے اور وہ اپنے آپ کو احساسِ جرم اور گناہ کی وجہ سے بیگانگی میں پاتا ہے۔ لیکن جب یہی انسان اللہ کی بارگاہ میں جھکتا ہے تو اس کے نفس کو سکون ملتا ہے اور بیگانگیت دور ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے۔

یہ تو تھا الٰہی نظریہ جس کی وجہ سے انسانوں میں بیگانگیت آتی ہے۔ وجودی فکر رکھنے والوں کے نزدیک انسانوں میں بیگانگیت کی ایک بڑی وجہ مشینی ترقی ہے۔ جیسے جیسے مشینوں نے ترقی کی تو انسانوں کے مقابلے میں مشینیں زیادہ کام کرتی گئی اور اس کے نتیجے میں انسان کے اثبات پر سوال اُٹھنے لگے۔ اس ترقی کی بدولت انسان کی اہمیت ثانوی ہو گئی اور انسان معاشرے میں مشین کی موجودگی کی وجہ سے بیگانہ ہوتے گئے۔ اس بارے میں ڈاکٹر اشرف کمال کہتے ہیں کہ:

> "بیگانگی کی اصطلاح موجودہ ترقی یافتہ دور کی دین ہے۔ جس میں مشینوں کی حکومت نے اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے ملنے والی آسائشوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ قریب ہوتے ہوئے بھی دور اور ہجوم میں ہوتے ہوئے تنہا۔"[۲۰]

بیگانگیت وجودیت کی دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی کرب بھی ہے جو معاشرے میں موجود ہر انسان پر کسی بھی حوالے سے اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔ لہٰذا بیگانگیت میں مذہب، سائنس اور منطق کی کلیت سے انحراف کر کے انسان کے اپنے وجود میں سفر کرنے سے عبارت ہے۔ یہ اصطلاح فلسفہ کی ہے لیکن اس فلسفہ کو ادب میں زیادہ مقبولیت ملی، جو آج کے صنعتی انقلاب کے درمیان پسنے والے کرب زدہ انسان کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ اس حوالے سے افتخار بیگ کہتے ہیں کہ:

> "بیگانگی کی اصطلاح وجودی فلاسفہ سے بیشتر ہیگل، مارکس اور فیورباخ نے بھی استعمال کی تھی۔ بیگانگی وجودی فلاسفہ کے نزدیک خالصتاً ایک داخلی کیفیت ہے، ایک ایسی کیفیت جس میں فرد شدید داخلی کرب کا شکار ہوتا ہے یہ کیفیات ہستی موجود کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتی ہے۔"[۲۱]

یورپ میں عقلیت کا رجحان بڑھنے کے باعث سائنس پر اعتماد کیا گیا اس وجہ سے سے پوپ سے تعلقات کم ہوتے گئے۔ صنعتی ترقی نے انسان کو "اشیاء" میں الجھائے رکھا جس کہ وجہ سے انسان عدم شناخت کی چھتری میں آ گیا۔ ان رجحانات کے ردِ عمل کے ساتھ ساتھ انسان کی شناخت اور پہچان کو واضح کرنے کے

لیے وجودی فلسفہ میدانِ عمل میں آیا اور اس نے سماجی، مذہبی اقدار کو چیلنج کیا اس فلسفہ میں فردِ واحد کا وجود بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔شاہین مفتی لکھتے ہیں کہ:

"صنعتی معاشرے کی عدم شخصیتی کو جنم دینے والی قوتوں کے خلاف ایک فکری بغاوت ضروری سمجھی گئی، وجودیوں نے اندازہ کیا کہ شخص کو ان عناصر سے محفوظ رکھنا ضروری ہے جو اس کی آزادی سلب کر رہے ہیں، مروجہ نظام کی انفرادیت کے لیے سم قاتل ہے یہ فرد کو ایک کل پرزے کے طور پر استعمال کر رہا ہے جس کی معاشرے میں تنہائی اور بیگانگی کا عمل دخل بڑھ رہا۔۔۔۔۔یہ فلسفہ فردِ واحد، اس کی اہمیت یاس کے مسائل کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا، وجودیت کے پیروکاروں نے فردِ واحد اور اس کے گونا گوں مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔"(۲۲)

بیگانگیت اور وجودیت کا باعث بننے والی دو اہم وجوہات میں نو آبادیات کا قیام(اور مقامی اور عالمی) جنگیں شامل ہیں جن کی وجہ سے عوام میں اجنبیت اور دوری پھیلتی چلی گئی۔نو آبادیات اور جنگوں میں ہونے والی قتل و غارت گری کی وجہ سے انسان کی قیمت ختم ہو گئی، تو جنگ زدہ اور تیسری دنیا کے مظلوم لوگوں نے اپنا اثبات چاہا اور اس اثبات کے پیچھے بیگانگیت کا ہاتھ ہے جو کوشش اور جدوجہد کی طرف فرد اور قوم کی رہنمائی کرتی ہے۔شاہین مفتی کہتے ہیں کہ:

"فرانس کی شکست وریخت ایشیا، مڈل ایسٹ، افریقہ، لاطینی امریکہ، کشمیر، فلسطین کی مقامی جنگیں اور انسان کی بے حیثیتی کا نہ ختم ہونے والا ڈرامہ جاری و ساری ہے۔ان انتہائی صورتوں میں وجودیت قاری اور سامع کے دل کی آواز بن گئی ہے کیونکہ وجودیت ایک لحاظ سے برائی کے خلاف فرد کا وہ مزاحمتی رویہ بھی ہے جو فرد کا ذاتی اثبات چاہتا ہے۔پس وجودیت کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی مجبوری و مقہوری سے کماحقہ آگاہ ہوتے ہوئے بھی فرد کی بے معنی زندگی میں ذاتی آزادی، ذاتی اعتماد اور ذاتی اُمنگ کا وہ دیا روشن کرتی ہے جو کائناتی ظلمت میں بہت معمولی سی تبدیلی کا ضامن سہی لیکن روشنی کا استعارہ بن کر اپنا اثبات چاہتا ہے۔"(۲۳)

وجودی فلسفہ کے مطابق انسان اہم ہے اس کا مرکزی نقطہ انسان کا وجود ہے۔وجود کی کیا کیفیت ہے؟وجود کس سمت سفر پر آمادہ ہے؟اور یہ وجود کس کرب میں ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟ان سب سوالات کی تلاش وجودیت کے فلسفہ میں جاری و ساری رہتی ہے۔آج کے معاشرے میں انسان خود کو اجنبی سمجھتا ہے وہ ایک بے خانماں زندگی گزار رہا ہے اور اس کی زندگی خود سے مقابلہ کرتے کرتے ختم ہو جاتی ہے۔غفور شاہ

قاسم کہتے ہیں کہ:"وجودیت نے جہاں زندگی کے لغو اور بے معنی ہونے کا تصور دیا وہاں ارادے اور عمل کی آزادی پر بھی زور دیا۔"(۲۴) وجودی نقطہ نظر ایک لایعنیت سے دوسری لایعنیت تک سفر کا نام ہے۔ جس میں دورانِ سفر جدوجہد پر زور دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں افتخار بیگ لکھتے ہیں کہ:

> "ہمہ جدوجہد "وجود" کے اثبات کے لیے ضروری بھی ہے۔ وہ ہر سمے بے چین و بے قرار ہوا کرتا ہے کہ کسی بھی صورت اپنے آپ کو تسلیم کروائے۔ سکوت و سکون اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں جبکہ عملاً سماجی صورتحال میں وہ اپنے آپ missfit محسوس کرتا ہے اور یوں وہ اپنے آپ کو Homeless محسوس کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے سو جدوجہد کا جذبہ اسی تنہائی اور بیگانگی سے کسی چشمے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے۔"(۲۵)

الٰہی اور وجودی نظریہ کی روشنی میں بیگانیت کی توضیح و تشریح کرنے کے بعد ایک اور بیگانگیت کا نظریہ کارل مارکس نے دیا ہے۔ اس نظریے کا محور معیشت ہے، یعنی مزدور کی اپنی محنت سے بیگانگی۔ اس بارے میں کارل مارکس کہتا ہے کہ:

> "The process of production is one of objectification,whereby men make material objects which embodyhuman creativity yet stand as entities sparate from their creator. Alienation occurs when when once objectified, man no longer recognis him self in his product which has become alien to him, is no longer his own, and stand opposed to him as an automous power.Objectification, however, only becomes alienation in the specific historical circumstances of capitalism.In capitalist society one group one group of people, capitalist, appropriates the products created by other.This is the origin of alienation.[26]

سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مزدور جب کارخانے میں اپنی محنت کے بل بوتے پر کام کرکے جوتی بنالیتا ہے لیکن جوتی کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے خریدنے سے قاصر ہے۔ وہ جوتا جسے مزدور نے بنانے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کی ہوتی ہیں لیکن اب مارکیٹ میں آنے کے بعد اُس جوتی اور مزدور کے درمیان اجنبیت آڑے آجاتی ہے۔ مزدور اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے جوتے کو استعمال میں

نہیں لا سکتا۔ جہاں ایک مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بیگانگی کا احساس کرتا ہے وہاں دوسری طرف پورا معاشرہ احساسِ بیگانگیت کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ بیگانگیت اور وجودیت اہلِ مغرب کا مسئلہ تھا، کیونکہ وہاں مادی ترقی تو بہت ہوئی لیکن روحانی طور پر تنزلی اور زندگی کا کوئی ہدف اور مقصد رکھنے کی وجہ سے جب مشین سے مانوس اور معاشرے سے رابطہ کٹا تو بیگانگیت کے لیے راستے ہموار ہوئے۔ کارل مارکس کے ہاں الگ نوعیت کی بیگانگی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں ایک مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بیگانگی کا احساس رکھتا ہے وہاں پورا سماج بھی احساسِ بیگانگیت کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں کارل مارکس کے نظریے کو ڈاکٹر مدیحہ ہاشمی نے اپنے الفاظ میں کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

"یہ (بیگانگی) کیفیت سرمایہ دارانہ (capitalist) نظام کا لازمی جز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظام کے تحت کسی بھی انسان کو اپنے نان نفقہ کے لیے روز اپنی محنت پیسے کے عوض بیچنی پڑتی ہے۔ اس عمل سے اُس کے اندر بد دلی اور کراہت کے جذبات اُبھرتے ہیں کیونکہ اس کے دن کا بیشتر حصہ ایسے کام میں صرف ہوتا ہے جو وہ دل سے نہیں کرتا، محض معاوضے کے عوض کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ بد دلی کی کیفیت اُس کی پوری زندگی کا احاطہ کر لیتی ہے اور وہ ہر چیز سے، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی نفرت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اِسی عمل کو مارکس نے بیگانگیت (Alienation) کا نام دیا ہے۔"(۲۷)

کارل مارکس نے سرمایہ داریت کے تجزیہ کے دوران تصور بیگانگی کی کھوج لگائی۔ جس دوران اسے اندازہ ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع پیداوار اور پیداواری تعلقات میں شدید ترین اختلافات اور تضادات ابھر رہے ہیں جس کے نتیجے میں بیگانگی کا المیہ سامنے آتا ہے۔ ذرائع پیداوار اور پیداواری تعلقات کے درمیان تضاد واختلافات نے ہی سماجی بیگانگی کے نظریے کو جنم دیا۔ استحصال کردہ و استحصال زدہ، ظالم و مظلوم، جابر و مجبور اور آقا و غلام کے اسی اختلاف کی وجہ سے بیگانگی کا مرض دنیا بھر میں پھیل رہا ہے۔ پوری دنیا ایک فکری، سیاسی، ذہنی، جذباتی، معاشی اور سماجی بحران کی زد میں ہے اور اس بحران کی جڑیں سرمایہ داریت کے وجود میں ہی پوشیدہ ہیں۔ دیکھا جائے تو بیگانگی کا آغاز سرمایہ داریت سے نہیں ہوا بلکہ اس کی شاخیں تو کئی ہزار سالوں پہلے بھی موجود تھیں اور ہر طبقاتی نظام میں اس کا شور مچتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں کہ:

"شخصیت کی یہ توڑ پھوڑ دراصل اس وقت شروع ہوئی جب معاشرہ طبقات میں تقسیم ہوا اور

اس کی وحدت پر پہلی ضرب لگی۔ جن دنوں معاشرہ طبقوں میں نہیں بٹا تھا اور نہ بادشاہتیں قائم ہوئی تھیں بلکہ ہر قبیلے کی نوعیت ایک بڑے گھرانے کی تھی اور لوگ زرعی زندگی یا گلہ بانی یا ماہی گیری کے اشتراکی دور سے آگے نہیں بڑھے تھے تو معاشرہ ایک سالم وحدت تھا۔ معاشرے اور فرد کے مفاد میں کوئی ٹکر نہیں تھی۔ اس وقت تک دیوی، دیوتا نہیں بنے تھے اور نہ مذاہب کا ظہور ہوا تھا بلکہ انسان دہر کا قیاس اپنے روز مرہ کے تجربوں سے کرتا تھا۔ وہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے فرق کو نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ تمام موجودات عالم اس کے مانند فعال اور با ارادہ ہیں۔"[۲۸]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے طبقاتی تقسیم و تفریق کی وجہ سے ہی سماجی خلیج میں اضافہ ہوا اور اس خلیج کا سارا خمیازہ ہمیں بیگانگی کے روپ میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ایسی صورتحال میں محبت و اخوت جیسے جذبے کمزور ہو جاتے ہیں جبکہ نفرت و حقارت کے جذبوں کو تقویت ملتی ہے۔ انسان آپس میں جڑے رہنے کی بجائے ایک دوسرے کو اپنا حریف تصور کرتے ہیں اور سہارا بننے کی بجائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ یہ صورتحال مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معاشرے کے زوال اور انحطاط کا باعث بنتی ہے۔ مبارک علی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ: "وہ معاشرے جو انتہاء پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، پستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔"[۲۹] طبقات پر مبنی معاشی نظام کا بحران معاشی بدحالی، سیاسی عدم استحکام اور سماجی عدم تحفظ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ زوال پزیری کے اثرات معاشرے کے تمام شعبوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ سماجی نظام میں ایک طرف مانگ ہے تو دوسری جانب نئی اشیاء کی نمائش ہے۔ موبائل سے لے کر موجودہ زندگی میں ہماری زندگیوں پر مسلط کردہ مختلف فیشنوں و ضروریات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بنیادی ضروریات سے انسانوں کی محرومی ہے جبکہ ثانوی ضروریات کی بھرمار ہے۔ یہ سب بنیادی طور پر اس انتشار بھرے معاشرے میں انسان کی بیگانگی کی اندوہناک ویرانی کی غمازی کرتا ہے۔ آج کے دور میں بیگانگی اور تنہائی کا مسئلہ بنیادی طور پر شخصی یا انفرادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی اور معاشرتی مسئلہ ہے جو اس نظام زد اور اس کے بحران سے پورے معاشرے کو لاحق ہے اور اس کا ہر فرد کسی نہ کسی شکل اور سطح پر اس سے متاثر ہے۔

کارل مارکس کے نظریہ بیگانگی کا تعلق انسانی معاشرت کے ان پہلوؤں سے ہے جہاں فرد اپنی ذات، اپنی اردگرد کے افراد، اپنی محنت حتیٰ کہ اپنے ہی سماجی حالات سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ کارل مارکس نے نظریہ بیگانگی صنعتی معاشروں کے تناظر میں پیش کیا تھا۔ مگر نظریہ بیگانگی آج کے پاکستان کی سماجی، معاشی، ثقافتی اور

سیاسی صورت حال پر بھی لاگو کیا جا سکتا ہے۔ مارکس کے نظریہ بیگانگی کے مطابق سرمایہ داری کے تحت مزدور اپنی محنت کے نتائج سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ جو کچھ بھی وہ پیدا کرتا ہے وہ اس کی اپنی زندگی کی جگہ سرمایہ دار کے مفاد کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کے ایک دوسرے سے بیگانہ ہونے کی صورتحال کا بھی سامنا ہوتا ہے کیونکہ وہ مادی فائدے کے حصول کے لیے ایک دوسرے کا استحصال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پاکستان میں سماجی بیگانگی کی صورت میں ایک سنگین مسئلہ لوگوں کو درپیش ہے۔ طبقاتی فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور اس سے معاشرے میں موجود افراد کے درمیان دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ ایک ایسی صورتحال اختیار کر چکا ہے جس نے لوگوں کو انسانیت سے دور کر دیا ہے۔ یہ بیگانگی صرف امیر اور غریب کے درمیان ہی نہیں ہے بلکہ مختلف لسانی اور مذہبی گروہوں کے درمیان بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پاکستان میں سماجی بیگانگی کا سب سے زیادہ اثر نوجوان نسل پر ہوا ہے۔ تعلیمی نظام کی خرابی، بے روزگاری اور مستقبل کی بے یقینی نے نوجوانوں کو معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔ یہ وہ نسل ہے جو ملک کی ترقی میں بہتری لا سکتی ہے مگر بیگانگی کے باعث وہ سماج سے کٹتی جا رہی ہے۔

پاکستانی سیاست میں بیگانگی کا مظاہرہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ عوام کی اکثریت اپنے سیاسی نظام اور مسائل سے بیگانہ محسوس کرتی ہے کیونکہ سیاسی جماعتیں اور رہنما عوامی مفادات کا خیال رکھنے کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں عوام کا حکومت پر اعتماد دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ عوام کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ان کی رائے ان کی زندگیوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی۔ دیکھا جائے تو پاکستان کی سیاست میں بیگانگی کا مظاہرہ "انتخابات" میں بھی واضح ہوتا ہے۔ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد انتخابات میں حصہ لینے سے گریز کرتی ہے کیونکہ عوام کو پختہ یقین ہے کہ ان کے ووٹ سے کچھ بدل نہیں سکتا۔ ایسے عوام اور حکومت کے درمیان بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے جو ایک جمہوری ملک کے لیے خطرناک صورتحال ہے۔

مارکس کے نظریہ بیگانگی کے تناظر میں پاکستان کی معاشی صورتحال کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری نظام نے ملک میں مزدوروں کو ان کی محنت کے ثمرات سے بیگانہ کر دیا جس وجہ سے مزدور کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے برعکس بڑے سرمایہ دار ان کی محنت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ معاشی بیگانگی کا مظاہرہ غربت اور بے روزگاری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ پاکستان میں غربت بڑھتی جا رہی ہے اور عوام

کی اکثریت اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورتحال میں عوام کا اپنے ہی ملک کی معاشی پالیسیوں پر اعتماد ختم ہوتا جارہا ہے۔

ثقافتی بیگانگی کو دیکھا جائے تو پاکستان میں مغربی ثقافت کا اثر بڑھتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے مقامی ثقافت اور روایات ختم ہوتی جارہی ہیں۔ پاکستانی نوجوان مغربی کلچر اور طرز زندگی کو اپنارہے ہیں جو ان کی شناخت اور روایتوں سے بیگانگی کی وجہ بن رہی ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں کی اپنی ثقافت ہے، مگر ان ثقافتوں کو فروغ دینے کی جگہ مغربی کلچر یا ایک قومی شناخت کو مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے مختلف ثقافتی گروہوں میں بیگانگی کا احساس بڑھ رہا ہے اور وہ اپنی شناخت کو کھونے کے خوف سے دوچار ہیں۔

کارل مارکس کے نظریہ بیگانگی کے تناظر میں پاکستان کی موجودہ صورت کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں میں بیگانگی نے ہمارے معاشرے کو بہت سے مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس بیگانگی کو دور کرنے کے لیے جب تک مناسب اقدامات نہیں کیے جاتے، ملک میں ترقی اور استحکام کسی صورت ممکن نہیں۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو ان کی محنت کے ثمرات سے مستفید کیا جائے۔ سیاسی نظام میں عوام کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے اور ثقافتی روایات کو فروغ دینے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس طرح ہم ایک بیگانہ معاشرت سے بچ سکتے ہیں اور ایک مستحکم، متحد اور خوشحال پاکستان کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ناول نگاروں کے ہاں بھی کارل مارکس کے نظریہ بیگانگی کے تحت پائے جانے والے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی وجہ سے سماج میں ثقافتی حوالے سے کئی بحرانوں نے سر اٹھایا ہے۔ اگلے صفحات میں اسی حوالے سے بحث و تحقیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کاروانِ وجود:

کاروانِ وجود (۱۹۸۰ء) میں پاکستان بننے کے بعد کی صورت حال کی عکاسی بڑے فلسفیانہ انداز میں ملتی ہے۔ اس ناول کا بنیادی کردار سارہ ہے جس کے ذریعے ناول نگار نے اس نسل کی عکاسی کی ہے جو کچھ خیالات رکھتے ہیں مگر یہ خیالات ادھورے رہ جاتے ہیں جس کی بناء پر کردار ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سارہ جس کے ذہن میں بہت سی سوچیں ہیں جب ان کو مناسب کنارہ نہیں ملتا تو وہ روحانی سکون کے لیے مذہب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ وہ یونیورسٹی کے سیمینار میں جب شرکت کرتی ہے تو یہ احساس اُس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے کہ روحانی آسودگی بڑی چیز ہے اور یہ ہر کسی کو نہیں ملا کرتی۔ سارہ ناول نگار کی انگلی پکڑ کر چلتی ہے اور اس

کے دماغ میں یہی سوچیں کلبلاتی ہیں کہ آزادی کے بعد بھی کچھ نہیں ملا۔ سماجی و ثقافتی ڈھانچے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی ذہنی اور مذہبی سکون بہت کچھ تھا مغربی افکار اُن کے نظریات نے انسان کو مذہب سے دور کر دیا۔ یہ دوری ہی تھی جس نے خدا کے بارے میں موجود شواہد اور نشانیوں پر بھی سوالات کھڑے کر دیئے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو ناول کے کینوس پر چھائے ہوئے ملتے ہیں۔ ناولوں میں گذشتہ صدیوں کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی حالات، بنتی، بگڑی قدریں اور ان کی شکست کے زوال کا نوحہ موجود ہے۔ ثمر صالح اور سارہ کی زندگی کو ناول نگار نے وجودی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے اور دونوں کے کرداروں کو اپنے آدرش کا اسیر دکھایا ہے۔

کرداروں کے اندر لاحاصلی کا دکھ اور زندگی کی معنویت سے انکار کے ضمن میں اگر دیکھیں تو ہجرت، فسادات اے، ۶۵ء کے سانحے اور پھر اس کے بعد ملکی سیاست میں ایک بڑی تبدیلی آتی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم بنتے ہیں اور عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کے خوبصورت نعرے کے ساتھ عوام کی ہمدردیاں تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن عوامی اُمنگوں کو پورا کرنا ان کے لئے بھی مشکل تھا۔ ایک رات کے اندھیرے میں آنے والے فوجی انقلاب کی بدولت وہ وزارت اور سیاست میں آئے تھے۔ سیاست اور فوج کی بدولت اس مضبوط کُرسی تک پہنچے تھے ایک اور رات کے اندھیرے میں آنے والے فوجی انقلاب نے انہیں اقتدار کی کرسی سے الگ کر دیا یوں رات کے اندھیرے میں ایک دور ختم ہوا اور دوسرا شروع ہو گیا۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے نثار عزیز کے تقریباً تمام ناولوں کو آئیڈیل کی تلاش سے تعبیر کیا ہے اور ان کے بقول نصب العین کی تکمیل کے حوالے سے جو خواب ٹوٹتے اور بکھرتے ہیں۔ یہ ناول اس کا اظہار ہے بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

> " نثار کے ہاں آدرش یا اسیری ایک اہم تھیم ہے جس کے تجزیے کو انہوں نے تین ناولوں کے مشترک کینوس پر کامیابی سے پھیلا دیا ہے۔ جس کی زد میں گزشتہ دہائیوں کا پُر آشوب سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی ماحول فرد کی نفسیاتی تحلیل اور اس کے نازک خیالات اور لمحہ لمحہ بدلتی زندگی کی قدریں سب کچھ ہی آ گیا ہے۔"(۳۰)

روایت و جدت کی کشمکش ناولوں کا بنیادی تھیم ہے اور اس بات کو انہوں نے کرداروں کی بحثوں کے ذریعے سے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نثار عزیز بٹ نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے ذریعے سے ایک نصب العین پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلطانہ بخش: کسی نہ کسی نصب العین سے وابستگی نثار عزیز کا پسندیدہ

موضوع ان کے تین ناولوں میں جاری و ساری نظر آتا ہے اور انہوں نے اسے بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔(۳۱)ناول کا کینوس بہت زیادہ وسیع نہیں کیونکہ ان کے کردار ہمیشہ کی طرح نئی جولان گاہوں میں سفر کرتے نظر نہیں آتے۔واقعاتی اور مقاماتی تکرار کی وجہ سے کینوس محدود ہو جاتا ہے۔پلاٹ کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز احمد خان رقم طراز ہیں:

"نثار کے تیسرے ناول "کاروان وجود" کا کینوس بہت محدود ہے۔بلکہ یہ ناول ان کے " نگری نگری پھرا مسافر" کی جانب مراجت کے سفر کو ظاہر کرتا ہے۔ایک طرف اس میں وہ کردار ہیں جو "نے چراغ نے گلے" کے آخر میں تیسری نسل کے طور پر ابھرتے ہیں یعنی سارہ سراج وغیرہ اس طرح یہ ناول "نے چراغ نے گلے" کی ایک قسم کی منطقی توسیع ہے اور دوسری طرف ثمر صالح کا کردار" نگری نگری پھرا مسافر" کی افگار ہی کی دوسری شکل ہے۔"(۳۲)

جیسا کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اس کے کینوس کی محدودیت کا ذکر کیا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ کے پاس شاید ایک ہی کہانی ہے جس کو وہ نئے کردار اور مقامات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔اس کے علاوہ بھی اگر کہانی کو بغور پڑھا جائے تو پلاٹ کے بہت سے نقائص سامنے آتے ہیں اور قاری ناول کو پڑھتے پڑھتے کئی غیر مربوط سلسلوں کو پاتا ہے جو شاید کہانی کے تسلسل اور اس کے ربط میں مائل ہیں۔"کاروان وجود" کے کردار ان کے دوسرے ناولوں کی طرح گزشتہ کرداروں کی بازگشت ہیں۔بقول ڈاکٹر سلطانہ بخش:

"کاروان وجود کے بعض کردار بھی نثار عزیز کے پچھلے ناولوں ہی کا دوسرا جنم معلوم ہوتے ہیں۔ اس ناول کی ثمر صالح "نگری نگری پھرا مسافر" کی افگار ہی کا دوسرا روپ ہے۔اسی طرح "نے چراغ نے گلے" کی تیسری نسل دو کردار سارہ سراج بھی اس میں موجود ہیں۔"(۳۳)

نفساتی حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سارہ اور ثمر ایک دوسرے کی شخصیت کو مکمل کرنے والے کردار ہیں۔اس ناول کے حوالے سے اگر ان کے نسوانی کرداروں کا موازنہ مردانہ کرداروں سے کیا جائے تو مردانہ کردار قدرے نامکمل اور کمزور ہیں۔بحیثیت مجموعی اس ناول کو ہم کم درجے کے فکری و فنی ناولوں میں شمار نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے اس ناول نے ادباء اور ناقدین کی توجہ ضرور حاصل کی ہے اور اپنے دور کے چند اہم اور اچھے ناولوں میں اس ناول کا شمار کیے بغیر چارہ نہیں۔اس حوالے سے اگر ہم اردو ادب کے

ایک نامور نقاد اور محقق جناب ڈاکٹر سلیم اختر کے اس دور کے اردو ناولوں کے تجزیئے کو سامنے رکھیں تو ہمیں اس ناول کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا آپ کے بقول:

"گزشتہ چند برسوں میں یکے بعد دیگرے اچھے ناول طبع ہوئے کہ ناقدین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے رہیں گے یہ ہیں: بستی (انتظار حسین) ایک سومنات (سعید انور) دیوار کے پیچھے (انیس ناگی) پاگل خانہ (حجاب امتیاز علی تاج) کاروان وجود (نثار عزیز) چہرہ باچہرہ روبہ رو (جمیلہ ہاشمی) راجہ گدھ (بانو قدسیہ) چلتا مسافر (الطاف فاطمہ) ندی (انور غالب) جنت کی تلاش (رحیم گل) اور خوشیوں کا باغ (انور سجاد)۔"[۳۴]

جن ناولوں کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر نے کیا ہے وہ واقعی اردو ادب کے اہم ناول ہیں اور اس صف میں اگر "کاروانِ وجود" کو بھی شامل کیا گیا ہے تو یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے کہ نثار عزیز ایک اہم ادیبہ ہیں اور ان کے اس ناول کو چند فنی نقائص کے باوجود ایک اچھا اور کامیاب تجربہ تصور کیا جانا چاہیے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

حسن منظر کا دوسرا ناول دھنی بخش کے بیٹے جو ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے یہ ایک اہم ناول ہے۔ سندھ کے ایک دور دراز گاؤں دھنی بخش میں مقیم، ایک خاندان کے گرد ناول کی پوری کہانی گھوم رہی ہے۔ ناول کا بنیادی موضوع استحصالی نظام اور اس کے شکنجے میں پسے ہوئے غریب کسان ہیں۔ آج انسان ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ستاروں پر کمند ڈال رہا ہے لیکن وڈیروں اور جاگیرداروں کا ظالمانہ نظام آج بھی پورے کروفر کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ ظلم وجبر کی نئی داستانیں رقم کر رہا ہے۔ اس میں قصوروار وہ مظلوم بھی ہیں جو ظلم تو سہتے ہیں لیکن بغاوت نہیں کرتے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں :

"حسن منظر کا کمال یہ ہے کہ وہ ہمیں فکشن کے پیرائے میں یہ بھی باور کرا دیتے ہیں کہ استحصال اور جبر کا شکار یہ طبقہ اپنی حالت خود بھی نہیں بدلنا چاہتا وہ نہ جانے کیوں اس ظلم اور زیادتی پر صابر اور شاکر ہو گیا ہے یہی وہ چبھتا ہوا سوال ہے جو مصنف نے اٹھایا ہے۔"[۳۵]

ناول میں جاگیردارانہ نظام کے عیوب کے ساتھ ساتھ مصنف نے مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے تضادات بھی پیش کیے ہیں۔ مغربی معاشرے کی بے راروی اور جدید اعتدال سے تجاوز کرتی ہوئی آزاد خیالی کی جھلک بھی ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ حسن منظر پاکستانی فکشن نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اولین

وجہ شہرت افسانہ نگاری ہے اس میدان میں خود کو منوا لینے کے بعد ادب میں ان کی پہچان کا تازہ ترین حوالہ ناول نگاری ہے جس کا آغاز "العاصفہ" سے ہوا۔ ان کے دیگر ناولوں میں "دھنی بخش کے بیٹے"، "وبا" دو مختصر ناول "بیر شیبا کی لڑکی" اور "ماں بیٹی"، "انسان۔ اے انسان" شامل ہیں۔ حسن منظر نے اپنے دوسرے ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں مغربی تہذیب کے اثرات مقامی ماحول میں دکھانے کے علاوہ امریکہ میں جا کر آباد ہونے والے پاکستانیوں پر بھی دکھائے ہیں۔ ناول سندھ کے ایک گاؤں میں مقامی جاگیر دار دھنی بخش کے بیٹوں کی زندگیوں کی عکاسی پر مبنی ہے۔ طبقات میں منقسم انسان، جبر کے شکنجے میں جکڑے ہوئے غریب لوگ اور استحصالی قوتیں ناول کا مرکزی موضوع ہیں۔ ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں مشرق و مغرب کی تہذیبوں میں کئی سطوح پر پائے جانے والے امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ امریکی زندگی کی جھلکیاں مغربی معاشرے اور تہذیب کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں۔ جبکہ اسی کی مدد سے حسن منظر نے مذکورہ دونوں تہذیبوں کے باہمی تضادات واضح کرنے کا کام لیا ہے۔ حسن منظر نے مشرقی و مغربی تہذیبوں کے کئی پہلو دکھائے ہیں اور خاص طور پر مغربی تہذیب کے مقامی تہذیب پر اثرات کو اپنے ایک اہم کردار علی بخش کی مدد سے اجاگر کیا ہے تاہم دونوں تہذیبوں کی عکاسی میں موازنے کا عنصر تو موجود ہے لیکن تصادم زیادہ نمایاں ہو کر نہیں ابھرتا۔ جیسا کہ روبینہ سلطان نے لکھا ہے: "دھنی بخش کے بیٹے" کی آئیڈیالوجی میں دو تہذیبوں کا تصادم اور اس میں پائی جانے والی برائیوں اور کمزوریوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔"[۳۶] حسن منظر نے اپنے ناولوں میں مغربی تمدن کے کئی پہلو پیش کیے ہیں جن میں سب سے نمایاں مغربی مادیت پرستی، مسابقت کی اندھی دوڑ، اخلاقی بے راہ روی اور عقلیت پر مبنی رویے ہیں۔ وہ کسی حد تک مشرقی تہذیب سے مغربی تہذیب کا موازنہ بھی کرتے ہیں لیکن اسے دو تہذیبوں کے تصادم کی صورت میں نہیں دیتے۔ تاہم ان کے ناولوں میں مغربی تہذیب کو جس طرح اجاگر کیا گیا ہے اس سے منفی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ حسن منظر مغربی تہذیب کے شیدائی نظر نہیں آتے اور مشرقی لوگوں پر اس کے منفی اثرات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنی تہذیبی میراث گنواتے ہوئے کوئی ملال تک محسوس نہیں کر پاتے اور اپنی جھولی میں جدید تہذیب کے چمکتے ہوئے بے قیمت ٹکڑے گویا لعل و جواہر سمجھتے ہوئے سمیٹ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مغربی تہذیب کے کھوکھلے نظام کا پردہ بھی چاک کیا ہے اور اس بات کی عکاسی کی ہے کہ مغرب میں بھی حد سے بڑھی ہوئی آزادی خواہ محدود پیمانے پر سہی لیکن سوالات کو جنم دے رہی ہے۔ وہاں جا کر آباد ہونے والوں کے لیے اس مسئلے سے نمٹنا دشوار ہوتا جا رہا ہے اور وہ اپنی اگلی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے جو بھی

جتن کرتے ہیں وہ اکثر لاحاصل رہتے ہیں۔"دھنی بخش کے بیٹے" کے مرکزی کرداروں کا تعلق متمول طبقے سے ہے۔ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔احمد بخش دھنی بخش کا سب سے چھوٹا بیٹا اور ناول کا مرکزی کردار ہے،وہ ایک پڑھا لکھا لیکن حساس طبیعت کا مالک ہے۔اپنے آس پاس ہونے والے ظلم و جبر اور زیادتی کی ہر داستان پر وہ کڑھتا رہتا ہے لیکن عملی طور پر وہ ایک کمزور کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔وہ اپنے بھائی کی عیاشیوں اور جنسی آزادیوں کو روکنے کی ہمت تو رکھتا ہے لیکن اس سلسلے میں مستقل مزاج نہیں ہے۔وہ اپنی بستی اور آس پاس کے حالات تو بدلنا چاہتا ہے لیکن زمینداری یا گھر کے باقی معاملات کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں۔اس سارے وحشت زدہ اور ظالم سماج سے بھاگ کر وہ امریکہ جاتا ہے۔امریکہ میں وہ ایک غیر مذہب لڑکی اولا سے شادی کر لیتا ہے۔اولا سے شادی کے بعد جب اس کے بچے بڑے ہونا شروع ہوتے ہیں تو نئے وسوسے اس کو گھیر لیتے ہیں۔وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہونا شروع ہو جاتا ہے۔اسے لگتا ہے اس کے بچے بالغ ہوتے ہی اس کو چھوڑ کر کہیں اور رہنے لگ جائیں گے۔یہ خوف اور سوچیں اسے واپس اپنے ملک جا کر کچھ کرنے پر اکساتی ہیں۔وہ اپنے لوگوں کی مدد یا ان کی زندگیوں کو بدلنے کے لیے پاکستان واپس لوٹتا ہے۔واپسی پر اسے سب کچھ پہلے جیسا لگتا ہے جسے دیکھ کر وہ مایوس ہو جاتا ہے۔آخر پر وہ شکست خوردہ، کمزور اور بے بس کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔

علی بخش دھنی بخش کا دوسرا بیٹا ہے،اس کے کردار میں ایک جاگیر دار کی تمام روایتی برائیاں یا عادات موجود ہیں۔وہ کم عمری میں ہی بدتمیز ہو گیا تھا، علی بخش کا کردار اپنی اصل میں ناول کا مضبوط ترین کردار ہے۔وہ زمینوں کو گروی رکھ کر اپنے تمام شوق پورے کرتا ہے،اپنی زمینوں کو گروی رکھ کر عیاشیاں کرنے کا یہ طریقہ وادیِ سندھ کے زمینداروں کی پرانی ریت ہے۔زمینوں سے جتنا وہ کماتے تھے اس سے زیادہ میلوں، شادیوں اور لڑائیوں میں خرچ کر دیتے تھے۔علی بخش بھی ویسا ہی جاگیر دار ہے۔وہ عورتوں اور شراب کا شوقین ہے۔حرمت علی بخش کی پہلی بیوی ہے اس کا مقام گھر میں وہی ہے جو جاگیر دار خاندان میں روایتی پہلی بیوی کا ہوتا ہے۔گھر کا سارا خرچہ علی بخش اسے ہی دیتا ہے۔وہ علی بخش کی تمام بیویوں اور بچوں کی ضروریات پوری کرتی ہے۔ہر نئی آنے والی سوتن کو نہ صرف برداشت کرتی ہے بلکہ ان کے مر جانے کے بعد ان کی اولادوں کو بھی پالتی ہے۔حرمت کا کردار بنگلے اور گھر کے درمیانی معاملات میں پل کا سا ہے۔

صفر سے ایک تک:

ادب کی دنیا میں مرزا اطہر بیگ کی شناخت ناول، افسانہ اور ڈرامہ نگاری سے ہے اور انہوں نے اعلیٰ معیار کی تخلیقات سے اُردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ پہلا ناول "غلام باغ "۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آیا اس کے بعد دو ناول "صفر سے ایک تک۔۔۔ سائبر سپیس کے منشی کی سرگزشت" ۲۰۰۹ء اور حسن کی صُورت حال خالی۔۔۔ جگہیں۔۔۔ پُر۔۔۔ کرو ۲۰۱۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۹ء میں آنے والا اطہر بیگ کا دوسرا ناول "صفر سے ایک تک۔۔۔ سائبر سپیس کے مُنشی کی سرگزشت" مغربی تمدن کے ایک اہم مظہر یعنی سائنس و ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز پیش رفت کو کہانی کا حصّہ بنایا گیا ہے۔ ناول کے دو مرکزی کرداروں ذکی اور زلیخا کے مابین رابطے کا اہم ترین وسیلہ انٹرنیٹ ہے۔ اردو ناول میں یہ ایک منفرد تجربہ ہے:" ناول میں مصنف نے جس انداز سے ایک نئے موضوع کو برتا ہے اس نے اردو فکشن میں ایک نیا دریچہ کھول دیا ہے۔ "[۳۷] جدت صرف موضوع تک محدود نہیں رہی بلکہ ناول کی زبان بھی جدید ہے اور اس میں بکثرت کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اصطلاحات اور زبان کا استعمال کیا گیا ہے جو سائبر سپیس سے مخصوص ہے۔ جدید مغربی تمدن کے اہم مظہر انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اردو ناول میں موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی معاشرہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے دامن کشاں ہو کر نہیں رہ سکتا اور مقامی معاشرہ بھی اس سے الگ نہیں۔ ناول نگار نے بڑی خوبی سے مشین کے عہد کا موجودہ زندگی سے تعلق دکھایا ہے یہاں تک کہ محبت جیسے جذبے کو اسی مشین کی وساطت سے دو ملکوں میں رہائش پذیر افراد کے مابین جنم لیتے اور پنپتے دکھایا ہے جو اس عہد کی بہت بڑی حقیقت ہے۔

"صفر سے ایک تک" میں مصنف نے چونکہ مرکزی کردار ذکی کے ذریعے سے اس کی آپ بیتی پیش کی ہے۔ اس لیے قصہ ایک خود نوشت سوانح کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کا آغاز ذکی زلیخا کی ملاقات سے ہوتا ہے اور اختتام زلیخا کا بطور صحافی ایشیا آنا اور اغوا ہونے پر ہو جاتا ہے۔ مصنف جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس نے کہا مگر کہانی کو کرداروں سے جوڑے رکھا۔ عنوانات قائم کر کے واقعات کو قابو میں رکھ کر انہیں جلد از جلد سمیٹنے کی بھی کوشش کی۔ شاید اسی قسم کے ناول سے متعلق لکھتے ہوئے علی عباس حسینی کہتے ہیں:

> "نہ جانے کتنے غور کی ضرورت پڑی ہو گی جب کہیں جا کر اس قدر بے ترتیب مگر نتیجہ خیز باتیں کہی جا سکی ہوں گی۔ غرض نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ بغیر پلاٹ کے کوئی ناول نہیں ہوتا اور اس کا خاکہ بہت غور کر کے پہلے ہی سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ "[۳۸]

مصنف نے ناول میں سائبر سپیس کے منشی کی سر گزشت بیان کی ہے اس لیے ہر قدم پر کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کو مصنف نے ایک زندہ کردار کی طرح پیش کیا ہے۔ ناول کی کہانی مرکزی کردار ذکی کی زبانی قاری تک پہنچتی ہے جو کمپیوٹر جینئس ہے اس لیے جہاں جہاں ذکی نظر آتا ہے وہیں ہمیں کمپیوٹر نظر آتا ہے۔ شہر میں ذکی فیضان سالار کے ساتھ رہتا ہے تو وہاں کمپیوٹر کا استعمال کرتا ہے۔ پھر گاؤں میں اپنے والد کو کمپیوٹر میں طاق کرنے کی کوشش جاری رکھتا ہے۔ بلکہ زمینوں کے کاغذات کو کمپیوٹر میں محفوظ کرنے کے طریقے بھی سکھاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے باپ کو نہ صرف ایک سرگرمی مل جاتی ہے۔ بلکہ کمپیوٹر کا ایک مصرف بھی سامنے آتا ہے۔ اسی طرح اپنے بھائی کے ڈیرے پر ہوتا ہے تو وہاں بھی اس کا بھائی لیپ ٹاپ منگوا دیتا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کے ناول کا مرکزی کردار "ذکی" ایک کمپیوٹر جنیئس ہے جس کا تعلق دیہات سے ہے۔ ناول میں مصنف نے بنیادی طور پر ذکی کی سر گزشت بیان کی ہے۔ جس کے مطابق دیہات سے آئے ہوئے ذکی کی سالاروں کی ایک محفل میں زلیخا خلجی نامی ایک لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے۔ جس سے ذکی اپنے دوست فیضان کے لیے تعارف حاصل کرنے جاتا ہے اور زلیخا خلجی ذکی کے غیر سالار ہونے کی وجہ سے اس سے رابطہ رکھتی ہے۔

ذکی کے علاوہ ناول میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے والا نسوانی کردار زلیخا کا ہے۔ زلیخا کا کردار ناول کے بیانیے میں دو تین دن کے لیے لاہور کی سرزمین میں اُبھرتا ہے۔ باقی ناول میں ہم ذکی کی گفتگو یا انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہی زلیخا سے متعارف ہوتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار ثناء اللہ کی ملازمہ گاموکا ہے۔ گاموکا آبائی پیشہ دائی گیری کا تھا۔ گامو کی ماں نے بیٹی کو آبائی پیشے میں طاق کرنے کے بعد اس کی شادی ایک ٹرک ڈرائیور سے کر دی جو اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لیے اسے زدو کوب کرتا تھا۔ ایک رات گامو نے ایک بیلنا ٹرک ڈرائیور کے پیٹ پر کھینچ مارا۔ ڈرائیور بیمار پڑ گیا اور چھ ماہ میں مر گیا۔ خبر تمام علاقے میں پھیل گئی اس لیے اسے بطورِ دائی کوئی کام کے لیے نہیں بلاتا تھا اس لیے وہ بھوکوں مرنے لگی تو ثناء اللہ اسے ڈیرے پر لے آیا۔ گامو ڈیرے پر ذکی کا علاج کرتی ہے مگر ساتھ ہی خود عشق لاعلاج کا شکار ہو بیٹھتی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ اپنے طور پر وہ جادو کا سفوف کھلا کر اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کرتی ہے مگر ناکام رہتی ہے اور ڈیرہ چھوڑ دیتی ہے۔ ناول کا ایک اہم کردار پیر ثناء اللہ جو ناول کی دنیا میں ہمیں کئی رنگ بدلتا نظر آتا ہے انتہائی دل چسپ کردار ہے۔ ثناء اللہ کے گھر والے اس سے ناراض ہوتے ہیں کیوں کہ سگو سے شادی نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس

نے مختلف علاقوں میں بسنے والے درمیانے اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی مطلقہ بیوہ اور بے سہارا عورتوں سے شادی کی اور غائب ہو گیا جو مالی طور پر آسودہ ہوتیں۔

نو لکھی کوٹھی:

"نو لکھی کوٹھی" علی اکبر ناطق کا ناول ہے جو ۲۰۱۴ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ اکبر ناطق کا ناول "نو لکھی کوٹھی" موضوع کے لحاظ سے منفرد ناول ہے تمام کردار اپنی اپنی جگہ پر پوری طرح واضح نظر آتے ہیں۔ یہ اردو کا ایک اچھا ناول ہے جس میں قیام پاکستان سے قبل کے حالات، قیام پاکستان کے دوران ہونے والی قتل و غارت گری، قیام پاکستان کے بعد کی لوٹ سیل، غریب مزارعوں اور کاشتکاروں میں ہونے والے استحصال کو بیان کر کے علی اکبر ناطق نے اپنے آپ کو ناول نگاروں کی فہرست میں نمایاں کر لیا ہے۔

نشہ آج کی ترقی یافتہ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ناول میں غریب لوگوں کے اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دیہی لوگ تمباکو نوشی کے بری طرح عادی ہوتے ہیں۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کے ڈیرے کے حقے کے بغیر رونق ہی نہیں ہوتی۔ غریب لوگ جو تمباکو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ شام کو نمبرداروں اور چودھریوں کے ڈیروں پر جا کر حالاتِ حاضرہ سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں اور اپنی نشے کی عادت بھی پوری کر لیتے ہیں۔ غریب آدمی جہاں زندگی کے دیگر معاملات میں زمینداروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور دیگر بااثر طبقات کا مرہون منت ہوتا ہے وہاں الیکشن کے دنوں میں وہ اپنی مرضی سے ووٹ بھی نہیں دے سکتا۔ ناول نگار نے اس حقیقت کو بھی عیاں کیا ہے کہ بااثر افراد پولنگ سٹیشن پر مکمل طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسمبلیوں میں ہمیشہ طاقتور طبقہ ہی پہنچتا ہے۔ غریبوں کی نمائندگی کرنے والوں کو کبھی کامیابی نہیں ملتی۔ یہ لوگ الیکشن میں کامیابی کے ایسے طریقے اور راستے جانتے ہیں کہ کوئی غریب امیدوار اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غلام حیدر نے جب ملک بہزاد کو بتایا کہ نواب افتخار اس کا محسن ہے اور اسے الیکشن میں جتوانے میں اس کی مدد ضروری ہے تو ملک بہزاد نے مشورہ دیا کہ پہلے تو امیر سبحانی کے ذریعے علاقے میں غلام حیدر کو ایک ہیرو کی طرح پیش کیا جائے جس نے سکھوں کا صفایا کیا۔ اس کے علاوہ اس نے غلام حیدر کو وہ فارمولا بتایا جس کی مدد سے کامیابی یقینی تھی اس نے کہا:

> "پھر بھی جس جگہ سے نواب کے خلاف ووٹ پڑنے کا خطرہ ہوا، وہاں پر نواب سے کہہ دینا، الیکشن والے دن اپنے بندے ہمارے ساتھ کر دے، نگرانی ہم کریں گے اور وہ پرچیاں اپنے

ہاتھوں سے نواب صاحب کی صندوقچی میں ڈالتے جائیں گے۔ جس نے بھی چوں چراں کی،
چار متھریں چوتڑوں پر ماریں گے سیدھا کر دیں گے۔"(۳۹)

ناول نگار نے اس حقیقت کو بھی عمدہ طریقے سے اجاگر کیا ہے یہی پسماندہ اور غریب طبقہ ہے جو سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ وقت آنے پر سیاسی جماعتوں کے یہ نمائندے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پارٹیاں بدل لیتے ہیں مگر کارکن اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔۔"نولکھی کوٹھی" ہندوستان میں انگریز حکومت کے آخری دنوں کی تاریخ کے ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی دشمنیوں اور اس کے نتیجے میں مارے جانے والے لوگوں کی داستان ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہر شخص کو اپنی جنم بھومی سے پیار ہوتا ہے۔ ولیم اگرچہ نسلی طور پر انگریز تھا اور اس کے والدین انگلستان سے آئے تھے مگر چونکہ اس کی پیدائش ادھر کی تھی اس لیے قیام پاکستان کے بعد بھی اس نے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ نہ اسے پاکستان کا شہری مانا گیا اور نہ اس کی اس دیس سے محبت کو سمجھا گیا۔ امجد سلیم منہاس کی "نولکھی کوٹھی" کے مصنف اور ناول کے حوالے سے رائے ہے کہ:

"علی اکبر ناطق۔۔۔۔ حیران کر دینے والا شاعر اور کہانی کار تو تھا ہی لیکن اب ناول نگاری کی دنیا کو نیا رخ دینے بھی آپہنچا ہے۔ لگتا ہے یہ نوجوان لٹریچر کا کوئی پکھ بھی چھوڑنے کو تیار نہیں اور دل و دماغ کے گھوڑے کو وسیع میدانوں میں سرپٹ دوڑائے جارہا ہے۔ تاریخ، ادب اور سیاسیات میں قائم لگے بندھے تصورات کو چیلنج کرنے کے نتیجے میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے لگتا ہے کہ نیا بیانیہ تخلیق ہونے جارہا ہے۔"(۴۰)

ناول نگار نے ایک نوجوان انگریز آفیسر ولیم کو ناول کا مرکزی کردار بنا کر انگریز افسروں کے اندازِ حکمرانی کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ضلع فیروز پور اور خاص طور پر اس کی تحصیل جلال آباد کے حوالے سے مسلمان اور سکھ سرداروں کی دشمنیاں بھی بیان کی ہیں اور اس پس ماندہ علاقہ کے نوجوان اسسٹنٹ کمشنر ولیم کی علاقہ کی بہتری کے لیے کوششیں بھی سامنے لانے کی کوشش ہے۔ ولیم جس کا باپ اور دادا بھی ہندوستان میں سول سروس میں آفیسر تھے جب آٹھ سال انگلینڈ میں رہ کر آیا تھا اُسے ایک سال مختلف دفتروں میں ٹریننگ کے مراحل سے گزرنے پر اسسٹنٹ کمشنر جلال آباد لگایا گیا۔ جہاں وہ چار سال تک تعینات رہا۔ اپنے اس عرصہ تعیناتی کے دوران اُس نے تحصیل میں تعلیم، آب پاشی اور معالیات کے حوالے سے بہت کام کیا مگر افسران بالا اس کی اس کاوش کے معترف ہونے کے باوجود اس سے صرف اس لیے نالاں تھے کہ وہ دیسی

لوگوں سے کبھی نہ کبھی بات کرلیتا تھا۔ جلال آباد میں مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے ولیم نے مولوی کرامت کو ۳۰ روپے ماہوار پر بھرتی کر کے اس کے ذمے لگایا کہ مسلمان والدین کو تعلیم کی جانب راغب کرے۔ چار سال بعد ولیم کا تبادلہ لاہور چیف سیکریٹری کے دفتر میں کر دیا گیا جہاں اُس کی ڈیوٹی سرکاری ملازمین کی چھٹیاں منظور کرنا تھی۔ وہاں ایک دن اُسے ملنے مولوی کرامت کا بیٹا فضل دین آیا، اُس نے اپنے باپ کی وفات کا بتایا اور بتایا کہ وہ ایف۔ اے کر چکا ہے۔ ولیم نے اُسے گورنر ہاؤس میں کلرک بھرتی کروا دیا۔ لاہور سے ولیم کا تبادلہ بطور ڈپٹی کمشنر روھتک ہوا مگر وہاں سوائے جنگِ عظیم کے لیے سپاہی بھرتی کرنے کے اُس سے خاص دلچسپی کا کام نہیں لیا گیا۔ وہ مختلف عہدوں پر رہا اور قیام پاکستان کے بعد بھی انگلینڈ جانے سے انکار کر دیا۔ اس کی بیوی اور بچے انگلینڈ چلے گئے۔

ولیم نے حکومتِ پاکستان کو درخواست دی کہ وہ پاکستان میں رہ گیا ہے اور پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے اُسے ملازمت دی جائے مگر کچھ دنوں بعد چیف سیکٹری نے خط لکھا کہ وہ پاکستان کا شہری نہیں اور شہریت حاصل کرنے کے لیے وہ وزارتِ داخلہ کو درخواست دے۔ ولیم نے رینالہ اسٹیٹ میں اپنی نولکھی کوٹھی میں رہائش اختیار کرلی اور آرام سے رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کے قبضہ میں موجود زمین فوجی افسران کو الاٹ کر دی گئی اور آخر کار مولوی کرامت علی کے پوتے اور فضل دین کے بیٹے نواز الحق نے جو اسسٹنٹ کمشنر او کاڑہ آکر لگا تھا نولکھی کوٹھی ایک پیر صاحب کو الاٹ کر دی۔ اس طرح اس سرزمین سے محبت کرنے والا ولیم بے گھر ہو گیا اور یہیں مر گیا جسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ناول کا دوسرا اہم کردار اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان غلام حیدر ہے جو اپنے باپ کی وفات کے بعد دشمنوں میں ایسا پھنسا کہ آخر تنگ آکر سودھا سنگھ سمیت پندرہ آدمیوں کو قتل کر کے کشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں میں دس سال تک روپوش رہا۔ نواب افتخار ممدوٹ کی کوششوں سے اس کی سزا معاف اور جائیداد بحال ہوئی۔ اس نے اپنے ضلع فیروز پور اور خاص طور پر تحصیل جلال آباد میں مسلم لیگ اور اور نواب افتخار ممدوٹ کو کامیاب کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب قیام پاکستان کے وقت قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ اپنے تینوں گاؤں کی رعایا کو ساتھ لیکر بحفاظت ہیڈ سیلمانکی پہنچا۔ جہاں ڈیوٹی پر موجود ڈوگرہ فوجی پاکستان سے جانے والے سکھوں اور ہندوؤں کو تو ہندوستان جانے کے لیے گزرنے دے رہے تھے۔ غلام حیدر نے اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ حملہ کر کے فوجیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا اور خود بھی شہید ہو گیا مگر وہ ہزاروں لوگ جو ہیڈ پر موجود تھے بحفاظت پاکستان میں داخل ہو گئے۔

ناتمام:

صائمہ کا کردار ناول میں مرکزی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ صائمہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو جب چھوٹی تھی تو اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں اپنے باپ کی دُھندلی سی تصویر موجود تھی جو زیادہ واضح بھی نہیں تھی کیونکہ جس عمر میں وہ تھی اسے اس وقت مرنے کا معنی بھی معلوم نہیں تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بڑی بہن نے گھر کو سنبھالا لیکن ماں نے جلد ہی صائمہ کی بہن کی شادی کر دی۔ کچھ عرصے بعد جب صائمہ کی باجی طلاق لے کر گھر واپس آجاتی ہے تو گھر کا ماحول بالکل بدل جاتا ہے۔ ماں باجی کی طلاق کے صدمے میں بیمار ہو جاتی ہیں۔ باجی نوکری شروع کر دیتی ہیں لیکن ماں کی بیماری میں کوئی کمی نہیں آتی اور آخر کار وہ جنونی ہو جاتی ہے۔ صائمہ جس کا کوئی دُکھ درد کا ساتھی نہیں ہے وہ محلے کے ایک آوارہ لڑکے وسیم کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہوئے اُس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ لیکن وسیم جو کہ ایک آوارہ، بدچلن لڑکا ہے اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اسے اکیلا چھوڑ کر بیرونِ ملک چلا جاتا ہے اور صائمہ اُس کے جانے کے بعد پھر تنہا ہو جاتی ہے۔ صائمہ گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے کے لیے نرسنگ کا کورس کر کے نوکری شروع کر دیتی ہے اور وہاں اُسے ایک ڈاکٹر وقاص ملتا ہے لیکن وہ بھی اپنی بیوی کی وجہ سے صائمہ کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ صائمہ کی کہانی ہمارے معاشرے کی تنہا لڑکی کی کہانی ہے جو بچپن میں یتیم ہونے کے بعد ماں اور بہن سے اُمیدیں وابستہ رکھتی ہے اور دونوں کے مرنے کے بعد خود کو اکیلا تصور کرتے ہوئے وہ وسیم جیسے لڑکے کا سہارا لیتی ہے لیکن وہ بھی اُسے دھوکا دیتا ہے۔

صائمہ وسیم کی باتوں میں آجاتی ہے کیونکہ باجی کی طرف سے اُس پر بہت سی پابندیاں لگائی گئی ہوتی ہیں اور وسیم کی پیار بھری باتیں سن کر وہ اُس کی محبت کا دم بھرنے لگتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ عورتیں مردوں کی باتوں پر بہت جلدی اعتبار کر لیتی ہیں۔ صائمہ جو کہ ناول میں شروع سے محبت کو ترستی ہوئی دکھائی گئی، بچپن میں باپ کی وفات، ماں کی بیماری، باجی کی طلاق یہ سب وہ باتیں ہیں جو اسے دوسروں پر اعتبار کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ وسیم کی بے وفائی کے بعد صائمہ کی زندگی میں ایک اور مرد ڈاکٹر وقاص کی صورت میں سامنے آتا ہے حالانکہ وہ شادی شدہ ہے لیکن اُسے بھی صائمہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صائمہ کو فلیٹ لے کر دیتا ہے اور اُسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے جب یہ سب اُس کی بیوی کو معلوم ہوتا ہے تو وہ صائمہ کو چھوڑ دیتا ہے اور ایک بار پھر وہ تنہا ہو جاتی ہے۔ صائمہ کے کردار کے یہ سب عناصر اُسے آخر میں ذہنی مریض بنا دیتے ہیں اور وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

اس ناول کا دوسرا مرکزی کردار وسیم کا ہے۔ وسیم ملتان سے داخلہ لینے کے لیے لاہور آتا ہے اور یہاں اس کی ملاقات صائمہ سے ہوتی ہے۔ صائمہ سے اس کی محبت بھری باتیں، اس کا باپ سے ضد کر کے لاہور آ کر پڑھنا، سارا سارا دن صائمہ کے لیے گلی میں انتظار کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو صائمہ کو اس کی سچی محبت کا یقین دلاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وسیم کو بزدل بھی دکھایا گیا ہے وہ صائمہ کے ساتھ پورا دن گزارتا ہے اور جیسے باجی کے گھر آنے کا وقت ہوتا ہے تو اُس کے ڈرنے کی وجہ سے صائمہ اسے وہاں سے نکالتی ہے۔ اسی لیے ایک دن جب باجی ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیتی ہیں تو وسیم خاموش کھڑا رہتا ہے جیسے اُس نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ اس واقعے کے بعد وسیم منظر سے غائب ہو جاتا ہے اور بیرونِ ملک چلا جاتا ہے لیکن اُس کے اندر ہمت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ اپنے باپ سے صائمہ کے ساتھ شادی کی بات کر سکے اور اسے عزت دار زندگی دے سکے۔ وسیم ایک مرد ہونے کے باوجود بھی فیصلہ کرنے سے کتراتا ہے اور نہ ہی اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ کسی یتیم لڑکی کو سہارا دے سکے۔

اس ناول کے دوسرے اہم نسوانی کرداروں میں ماں جی اور باجی کا کردار ہیں۔ باجی اور ماں کا کردار ہمارے معاشرے کی مظلوم خواتین کا کردار ہے۔ ماں جی بیوہ ہونے کے بعد دو جوان بیٹیوں کے ساتھ تنہا زندگی گزارتی ہے، کوئی بھی ان کا ہمدرد نہیں۔ باجی جو اپنے سسرال کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہوتی ہے جلائی جاتی ہے یہ وہ عناصر ہیں جو ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں دکھائی دیتے ہیں۔ ماں اور باجی کے کردار ہمارے معاشرے کی تمام مظلوم عورتوں کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس ناول کے ذیلی کرداروں میں اماں حاجن، نسرین، کلثوم اور ڈاکٹر وقاص کے کردار بھی اہم ہیں۔

اماں حاجن ہمارے معاشرے کی اس عورت کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہیں جو ہر جگہ موجود ہے۔ ناول میں اماں حاجن، صائمہ کی ماں کی سہیلی ہیں۔ شوہر کے بیرونِ ملک چلے جانے کے بعد اکیلی زندگی گزارتی ہیں اور اپنے آپ کو مصروف رکھتی ہیں۔ محلے کی عورتیں اماں حاجن کو پسند کرتی ہیں کیونکہ وہ انہیں تمام محلے کی خبریں سناتی ہیں۔ اس ناول میں نسرین کا کردار صائمہ کی سہیلی کا ہے جو صائمہ کی رازدار بھی ہے اور اچھی سہیلیوں کی طرح اس کا ساتھ بھی دیتی ہے۔ باجی کی وفات کے بعد جب صائمہ اس کے گھر جاتی ہے تو نسرین اس کی حالت دیکھ کر خود بھی دُکھی ہو جاتی ہے اور اپنی سہیلی کو تسلی دیتی ہے۔ کلثوم اس ناول کا ایک اور ذیلی کردار ہے، صائمہ سے اس کی ملاقات نرسنگ ہاسٹل میں ہوتی ہے۔ کلثوم بھی معاشرے کی ایک ستائی ہوئی عورت ہے، شوہر سے طلاق کے بعد وہ صائمہ کے ساتھ ہاسٹل میں ہی آ کر رہنے لگتی ہے۔

ناول کے مردانہ کرداروں میں ایک کردار ڈاکٹر وقاص کا بھی ہے، اس ناول کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں کے مقابلے میں زیادہ جان دار ہیں، ناول کے کرداروں میں وہی پراگندگی ہے جس میں پاکستان کے ہزاروں خاندان مبتلا ہیں۔ یوں تو مردوں کا عورتوں کی کمزور حیثیت سے فائدہ اٹھاتے رہنا روزمرہ کا ماجرہ ہے۔ ناول کا اختتام پڑھ کر انسان بھی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ناول کا نام ہی ناتمام نہیں ہے یعنی یہ ایک ایسا موضوع ہے جو صدیوں سے چلتا آرہا ہے اور چلتا رہے گا۔ کبھی صائمہ بن کر اور کبھی سیتا بن کر یہ کہانی یوں ہی چلتی رہے گی۔ کرداروں کے حوالے سے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

> "ناول بہت خوبصورت ہے۔ دائرہ میں جس قدر دھوم دھڑکے کے کردار ہیں۔ ویسے کردار مجھے ناتمام میں نظر نہیں آئے۔ صائمہ کے کردار میں مجھے وہ منہ زوری نظر نہیں آتی جو نورین میں تھی باغی "صائمہ" بھی ہے۔ جینا یہ بھی جانتی ہے یشودھرا کی طرح اپنے عورت ہونے کے عذاب کو سہہ رہی ہے۔"(۴۱)

"ناتمام" کی کہانی میں ہمیں اندرونِ شہر لاہور کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عاصم بٹ نے ایک بڑا عرصہ اسی ماحول میں گزارا ہے۔ عاصم بٹ کے ناول ناتمام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے جدید اور قدیم دونوں تہذیبوں کی عکاسی پیش کی ہے، جو عاصم بٹ کے اسلوب کی ایک خاص خوبی ہے۔ انہوں نے اپنے ناول میں صائمہ کی کہانی کے ساتھ ساتھ سیتا اور یشودھرا کو بھی پیش کیا ہے۔ اپنی کہانی اور ان دو قدیم کہانیوں کے درمیان مشترک خوبی کو بیان کیا ہے کہ عورت چاہے وہ جس معاشرے میں ہو جس زمانے میں ہو جس علاقے میں ہو اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ہوتی رہیں گی۔ اور یہی عاصم بٹ کے ناول "ناتمام" کا مطلب بھی ہے کہ نہ ختم اور ہمیشہ زندہ رہنے والی کہانی۔

میرواہ کی راتیں:

"میرواہ کی راتیں" رفاقت حیات کا پہلا ناول ہے اور یہ ایک نوجوان نذیر کی جنسی واخلاقی حصوں میں بٹی سوچوں کی کہانی ہے۔ یہ ایک دیہاتی نوجوان کی کہانی ہے جو بس اندرونِ سندھ کے ایک گوٹھ میرواہ میں اپنے چاچے کے گھر رہنے والے نذیر سے متعلق نہیں بلکہ یہ اُسی طرح پنجاب میں رہنے والے ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو نوجوانی کی دہلیز پر قدم جماتے ہی جنسی کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔ سولہ سے بیس سال کی عمر ایسی عمر ہوتی ہے جب آپ کو ہر عورت اچھی لگتی ہے۔ جب دل کرتا ہے کہ اس کا تعلق بھی کسی لڑکی سے ہو، چاہے وہ آنکھوں کی حد تک، باتیں کرنے کی حس تک محدود ہو یا جسمانی لذتوں کے رازوں کو پالینے تک پہنچ

جائے۔ایسی ہی ذہنی کشمکش لیے نذیر جو ایک حلوائی کا بیٹا ہے اور آٹھویں میں ہی پڑھائی چھوڑ کر لوفر ہو جاتا ہے۔سارا دن لوفری کرنا اور لڑکیوں کو بہن سمجھ کر اُن کے گھر تک چھوڑنے جانا جیسے اہم کام سر انجام دیتا ہے۔نذیر بھی میر پور ماتھیلو کی مشہور رنڈی روزی سے بس بات کرنے کے لیے وہ پچاس ہزار روپے اسے دے دیتا ہے جو اس کا باپ اسے بینک میں جمع کروانے کے لیے دیتا ہے۔اس واقعے کی وجہ سے اس کا باپ اسے شہر بدر کر دیتا ہے اور وہ میر واہ میں اپنے چاچا غفور کے پاس رہنے لگتا ہے جو کہ ایک درزی ہوتا ہے۔

نذیر کے کردار کے علاوہ شمیم اور خیر النسا کا کردار دیہی زندگی میں کم عمر لڑکیوں کی بوڑھے مردوں کے ساتھ بے جوڑ شادیوں کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو سامنے لاتا ہے۔شمیم اور خیر النسا جو کہ دونوں شادی شدہ ہیں،اس کے باوجود وہ کسی نوجوان کی نظر التفات سے اپنے اندر ایک عجیب سرور اور خوشی محسوس کرتیں ہیں وہ خود کو اہم محسوس کرنے لگتیں ہیں۔اس ناول کا دوسرا واقعہ ساٹھ سالہ چاچا غفور کی پینتیس سالہ خیر النسا کے ساتھ شادی ہے۔یہ بے جوڑ کی شادی بھی بالآخر ایسے گناہ پر منتج ہوتی ہے،جو اخلاقیات کی جڑیں ہلا کر رکھ دیتا ہے۔تیسرا واقعہ شمیم کے ساتھ موسیٰ جوگی کی بے توجہی،غیر عورتوں میں دلچسپی اور اپنی بیگم کے نسوانی جذبات کی تسکین کا خیال نہ رکھنے کے سبب وقوع پذیر ہوتا ہے۔جو ناول کے مرکزی کردار نذیر کے ساتھ شمیم کے معاشقے پر ختم ہوتا ہے۔نذیر کے ساتھ اس کے گھر والوں کا برتاؤ،چاچا غفور کا بڑھاپے میں کم عمر عورت بیاہ لانا اور موسیٰ جوگی کا بیوی کی طرف مائل نہ ہونا،اس سماج کے رویوں کے ایسے تضادات ہیں،جن پر مصنف نے بھرپور تازیانے برسائے ہیں۔ناول میں بڑی بے باکی اور مہارت سے اس عورت کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ناول کے کردار ہوں یا کہانی کا تسلسل،روانی ہو یا ربط،ناول نگار نے کہانی کے تمام لوازمات پر بھرپور محنت کی ہے۔

کوہِ گراں:

ناول کا مرکزی کردار حلیم کسی بڑے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد،اپنے گاؤں کی طرف لوٹ آتا ہے۔ گاؤں جو کبھی آباد تھا،ویران پڑا ہے،کھنڈر ہو چکا ہے،پانی کہیں نظر نہیں آتا۔حلیم کا خیال تھا کہ گاؤں میں کوئی بھی نہ ہو گا اس کا قیاس غلط نکلا۔ایک اپاہج آدمی اور تپ دق میں مبتلا مریض وہاں ٹکے ہوئے تھے اور حلیم ان کو جانتا تھا۔ایک جوان عورت بھی موجود تھی جس کی ماں سے حلیم واقف تھا۔ناول کوہ گراں جس کا بنیادی موضوع ایک گاؤں ہے جو قحط سالی کی وجہ سے اُجڑ چکا ہے،دور دور تک پانی ملنے کے امکانات نہیں۔ایسے میں گاؤں کے چودھریوں کا ایک فرد حلیم گاؤں میں واپس لوٹتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کے علاوہ

بھی تین لوگ موجود ہیں جو گاؤں کی محبت میں کہیں ہجرت کرنے کو تیار نہیں۔ حلیم کی آمد سے انھیں حوصلہ ملتا ہے اور یہیں سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔

خالد فتح محمد نے اُجڑے ہوئے گاؤں کی منظر کشی کی ہے اور اہم پہلو کہ گاؤں اجڑنے کا ذکر کئی ناولوں میں دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن اس گاؤں کو آباد کرنے کا منصوبہ صرف کوہِ گراں میں دکھائی دیتا ہے۔ بنیادی کردار حلیم کے ذریعے بتاتا ہے کہ قحط سالی سے گاؤں، دیہات اُجڑ جاتے ہیں تو دوبارہ آباد بھی کیے جاسکتے ہیں، یعنی مصنوعی طریقے سے قدرتی پانی لایا بھی جاسکتا ہے۔ خالد فتح محمد نے اپنے ناول میں دیہی زندگی کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے ان کی دیہی زندگی کے متعلق گہرے مشاہدے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ناول کے بنیادی کردار حلیم کا گاؤں میں لوٹنے کا واحد مقصد گاؤں میں پانی لانا اور گاؤں آباد کرنا ہے۔ یہیں پر مصنف ہمیں دکھاتا ہے کہ ہر مقصد کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں اور حلیم کی راہ میں گڈو کا جسم ایک رکاوٹ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ گڈو کا کردار بھی خاصے مزے کا ہے۔ بدبودار، میل چڑھی عورت، جس کی ماں فاطمہ کے ساتھ جوانی کے دنوں میں حلیم کے تعلقات قائم رہے تھے۔ گڈو کئی بار اسے ہم بستری کرنے کا اشارہ دیتی ہے اور پھر تنگ آکر جادو ٹونے کرتی ہے، جو اس نے اپنی ماں سے سیکھے تھے۔

ناول کا ایک اور اہم حصہ گاؤں سے ہجرت کرنے والے لوگ کیمپوں میں پناہ گزین ہیں۔ این جی او کے لوگ سامان بانٹنے آتے ہیں۔ وہاں پر بھی غذائی ضروریات کے لیے حسن کے پیمانے مقرر ہیں۔ لڑکیاں اغوا بھی ہو رہی ہیں، عزتوں کی پامالی بھی ہو رہی ہے۔ خالد فتح محمد نے پہلی بار پانی کے موضوع کو اس انداز میں لکھا ہے کہ اُجڑے گاؤں کی گلیوں میں اڑتی دھول مٹی، گرے ہوئے مکانوں کی دیواروں کے اندر باہر کی فضا قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ آخر میں ایک دن آتا ہے جب مرالہ ہیڈ ورکس کو ڈائنامائٹ سے تباہ کر دیا گیا ہے اور پانی کا ریلا گاؤں کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے ساتھ فوجی بھی ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں کہ پانی کے حصول کے لیے کس نے ہیڈ کو تباہ کیا ہے۔ حلیم نہر کے کنارے کھڑا دیکھ رہا ہے یکایک دور سے بادلوں کی گرج سنائی دیتی ہے، بجلی چمکتی ہے اور مُوسلادھار بارش برسنے لگتی ہے یعنی پانی ہی پانی۔

دشتِ وفا:

آغا گل کا پہلا ناول "دشتِ وفا" پہلے ایک ناولٹ کی صورت میں "دشت میں سفر" کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تینتیس برس قبل جب یہ ناول شائع ہوا تو اس اولین اشاعت میں یہ خالص رومانوی ایسے پر مبنی کہانی پر مشتمل تھا۔ البتہ بعد ازاں نوے کی دہائی میں جب اس کا دوسرا ایڈیشن آیا

تو اسی کہانی کے اندر بلوچستان میں سَن ستر کی دہائی میں اٹھنے والی بغاوت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، باقی رومانوی کہانی اسی طرح رہنے دی گئی ہے۔ اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تازہ ترین ایڈیشن فکشن ہاؤس لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔

مختصراً، کہانی کے تین مرکزی کردار نجیب، رخسانہ اور قاضی ہیں۔ قاضی، رخسانہ پہ لٹو ہو جاتا ہے، لیکن رخسانہ ایک کایاں لڑکی ہے۔ نجیب ایک متمول گھرانے کا فارغ البال نوجوان ہے۔ قاضی، اسے رخسانہ سے ملواتا ہے تو وہ اُس پہ دل ہار بیٹھتا ہے، رخسانہ بھی اس کا جواب محبت سے دیتی ہے۔ یوں دو طرفہ تعلق پروان چڑھنا شروع ہوتا ہے۔ قاضی کو بیچ سے نکال دیا جاتا ہے تو قاضی، نجیب کو بتاتا ہے کہ رخسانہ کے ساتھ جو تین بچے ہیں، وہ اس کی اولاد ہیں اور اُس نے اپنے شوہر کو زہر دے کر مار دیا تھا۔ نجیب کو اس سے شدید صدمہ پہنچتا ہے، اُس کے استفسار پہ رخسانہ بتاتی ہے کہ بچپن میں ہی اس کی شادی ہو گئی تھی، شوہر نے اسے جسم فروشی پہ مائل کرنا چاہا اور اس لیے اس نے بے زار آ کر ایک دن اسے قتل کر دیا۔ نجیب کا دل پگھل جاتا ہے اور دونوں کے دل صاف ہو جاتے ہیں۔ بعد ازاں نجیب نوکری کے سلسلے میں کچھ عرصہ اسلام آباد چلا جاتا ہے جب واپس آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ رخسانہ نے ایک سیٹھ کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس انسپکٹر جو اس کا دوست نکل آتا ہے، اسے بتاتا ہے کہ رخسانہ ایک پیشہ ور عورت ہے۔ نجیب ایک بار پھر شدید صدمے سے دوچار ہوتا ہے، رخسانہ دوستوں کے پاس ہوتی ہے۔ نجیب جب اس سے ملتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ سیٹھ اسے ایک بار پھر جسم فروشی پہ مجبور کر رہا تھا، اس لیے اُسے قتل کر دیا۔ اس کا پیسہ بھی لوٹ لیا، اب دونوں یہاں سے بھاگ چلیں گے۔ رخسانہ کا ایک کزن غفار مکران کے ساحل پر اسمگلنگ کا کام کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دونوں کے لیے لانچ کا انتظام کر دے گا۔ رُخسانہ نجیب کو دھوکہ دے رہی ہوتی ہے لیکن نجیب ایک بار پھر اس کی محبت میں آ جاتا ہے۔ لیکن وہ صرف رخسانہ کو لے جانا چاہتا ہے، اس کے بچوں کو نہیں۔ رخسانہ دل پر پتھر رکھ کر اس کے ساتھ چل پڑتی ہے، لیکن وہ جونہی ساحل پر پہنچتے ہیں۔ رخسانہ یہ کہہ کر غفار کے ساتھ روانہ ہو جاتی ہے کہ نجیب تم میرے بچوں سے نفرت کرتے تھے، غفار میرا اپنا ہے، وہ میرے بچوں کا بھی خیال رکھے گا، جب کہ غفار پیسوں کا بیگ لے کر اسے دھکا دے کر، خود لانچ میں روانہ ہو جاتا ہے۔ نجیب یہ دیکھ کر گاڑی سے ہتھیار اٹھا لاتا ہے اور لانچ پر فائرنگ کر دیتا ہے۔ جواب میں اس پر بھی فائر ہوتا ہے، جس میں وہ زخمی ہو جاتا ہے۔ لیکن اتنے میں لانچ میں آگ بھڑک اٹھتی ہے اور وہ تباہ ہو کر سمندر برُد ہو جاتی ہے، تب رخسانہ آگے بڑھتی ہے اور اپنے دوپٹے سے نجیب کا زخم باندھنے لگتی ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

پاکستان بننے کے بعد سے اب تک کئی اقوام اپنی شناخت کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ اس جنگ، کرب اور محرومی کو محمد حفیظ خان نے اپنے ناول " ادھ ادھورے لوگ" میں بیان کیا ہے، یہ ناول پہلے سرائیکی زبان میں شائع ہوا پھر بے پناہ شہرت اور پسندیدگی نے ناول نگار کو اسے اردو زبان میں شائع کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ناول قارئین کو ریاست بہاول پور کے مکینوں کی، قیام پاکستان کے بعد بنی "ادھ ادھوری شناخت سے روشناس کرواتا ہے۔ ناول کا موضوع ریاست بہاول پور ہے، جس کے الحاق کو لے کر عام لوگوں سے امراء تک سب پریشان ہیں۔ پھر ملکوں کی تقسیم کے وقت پیش آئے مسائل، جانے والوں کی زمینوں پر قبضے، خونی رشتوں کا سفید ہونا اور صاحب کردار لوگوں کی موجودگی کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

ناول کا آغاز بہاولپور کے ایک گاؤں احمد پور کے دو کرداروں وادھو اور دھچر سے شروع ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اگر نیا ملک پاکستان بن گیا تو ریاست بہاولپور کس کے ساتھ جائے گی پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے گی۔ دھچر کہتا ہے یار میرا تیرا کیا واسطہ حکیم رام لعل کی حکمت کی دکان ہے جو اپنے گھر سے بے خبر حکمت کے پیشے سے جڑا ہوا ہے۔ تلسی رام لعل کی اکلوتی بیٹی جو بیس اکیس برس کی نرم و نازک اور خوب صورت ہے۔ جس کو پانچویں جماعت کے بعد سکول سے ہٹا دیا گیا تھا۔ وشنو تُلسی کا منگیتر جو بالکل نکما اور گیا گزرا انسان ہے، سوڈھی مل وشنو کا باپ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد تلسی کی شادی کر دی جائے۔

فیاض اس ناول کا مرکزی کردار ہے فیاض کا باپ نواب آف بہاولپور کا باڈی گارڈ ہے وہ فیاض کو بھی باڈی گارڈ بنانا چاہتا ہے لیکن فیاض اس سے انکار کر دیتا ہے اور حکیم رام لعل کی دکان پر حکمت سیکھنے چلا جاتا ہے اور بہت جلد وہ حکیم بن جاتا ہے۔ ۴۷ کی تقسیم کے بعد دو الگ الگ ملک ہندوستان اور پاکستان بن جاتے ہیں اور ریاست بہاولپور پاکستان کے ساتھ شامل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقلیتوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جاتا ہے بہت سے فسادی رام لعل کے گھر اور دکان کو بھی آگ لگانا چاہتے ہیں اور بعض قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ حکیم رام لعل اپنی دکان اور مکان فیاض کے نام کر دیتا ہے اور ہندوستان چلا جاتا ہے۔

اس دوران ایوب خان کا مارشل لا آتا ہے، اور ون یونٹ کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے اس دوران اینٹی ون یونٹ تحریک اٹھتی ہے۔ فیاض بھی اس تحریک میں شامل ہوتا ہے اس تحریک کے مختلف کارکنوں کی گرفتاریاں ہوتی ہیں۔ ان میں فیاض بھی گرفتار ہو جاتا ہے اور دس سال بغیر کسی جرم کے جیل میں قید رہتا ہے۔ وہاں سے ایک دن سلمٰی بدر الدین جو ایک ویلفیئر سوسائٹی چلاتی ہے نکلوا کر اپنے گھر لے آتی ہے جب

فیاض کو جنسی تعلقات پر مجبور کرتی ہے تو وہاں سے بھاگ جاتا ہے اور ٹرکوں پر آڑ ھتیوں کا کام کرتا ہے۔ ناول میں معاشرتی جبر، عورتوں پر ہونے والے مظالم، عورت کو بطور ٹیشو پیپر استعمال کر کے کیسے پھینک دیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہے۔ فیاض کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو ساری زندگی ریاست کی شناخت کے لیے لڑتا ہے اور بالآخر بے نام مارا جاتا ہے۔ مہراں کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو معاشرے میں اپنے حق کی تلاش میں ساری زندگی بسر کر دیتی ہے اور اپنا حق نہیں مانگ سکتی۔ تلسی کو معاشرے کے تمام مرد اپنے باپ اور وشنو جیسے ادھ ادھورے نظر آتے ہیں۔ سوڈھی مل کا کردار معاشرے کا وہ ناسور ہے جس کو حرام حلال کی پہچان نہیں مصنف نے اس کو مردار کھانے والے جانور گدھ سے تعبیر کیا ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت خوب صورت ناول ہے۔

حفیظ خان کے معاصرین اور احباب نے ان کی شخصیت کے بارے میں مختلف اخبارات میں چھپنے والے مضامین میں اپنی رائے دی ہے جو کہ درج ذیل ہے۔ الیاس میراں پوری کہتے ہیں کہ حفیظ ظاہری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باطنی خوبصورتی کے بھی مالک ہیں۔ ان کے عادات و خصائل اور اطوار ان کی باطنی خوبصورتی کے عکاس ہیں۔ الیاس میراں اپنے مضمون حفیظ خان کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> "حفیظ خان بڑے مہمان نواز اور سلیقہ شعار ہیں۔ ان کی پوری زندگی ترتیب و تہذیب اور توازن سے عبارت ہے۔ انہوں نے کبھی اس میں بگاڑ پیدا نہیں کیا۔ اصول پرست ہیں اس لیے اصولوں پر کبھی سود ابازی نہیں کی، سودے بازی کے اناڑی پن نے انہیں کئی نقصانات بھی پہنچائے ہیں۔ خان صاحب دل فطرت شناس کے مالک ہیں۔"(۴۲)

شیخ حبیب الرحمن بٹالوی اپنے مضمون "حفیظ خان دھوپ میں چھاؤں جیسا" میں ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> "دہرے بند کے سادہ طبیعت انسان، عہدے کے لحاظ سے عدالت کے پردھان مگر غرور نہیں، آدمیت ان کی پہچان، خوش اخلاق، خوش گفتار، دل بھی شگفتہ، طبیعت بھی شگفتہ، گھنی پلکیں، گورا رنگ، گل کی طرح مسکراتا ہوا چہرہ، خوش لباس اور خوش مزاج، آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگاتے ہیں جن میں شرافت اور بصیرت جھلکتی ہے۔ خوش لہجہ و خوش کام ایسے کہ زبان سے الفاظ نہیں گویا شاخوں سے کلیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ ادبی دنیا میں ایک محترک، ایک مستعد کردار جو اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ قلم قرطاس کی خدمت میں مصروف

رہتے ہیں۔"(۴۳)

جبار مفتی نے انہیں محنتوں اور شہادتوں کا نشان قرار دیا ہے اور ان کے بارے میں روزنامہ نوائے وقت ملتان میں لکھے جانے والے ایک مضمون میں حفیظ خان لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگ چومکھی لڑنے کے عادی ہوتے ہیں بیک وقت کئی محاذ کھول لیتے ہیں۔ قسمت یاوری کرے تو ہر محاذ پر کامران ہوتے ہیں۔ البتہ حفیظ خان نے یہ چومکھی اپنی محنت اور ذہانت سے جیتی ہے۔ وہ ریڈیو پر اناؤنسمنٹ بھی کرتا رہا ہے۔ ڈرامہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔ مختلف ماہناموں میں شاہکار افسانے بھی چھپوائے یونیورسٹی لاء کالج ملتان کے مجلہ "العدل" کی ادارت بھی سنبھالے رکھی اور ایل ایل بی کا نتیجہ نکلا تو ریگولر طلباء میں سب سے ممتاز نظر آیا۔"(۴۴)

اپنی با اخلاق فطرت کے سبب حفیظ خان ایک وسیع حلقہ احباب رکھتے ہیں اور ان کے تمام دوست ان کی ہمدرد اور مخلص دوستی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

ناول کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جو زیادہ تر تحصیلدار اقبال محمد خان اور اس کے بیٹوں جاوید، آفتاب اور بالے کی زندگیوں کے گرد گھومتی ہے۔ باب اول جاوید اقبال سے متعلق ہے جو پیشے کے لحاظ سے ایک صحافی ہے اور گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں اپنے پالتو کچھوے ارشمیدس کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ جاوید جنسی طور پر ناآسودہ کردار ہے، زرینہ اس کے سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہے۔ جنسی بھوک کا مارا جاوید، زرینہ کو اپنی کھڑکی سے چھپ چھپ کر دیکھتا ہے اور بالآخر اسے جنسی طور پر حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ جاوید کے آفس میں مشعال نامی ایک لڑکی کام کرتی ہے جسے جاوید پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مشعال بھی اسے پسند کرتی ہے لیکن اسے ایک چینل میں اینکر کی ملازمت ملتی ہے اور اس کی ترجیحات تبدیل ہو جاتی ہیں۔

باب دوم آفتاب اقبال سے متعلق ہے جو جاوید اقبال کا سوتیلا بھائی ہے، آفتاب پروفیسر ہے لیکن بعد ازاں پروفیسری چھوڑ کر وکیل بن جاتا ہے۔ آفتاب اپنی سٹوڈنٹ سلمٰی کو چاہنے لگتا ہے، سلمٰی بھی آفتاب کو پسند کرتی ہے۔ آفتاب کی والدہ احمدی فرقے سے تعلق رکھتی ہے جس کا علم سلمٰی کے باپ کو ہو جاتا ہے جو اسے فون کر کے دھمکی دیتا ہے کہ تمہاری حقیقت ہم پر آشکار ہو چکی ہے لہٰذا تم استعفٰی دے کر چلے جاؤ۔ باب سوئم

جاوید اقبال کے کچھوے ارشمیدس کا باب ہے، اس میں وہ اپنا تعارف کرواتا ہے اور کچھوؤں سے متعلق سائنسی وارتقائی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ ارشمیدس اس باب میں انکشاف کرتا ہے کہ راوی کے کرداروں کو جتنا وہ جانتا ہے اتنا کسی راوی کا باپ بھی نہیں جانتا۔

باب چہارم میں بالا دی ویجی گاٹ کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ بالا، آفتاب اور جاوید کا بھائی ہے، یہ ولد الحرام ہے اور ان کے والد کے عالمگیر نامی خاتون سے جنسی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ بالا عالمگیر، اس کے خاوند شوکت اور گاؤں کے لوگوں کی گالیاں کھاتا، پھٹکاریں سنتا جوان ہوا ہے۔ بالا رفیق نامی نوجوان سے نفرت کرتا ہے، رفیق بالے کی بہن نسرین میں دلچسپی لیتا ہے اور پورے گاؤں کو بازاری انداز میں یہ بات بتاتا پھرتا ہے۔ بالا بربنائے غیرت رفیق کو قتل کر دیتا ہے اور گاؤں سے فرار ہو کر جہادیوں کے ساتھ شامل ہو کر خودکش بمبار بن جاتا ہے۔

پانچواں باب جاوید، آفتاب اور بالے کے والد اقبال محمد خان کی کہانی ہے۔ موصوف تحصیلدار ہیں اور جنسی مہم جو ہیں۔ اقبال محمد خان کا نام ان کے والد علامہ اقبال کے نام پر رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی شادی امتہ الکریم سے ہوتی ہے جو انتہائی باپردہ خاتون ہے، آفتاب انہیں کے بطن سے ہے۔ رنگین مزاج اقبال محمد خان کا دل، امتہ الکریم کی روکھی طبیعت سے اُچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ سلطانہ نامی محفل آرائی کے فن میں مشتاق عورت سے شادی کر لیتے ہیں۔ اس سے قبل ان کے جنسی تعلقات سلطانہ کی خالہ کلثوم سے بھی رہ چکے ہیں۔ سلطانہ بھی ان کی بے دریغ جنسی مہم جوئی سے تنگ ہے اور ایک دن ایس پی کی بیوی کے ساتھ اقبال کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر اپنے بیٹے جاوید اقبال کو لے کر کراچی چلی جاتی ہے۔ اسی باب میں عالمگیر نامی ملازمہ کے ساتھ اقبال محمد خان کے جنسی تعلقات اور اس کے نتیجے میں بالے کی پیدائش کا بھی تذکرہ ہے۔

باب ششم میں تمام کرداروں کی کہانیاں اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ آفتاب اور سلمیٰ کورٹ میرج کر لیتے ہیں، جس کے بعد ان کی رہائش گاہ پر مذہبی شدت پسند حملہ کرتے ہیں اور دونوں جان بچا کر صوبہ سندھ میں آجاتے ہیں۔ بالے کے ذمے بے نظیر بھٹو پر خودکش حملہ کرنا ہے لیاقت باغ راولپنڈی میں بے نظیر جلسے سے خطاب کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس جارہی ہوتی ہے، اسی لمحے دو فائر ہوتے ہیں اور بالا بھی خود کو بم سے اُڑا لیتا ہے۔ اسی باب میں اقبال محمد خان کی کہانی بھی اختتام پذیر ہوتی ہے جو سلطانہ کو یاد کرتے کرتے جھیل میں نہانے اتر جاتے ہیں جہاں ان کے کندھے پر کوئی کلہاڑی کا وار کرتا ہے۔ وہ جیسے تیسے اپنی گاڑی تک پہنچتے ہیں اور وہیں ان کی موت واقع ہو جاتی ہے اور ناول بھی اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

پانی مر رہا ہے:

ناول کی کہانی میاں اللہ یار کے بیٹے اسرار کی گاؤں آمد سے شروع ہوتی ہے جو وکیل بننے شہر گیا لیکن کسی اور ہی حلیے میں گاؤں واپس آیا، اور گھر آتے ہی سانپ اسے ڈس لیتا ہے۔ اسرار نامی اس کردار کے چھ سوتیلے بھائی بھی ہیں اور ان میں ایک یامین نامی بھائی بھی ہے جو کانا ہے اور مصنفہ کے مطابق کانا بڑا سیانا ہے۔ مینے کی بیوی شاماں اسرار کو پالتی ہے۔ پھر بکری کے میمنوں کا ذکر آتا ہے جو جنگل میں پہنچ کر گھریلو جانور نہیں رہتے بلکہ درندے بن جاتے ہیں۔ یہاں کچھ مزید عجیب و غریب واردا تیں ہوتی ہیں اور پھر جوگی کی جوش بھری للکار سنائی دیتی ہے۔ جس سے آس پاس کا علاقہ نہ صرف لرز اٹھتا ہے بلکہ زمین پھٹ جاتی ہے۔ بہر حال اس واقعے کو بیچ میں چھوڑ کر، مصنفہ کہانی کو ماضی میں لے جاتی ہے اور بھوریوں والے کلے کی داستان سنانا شروع کر دیتی ہے جو دو اڑھائی ایکڑ چوڑا اور تقریباً اٹھارہ سے انیس ایکڑ لمبا ریتلا ٹکڑا ہے اور دریائے بیاس کی پرانی گزر گاہ ہے۔ وہ اپنے بیٹے مینے کے ساتھ بھوریوں والے کلے جاتا ہے جہاں ایک جنگلی سور اُسے زخمی کر دیتا ہے۔ ایک جوگی اس کی جان بچا کر اسے اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے۔ اس سے آگے اسرار کی پیدائش اور اس کی ماں فضل بی بی کی موت کا بیان ہے۔

یہاں سے مصنفہ ہمیں شہر لے آتی ہے، جہاں حسین و جمیل انجینئر عرفان جو واپڈا میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اُس کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ اس کی شادی شاہدہ نامی انتہائی خوش رو اور امیر لیکن بانجھ عورت سے ہوتی ہے۔ ان کے ہمسائے میں بترا خاندان اپنے گھر داماد سمیت مقیم ہے، یہ گھرانہ سوائے ایک دادی کے پاکستان بنتے وقت سارے کا سارا مسلمان ہو چکا ہے۔ بترا صاحب کی بیٹی مدھو عرف زینب، شاہدہ کی سہیلی ہے اور اس کے شوہر عرفان کو پسند کرتی ہے۔ ایک دن مدھو شاہدہ سے ملنے اس کی کوٹھی میں آتی ہے لیکن اس کی ملاقات لان میں بیٹھے عرفان سے ہو جاتی ہے۔ اسی دوران بادل گرجتا ہے جس سے خوفزدہ ہو کر وہ عرفان سے لپٹ جاتی ہے اور اپنے دانت اس کے کندھے میں گاڑ دیتی ہے۔ شاہدہ یہ منظر دیکھ لیتی ہے، اسی وقت بارش شروع ہو جاتی ہے اور آسمان سے مچھلیاں برسنے لگتی ہیں جن کی دموں اور جسموں کی رگڑ سے اس کے کپڑے تار تار ہو جاتے ہیں اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ وہ خوف زدہ ہو کر اس جگہ جاتی ہے جہاں کالا ناگ موجود ہے۔ کمرے سے اس کی برہنہ لاش برآمد ہوتی ہے۔ بارش سے گرنے والی چار عدد مچھلیاں منظور نامی ڈرائیور گھر لا کر اپنی حاملہ بیوی کو کھلاتا ہے اس کے گھر میں جو بچی پیدا ہوتی ہے اسکا آدھا بدن لڑکی کا اور آدھا مچھلی کا ہوتا ہے۔

مدھو کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ داماد جی خوشی میں ہوائی فائرنگ کرتے ہیں لیکن بربنائے لاپرواہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بترا صاحب خودکشی کر لیتے ہیں اور دادی بھی غائب ہو جاتی ہے، مسز بترا پاگل ہو جاتی ہیں۔ اگلے باب میں مصنفہ ہمیں پھر ماضی قریب میں لے جاتی ہے جہاں اسرار یونیورسٹی لاء کالج میں پڑھ رہا ہے اور یونیورسٹی کی سب سے حسین لڑکی نازنین اس پہ عاشق ہو گئی ہے۔ نازنین کا گھر عرفان اور بترا خاندان کے ہمسائے میں ہے جہاں ایک رات وہ اسرار کے ساتھ آسیب زدہ گھر میں جاتی ہے، جہاں جنگل اُگ آیا ہے۔ نازنین وہاں خوف زدہ ہو کر اسرار کے کندھے میں ویسے ہی اپنے دانت گاڑتی ہے جیسے مدھو نے عرفان کے کندھے پر گاڑے تھے۔ جیسے تیسے دونوں واپس آتے ہیں لیکن وہ بیمار ہو جاتی ہے اور اسرار سے ملنا چھوڑ دیتی ہے اور ایک مالدار بزنس مین سے شادی کر کے لندن چلی جاتی ہے۔

میاں اللہ یار بھی اسرار کے زندہ بچ جانے کی خوشی میں جشن منانے والے دن اچانک بے ہوش ہو جاتا ہے اور دنیا سے چل بستا ہے۔ نازنین لندن میں ایک جل پری کو جنم دیتی ہے اس کا خاوند اس واقعے سے بے حد رنجیدہ ہوتا اور بچی کی جان لینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس سے طلاق لے کر اپنی بیٹی کو لے کر پاکستان واپس آ جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ بھی عرفان جوگی کے پاس جاتی ہے جہاں بابا جی اور اس کی بیٹی بھی جوگی کی کٹیا میں ہوتے ہیں وہاں ایک شدید زلزلہ آتا ہے، اسرار اور نازنین کے سوا سب زمین میں پڑنے والی دراڑ میں گر کر مر جاتے ہیں۔ زلزلے کی شدت سے نہر کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور اس کا پانی پورے گاؤں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اسرار مرتا نہیں بلکہ بقول مصنفہ اس ویران جزیرے پہ اس کی نسل گرگٹ کے بچوں کی طرح پلی بڑھی اور آباد ہوئی۔

گل مینہ:

کئی دہائیوں سے پاکستان میں جس آگ اور خون کے سلسلے کا راج رہا ہے اور اس کے اثرات نے جس بے رحمی کے ساتھ لوگوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں۔ یہ ناول اسی فضا، اس کی سفاکی اور بے حسی کی مختلف پرتیں کھولتا ہے۔ گُل مینہ میں اس انتہائی اہم موضوع کو اس کی جزئیات کے ساتھ تحریر میں لایا گیا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی اور خودکش بمباروں کا ذکر کچھ دوسرے ناولوں میں بھی جزوی طور پر کیا گیا ہے، مگر اس ناول کی خصوصیت یہ ہے جیسے پوری صورتحال کو اس کے بلیک ہول میں بیٹھ کر سنایا گیا ہو۔ ناول میں شمال مغربی سرحد اور اس سے ملحقہ افغانستان میں بسنے والوں کی زندگی کو اس کی جزئیات سمیت بیان کیا گیا ہے اور صدیوں سے

چلی آرہی روایات اور قوت کے مختلف مراکز نے یہاں کے بسنے والوں کی نفسیات پر جو اثر ڈالا، اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ناول کا سب سے متاثر کن سین اس کا وہ باب ہے جہاں خودکش بمباروں کے تن سے جدا سر ایک کمرے میں مرتبانوں میں رکھے گئے ہیں اور یہاں گُل مینہ اپنے بیٹے کا مردہ سر دیکھتی ہے جس کا دھڑ کمر کے گرد باندھی ہوئی جیکٹ کے ساتھ اڑ چکا تھا۔ اس باب میں ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے، جس میں جیتے جاگتے لوگ، نوجوان بچے گرفتار ہو گئے ہیں جہاں ان کے سر شیشوں کے مرتبانوں میں بند ہو گئے ہیں اور زندگی سے وابستہ ان کے دھڑ کا کوئی وجود کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ یہ ناول اپنے اندر کئی ادوار کو سمائے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے بڑے احسن انداز میں برطانوی راج، اس راج میں اٹھنے والی قبائلی باغیانہ شورشوں، قبائلیوں کا برطانوی فوج کے خلاف سینہ سپر ہونا اور پاکستان کی موجودہ صورت حال کو پیش کیا ہے۔ ناول میں فلیش بیک کا استعمال کمال مہارت سے کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار گل مینہ ہے، گل مینہ ایک ایسے معاشرے کی باسی ہے جہاں عورت کو محض عیاشی کا سامان سمجھا جاتا ہے۔ قبائل کے اندر عورت کی تعلیم کا کوئی بھی انتظام نہیں ہے، اس کی مرضی کے بغیر اس کا رشتہ عمر میں بڑے مرد سے کر دیا جاتا ہے۔ گل مینہ بغاوت کی علمبردار ہے۔ اپنی مرضی کی شادی کے لیے اسے گھر، علاقہ اور یہاں تک کہ پاکستان سے نکل کر افغانستان تک جانا پڑتا ہے۔ جہاں اس کا شوہر دہشت گردوں کے نرغہ میں آ کر جہادی بن جاتا ہے اور مارا جاتا ہے۔

برطانوی راج کے اندر اپنی باغیانہ کاروائیوں کی وجہ سے سامنے آنے والا کردار گل مینہ کا دادا پاؤ جان ہے۔ اپنی بہادری و شجاعت کی وجہ سے انگریز سرکار سے انعام حاصل کرتا ہے، عورت کی تعلیم کے حق میں ہے مگر پورا قبیلہ مخالفت کرتا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد معصوم بچوں کا نمائندہ کردار فتح خان ہے جو کہ مدرسہ میں دہشت گرد بن کے آتا ہے۔ شفیق پینٹر ناول کے وسط کے بعد آیا مگر اپنے رنگوں سے ناول میں جاندار کردار بن گیا۔ اپنے خوش نما کام اور مہارت کی وجہ سے دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ناول کا اختتام ایک بہت بڑے پاکستانی سیاسی المیہ سے ہوتا ہے، جی ہاں لیاقت باغ میں محترمہ بے نظیر بھٹو پر خودکش حملہ۔ حملے کے بعد کی صورت حال ایک خاص پاکستانی صورت حال کو عیاں کرتی نظر آتی ہے، گل مینہ کا اپنے بیٹے کے سر کے حصول میں دشواری ایک خاص المیاتی تاثر دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر گل مینہ ایک ایسا ناول ہے کہ جس کے اندر تاریخی، جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی تصویر کشی کی گئی ہے۔ موجودہ عہد میں ناول نگاری کی جہت میں ایک اچھے فن پارے کا اضافہ ہے۔

گراں:

طاہرہ کی والدہ ماجدہ جمیلہ خاتون پڑھی لکھی اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ والد کی نسبت والدہ ذرا سخت مزاج تھیں۔ گھر میں کام کاج کرنے والیوں سے سختی سے پیش آتی تھیں۔ وہ خود کو ایسی ملکانی سمجھتی جس کا کوئی مد مقابل نہیں ہو سکتا۔ طاہرہ کے والد فیض اللہ بچیوں کی نسبت بچوں کی تعلیم کے پرجوش حامی تھے۔ بچیوں کی تعلیم صرف وہ اسی حد تک چاہتے تھے کہ وہ گھر کی چار دیواری میں خوش و خرم زندگی گزار سکیں۔ وہ مزاجاً نرم دل تھے، وضع دار تھے بچوں کے ساتھ بھی ایک خاص حد تک فاصلہ رکھتے تھے۔ "طاہرہ نے انٹرویو میں بتایا کہ میرے انداز اور عادات اور طرزِ فکر پر والد صاحب کے اثرات نمایاں ہیں۔(۴۵)

طاہرہ اقبال پانچ بہن بھائی ہیں جن میں سے ایک بھائی جاوید اقبال ۱۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ طاہرہ اقبال آغاز ہی سے خاموش طبع اور حساس رہی ہیں۔ آج بھی متانت و سنجیدگی ان کے چہرے سے ٹپکتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ فطرت بنانے میں ان کے ماحول نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ طاہرہ کی فیملی پردے کی سخت پابند تھی۔ بچیوں کو گھر سے باہر جانے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ تاج سعید اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "طاہرہ اقبال کی ابتدائی زندگی بھی ہماری عام خواتین کی طرح تھی اور افسانہ لکھنے سے پہلے اس کے حالات بھی کسی قلعہ بند پری کی طرح تھے۔ سو وہ اپنے بارے میں بتاتی ہیں کہ میرا تعلق میاں چنوں اور چیچہ وطنی کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ جہاں ایک قلعہ بند گھر میں زندگی کے شب و روز گزارے۔"(۴۶)

طاہرہ اقبال کا تعلیمی سلسلہ ساتویں کے بعد واپس گاؤں شفٹ ہونے کی وجہ سے منقطع ہو گیا کیونکہ وہ والدین کے فیصلے کی وجہ سے مجبور تھیں۔ وہ مزید پڑھنا چاہتی تھی والدہ نے والد صاحب کو راضی کیا اور انہیں پرائیویٹ امتحان دینے کی اجازت مل گئی۔ میٹرک، ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایم اے کے امتحان پاس کیے اور ثابت کیا کہ اگر جذبے سچے ہوں تو انسان ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے شوق اور ضد کو دیکھتے ہوئے ان کے والد ان کو پنجاب یونیورسٹی داخل کروانے پر راضی ہو گئے تھے۔ لیکن دل سے تیار نہیں ہوئے تھے اس لیے طاہرہ اقبال نے داخلہ نہیں لیا۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

> "والد صاحب پنجاب یونیورسٹی کا ماحول دیکھنے خود گئے۔ واپسی پر مجھ سے کہا کہ وہاں کا ماحول مجھے پسند نہیں آیا۔ لڑکے لڑکیاں اکٹھے پھر رہے ہیں۔ لیکن اگر تم چاہو تو۔۔۔۔۔۔ میں سمجھ

گئی وہ کیا چاہتے ہیں اور دراصل ان کا چاہنا ہی میری چاہت تھی۔ میں نے انہیں نہ ہارتے دیکھا تھا اور نہ ہی سمجھوتا کرتے اور نہ ہی دیکھنا چاہتی تھی سو میں نے وہی جواب دیا جو وہ سننا چاہتے تھے۔ (۴۷)

طاہرہ اقبال نے والد گرامی کی رضا کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ نہ لیا بطور پرائیویٹ امیدوار کے ایم اے اردو، ایم اسلامیات، بی ایڈ کرنے کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی اردو مکمل کیا۔ طاہرہ اقبال کا تعلیمی سفر مشکلات اور جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ وہ مردانہ معاشرے میں عورتوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے کہ:

"اس نے تمول اور اختیار رکھنے والے گھر میں پیدا ہو کر بھی اپنی تعلیم کے حوالے سے بے اختیاری رکھی مگر اب ڈاکٹریٹ کرنے والی ایک پروفیسر کے روپ میں اس لڑکی کو دیکھیں تو وہ ذاتی زندگی میں استعداد اور ہنر کے اظہار کے مواقع اور خاندانی بندشوں کی کشاکش کی ایک صبر آزما کہانی لگتی ہے۔" (۴۸)

طاہرہ اقبال کے عزم اور استقلال اور انقلابی فکر کی بدولت والدین کو نوکری کی اجازت دینا پڑی۔ دوران ملازمت بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ طاہرہ اقبال کی شادی اپنے خاندان سے باہر اعوان قبیلے کے ملک محمد اقبال اعوان سے ۱۹۹۱ میں ہوئی۔ دسمبر ۲۰۱۲ کو طاہرہ اقبال کے شوہر کا انتقال ہو گیا اللہ تعالی نے اس جوڑے کو اولاد کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔

طاہرہ اقبال کے ناول بھی تہذیبی اور ثقافتی عناصر کے آئینہ دار ہیں، ان کا ناول "گراں" پوٹھوہاری تہذیب کا عکاس ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کی تہذیب اور پھر اُسی کی دہائی کے بعد کی تہذیب میں واضح فرق موجود ہے۔ جسے مختلف کرداروں کے ذریعے، ناول نگار نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا پہلا حصہ پوٹھوہار کے اس دور کا نمائندہ ہے جو تقسیم ہندوستان کے فوراً بعد کا زمانہ ہے۔ اس دور میں پرانی تہذیب روبہ زوال ہے اور نئی تہذیبی اور ثقافتی اقدار ابھی نمایاں نہیں ہوئیں اور کردار بٹوارے سے پہلے کے واقعات کو یاد کر کے گزرتے وقتوں سے جذباتی لگاؤ کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس باب کا تجزیہ قاری پر واضح کرتا ہے کہ "گراں" کی تہذیب ایک بند تہذیب تھی۔ جو خوراک، لباس، اقدار اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر انحصار نہیں کرتی تھی۔ گاؤں کی تاریخ بھی سادہ اور مختصر تھی اس سماج کی عورت معاشرتی جبر کا شکار تھی جس کی قسمت کے تمام تر فیصلے خاندانی بزرگ کیا کرتے تھے، خاندان کے مردوں سے وفاداری اس کے لاشعور کا حصہ

تھی۔ ایک دفعہ جس سے منسوب کر دی جاتی، پھر تمام عمر وہ اسی کی ہو رہتی۔ زرینہ جان، جھلی میرن، شکیلہ جان اور فاطمہ کے کردار اس کی مثالیں ہیں۔ ایک نسل کے تفاوت کے بعد غزل جان بھی بغاوت کے باوجود اسی جبر کا شکار ہوئی۔ مصنفہ نے ان کرداروں کے ذریعے پوٹھوہاری تہذیب و ثقافت کا نوحہ بیان کیا ہے۔ ناول میں شکیلہ جان، صنوبر جان، محمد جان، میرن فاطمہ، تائی بختو، رحمت جان، غزل جان، ساریہ جان اور جسبیر کور وغیرہ کے کرداروں سے ہٹ کر مردانہ کرداروں میں اصغر خان، اکبر خان، عثمان خان، حکم داد، اظہار الحق، مختار، چودھری نذیر، چودھری محمد اکرم اور تاج وغیرہ شامل ہیں۔ گراں کے زیادہ تر لڑکے فوج میں بھرتی کیے گئے اور انھیں جنگوں میں جھونک دیا گیا۔ ان کی منگیتروں اور بیواؤں کے حصے میں فقط انتظار آیا۔

ناول کے دوسرے حصے میں پوٹھوہار کی بدلتی تہذیب اور نئی اقدار کے نمودار ہونے کے عمل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہندوستانیوں کی ثقافتی اور تہذیبی صورت حال کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ستر کی دہائی میں ہر مرد پوٹھوہار سے پاسپورٹ بنوا کر بیرون ملک کمائی کرنے چلا گیا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے سوا کوئی مرد دکھائی نہ پڑتا تھا۔ بچے روات، سہالے اور پنڈی کے انگریزی سکولوں میں پڑھنے لگے۔ "گراں " کے گھروں میں نل لگ گئے، باتھ روم بن گئے اور وہ لڑی ویران ہو گئی جہاں گراں کی عورتیں پانی بھرنے اور کپڑے دھونے جایا کرتی تھیں۔ پتھروں سے اسارے گئے مکانات کوٹھیوں میں بدل گئے۔ فریج اور کولر نے گھڑے کی جگہ لے لی۔ ناول کا تیسرا حصہ "چودھری محمد اکرم NZD VS کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس میں ان دو کرداروں کی مدد سے جدید تہذیب اور دیہی تہذیب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چودھری محمد اکرم دیہی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے، جبکہ نذیر احمد جدید تہذیب کو پیش کر رہا ہے۔

ناول کے آخری حصے میں مشرقِ وسطیٰ اور سعودی عرب کی ثقافت اور یہاں مقیم پاکستانیوں کی صورتِ حال کو اُجاگر کیا گیا ہے، کئی پاکستانی یہاں عمرے یا حج کا ویزہ لے کے آتے ہیں اور پھر ادھر اُدھر چھپ جاتے ہیں، اس طرح کئی غیر قانونی تارکینِ وطن یہاں مقیم ہیں جو سستی اُجرت پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ یہاں پر عثمان خان کا بھائی مقیم ہے۔ ان کرداروں کے توسط سے ناول میں اس خطے میں غیر ملکیوں کی صورتِ حال اور ان کے دوہرے رویوں کا فنکارانہ چابک دستی سے پردہ چاک کیا گیا ہے۔

ا۔ مواصلات:

مواصلات سے مراد ایسا طریقہ کار ہے جس سے معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے یا ایک ذریعہ سے دوسرے ذریعہ میں معلومات کی ترسیل کی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں مواصلات کی بے انتہا ترقی کی بدولت معلومات کی ترسیل اور لوگوں میں پیغام رسانی کے تبادلے کے مختلف ذرائع دیکھے گئے ہیں۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے تک مواصلات کی کئی اقسام موجود رہی جن میں نمایاں یہ ہیں، محکمہ ڈاک، ٹیلی گرام، فیکس وغیرہ۔ صوتی مواصلات میں صرف آواز کا تبادلہ ممکن ہے، اس میں روایتی طور پر ٹیلی وژن، ریڈیو، انٹرنیٹ اور موبائل فون سے یہ کام انجام دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم متحرک تصویری مواصلات ہیں جن میں جدید طور پر کئی ذرائع موجود ہیں، جن میں دو مختلف مقامات پر رہنے والے لوگ فوری طور پر ایک دوسرے کو دیکھ کر بات کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر اور سیل فون پر اسکائپ، واٹس ایپ، گوگل ہینگ آؤٹ اور ایمو سے بھی یہی کام ممکن ہے۔ اس طرح کے مواصلات کے ذریعے بات کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی ایسی سہولتیں بھی موجود ہیں جن میں سے صرف متون کا تبادلہ ممکن ہے، ان میں اخبارات، ای میل، چیٹ وغیرہ جیسی آن لائن خدمات عام ہیں۔ دنیا کے زیادہ تر حصوں میں کسی دور میں پیجر، فیکس اور ٹیلی گرام سے بھی یہی خدمات انجام پاتی تھی۔

محکمہ ڈاک مواصلاتی نظام کا ایک موئژ اور مفید ذریعہ ہے اس کے ذریعے سے لوگوں کے بیچ خطوں کا تبادلہ ممکن ہوتا ہے۔ ڈاک کی خدمات اکثر دوسرے ذرائع کے مطابق دھیمی ہوا کرتی ہیں محکمہ ڈاک کے متبادل ذرائع جو جدید دور میں موجود ہیں جن میں آج کل کوریئر کمپنیاں بھی کام کر رہی ہیں، خط یا پارسل کوریئر والے وزن کے حساب سے پیسے لے کر متعلقہ جگہ پہنچاتے ہیں۔ مواصلات کا ایک ذریعہ انٹرنیٹ بھی ہے، جس کے ذریعے فوری طور پر ایک پیغام کو دوسرے تک منتقل کیا جاتا ہے اور یہ کام پلک جھپکنے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے یہ تمام چیزیں جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ہی ممکن ہو سکی ہیں۔ ناولوں میں موجود کچھ مثالوں سے اس پہلو کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے۔ مواصلات کے ذرائع نے جہاں ایک طرف فاصلوں کو آواز اور تصویر کی صورت میں سمیٹا ہے وہیں دوسری طرف ایک بہت بڑے بحران کو بھی جنم دیا ہے۔ اب محفلوں کی وہ رونق ختم ہو گئی ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔

کاروانِ وجود:

این کالج میں سارہ کی استانی ہے، جو کہ سارہ سے بہت پیار کرتی ہے اور دونوں میں کافی گفتگو بھی رہتی ہے۔ اکثر این سارہ کو چھوڑنے اس کے ساتھ آجایا کرتی تھی۔ این سارہ کو اس کے گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ گئی اور راستے میں دونوں کی گفتگو ہوتی رہی اور اس دوران ان دونوں کے درمیان نوشابہ اور ثمر کی ذات کے مختلف پہلو زیرِ بحث آتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں، نوشابہ کھل کر بات کرنے کے ساتھ ساتھ زور سے ہنستی ہے اور لوگوں میں جلدی سے گھل مل جاتی ہے۔ این ثمر کو ایک بند دروازے کی مانند کہتی ہے۔ این جب سارہ کو چھوڑ کر واپس جا رہی ہوتی ہے تو اُس کی نظر راستے میں گزرتے ہوئے ثمر کے کزن سید پر پڑتی ہے۔ سعید کے ہاتھ میں بہت سے خطوط ہیں جن کو وہ اس قدر انہماک سے پڑھ رہا ہے کہ اُس کو این کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ٹیکنالوجی میں جیسے جیسے ترقی آتی گئی ایسے ایسے خطوط کی جگہ بہت سے جدید ذرائع لیتے گئے آجکل اس کام کے لیے واٹس ایپ، ای میل، فیس بک، ایمو اور بہت سی دوسری ایپلیکیشنز وجود میں آگئی جس سے میلوں دور بیٹھے شخص سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ پرانے وقتوں میں خط بھی مواصلات کا بہترین ذریعہ رہے ہیں۔ اگرچہ اس کے ذریعے کافی انتظار کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ خط کا جواب آنے میں کچھ دن کا عرصہ لگ جاتا تھا۔ اور ناول میں اس کی مثال ثمر کے کزن سعید کی ہے:

> "این سارہ کو اس کے گھر چھوڑ کر واپس اپنے گھر کی طرف مڑی تو اس نے دیکھا ثمر کا کزن سعید پل پر بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں چند خط ہیں۔ جن میں سے ایک وہ پڑھ رہا ہے۔ "ہیلو ہیلو" کر کے وہ آگے نکل گئی۔ جبکہ سعید اپنے خط میں مگن رہا۔" (۴۹)

مصنف اپنے اس ناول میں سعید کے کردار کو مواصلات کے پرانے طریقے یعنی خط سے جڑا دکھاتا ہے۔ مواصلات میں جدت کے باوجود کچھ لوگ ابھی تک پرانے طریقے کو استعمال کرتے ہیں۔ جدت کے اثر کو قبول نہ کرنا بھی بحران کی ایک وجہ ہے، کیونکہ ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے جدید طریقوں کو اپنانا پڑے گا۔

دھنی بخش کے بیٹے:

احمد بخش دھنی بخش کا دوسرا بیٹا ہے جو کہ ناول کا نمائندہ کردار ہے، جس کے گرد کہانی گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ احمد بخش گاؤں واپس آنے کے بعد پوسٹ آفس گیا جہاں وہ باہر جانے سے پہلے اکثر دوستوں کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہاں اُسے ایک اُستانی مریم کے بارے میں پتہ چلا جس کو زمیندار تنگ کرتا تھا۔ نا جانے اُس

نے کہاں سے اُس کا نمبر لے لیا تھا اور اُس کو دھمکیاں دیتا تھا کہ مجھ سے ملو اور کبھی رات کو فون کر کے کہتا کہ میں تمھارے ہاتھ کی چائے پینا چاہتا ہوں اور اگر کسی کو یہ بات بتائی تو تمھاری خیر نہیں تمھیں بھی گولی مار دوں گا اور خود کو بھی ختم کر دوں گا۔ سکول کی اُستانی بیوہ تھی اور اکیلی سکول کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ سکول شہر کے باہر ہونے کی وجہ سے وہاں اور بھی سناٹا ہوتا تھا۔ یہ سب باتیں احمد بخش کو ہیڈ ماسٹر وحید الرحمٰن کی زبانی معلوم ہوئی۔ احمد بخش سکول مریم سے ملنے گیا اور اُسے زمیندار کا ٹیلی فون اور نام پتہ پوچھا اور اُسے تسلی دی کہ وہ اپنا کام جاری رکھے چند دن میں معاملہ سرد پڑھ جائے گا۔ گاؤں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اثر ورسوخ رکھنے والے لوگ ہر چیز کو اپنی جاگیر ہی تصور کرتے ہیں کیونکہ وہاں کے غریب طبقے میں آج کے دور میں بھی اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنے حق کے لیے لڑ سکیں۔ ایسی ہی مثال سکول کی استانی مریم کی ہے جس کو ایک زمین دار تنگ کرتا ہے:

> "یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا، "فکر مت کیجیے، پڑھاتی رہیے اور اسکول کا ایڈمنسٹریشن سنبھالے رکھیے۔ چند دن میں معاملہ سرد پڑ جائے گا۔ ہفتے بھر بعد میں آپ سے فون کر کے پوچھوں گا کہ ان زمین دار صاحب نے خود اپنی جان لی یا نہیں؟' ایک بار پھر میز کی طرف آتے ہوئے اس نے اسی پرچے پر اپنا فون نمبر لکھا جس پر اس نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔"(۵۰)

دھنی بخش کے بیٹے میں مصنف نے مواصلات کے منفی پہلو کو بھی دکھایا ہے کہ ایک زمیندار استانی مریم کا نمبر کس طرح سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اُسے تنگ کرتا ہے اور اکیلے میں ملنے کا کہتا ہے ہر چیز کے منفی اور مثبت دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ جب احمد بخش کو معاملے کا علم ہوتا ہے تو وہ معاملے کو حل کرتا ہے۔

روشن اندھیرے:

ناول میں شجاع کا کردار ایک رپورٹر کا ہے جسے بعد میں شوبز کی رپورٹنگ کے لیے چُن لیا جاتا ہے۔ ناول کا آغاز ہی ماریہ اور شجاع کی لڑائی سے ہوتا ہے۔ ماریہ شجاع کو پسند کرتی ہے اور وہ ہمیشہ اُس سے کھنچا سا رہتا ہے۔ شجاع ایک قابل رپورٹر ہے اور اس کے کام کی وجہ سے کافی لوگ اُس سے حسد رکھتے ہیں۔ اُس کو شوبز کی خبروں کے لیے تبدیل کر دیا جاتا ہے لیکن شجاع کو اس کے بارے میں اتنی معلومات نہیں ہیں اور ماریہ ایسے ہی بات بات میں اُسے اپنے مشورے دیتی رہتی ہے ایک دن حسن اور شجاع آپس میں بات کر رہے ہوتے

ہیں کہ ماریہ درمیان میں بول پڑتی ہے۔اور شجاع کو غصّہ آجاتا ہے اور وہ اُسے سب کے سامنے ڈانٹ دیتا ہے اور وہاں پر موجود سب لوگ حیران رہ جاتے ہیں شاید اِس بات کی کسی کو توقع نہیں تھی کہ شجاع اتنی سخت بات کر جائے گا۔کچھ دیر کمرے میں مکمل خاموشی ہو گئی کہ اچانک فون کی گھنٹی سے سب چونک جاتے ہیں۔ناول میں موبائل فون اور انٹرنیٹ کا استعمال مواصلات کا ذریعہ ہیں:

"اوکے،اوکے۔۔۔" حسن نے کہا تو میں سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ چائے پیتا رہا۔مجھے پر سکون ہونے میں کافی وقت لگا، تبھی میرا سیل بول اُٹھا۔میں نے سکرین پر نمبر پڑھے تو وہ عامر بشیر کے تھے۔اگرچہ اس کا باپ ایک بڑا صنعت کار تھا لیکن اس کا اپنا بزنس بھی تھا اور ابھی درمیانے درجے کے صنعت کاروں میں شمار رکھتا تھا،اس سے میری شناسائی دوستی میں بدل چکی تھی۔"[۵۱]

اس ناول میں موبائل فون اور انٹرنیٹ مواصلات کے جدید ذرائع ہیں۔موبائل اور انٹرنیٹ کی ہر وقت دستیابی کے جہاں ایک طرف فوائد ہیں وہیں اس نے انسانی زندگی کو افراتفری سے بھر دیا ہے۔آرام سے بیٹھ کر بات چیت ایک خواب و خیال ہو گیا جس سے آپس کے مراسم بھی متاثر ہوئے ہیں۔

صفر سے ایک تک:

صفر سے ایک تک میں منشی کے دو بیٹے تھے بڑا بیٹا ثناء اللہ جو کہ پیری مریدی سے منسلک تھا اور دوسرا بیٹا ذکی۔ذکی کو کمپیوٹر کا بہت شوق ہے اور اُس کا کردار بغیر کمپیوٹر کے نظر نہیں آتا وہ اپنے باپ کی بھی تمام فائلوں کو کمپیوٹر میں محفوظ کر دیتا ہے تاکہ اُن کا آبائی کام اُن کے پاس محفوظ رہے۔سالار ذکی کی اپنے بیٹے فیضان کے ساتھ دوستی کو پسند نہیں کرتا اور اُن کی طرف سے ذکی پر کافی دفعہ حملہ بھی ہوتا ہے۔جس کے بعد ذکی اپنے بھائی کے پاس گاؤں چلا جاتا ہے جہاں پر اُس کا بھائی اُس کے لیے کمپیوٹر کا انتظام کرتا ہے۔گاؤں کے لوگوں کے لیے کمپیوٹر بالکل نئی چیز ہے۔ثناء اللہ بھالیکے میں پہلا انٹرنیٹ کیفے قائم کرنے والے ماہرین کو بھی بلا لیتا ہے تاکہ Server کے بعض مسائل کو حل کیا جاسکے۔ذکی نے بھی مکینکوں کی تکنیکی مدد شروع کر دی کچھ ہی دیر میں وہ اُسے گرو ماننے لگے۔بھائی کے پاس آنے کے بعد ذکی کو انٹرنیٹ کی ضرورت اس لیے بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ وہ زلیخا سے رابطہ کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کی گفتگو بذریعہ انٹرنیٹ ہی ہوتی ہے۔چونکہ زلیخا ناول کی ہیروئن ہے اور ناول میں اُس کی آمد مختصر وقت کے لیے ہی ہوتی ہے۔ناول میں موبائل سے ہٹ کر انٹرنیٹ کا استعمال بھی مواصلات کے ذرائع کی عمدہ مثال ہے جس کا استعمال ناول میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے:

"میرے خدا! کمپیوٹر سے متعلق ہر وہ آلہ جس کا ذکر میں نے گذشتہ روز اُن کے ساتھ گفتگو میں کیا تھا انہوں نے لاہور کی ایک مارکیٹ سے منگوا لیا تھا اور ایک اچھی خاصی خطیر رقم صرف کر ڈالی تھی۔ اور پھر صرف یہی نہیں بھالیکے میں پہلا انٹرنیٹ کیفے قائم کرنے والے ماہرین کو بھی بلا لیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے ہی کمرے تک ٹیلی فون کی ایک لائین پہنچا دی گئی تھی جسے اب روشن دان کی لکڑی میں سوراخ کر کے اندر پہنچانے اور پھر لیپ ٹاپ سے لگا کر نیٹ کو نیکشن چالو کرنے کے مراحل درپیش تھے۔"(۵۲)

انٹرنیٹ کا استعمال بھی جدید ٹیکنالوجی کی ایجادات میں سے ایک ہے جس کے ذریعے دور دراز بیٹھے ہوئے اشخاص بھی ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ سکتے ہیں۔ ذکی کے ساتھ اس کا باپ بھی کمپیوٹر کا استعمال کرتا نظر آتا ہے اور اس پر گیمز بھی کھیلتا ہے۔ جس کی وجہ سے ذکی کی ماں اس سے نالاں رہتی ہے۔ منشی گیری کا تمام کام بھی کمپیوٹر سے لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک ہی جگہ بیٹھ کر تمام کام کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کے سامنے دیر تک بیٹھنے سے نہ صرف نظر کا مسئلہ جنم لیتا ہے بلکہ صحت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

نو لکھی کوٹھی:

ولیم انگریز آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ ناول کا نمائندہ کردار ہے۔ جو اپنے باپ، دادا کی طرح سول سروس میں ہے اور اسے ہندوستان سے بہت محبت ہے جس کی وجہ وہاں کی ہریالی اور نو لکھی کوٹھی ہے۔ کرم دین حکومت کی طرف سے دیا گیا ولیم کو ایک ملازم ہے جو کہ اُس کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ کرم دین ولیم کے لیے گرم گرم بھاپ اُڑاتی ہوئی کافی لے کر آتا ہے۔ جسے چُسکیاں لے کر پیتے ہوئے ولیم کیتھی کو خط لکھتا ہے اور نجیب شاہ کو بلا کر اُسے بذریعہ تار کیتھی کو بھیجنے کا کہتا ہے:

"پیاری کیتھی تمھیں خط لکھے بہت دن ہو گئے۔ آج سے چار دن پہلے تمھارا خط ملا تو میں پڑھنے کے بعد دیر تک اُسے چومتا رہا پھر سینے پر رکھ کر سو گیا۔ خواب میں تم ملیں اور میں نے دیکھا تم میرے سینے پر لیٹی ہوئی ہو۔"(۵۳)

کسی دور میں خط و کتابت کو آدھی ملاقات سمجھا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے پیغام رسانی میں تیزی آتی گئی مواصلات کے جدید ذرائع کو اپنایا جانے لگا۔ آج کل کے دور میں خطوط لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے کیونکہ اس کے لیے بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے انسان اپنے احساسات اور جذبات فوراً دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ان تمام جدید ذرائع نے ہماری ثقافت پر بھی اثرات مرتب

کیئے ہیں۔ مصنف نے بڑے دلکش پیرائے میں ایک انگریز آفیسر کو تمام سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی اسے مواصلات کے پرانے طریقے کو استعمال کرتے ہوئے دکھایا ہے۔

ناتمام:

ڈاکٹر صاحب کا کردار ناول میں اس وقت سامنے آتا ہے جب صائمہ ایک کلینک میں ملازمت اختیار کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ایک متوسط درجے کے گھرانے سے ہے لیکن ان کی بیوی کافی مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ شکی قسم کی خاتون ہیں جو ہر وقت ڈاکٹر صاحب پر شک کرتی رہتی ہے۔ اُس کو لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا صائمہ سے چکر ہے۔ ناول میں مواصلات کی مثال موبائل فون کا استعمال ہے، جس کا استعمال ناول میں موجود ہر کردار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دیکھا جائے تو آج کل موبائل کے بنا زندگی اُدھوری ہے کیونکہ لوگوں نے موبائل کو اپنی زندگی کا ضروری حصہ بنا لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب رات کو ہسپتال سے نکلتے ہوئے بھی موبائل فون پر ہی مصروف نظر آتے۔ صائمہ کے لیے وارڈ کی نسبت کلینک میں سارا کام دفتری نوعیت کا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کے لیے آئے ہوئے فون سننا، اِن کے خط سنبھالنا، فائلیں تیار کرنا، اِملا لینا اور ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کا اندراج کرنا جیسے کام شامل ہیں۔ جس کو وہ احسن طریقے سے انجام دے رہی ہے، ڈاکٹر صاحب نے صائمہ کو موبائل کی سہولت بھی میسر کر رکھی ہے۔ آج کل کے دور میں موبائل فون مواصلات کا اہم ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہر وقت لوگ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ ناول میں اِس کی مثال جگہ جگہ ملتی ہے:

> "ایک موبائل فون انھوں نے اسے لے دیا تھا کہ جتنا وقت وہ ان سے دور رہے، ان کے رابطے میں رہے۔ وہ ان کے لیے بیک کشن لائی تو اتنے احسان مند ہوئے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کپکپاتی میں آواز بولے " تھینک یو، شکریہ، دھنے واد، کتنے ان سفی شنٹ لفظ لگتے ہیں بعض اوقات۔"[۵۴]

انسانی زندگی کو اس ناول میں موبائل کے بغیر اُدھورا دکھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر وقاص، صائمہ کو موبائل خرید کے دیتے ہیں تاکہ آپس میں رابطے میں رہا جا سکے۔ ان دونوں کے روابط کی وجہ سے ڈاکٹر وقاص کی ازدواجی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

کوہِ گراں:

چودھری حلیم جو کہ ناول کوہِ گراں کا نمائندہ کردار ہے اور ناول میں اس کی آمد گاؤں کی دوبارہ بحالی کے لیے ہوتی ہے۔ جب وہ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے واپس آتا ہے تو گاؤں میں صرف تین لوگ

ہوتے ہیں جو کہ گاؤں کو کسی صورت چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔اس کے برعکس گاؤں کے اُجڑنے کے بعد لوگ آہستہ آہستہ دوسری جگہوں پر نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ حلیم شہر کی سہولیات کو چھوڑ کر گاؤں کو دوبارہ بسانے کے لیے اس وجہ سے آیا تھا کہ اس کا خاندان گاؤں میں کافی اثر ورُسوخ رکھتا تھا۔ یہاں پر وہ موبائل اور گھڑی ساتھ نہیں لایا تھا کیونکہ شہر میں وہ وقت کے درمیان زندگی گزارتا تھا۔ شروع کے دنوں میں حلیم کو اِس بات کا اندازہ سب سے زیادہ ہوتا تھا، کیونکہ شہر میں اُس کی زندگی وقت کے درمیان گزرتی تھی۔ لیکن یہاں پر اُس کو یہ سب چیزیں میسر نہیں تھیں، گاؤں میں وقت کا اندازہ لوگ سورج کی روشنی سے لگاتے تھے۔ شروع میں دیہات کی زندگی سادگی لیے ہوئے تھی لیکن جیسے شہر کی آب وہوا نے دیہاتوں کا رُخ کیا تو دیہاتوں میں وہ سادگی ختم ہوگئی جو یہاں کی زندگی کا خاصہ تھا وہاں بھی نمود و نمائش نے جگہ لے لی اور مواصلات کا استعمال ایک عام سی بات ہوگئی:

> "گڈو دہلیز سے اُٹھ کھڑی ہوئی تو فوراً وہاں بیٹھ گیا۔ اُس نے گڈو کو بیٹھنے کا اشارہ نہ کیا۔ شام ڈھل چکی تھی اور صحن سائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسے سامنے والی دیوار کے پار بھی روشنی نظر نہ آئی۔ اس نے ایک ردِ عمل کے طور پر کلائی پر وقت دیکھنا چاہا۔ اُسے ایک دم یاد آیا کہ وہ گھڑی اور موبائل فون ساتھ نہیں لایا تھا۔"(۵۵)

پہلے وقتوں میں وقت کا اندازہ لوگ سورج کی روشنی سے لگایا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے ٹیکنالوجی میں ترقی ہوتی گئی تو بہت سی چیزیں سامنے آتی گئیں، گھڑی کے ذریعے وقت دیکھا جانے لگا۔ اُس کے بعد گھڑی کی جگہ موبائل فون نے لے لی جو ایک طرف تو ایک دوسرے سے رابطے کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف اس میں ایک دنیا بھی موجود ہے۔ موبائل فون انٹرنیٹ کے ساتھ منسلک ہوتے ہی ہمیں ہر طرح کی معلومات پہنچاتا ہے جس کے ذریعے ہم ہر وقت دنیا کی تمام خبروں سے آگاہ رہتے ہیں۔ جہاں ان تمام سہولتوں کے فائدے موجود ہیں وہیں یہ نقصان بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اب لوگوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے نہ وہ ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ بیماری کی صورت میں بھی ایک پیغام بھیج دیا جاتا ہے یا فون کر دیا جاتا ہے جس نے دوریوں کو جنم دیا ہے۔

دشتِ وفا:

نجیب اور رُخسانہ جو کہ ناول کے نمائندہ کردار ہیں، تمام کہانی اور کردار انہیں کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ نجیب سے پہلے رُخسانہ نجیب کے دوست قاضی کے ساتھ محبت کا دم بھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

رخسانہ مردوں سے اپنے فائدے حاصل کرتی ہے ہمیں ناول میں وہ بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ نجیب نے ملازمت کے ساتھ ہی محبت کا آغاز بھی کیا۔رُخسانہ کے پاس فون کی سہولت میسر نہیں تھی اس لیے وہ ادھر اُدھر سے فون کر کے نجیب سے رابطہ کرتی ہے۔ رُخسانہ نجیب کو اپنے گھر والوں سے متعارف کرواتی ہے۔رُخسانہ کی شادی اُس کا باپ ایک ٹیلی فون آپریٹر سے کرواتا ہے، اُس وقت اس کی عمر تیرہ برس تھی۔اُس کا شوہر اُس کا سہارا بننے کی بجائے اُسے اپنا سہارا بنالیتا ہے اور اُسے پبلک کال آفس بنا دیتا ہے۔ کیونکہ رُخسانہ بہت خوبصورت تھی اور کم عمر ہونے کی وجہ سے سوچے سمجھے بغیر اپنے شوہر کے اشاروں پر چلنے لگی۔فون مواصلات کا بہترین ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم دور دراز بیٹھے ہوئے لوگوں سے فوری طور پر رابطہ کر سکتے ہیں:

"خورشید تو فون پہ ملا ہی نہیں۔جب ملا تو ہوش میں نہیں تھا۔اس نے بتایا کہ رخسانہ بیمار ہے فون پہ بھی نہیں آسکتی۔

"تو کیا وہ لکھ بھی نہیں سکتی۔اس کے خط نہیں آرہے۔"

"نہیں لکھ سکتی بلکہ تمہارے خط بھی نہیں دے رہے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔"(۵۶)

پہلے وقتوں میں لوگ کبوتروں سے پیغامات کی ترسیل کرتے تھے اور اس کے بعد خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جدید ٹیکنالوجی کے آنے سے بہت سے ذرائع سامنے آئے۔ناول میں اس کی مثال نجیب، خورشید اور رخسانہ کا کردار ہیں جو اکثر مقامات پر نجیب کو فون کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ رخسانہ مردوں سے دوستیاں کرتی ہے اور معاشرے کی ایک بگڑی ہوئی عورت کا روپ دھار لیتی ہے جو غلط کو بھی ٹھیک تصور کرتی ہے۔کیونکہ رخسانہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے اور وہ ناول میں بہتر سے بہترین کی تلاش میں ہے جس کی وجہ سے وہ مردوں کو دھوکا دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مشرقی معاشرے میں عورت کو عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن رخسانہ کا کردار بے حیائی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے جو کہ ہماری تہذیب وثقافت کا بہت بڑا بحران ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

وادھو کا کردار ناول میں ایک ہندو کا ہے جو کہ ایک شادی شدہ مرد ہے اور اس کا ہر وقت اپنی بیوی سے جھگڑا رہتا ہے۔کیونکہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہے،ماں اور بیوی اُسے جب بھی حکیم کے پاس چلنے کو کہتے ہیں تو وہ بیوی کو مار کر دُکان پر جا بیٹھتا ہے۔وادھو کو اُس کا دوست پاکستان بننے کی خبر دیتا ہے اور اُسے وہ اپنے

ساتھ حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہاں ریڈیو پر لوگ پاکستان بننے کی خبر سُن رہے ہوتے ہیں اور حیرت سے ریڈیو کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اُن لوگوں میں وادھو بھی شامل تھا۔ پاکستان بننے کی خبر سنتے ہی کئی لوگوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ ہندو خود ہی یہ خبر سن کے یہاں سے چلے جائیں گے اگر نہ گئے تو جوتے کھا کر جائیں گے۔ کئی جرائم پیشہ لوگوں نے تو آج کی رات لوٹ مار کے منصوبے بنانا بھی شروع کر دیئے تھے۔ وادھو کے لیے ریڈیو پر یہ سب ایک نیا تجربہ تھا کہ اتنا دور بیٹھا ہوا شخص کھوکھے میں سے کیسے بول سکتا ہے اُس کا دل کیا کہ وہ اس کھوکھے کے پیچھے جا کر دیکھے کہ کہیں سچ مچ کا کوئی بندہ تو نہیں بیٹھا۔ اُس کے لیے حیران کُن بات تھی کہ ریڈیو جیسے ڈبے میں سے کوئی انسان پورے ملک یا دنیا کے بارے میں جان سکتا ہے :

"وادھو کو یقین اُس وقت ہوا جب اُس کا ایک دوست احمد شاہ دوپہر کے وقت اُسے احمد پور اپنے کسی رشتے دار کے گھر لے گیا جہاں بہت بڑی حویلی میں ایک ریڈیو لگا ہوا تھا۔ کم و بیش چوبیس افراد چار پائیوں پر بیٹھ کر ریڈیو پر خبریں سُن رہے تھے۔ اگرچہ ریڈیو کے چرچے ہر طرف شروع ہو چکے تھے مگر وادھو کے لیے ریڈیو دیکھنا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لاہور میں بیٹھا ہوا کوئی شخص اتنی دور پڑے ہوئے ایک کھوکھے میں سے بول سکتا ہو۔" (۵۷)

مصنف نے گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کی زندگی بیان کی ہے کہ کس طرح ابھی مواصلاتی نظام کی رسائی صرف ریڈیو کی حد تک ہے جو کہ لوگوں کے لیے بالکل انوکھی بات ہے۔ وادھو اپنے دوست کے گھر میں ریڈیو ہی پر پاکستان بننے کی خبر سنتا ہے۔ سب لوگ اسے ایک کھوکھا تصور کرتے ہیں جو ساری دنیا کی خبریں دیتا ہے۔ ریڈیو مواصلات کا بہترین ذریعہ ہے اب تو جیسے جیسے جدید ٹیکنالوجی آتی جا رہی ہے تو مواصلات کے جدید ترین ذرائع سامنے آ رہے ہیں لیکن پہلے وقتوں میں لوگ ریڈیو ہی کے ذریعے خبریں سنتے تھے۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

ناول میں سب رپورٹر بے نظیر کی کراچی آمد اور اس کے جلسے کے بارے میں خبریں بنانے میں مصروف تھے کہ اچانک جاوید کے موبائل پر کال آجاتی ہے جیسے ہی وہ کال سنتا ہے تو آگے ذوالفقار کی آواز ہوتی ہے جو کہ عوامی اخبار کا رپورٹر تھا۔ ذوالفقار بی بی کے قافلے سے کافی دور ایک جگہ چائے پینے بیٹھا تھا جہاں پر اُسے دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ بھاگ کر کچھ دور جانے کے بعد جاوید کو کال ملانے میں کامیاب ہو جاتا ہے ابھی وہ بول ہی رہا ہوتا ہے کہ اُس کے عقب سے ایک اور دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے وہ جاوید کو بتاتا ہے کہ شاید بی بی کے قافلے میں دھماکا ہو گیا ہے اور بہت زور کی آواز آئی ہے۔ ساتھ ہی کسی نے جیمر آن

کر دیئے تھے جس کی وجہ سے قریب موجود کسی بھی رپورٹر کے موبائل فون پر کال نہیں جا پا رہی تھی۔ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ہی کیسے کچھ لمحوں میں انسان کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔ ناول میں بے نظیر کا قتل اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کیسے ایک دھماکے سے بی بی کے ساتھ ساتھ کئی لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔ دھماکے کے فوراً بعد سب اپنے پیاروں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ سب کچھ مواصلات کی وجہ سے ہی ممکن ہے اس بات کا اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

"ایسے میں شاید آخری لحات میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں پر حسرت سے ایک نظر کی تھی کہ یکا یک اس کا موبائل بج اٹھا تھا اور اس نے بے دلی کے ساتھ اسے اٹھایا تھا۔ یہ ذوالفقار تھا، عوامی اخبار کا رپورٹر۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ استاد بہت زور کی آواز آئی ہے۔ شاید بی بی کے قافلے میں دھماکا ہو گیا ہے۔"(۵۸)

اس ناول میں مصنف نے بے نظیر کے قتل کے واقعے کو قلمبند کیا ہے۔ جاوید بھی وہیں موجود ہوتا ہے اور اس کو موبائل پر اطلاع ملتی ہے کہ بے نظیر کو شہید کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی جیمر کو آن کر دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کا اپنے پیاروں سے رابطہ نہیں ہو پاتا اور لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پانی مر رہا ہے:

نازنین کے پڑوسی عرفان صاحب ہیں جو کہ شادی شدہ ہیں اور پیشے کے اعتبار سے انجنیئر ہیں اور واپڈا میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ شاہدہ اُن کی بیوی ہے، شاہدہ کی دوست مدھو عرف زینب عرفان صاحب کو پسند کرتی ہے۔ عرفان صاحب کے گھر عجیب وغریب واقع ہوتا ہے اُن کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد اُن کا گھر ویران ہو جاتا ہے، اسرار اور نازنین رات کے اندھیرے میں اُن کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد نازنین یونیورسٹی جانا چھوڑ دیتی ہے، عرفان صاحب کے گھر گزاری رات اسرار اور نازنین کے حواسوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اسرار دن بھر یونیورسٹی کے لانز میں بیٹھا اُس رات کو یاد کرتا رہتا ہے اور اُسے لگتا ہے کہ وہ سب جھوٹ تھا اور اُسے بار بار نازنین کا خیال آتا ہے کہ آخر اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے جو اُس نے یونیورسٹی آنا چھوڑ دیا ہے اور اُسے کسی سے ملنے کی بھی اجازت نہیں دی جا رہی۔ اسرار کے علاوہ اور بھی بہت سے لڑکے لڑکیوں نے نازنین سے رابطے کی کوشش کی لیکن کسی کو بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اگر کوئی اُس کے گھر فون بھی کرتا تو اُس کی ماں ٹال دیتی۔ اُس رات کے واقعے کے بعد نازنین نے خود کو

ایک کمرے میں بند کر لیا تھا اور اس کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا یہاں تک کہ اپنے بہت قریبی دوستوں سے بھی۔ ناول میں مواصلات کے طور پر موبائل فون کا استعمال ہی سامنے آتا ہے:

> "اس دن کے بعد نازنین کبھی یونیورسٹی نہیں آئی۔ اسرار نے جب بھی فون کیا اس کی ماما نے اٹھایا اور ہر بار بہت رکھائی سے جواب دیا کہ نازنین سو رہی ہے۔ "آخر کوئی کتنا سو سکتا ہے؟" اسرار نے سوچا اس کے کندھے پہ جہاں نازنین نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے دانت گڑوئے تھے، تین نشان بن گئے تھے۔ اوپر دو گہرے اور نیچے ایک ذرا ہلکا نشان۔" (۵۹)

ناول کے مرکزی کردار نازنین اور اسرار ہیں جو ایک رات عرفان صاحب کے گھر گزارتے ہیں۔ جہاں سے واپسی پر نازنین گھر میں بند ہو جاتی ہے اس کے تمام دوست فون پر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس کی ماں ہر ایک کو کہتی ہے کہ وہ سو رہی ہے۔ اسرار کے پاس بھی ایک ہی مواصلاتی ذریعہ ہے نازنین سے بات کرنے کا مگر اسے بھی کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔

گلِ مینہ:

شفیق کا کردار ناول میں ایک پینٹر کا ہے، جس کو طالبان اس کی اچھی کاریگری کی وجہ سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ مدرسے میں اُسے دیواروں پر جنت کے مناظر بنانے کا کہا جاتا ہے۔ جس دن شفیق کو طالبان اُٹھا کر لے جاتے ہیں اُس کو اپنے بیٹے کا خیال آتا ہے جو کہ صبح اسکول جاتے وقت اُس سے پیسوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو کہہ دیتا ہے کہ شام کو لے لینا، وہ چھ سو روپے موجود ہونے کے بعد بھی اُسے پیسے نہیں دیتا۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی بیوی نے پیسے دے کر موبائل میں بیلنس ڈلوا لیا ہو گا اور اُسے بار بار فون کر رہی ہو گی۔ اُسے موبائل کا خیال آتا ہے جو سفید کار والوں نے اُس کی جیب سے نکال لیا تھا۔ اُسے اپنے گھر والوں کی تکلیف کا سوچ سوچ کر بے بسی اور مجبوری محسوس ہوتی ہے اور اُس کے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ بھی موجود نہیں ہے:

> "شفیق نے اپنے بیٹے ارسلان کا نمبر لکھوا دیا۔ اسے اپنی بیوی عائشہ اور بیٹی شائستہ کا خیال آیا۔ نہ معلوم اسے لاپتہ ہوئے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ اغوا کی رات جب وہ وقت پر گھر نہیں پہنچا ہو گا تو شاید ارسلان نے اسے فون کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ لیکن اس کے پاس دو دن سے فون بیلنس ختم تھا۔" (۶۰)

گل مینہ میں شفیق کا کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب طالبان اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اس سے موبائل چھین لیتے ہیں۔اس کو رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس کے گھر والے اس سے رابطے کی کوشش کر رہے ہوں گے اور پریشان ہو رہے ہوں گے۔ شفیق کو موبائل نہ ہونے کا احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اگر سفید کار والے اُس سے موبائل نہ لیتے تو وہ دھماکے سے قبل پولیس کو آگاہ کر کے بہت سے لوگوں کی جان بچا سکتا تھا اور اپنے گھر والوں کو بھی اطلاع دے سکتا تھا۔

گراں:

غزل جان ناول کا نمائندہ کردار ہے جس کے گرد تمام کہانی گھومتی ہے۔ گاؤں کے رواج کے مطابق اُس کی شادی کزن سے کر دی جاتی ہے۔وہ باہر ملک آنے کے بعد سوچتی ہے کہ کیا وطن میں اب بھی وہ دوستیاں برقرار ہوں گی،اُسے پوٹھوہار کے دوستالے اور سہلیاں یاد آتی ہیں۔ وہ سوچتی ہے کہ دوستیوں اور ہمسائیگی کے کتنے گہرے رشتے وطن میں موجود ہوں گے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی اقدار اور روایات بدل رہی ہیں۔ کیا پتہ ان کا اثر اِن دوستیوں پر بھی پڑا ہو،اپنے دیس سے دور ہونے کے بعد ان تمام چیزوں کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔جو کہ غزل جان کو بھی ہے اور وہ تمام جدید ذرائع کے بارے میں بھی سوچتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے ان رشتوں سے منسلک رہ سکے۔ جس کی عکاسی اِس اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے:

> "اب جب کہ نئی دوستیاں نئے گلوبل ویلج نئے انداز، نئی مشینیں استوار کر رہی ہیں۔ تعلقات کے نئے نئے ذرائع ایجاد ہو رہے ہیں۔ کیا تعلقات کی نوعیت اور جذبات کی تفسیر نئے زمانے کے جدید مواصلاتی ذرائع نئے انداز سے ترتیب دیں گے۔ دوپٹہ بدل پگڑی بدل، شہ بالوں، سہیلیوں اور دوستالوں کی جگہ فیس بک،ای میل کی فاصلاتی دوستیاں لے لیں گی۔ ان ٹوٹ رشتے جو نسل در نسل موروثی جائیداد کی طرح ساتھ چلتے اور آبائی گھروں اور قبرستانوں کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔" (۶۱)

اس ناول میں غزل کے کردار کو نئی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ اپنے ماضی سے جڑا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ایک ایسا شخص جو سہولتوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اپنے وطن اور پیاروں سے دور ہونے کی وجہ سے پرانے وقتوں کو یاد کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غزل جان سوچتی ہے کہ کیا تعلقات کے لیے نئے نئے ذرائع ایجاد ہونے سے کیا پرانی دوستیوں پر ان چیزوں کا اثر پڑے گا، کیا ڈوپٹہ بدل، پگڑی بدل،شہ بالوں، سہیلیوں اور دو

ستالوں کی جگہ فیس بک، ای میل کی فاصلاتی دوستیاں لے لیں گی۔ کیونکہ کبھی نہ ختم ہونے والے رشتے آبائی گھروں اور قبرستانوں کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔

ب۔ ترقیاتی کام:

پہلے وقتوں میں ترقیاتی کاموں کی ذمہ داری گاؤں کے سرپنچ کی ہوتی تھی جو لوگوں کے مسائل سنتا اور اُن کو حل کرتا تھا لیکن جیسے جیسے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال عام ہوتا گیا ہر سطح پر بہتری کے آثار نمودار ہوتے گئے۔ اب کے دور میں ترقیاتی کاموں کی طرف توجہ حکومت میں موجود لوگ دیتے ہیں ہر علاقے کا اپنا ممبر ہوتا ہے جسے لوگ اپنے ووٹوں کے ذریعے چنتے ہیں وہی علاقے میں موجود لوگوں کے مسائل سنتا اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ ان مسائل پر زیادہ توجہ ووٹ لینے سے پہلے ہی دی جاتی ہے کیونکہ حکومت میں آنے کے لیے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان دنوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ لوگوں کے مسائل کو زیادہ سے زیادہ حل کیا جائے اور اپنے ووٹوں کو پکا بنایا جاسکے۔

ترقیاتی کاموں کے لیے سرمایہ کے ساتھ ساتھ حکومت کی صلاحیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے موجودہ دور میں جو ملکی حالات جا رہے ہیں اس میں سرمائے کی قلت ہے مزید حکومت اپنے مسائل میں پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ صلاحیت موجود نہیں ہے جس کو بروئے کار لا کر ترقیاتی کاموں کو تیز کیا جاسکے۔ حکومت سیاسی سوچ سے آگے نہیں جا رہی جس کی وجہ سے ترقیاتی کام صحیح سمت نہیں جا پا رہے اور نہ ان میں بہتری آرہی ہے۔ بحران کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں سرمایہ کی ضرورت ہے جس کے لیے ہمیں I.M.F کے پاس جانا پڑتا ہے اور وہ ادارہ ہمیں پابند کر دیتا ہے جبکہ ہماری ترقیاتی کاموں کے لیے ہمارے ملک کی ترجیحات اور ہیں جس کی وجہ سے بحران کی صورتحال درپیش ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

دھنی بخش جو کہ ناول میں تین بیٹوں کا باپ دکھایا گیا ہے اور اس کا گھرانہ گاؤں میں کافی اثر و رسوخ رکھتا ہے لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے اس کے پاس آتے ہیں۔ دھنی بخش کے گھرانے نے گاؤں کی بہتری کے لیے بہت سے کام کیے تھے۔ مسجد بھی دھنی بخش نے ہی بنوائی تھی، لیکن بجلی لگوانے سے پہلے ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے یہاں ایک کچی مسجد تھی، نئی مسجد کے لیے لوگوں نے دھنی بخش کو بہت سمجھایا کہ بجلی آجانے سے لاؤڈ (اسپیکر) لگ جائے گا جس سے اذان کی آواز دور دور تک جایا کرے گی اور اس کا

تمھیں ثواب ملے گا۔ مسجد میں بورنگ کا پانی بھی تھا جس کو موٹر کی مدد سے ٹونٹیوں تک پہنچایا جاتا جس سے نمازی وضو کرتے تھے۔ دھنی بخش کے گھرانے کا گاؤں میں اثرورسوخ ہونے کی وجہ سے وہاں کے لوگ اس کی کافی عزت کرتے ہیں:

"مسجد دھنی بخش کی بنوائی ہوئی تھی اور اتنی بڑی تھی کہ اندر چالیس نمازی سما سکتے تھے، دو دروازوں کی جگھوں پر چار بڑے یا آٹھ بچّے، دالان میں چالیس اور اُتنوں ہی کی گنجایش صحن میں تھی۔ پانی "بورنگ" کا تھا جو امام صاحب نل چلا کر یا بچوں سے چلوا کر ٹنکی میں بھر دیتے تھے۔ وہاں سے نلکا نکلتا تھا جس کے سامنے ٹرنچ تھے اور اس کے اوپر ایک قطار میں پانی کی ٹونٹیاں جن پر بیٹھے لوگ وضو بنایا کرتے تھے۔"(۶۲)

دھنی بخش کا دوسرا بیٹا جس کا نام احمد بخش تھا اور جو اپنے چھوٹے بھائی کے مقابلے میں کافی سمجھدار بھی تھا۔ اس نے شہر میں رہ کر اپنی پڑھائی مکمل کی اور اس کے بعد وہ وہاں سے باہر کے ملک چلا گیا۔ باہر کے ملک جا کر اُسے اپنے گاؤں کے حالات کا زیادہ احساس ہوا اُس نے وہاں کی ترقی سے اپنے گاؤں کا موازنہ کیا جہاں بنیادی تعلیم بھی موجود نہ تھی اُس نے اپنے بھائی کو خط لکھا کہ اپنے ملک اور علاقے کے لیے کچھ کام کرنا چاہتا ہوں میرے حصّے کی رقم گاؤں کے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرو۔ وہاں پر کتنے ہی بچے، بچیاں ہیں جو ہونہار ہیں اگر ان کی تعلیم کا خرچہ اُٹھائیں تو وہ معاشرے کے معزز فرد بن جائیں گے اور وطن واپسی پر اُن سے اپنے پروگرام میں حصّہ لے سکوں گا۔ احمد بخش کو اس بات کا احساس تھا کہ اُس کے گاؤں کے بچوں کو تعلیم دلوانا ان کا فرض ہے کیونکہ گاؤں میں اُن کا گھرانہ معزز سمجھا جاتا تھا:

"احمد بخش نے کہا، "وہاں جی نہیں لگتا تھا۔ اپنے وطن میں مشنری کا کام کرنے آیا تھا کہ تھوڑا غریبوں کی حالت سدھارنے کا کام کروں گا۔ اس میں میری بیوی بچّے بھی شریک ہوں گے لڑکے لڑکیوں کو تعلیم دینا، ان کے علاج معالجے میں شرکت کرنا، ضرورت مندوں کو اسپتال لے جانا، لوگوں کو صحت کے اصول سمجھانے، کوڑا، نالیاں، مچھر، مکھیاں ان سے نمٹنا۔ کرنے کے ایک ہزار کام ہیں جن کے لیے نہ پیسے والوں کے پاس ٹائم ہے نہ الیکشن جیتنے والوں کے۔"(۶۳)

دھنی بخش کے بیٹے گاؤں کے ترقیاتی کاموں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گاؤں کے معزز لوگ اپنے گاؤں کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ دھنی بخشی مسجد بنواتا ہے اس کا بیٹا احمد بخش ملک سے باہر رہتا ہے وہ وہاں کی ترقی دیکھ کر اپنے گاؤں میں بھی سکول بنوانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے حصے کی جائیداد گاؤں کے بچوں کی تعلیم

پر خرچ کرنے کا اپنے بھائی سے کہتا ہے۔ تاکہ بچے معاشرے کے معزز فرد بن سکیں وطن واپسی پر بھی وہ سب کو بتاتا ہے کہ اس کے بیوی بچے بھی اس کے ساتھ مل کر فلاحی و ترقیاتی کام کریں گے۔

نو لکھی کوٹھی:

ناول نو لکھی کوٹھی میں ترقیاتی کام کی صورتحال کی نوعیت کا اندازہ شاہ پور گاؤں سے لگایا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ولیم نے جو بطور افسر وہاں پر کام کیے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پر ترقیاتی کاموں کی نوعیت کس قسم کی تھی۔ ولیم کے ترقیاتی کاموں کی وجہ سے شاہ پور گاؤں ارد گرد کے گاؤں سے زیادہ خوشحال تھا۔ پرائمری درجے کا ایک سکول بھی تھا جس کی بیرونی دیوار سے ہی انگریزی وقار جھلکتا تھا۔ مولویوں کی مہربانی سے بچوں کی تعداد بیس سے نہ بڑھ سکی، اور وہ بچے بھی چوہڑیوں اور کراڑوں کے تھے۔ شاہ پور میں کئی مکان پکے تھے، شیر حیدر اپنے گاؤں کو ماڈل گاؤں بنانا چاہتا تھا تاکہ چودھریوں پر اس کی دھاک بیٹھی رہے۔ شاہ پور گاؤں میں ترقیاتی کام کی نوعیت کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

> "الغرض جودھا پور کی نسبت شاہ پور ایک خوشحال گاؤں تھا۔ لوگوں کے پاس مال مویشی بے انت تھا۔ شیر حیدر جب تک زندہ رہا، اس کی ساری توجہ اپنے آبائی گاؤں شاہ پور پر رہی۔ اُس نے خصوصی ہدایت کی تھی کہ گاؤں صاف ستھرا اور کوڑا کرکٹ سے پاک رہنا چاہیے جس پر پورا عمل کیا گیا۔ وہ اُسے ایک ماڈل گاؤں بنانا چاہتا تھا تاکہ آس پاس کے چوہدریوں پر اُس کی مزید دھاک بیٹھ جائے۔"(۶۴)

ولیم شاہ پور گاؤں کو دوسرے گاؤں کی نسبت ترقی کی طرف گامزن دیکھنا چاہتا ہے جس میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ انگریزی طرز کا ایک پرائمری سکول بناتا ہے۔ شیر حیدر نے اپنی زندگی میں گاؤں کی صفائی کا بھی بہت خیال رکھا اور اپنے گاؤں کو ماڈل گاؤں بنایا۔ ولیم کی نو لکھی کوٹھی بھی طرز تعمیر کا شاہکار تھی۔ ولیم جب جلال آباد آیا تو وہاں درخت نہ ہونے کے برابر تھے البتہ جڑی بوٹیوں اور عک کے پودوں کی بہتات تھی جو اُس کی طبیعت پر اچھا اثر نہیں ڈال رہے تھے۔ اُس کے ماتحت آفیسر اس کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے اور یہ سلسلہ ایک گھنٹہ جاری رہا ایک جگہ رہٹ چل رہا تھا تو ولیم نے اپنے ماتحتوں سے کہا جو کچھ میں دیکھ اور سوچ رہا ہوں آپ لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ ہم اس ہیڈ کی گیج کو بڑھا کر دُگنا کر دیں گے اور مزید تین در کھول دیں گے۔ اُسی طرح اس نہر کا پاٹ بھی دُگنا کر دیں گے اور نہر کا رُخ روہی کے زیریں علاقے کی طرف موڑ دیں گے اور وہ پانی ہم جلال آباد کی تحصیل سے لیں گے۔ جلال آباد میں ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ

وہ اپنے گھروں کے صحنوں، بازاروں اور جلال آباد کے مضافات میں شہتوت کے پودے لگائیں اس سے ریشم کا کیڑا حاصل ہو گا اور ریشم کا کاروبار چلے گا۔ پانی کی وجہ سے فصلوں کی کاشت بہتر ہونے لگی۔ ایک نئی نہر اور کئی چھوٹے چھوٹے رجواہے جاری کر دیئے گئے۔ ولیم جو کہ ناول کا ہیرو ہے جب اس کی تعنیاتی جلال آباد میں ہوئی تو اس نے وہاں کی صورتحال کا جائزہ لیا:

"جب ولیم نے جلال آباد میں قدم رکھے تھے اور آج اُسکی تعیناتی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اُس نے جلال آباد تحصیل میں کئی قدم اُٹھائے۔ تعلیم کا معیار پنجاب کی تمام تحصیلوں سے آگے نکل چکا تھا۔ اِسی طرح ایک نئی نہر اور دوسرے کئی چھوٹے چھوٹے رجواہے جاری کر دیے۔ جن کی وجہ سے تحصیل کے ہر گوشے میں پانی کی بہتات ہو گئی۔ گندم، چاول اور مکئی کی فصلیں کثرت سے پیدا ہونے لگیں اور لوگوں کے چہروں پر ایک قسم کی خوشحالی آنے لگی۔"(۶۵)

ولیم نے جلال آباد کی ترقی کے لیے بھی بہت سے اقدامات کیے، تعلیم کا معیار بہتر کیا۔ نہر اور رجواہے جاری کیے جس سے زرعی طور پر ترقی ہوئی۔

ناتمام:

صائمہ ناول کا مرکزی کردار ہے، اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے وہ مختلف لڑکوں سے دوستی کرتی ہے اور تمام حدیں پار کر جاتی ہے۔ ابارشن کے لیے اپنی ایک دوست کے ساتھ کلینک جاتی ہے تو نرس اس کو تسلی دیتی ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا بس وہ اُس پر یقین رکھے۔ وہ صائمہ کو بتاتی ہے کہ ہمارے کونسلر صاحب عوام کی خدمت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ انہوں نے گلیاں بنانے کے ساتھ اور بھی بہت سے ترقیاتی کاموں کا وعدہ کر رکھا ہے وہ گورنمنٹ کے فنڈز سے ترقیاتی کام کریں گے۔ محلے کے لوگوں کی مدد کرنا ہی اُن کا مقصد ہے وہ سیاست میں آئے ہی بہتری کے کام کرنے کے لیے ہیں۔ یہ تمام کام کرنے کے بعد وہ یہاں کے لوگوں اور غریبوں کی دعا ہی لیں گے اور اُن کا اِس سے ہٹ کے مقصد بھی کیا ہے۔ کیونکہ جب کوئی سیاست میں آتا ہے تو اس کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی بہتری کے لیے کام کرے۔ ایسے ہی کچھ وعدے اس علاقے کے کونسلر نے بھی لوگوں سے کر رکھے ہیں تاکہ وہ آگے کے لیے بھی اپنے ووٹ پکے کر سکیں اس بات کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

"کہتے تھے کلینک میں اے سی لگوا دیں گے۔ دیکھو، مرضی کے مالک ہیں۔ وعدے تو بڑے بڑے کرتے ہیں۔ گلی بنا دیں گے، مسجد پکی کرا دیں گے۔ فنڈ لیتے ہوں گے گورنمنٹ سے۔

ہمارے بھی دو چار کام کرا دیں گے تو دعا ہی لیں گے۔ یہاں آتے رہتے ہیں۔"(٦٦)

اس اقتباس میں مصنف نے سیاستدانوں کی اصلیت دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ وعدے تو بہت کرتے ہیں مگر ان کو پورا کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ کونسلر صاحب بھی سیاستدانوں کی طرح سبز باغ ہی دکھاتے ہیں کہ کلینک میں اے سی لگوا دیں گے، گلی بنوا دیں گے، مسجد پکی کرا دیں گے، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ترقیاتی کام کرنا سیاستدانوں کا فرض ہے۔ مگر وہ الیکشن سے پہلے ہی نظر آتے ہیں اور جو وعدے انھوں نے کیے ہوتے ہیں بعد میں وہ اُدھورے رہ جاتے ہیں۔

میر واہ کی راتیں:

نذیر ناول میں بگڑے ہوئے ہیرو کے روپ میں سامنے آتا ہے اور اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کا باپ اسے اپنے بھائی کے پاس بھیج دیتا ہے تاکہ وہ کچھ سیکھ سکے۔ نذیر چاچے کے پاس جا کر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ نذیر کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جاتے ہوئے جو سفر اختیار کرتا ہے اس سے بخوبی ترقیاتی کاموں کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قاری کو ریلوے اسٹیشن اور وہاں موجود ہوٹل، عمارتوں کی صورتحال کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ گاؤں کے مقابلے میں شہروں میں ترقیاتی کاموں پر توجہ زیادہ دی جاتی ہے۔ پڈعیدن پہنچ کر کام ختم کرنے کے بعد وہ ٹرین کا انتظار کرنے لگا پڈعیدن شہر ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے مخالف سمت میں واقع تھا وہ پیدل چلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ پڈعیدن اسٹیشن ایک جنکشن تھا، جہاں سے کبھی چھوٹے قصّبوں کی طرف ریل جایا کرتی تھی۔ مگر بہت عرصے سے محکمہ ریلوے نے کوئی ترقیاتی کام نہ ہونے کی وجہ سے ٹرینوں کی آمدورفت کو منسوخ کر دیا تھا۔ اسٹیشن کا پھیلاؤ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ اس اقتباس سے اس شہر کی صورتحال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پر ترقیاتی کاموں کی صورتحال کیسی ہے۔ کیونکہ کسی بھی چیز کے بارے میں آگاہی وہاں پر بسنے والے لوگوں اور اردگرد کے ماحول سے ہی لگا سکتے ہیں:

"پڈعیدن ریلوے اسٹیشن ایک جنکشن تھا، جہاں سے برسوں پہلے نوشہرہ فیروز، ٹھارو شاہ، کنڈیارو اور دیگر چھوٹے قصبوں کی طرف ریل جایا کرتی تھی، مگر اب بہت عرصے سے محکمہ ریلوے نے اس راستے پر جانے والی ٹرینوں کو منسوخ کر دیا تھا؛ اب یہاں سے صرف مین لائن ٹرینیں ہی گزرتی تھیں۔ لیکن پڈعیدن ریلوے اسٹیشن کا پھیلاؤ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا اور اب بھی اس کے نام کے ساتھ بہت سے اسٹیشنوں کی طرح جنکشن کا دم چھلا لگا ہوا تھا۔"(٦٧)

مصنف ناول کے مرکزی کردار نذیر کے ذریعے ہمیں ترقیاتی کام دکھاتا ہے۔ نذیر اپنے چاچے کے پاس جاتے ہوئے جو راستہ اختیار کرتا ہے وہاں اسے پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کی نسبت شہروں میں زیادہ ترقیاتی کام ہوئے ہیں۔ دیکھا جائے تو اگر گاؤں میں کوئی بھی معزز شخص جس کو گاؤں کی ترقی سے دلچسپی ہو وہ چاہے تو گاؤں میں ترقیاتی کام ہوتے ہیں۔

کوہِ گراں:

چودھری حلیم کا گھرانہ گاؤں میں اپنا اثر ور سوخ رکھتا ہے۔ گاؤں کی خوشحالی و بحالی کے بارے میں یہی گھرانہ باقاعدہ حکمت عملی اختیار کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے جب حلیم واپس آتا ہے تو وہاں موجود سبھی لوگ اس سے امید رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گاؤں اجڑنے کے بعد سب لوگوں نے اپنی ضرورت کے پیش نظر یہاں سے دوسری جگہوں پر نقل مکانی شروع کر دی۔ حلیم کا گھرانہ تمام غریب گھروں میں گندم تقسیم کرتا تھا۔ کمی کمینوں کی عورتیں ان کے گھر اور باہر کے کام کرتیں کیونکہ ان کے گھر کی عورتیں باہر نہیں جاتی تھیں۔ حلیم نے رات میں کنواں صاف کروانے کا کہا تاکہ کنواں استعمال میں آسکے، حلیم کا باپ بھی پورے گاؤں کی خوشحالی و بہتری کے لیے کام کرتا تھا۔ اب چودھری حلیم گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے اہم فیصلے لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ گاؤں اجڑنے سے پہلے وہاں کی صورتحال کچھ اس طرح تھی:

> "دِتا سر جھکائے اُٹھ کر چلا گیا۔ اگلے دن سے اُس کی بیوی حیاتاں تمھارے گھر میں صفائی اور گندگی اُٹھانے لگی۔ بڑے چودھری نے تمھارے پھوپھا کو کہا کہ وہ بابے ہٹی والے سے گندم تلوا کر ضرورت کے مطابق سارے گھروں میں بھیج دے۔"[۶۸]

حلیم جب گاؤں میں واپس آتا ہے تو وہاں صرف تین لوگ موجود ہوتے ہیں، جو کہ گاؤں اجڑنے کے بعد بھی وہاں سے نہیں گئے تھے۔ گاؤں کو دوبارہ سے آباد کرنے پر حلیم کے سامنے ایک اور حل طلب مسئلہ کھڑا ہو گیا، اُسے لگا کہ یہ مسائل پہلے حل کرنا ہوں گے۔ گاؤں کی آبادکاری کے لیے حلیم کے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ تو نہیں تھا لیکن وہ یہ ارادہ کر رہا تھا کہ گاؤں کی زمین پر فصل اُگانی ہے اور پینے کے صاف پانی کا بندوبست کرنا ہے۔ پاس موجود پانی کو تقسیم کر کے ایک کو اُبال کر پینے کے لیے رکھ لیا جائے گا اور دوسرے حصّے کا پانی نہانے اور ذاتی صفائی کے کام آئے گا جس کے لیے انہیں پانی کو ذخیرہ کرنا ہو گا۔ اُس نے گاؤں سے نکل کر مشرق کی طرف جانے والی سڑک پر چلنا شروع کر دیا اور اُسے یاد آیا کہ نہر کے دونوں طرف سفیدے اور ٹاہلی کے درخت ہوا کرتے تھے جو کہ گاؤں میں ایک اچھا نظارہ پیش کرتے تھے لیکن جب پانی ہی نہ رہا تو

درختوں کا وجود کیسے رہتا۔ اُسے گاؤں میں ایک کنواں نظر آیا اور اُس نے کنوئیں کی صفائی کا حکم دیا۔ کنوئیں کی صفائی کروانا ترقیاتی کام کی طرف پہلا قدم تھا۔ گاؤں کے اجڑنے کے بعد وہاں کی صورتحال کی اس اقتباس سے عمدہ عکاسی ہوتی ہے:

"یہاں سے ہیڈ مرالہ تک نہر کے دونوں طرف سفیدے اور ٹاہلی کے درخت ہوا کرتے تھے۔ درخت زیادہ خوبصورت نظارہ نہیں تھے لیکن تم جانتے ہو کہ درخت ہمیشہ ایک خوب صورتی کا احساس دلاتے ہیں۔ میرے خیال میں جب پانی ہی نہ رہا تو درخت کس کام کے؟ اُس جنگ میں جس کا آغاز مولویوں نے کیا تھا، درختوں نے بھی قربان ہونا تھا۔ کہیں بھی درخت نہیں رہے۔ دیکھو کہ جڑیں بھی نکال لی گئی ہیں۔"(۶۹)

حلیم گاؤں کے اُجڑنے کے بعد اس کی دوبارہ بحالی کے لیے واپس آتا ہے اس کے پاس کوئی باقاعدہ منصوبہ تو نہیں ہوتا لیکن وہ ترقی اور بحالی کا خواہ ہے ۔ پانی کی کمیابی کی وجہ سے لوگ گاؤں سے نقل مکانی کر جاتے ہیں اور آخر میں ڈائنامائٹ کی مدد سے نہر کا بند تڑوا دیتا ہے جس کی وجہ سے ہر طرف پانی پانی ہو جاتا ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

ناول ادھ ادھورے لوگ میں نواب صاحب نے اپنی ریاست بہاول پور کی بحالی کے لیے بہت سے کام کیے۔ نواب صاحب کی وجہ سے ریاست بہاول پور کا امن پورے علاقے میں مشہور تھا کسی نے بھی ریاست پر حملہ نہ کیا کیونکہ نواب صاحب مزاجاً حملہ آوری کو پسند نہیں کرتے تھے ۔نواب نے پوری ریاست میں کالج، اسکول اور ہسپتال بنائے، میونسپلٹی کا ہرکارہ اپنے کندھے پر سیڑھی رکھے اور ہاتھ میں تیل کا ٹین اُٹھائے گلی محلوں سے گزرتا اور سیڑھی کی مدد سے لالٹینوں کے شیشے صاف کرنے کے بعد اُن میں مٹی کا تیل بھر کر انھیں روشن کر دیتا۔ تاکہ اندھیرا ہونے کے بعد بھی اندھیرا نہ ہو اور فجر کی اذان سے پہلے انھیں بند کرنا بھی اُن کی ذمہ داری تھی۔ نواب صاحب نے پوری ریاست کی بہتری کے لیے بہت کام کیا، اس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس ریاست کی صورتحال کس طرح کی تھی:

"اُنھوں نے پوری ریاست میں اسکول، کالج اور ہسپتال بنوائے۔ ہر شہر کا اپنا پاور ہاؤس لہذا بجلی وافر اور نہری نظام پر کڑے کنٹرول کے سبب زراعت فراواں اور منڈیاں اجناس سے بھری ہوئیں۔ ناں کوئی چوری چکاری اور نہ ہی کوئی قتل یا ڈاکہ۔ سنتے تھے کہ پُلس کے ہتھیاروں کو بار بار زنگ لگ جایا کرتا تھا جسے ہر بار رگڑ رگڑ کر اُتارا جاتا۔"(۷۰)

نواب صاحب ریاست بہاولپور کی ترقی کے خواہاں تھے انہوں نے تعلیم کے شعبے میں بہت کام کروائے اور سکول کالج بنوائے۔ صحت کی بحالی کے لیے ہسپتال بنوائے۔ ریاست میں بجلی وافر مقدار میں موجود تھی جو کہ پاور ہاؤس کی بدولت تھی، زراعت کے شعبے میں بھی بہت ترقی ہوئی۔

پانی مر رہا ہے:

آمنہ مفتی کے ناول " پانی مر رہا ہے " میں اسرار کی طبیعت خراب ہونے پر اس کو گاؤں میں موجود ایک اسپتال میں لے کر جاتے ہیں، جہاں پر موجود ڈاکٹر اور اسپتال کی صورتحال کچھ اس نوعیت کی ہوتی ہے۔ڈسٹرکٹ اسپتال کی حالت اتنی خراب ہے کہ مریض بے چارہ وہاں پر لگے عجیب ہیئت کے بلبوں اور دیگر آلات سے اتنا دہشت زدہ ہو جاتا ہے، جیسے بڑے بڑے سیاستدان اور صحافی شاہی قلعے کے ٹارچر سیل کو دیکھ کر ہوتے تھے۔ یہ سب دیکھ کر مریض اپنے آپ کو صحت مند سمجھنے لگتا ہے اور ایک ہی دوا سے بھلا چنگا ہو جاتا ہے اور مذبح خانے میں جانے سے توبہ کر لیتا ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب جمعداروں کے ساتھ مل کر پوسٹ مارٹم بھی یہاں ہی کرتے تھے ڈاکٹر کا حلیہ بھی عجیب سا تھا، ہسپتال میں اُس کے بیوی بچے بھی رہتے تھے۔ پورسٹ مارٹم کے کمرے میں بکریاں بندھی ہوئی تھیں، پوسٹ مارٹم بھی یہاں ہی ہوتا تھا۔ شہروں کے مقابلے میں دیہات میں صحت کی سہولیات بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں کیونکہ وہاں پر ترقیاتی سطح پر کام بہت کم ہوتا ہے تو لوگ زیادہ تر علاج معالجے کے لیے شہروں کا رُخ کرتے ہیں تاکہ وہاں پر ان کو علاج کی بہتر سہولیات مل جائیں۔ اس اقتباس سے گاؤں میں ترقیاتی کاموں کی صورتحال کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے:

> "ڈسٹرکٹ اسپتال کے برآمدے میں نیم گنجے ڈاکٹر صاحب دھوتی پہ بنیان پہنے ایک جھلنگا سی کھاٹ پہ آرام فرما رہے تھے۔ ان کا سرکاری کوارٹر پچھلے ساون میں ڈھے گیا تھا اور اب ان کی بیوی بچے اسپتال کے جنرل وارڈ میں رہتے تھے۔ نرسیں ان کی بیوی کے ساتھ مل کر کدو اور کریلے چھیلتیں اور سویٹروں میں نمونے ڈالا کرتی تھیں۔ قسمت کا مارا مریض جو یہاں آتا اسے آپریشن تھیٹر میں لٹا کر معائنہ کیا جاتا۔"[۷۱]

اسرار کے گاؤں میں ہسپتال کی حالت انتہائی مخدوش ہے، کوئی بھی ترقیاتی کام ہوتا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹروں کو بھی ہسپتال کی اس حالت سے کوئی غرض نہیں۔ ہسپتال میں انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ رہائش رکھی ہوئی ہے۔ دیہات میں لوگوں کو بیمار ہونے پر شہروں کا رُخ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہسپتال میں علاج کے آلات بھی نہیں ہیں۔

گُل مینہ:

گُل مینہ اور زر جان ناول کے مرکزی کردار ہیں جو رسم و رواج سے بغاوت کر کے گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے علاقے سے بہت دور آجاتے ہیں تاکہ ایک نئی زندگی گزار سکیں۔ گُل مینہ کا تعلق ایک قبائلی علاقے سے ہے اور وہاں پر سرداروں اور طالبان کی حکومت تھی۔ سرداروں کے دور میں وہاں پر انھوں نے جگہ جگہ پر راستے بند کئے ہوئے تھے۔ گُل مینہ زر جان کو بتاتی ہے کہ میری مائی نے بتایا تھا کہ طالبان بڑے ظالم ہیں۔ لوگوں کو مارتے ہیں اور جو عورت پردے کے بغیر نظر آئے اُس کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ زر جان گُل مینہ سے کہتا ہے کہ تمہیں کس چیز کا ڈر ہے تم تو پردہ کرتی ہو اور طالبان نے کئی اچھے کام بھی کیے ہیں۔ سڑکیں کھول دی ہیں جس کا لوگوں کو یہ فائدہ ہو گا کہ چیزیں سستی ہو جائیں گی۔ اور زنجیریں ہٹا دیں ہیں جس کی وجہ سے ہر جگہ جو محصول دینا پڑتا تھا وہ اب نہیں دینا پڑے گا۔ اور اس کے علاوہ مہینے کے مہینے بھتہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔ سڑکیں کھلنے سے کرایہ بھی کم لگے گا۔ طالبان کے آنے کی خبر کے ساتھ ہی وہاں پر لوگوں کی سوچ میں تبدیلی کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> "سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ سڑکیں کھول دی ہیں۔ سرداروں کے غنڈوں نے سڑک پر جگہ جگہ زنجیریں باندھی ہوئی تھیں۔ یاد ہے قندھار کے راستے میں دو جگہ زنجیریں لگی ہوئی تھیں، پچھلے مہینے تو ان میں بھی ایک اور زنجیر کا اضافہ ہو گیا تھا، اور ہر جگہ ان حرامیوں کو محصول دینا پڑتا تھا۔ طالبان نے آتے ہی ان سب غنڈوں کو بھگا دیا ہے۔ سڑکیں کھلنے سے کرایہ بھی کم ہو جائے گا اور ساتھ ہی چیزیں بھی سستی ہو جائیں گی، کیوں کہ دکانداروں کو سامان پر ہر جگہ محصول کے علاوہ مہینے کے مہینے بھتہ بھی دینا پڑتا تھا۔ پھر ڈیزل کی آئے دن کی قلت بھی دور ہو جائے گی جس سے گاڑی تین تین دن رکی رہتی تھی۔"(۷۲)

زر جان پہاڑوں پر مسافروں کو لے جانے کے لیے ایک وین چلاتا تھا۔ گُل مینہ کے دادا کی ملاقات بھی اس سے ایک سفر کے دوران ہی ہوئی تھی۔ اور دادا جان کو زر جان پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ دادا جان کے زر جان کے ساتھ ایک سفر سے اس علاقے میں ترقیاتی کام کی نوعیت کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ جیپ گاؤں سے نکل کر پہاڑ پر چڑھ رہی تھی موڑ اِس قدر بے ڈھنگا تھا کہ جیپ کو تھوڑا آگے جانے کے بعد واپس ہونا پڑتا تھا۔ کلینر پچھلے پہیوں کے نیچے پتھر رکھتا جاتا تھا، پھر کہیں جا کر جیپ مڑ پاتی تھی۔ سڑک بھی جگہ جگہ سے کٹی پھٹی ہوئی تھی۔ جہاں سے کسی گاڑی کا گزرنا ناممکن ہی نظر آتا تھا لیکن ڈرائیور کسی نہ کسی طرح وہاں سے گاڑی

گزار لیتا تھا اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کسی بھی حکومت نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ ناول کے اس اقتباس سے اس بات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے:

"او تیرا بیڑا غرق، خانہ خراب، کام چور ٹھیکیدار نے پیسے پورے لے لیے اور سڑک کی یہ حالت ہے کہ اس پر گاڑی تو کیا، گدھا بھی نہیں چل سکتا'۔ دادا کا سر تیسری بار جیپ کی چھت سے ٹکرایا تھا۔ وہ تو خیر گزری کہ ان کے سر پر تلے والا مضبوط کلہ تھا، ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔"(۴۳)

زیرِ نظر اقتباس میں قبائلی علاقوں میں ترقیاتی کاموں کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی کیونکہ وہاں کے معاملات سے حکومت کا کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ قبائلی نظام میں جرگہ سسٹم رائج ہونے کی وجہ سے لوگ اپنے معاملے خود حل کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ سکولوں کی حالت بھی مخدوش ہے، جس کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کا بھی رواج نہیں ہے۔

گراں:

گراں میں موجود گھرانوں کے لوگوں نے جیسے جیسے باہر کے ممالک کی طرف رخ کرنا شروع کر دیا تو پیچھے اُن کے خاندان کے لوگوں کی زندگی میں نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ پہلے لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور اب وہاں کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ بزرگ اس ترقی کو اچھا تصور نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں نمود و نمائش نے اپنائیت کو ختم کر دیا تھا۔ فریج کی بوتلیں انہیں عذاب لگتی تھی۔ فارمی گوشت اور کھادوں والی سبزیاں بھی انہیں کوئی لذیز ذائقہ نہ دیتی تھیں۔ مردوں کے باہر جا کر کمانے سے گاؤں میں اعلیٰ الشان گھر بن گئے تھے، بجلی کے کھمبے اور ٹیلی فون کے تار بھی بچھ گئے تھے۔ گھروں میں موٹریں لگ گئی تھیں اور ٹھنڈے پانی کے لیے فریج کا استعمال ایک عام سی بات تھی اور تقریباً ہر گھر میں ٹی وی اور وی سی آر موجود تھا۔ پکی سڑکیں بنا کر گاؤں کو شہر سے جوڑا جا رہا تھا جس کی وجہ سے سفر بھی آسان ہو گیا تھا اور شہر میں ملنے والی ہر چیز گاؤں میں بھی دستیاب تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ترقی ہوتی جا رہی تھی اسی طرح لوگوں نے خود کو نئے دور میں شامل کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ جہاں جدید ٹیکنالوجی کے فوائد ہیں وہاں ہی اس کے نقصانات بھی ہیں۔ کسی بھی تہذیب و ثقافت کا اندازہ وہاں کے لوگوں کی طرز زندگی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور کسی بھی دور میں لکھنے والوں کے ناولوں سے ہم اس دور کی معاشرت، تہذیب و ثقافت کے بارے میں جان سکتے ہیں کہ اس دور کے حالات یا رسم و رواج کس قسم کے تھے اسی طرح

ترقیاتی کاموں کا اندازہ بھی ہم ناولوں میں ملنے والے اقتباسات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اس شہر یا گاؤں کے حالات کس قسم کے ہیں وہاں پر موجود ترقیاتی کاموں کی صورتحال کس نوعیت کی ہے:

"بھاپا جی جب مسقط سے وطن واپس آئے تو ادھر گراؤں میں چپکے چپکے شہر داخل ہو چکا تھا۔ بجلی کے کھمبے اور ٹیلی فون کے تار بچھے تھے۔ ہر سو پھیلی پکی سڑکیں گراؤں کو شہروں سے جوڑ رہی تھیں۔ چوے کا پانی منہا منہ اُبلتا ضائع جا رہا تھا۔ گھروں میں تو واٹر پمپ لگ گئے تھے۔ نوجوان وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھتے تھے اور پیپسیاں پیتے ملک شیک اور برگر کھاتے۔ مٹھیاں روٹیاں اور پوڑے اب یادداشتوں میں رہ گئے تھے۔"(۷۴)

گھر میں فریج اور موٹروں کی وجہ سے چوے سے پانی لانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی اور چوے کا پانی ایسے ہی بہتا رہتا اور دوسری طرف لوگوں کے گھروں میں ٹیلی فون لگ گئے جس سے وہ باہر رہنے والے اپنے پیاروں سے بات کر سکتے تھے۔

ناول کا تیسرا حصہ چودھری محمد اکرم NZD VS کے عنوان سے ہے۔ چودھری اکرم ناول میں دیہی تہذیب کا نمائندہ ہے اور نذیر احمد جدید تہذیب کو پیش کرتا ہے۔ محمد اکرم سرپنچ بننے کے بعد گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگا اور دوسرا دوست گاؤں سے دور باہر کے ملک چلا گیا۔ دونوں دوستوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا جس سے نذیر احمد کو گاؤں کے حالات کے بارے میں آگاہی ملتی رہتی ہے۔ چودھری اکرم کے سرپنچ بننے سے جنازہ گاہ اور قبرستان کی حالت بدل گئی اور نالیاں پختہ ہو گئیں۔ رابطہ سڑکوں سے لے کر گاؤں کی پلیاں اور گلیاں بھی پختہ ہو گئیں، چھوٹی سی مسجد جامع مسجد میں تبدیل ہو گئی اور اس کے ساتھ ساتھ میٹرک تک سکول بھی منظور کروا لیا گیا۔ گاؤں میں اُس کے فیصلے قابلِ قبول ہوتے تھے، ہر شخص کی زبان پر ایک ہی نام ہوتا تھا۔ محمد اکرم کے سرپنچ بننے کے بعد گاؤں کی حالت میں بہتری آنے لگی۔ گاؤں میں ترقیاتی کام کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

"گاؤں کی ساری برادریاں اُس کے فیصلوں کی تائید کنندہ ہوا کرتیں۔ وہ سبھی گھرانوں کی خوشی غمی میں سب سے پہلے پہنچتا اور آخر میں اُٹھ کر آتا۔ ہر تقریب کا وہی منتظمِ اعلیٰ ہوتا کبھی عید شب برات پر گاؤں جانا ہوتا تو گاؤں کی حالت پہلے کی نسبت سدھری ہوئی محسوس ہوتی۔ رابطہ سڑکوں سے لے کر گاؤں کی پلیاں اور گلیاں بھی پختہ ہو چکی تھیں۔ وہ ہمارے بچپن کی چھوٹی سی مسجد ایک کھلی اور جامعہ مسجد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میٹرک تک سکول منظور کروا لیا گیا تھا۔"(۷۵)

گاؤں کے لوگوں کے باہر جاکر کمانے اور پھر وہ کمائی وطن واپس بھیجنے سے گاؤں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ، بجلی اور ٹیلی فون کی سہولت بھی آگئی۔ چودھری اکرم نے نالیاں پختہ کروالیں، جامع مسجد کے ساتھ ساتھ جنازہ گاہ اور قبرستان کی حالت بھی بہتر کی۔ سکول کا قیام بھی گاؤں میں ایک اہم ترقی کے کام کی طرف اشارہ ہے۔

ج۔ صنعت:

جب معاشرے میں زندگی بتدریج مختلف مراحل طے کررہی ہوتی ہے تو معاشرہ مکمل طور پر صنعتی پھیلاؤ کی زد میں نہیں آتا اور نہ ہی فطرت سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط تک برصغیر کے بڑے شہروں کی زندگی میں کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ زندگی بتدریج طے ہو رہی تھی ، ہر شخص خود اپنی پہچان تھا، کیونکہ اس کا رشتہ اپنے آج سے اور آج سے پہلے والے کل سے اور اس سے پہلے گزرے ہوئے سارے کل سے کسی نہ کسی طور برقرار تھا۔ مگر پھر ہوا یہ کہ بتدریج طے ہوتی ہوئی زندگی کی رفتار میں مشینی تیز رفتاری آتی گئی اور زندگی بتدریج طے ہونے کی بجائے جستوں میں طے ہونے لگی۔ شروع شروع میں ایک جست سے دوسری جست کے درمیان فاصلہ کچھ کم تھا۔ پھر کچھ زیادہ ہوا اور پھر اتنا زیادہ ہو گیا کہ زندگی میں جو ایک تسلسل تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا۔ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی نے آدمی کے تجربات میں اس قدر تنوع پیدا کیا کہ اس کی یاداشت انہیں اپنی گرفت میں لینے سے ناکام ہو گئی۔ لٰہذا ہر آج رفتہ رفتہ اپنے گزرے ہوئے کل سے بچھڑتا گیا اور نتیجے کے طور پر صنعتی معاشرے کا آدمی اپنی پہچان سے دور ہو گیا۔ اس کی پہچان کا کھو جانا اور اس کی فردیت کا گم ہو جانا ایک ایسا المیہ ہے جو اس معاشرے کے آدمی کو اندر سے گھن کی طرح کھائے جارہا ہے۔

مشینی عہد کے آغاز کے ساتھ ہی پرانی قدروں کی شکست وریخت شروع ہوگئی اور ماضی اپنی اہمیت اور قدروقیمت کھونے لگا۔ ایک نیا طرزِ زندگی سامنے آیا جس کے جلو میں آدمی کے لیے ہر لمحہ نئے سماجی تقاضے تھے اور اس کو نئے معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے ان تقاضوں کے مطابق ہر لمحہ نئے چہروں سے خود کو آراستہ کرنا تھا۔ اس بات نے پرانے معاشرے کے سیدھے سادے آدمی کی پہچان کو چھین کر اسے ناٹک کا کردار بنا دیا۔

مشینی عہد نے جن مسئلوں کو جنم دیا ان میں ایک اہم مسئلہ Brain drain کا بھی ہے۔ بیسویں صدی میں جس بڑے پیمانے پر یہ مسئلہ انسانیت کو درپیش ہوا اس سے پہلے کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس مسئلے

نے آدمی کو اس کی اپنی سر زمین اور اپنے ماحول ہی سے دور نہیں کیا بلکہ اس کی پہچان سے بھی کوسوں دور پہنچا دیا۔ وہ اجنبی سر زمین، اجنبی چہروں کے درمیان، اجنبی آوازوں کے بھنور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں باہر سے مسلسل سمٹتا گیا اور اندر سے اس کا وجود انتشار کی تند ہواؤں میں سوکھے پتوں کی طرح بکھرتا رہا۔

ہم اپنے عصر کی طرف نظر کریں تو دیکھیں گے کہ ہم نے سائنسی ترقی کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں جس کے نتیجے میں صنعتیں مزید آگے بڑھی ہیں اور ان میں وسعت پیدا ہوئی ہے، زرعی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، اور انسان کی آسائش کے لیے طرح طرح کی ایجادات سامنے آئی ہیں۔ ہماری قومی آزادی کو جکڑنے والی زنجیروں کی کڑیاں ٹوٹ کر بکھر چکی ہیں اور جمہوری عمل نے بھی بعض رکاوٹوں کے باوجود کچھ نہ کچھ پیش رفت کی ہے۔ ان تمام عوامل نے مجموعی طور پر انسان کو اگر خوشحالی کی منزل پر نہیں پہنچایا تو کم از کم اس منزل سے قریب ضرور کر دیا ہے، اور وہ بلاشبہ کل کی نسبت کئی اعتبار سے آج زیادہ خوشحال ہے۔ اب اگر ہم اپنے عصر سے نکل کر روحِ عصر کی طرف آئیں تو اس صدی کا انسان اندر سے بہت دکھی اور ٹوٹا ہوا نظر آتا ہے اسے بے شمار واہموں اور وسوسوں نے بے یقینی اور بے اطمینانی کا شکار کر دیا ہے۔ اور یہ بے یقینی اور بے اطمینانی ایسی ہے جو بیک وقت اس کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں اسے خود اپنی ہی سانسوں کی سولی پر چڑھائے ہوئے ہے۔

ہمارا معاشرہ بھی ایسا ہی ایک معاشرہ تھا، مگر سائنسی عہد کے آغاز کے ساتھ ہی جب زندگی کی مسلمہ قدروں کی ٹوٹ پھوٹ شروع ہوئی تو جما جمایا معاشرہ بھی اندر سے بکھرنے لگا اور انسانی زندگی بے وقعتی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس ماحول میں نئی نسل نے جب ہوش سنبھالا اور گھر کی حدود سے نکل کر اپنے پیش رووں سے چارج لے کر آگے بڑھی تو زندگی کے راستے کی تمام نشانیوں اور مناظر اسے یکسر مختلف نظر آئے۔ پیش رووں کے قصوں میں تو صرف نشیب و فراز اور موڑوں کا ہی ذکر تھا، مگر یہاں نئی نسل کے راستے میں ہر قدم پر گہری کھائیاں تھیں جن میں پھسل کر کسی بھی لمحے گر جانے اور فنا ہو جانے کا دھڑ کا لگا رہتا تھا۔ اس کے بزرگوں کے آزمائے ہوئے ہتھیار بھی اب از کارِ رفتہ ہو چکے تھے، جو ہر لمحہ اس پر حملہ آور نئے نئے خدشات اور خطرات کے اِن گنت ڈراؤنے عفریت کا مقابلہ کرنے کے لیے ناموزوں تھے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ اس نسل کے ہاتھ سے اعتماد کا دامن چھوٹتا گیا اور وہ عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو گئی۔

دراصل سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقی کے عروج نے جہاں ایک طرف اس عہد کے انسانوں کے لیے بے شمار مواقع اور سہولتیں مہیا کیں وہیں دوسری طرف خطرات کی اِن گنت چمکتی تلواریں بھی اس کے

سر پر لٹکا دیں۔ اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ کچے دھاگوں سے بندھی ان تلواروں کے نیچے اس عہد کا فرد سانس بھی ڈر ڈر کر لے رہا ہے۔ اسے ہر لمحہ یہ کھٹکا لگا ہے کہ نہ جانے کب کس تلوار کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور وہ اس کے سر پر آن گرے۔ غرضیکہ سائنس کی عطا کردہ ہر سہولت کے ساتھ عدم تحفظ کا ایک احساس بھی نئی نسل کے حصے میں آیا ہے۔ چونکہ جدید ناول نگار بھی اسی بدلے ہوئے معاشرے میں سانس لیتا ہے اور اسی نئی نسل کا ایک رُکن ہے۔ اس عہد کے فرد کے سر پر لٹکتی ان ننگی تلواروں میں کوئی تو برق رفتار گاڑیوں کے نیچے کچل جانے کے خوف کی تلوار ہے، کوئی معاشی تباہی و بربادی کے خدشے کی تلوار ہے، کوئی جنگ کے خطرے کی تلوار ہے، کوئی ایٹمی فناکاری کے خطرے کی تلوار ہے اور کوئی کسی اور خطرے کی تلوار ہے۔

سڑکوں پر برق رفتار گاڑیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافے کے سبب فاصلے کم ہوتے اور سمٹتے چلے گئے۔ آج ہمارے صنعتی شہروں میں بیشتر افراد اپنے گھروں سے پندرہ بیس میل دور ڈیوٹی انجام دینے جاتے ہیں اور واپس آتے ہیں۔ ان کے لیے فاصلہ اب کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے۔ مگر اس مسئلے کے حل کے ساتھ ہی نیا ایک مسئلہ اژدہے کی صورت منہ کھولے بارونق سڑکوں پر رینگتا نظر آنے لگا ہے۔ وہ مسئلہ ہے ہر آئے دن سڑکوں پر پیش آنے والے حادثوں کا، جن کا شکار ہو کر کوئی اپنی ٹانگ گنوا بیٹھتا ہے، کوئی اپنے ہاتھ سے محروم ہو جاتا ہے، کوئی اپنی جانِ عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کو بے یار و مددگار ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال نے فرد کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا ہے، اور اب وہ کسی بھی لمحے اپنے کسی عضو سے بچھڑ جانے یا اپنی زندگی سے محروم ہو جانے کا خدشہ دل میں لیے ایک ایک قدم ڈر ڈر کر چل رہا ہے۔

بھاگتی گاڑی کی زد سے بچتا بچاتا سڑکوں کے بیچ سے نکل کر کوئی فٹ پاتھ تک پہنچ بھی جائے تو اُس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بلا سر سے ٹل گئی کیونکہ حادثہ تو صرف کسی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا جانے سے ہی پیش نہیں آتا۔ اس کی اس عہد میں اور بھی کئی صورتیں ہیں جو سائنس کی عطا کردہ سہولتیں اپنے ہمراہ لے کر آئی ہیں مثلاً بجلی نے جہاں ایک طرف ہماری اندھیری راتوں کو روشن کیا ہے اور قومی صنعت کی رگوں میں خون دوڑا کر اس میں زندگی کی روح پھونکی ہے، وہیں دوسری طرف ایک خطرہ بن کر بھی اس نے ہمارے دلوں میں عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیا۔

صرف برق رفتار گاڑیاں اور برقی لہریں ہی اس دور میں فرد کے لیے خطرے کا باعث نہیں بنی ہیں بلکہ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ اس کے ارد گرد بسنے والے اور اس جیسی شکلیں اور صورتیں رکھنے والے انسان

بھی اس کی جان ومال اور عزت و آبرو کے لیے خطرے کا نشان بن گئے ہیں، اس کی وجہ جہاں ایک طرف اخلاقی قدروں کا زوال ہے وہیں دوسری طرف یہ حقیقت بھی ہے کہ دیہاتوں سے نقل مکانی کر کے شہروں میں آباد ہونے والوں کے درمیان آپس میں ویسا رشتہ قائم نہ ہو سکا جیسا کہ دیہاتوں میں تھا۔ کیونکہ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کو ان کے پرکھوں کے حوالے سے جانتے تھے، اور ان کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو سمجھتے تھے، جبکہ صنعتی شہروں میں ایسا نہیں ہے۔ برسوں پڑوس میں رہنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کو نہ جانتے اور نہ پہنچانتے ہیں۔ اور جب ایسی صورتِ حال ہو کہ لوگ ایک دوسرے کو ہی نہ جانتے ہوں تو ان کی آنکھوں میں حیا کہاں سے آئے اور وہ پرائی عزت کو اپنی عزت کیسے سمجھیں؟ غرضیکہ اپنی عزت و آبرو کی طرف سے بھی اس عہد کا فرد عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس کیفیت نے اس کے دل میں شک وشبے کے کانٹے بو دیئے ہیں، جن کی نوکیں ہر لمحہ اندر ہی اندر چبھتی رہتی ہیں۔

جس امر نے لوگوں کو دیہاتوں کی سادہ زندگی ترک کر کے بڑے پیمانے پر شہروں کی جانب کوچ پر مجبور کیا وہ رزق کی تلاش اور بہتر مستقبل کا خواب تھا، اور اس خواب کی انگلی تھامے وہ اپنے بھرے پُرے گھروں کو بے رونق کر کے آگے بڑھ گئے۔ ہرے ہرے کھیتوں میں لہلہاتی بالیوں نے انہیں لاکھ اشارے کیے، بل کھاتی پگڈنڈیوں نے پاؤں تھامے اور اٹھلاتی ندیوں نے انہیں آوازیں بھی دیں، مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی اور آنکھوں میں ایک محفوظ مستقبل کے خواب کا دیا جلائے شہروں کی سڑکوں پر بھاگتے لوگوں کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ وہ مسلسل دوڑتے رہے اور اب تک دوڑ رہے ہیں۔ مگر ہر لمحہ انہیں یہ خوف لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب وہ ٹھوکریں کھا کر لڑکھڑا جائیں اور ان کے خوابوں کا شیشہ گر کر چکنا چور ہو جائے۔ غرضیکہ عدم تحفظ کا احساس یہاں بھی ان کو دامن گیر ہو گیا۔ اور جان ومال اور عزت و آبرو کے ساتھ ساتھ ان کی ملازمتیں اور مراعات بھی خطرے میں پڑتے نظر آنے لگے۔

سائنس نے اس عہد کو ایٹمی ٹیکنالوجی کے ایک ایسے عطیے کی صورت میں پیش کیا تھا، جسے توانائی کے بحران کے خلاف جنگ میں استعمال کر کے نئے دور میں انسانوں کی خوشحالی اور ارتقا کی راہوں سے اندھیرے دور کیے جا سکیں، اور ہر طرف روشنی پھیلائی جا سکے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہوا کہ پورے کرۂ ارض پر فنا کے سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ اور انسان کی بقا ہر لمحہ خطرے میں نظر آنے لگی۔

صنعتی پھیلاؤ اور اس کی تیز رفتاری کی زد میں آنے سے قبل ہمارے شہروں کا معاشرہ ایسے لوگوں کا معاشرہ تھا جو ایک سیدھی ڈگر پر زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ان کی ضرورتیں محدود تھیں، لہٰذا سماجی اور

معاشی مسائل بھی کم تھے۔ ملوں اور کارخانوں میں گو کہ "آقا اور ملازم کے اصول" کے تحت صنعتی تعلقات قائم تھے، مگر چونکہ صنعتی ادارے آج کی طرح اتنے بڑے بڑے نہیں تھے، اور ان میں کام کرنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ لہٰذا کارکنان اور کارخانہ دار کے درمیان براہ راست رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت نکلتی رہتی تھی، جس کے باعث آجر اور اجیر کا رشتہ بعض اوقات باپ اور بیٹے کے رشتے میں بدل جاتا تھا۔ اور کوئی کارخانہ دار اپنے کسی کارکن کی بیٹی کی شادی کے موقع پر یا کسی اور ضرورت کے وقت اس کی مدد کرتے ہوئے آج کی طرح یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتا تھا کہ کارکنان کہیں کل کو اسے مثال بنا کر اپنے حق کے طور پر مانگنے تو کھڑے نہیں ہو جائیں گے اور یہی بعد میں صنعتی تنازعے کا سبب تو نہیں بن جائے گا۔ دوسری طرف اس کارکن کے ذہن میں بھی یہ شبہ جنم نہیں لیتا تھا کہ کہیں اس طرح اس کی مدد کر کے اس کا کارخانہ دار اسے خود اس کے ساتھی کارکنان کے خلاف اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال تو نہیں کرنا چاہتا۔ غرضیکہ باہمی اعتماد کی ایک فضا قائم تھی اور شک وشبہے کی پرچھائیوں نے اپنے پر نہیں پھیلائے تھے۔

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانے اور اسے اپنانے کا عمل بھی اس عہد میں خاصا تیز رہا۔ شہروں کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملائے بجلی اور ٹیلیفون کے کھمبے پہلے ہی کھڑے ہو چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد لمبے لمبے بانسوں سے بندھے ریڈیو کے ایریل رفتہ رفتہ کھلنے لگے اور ٹی وی اینٹیوں کا ایک جال سا مکانوں کی چھتوں پر نظر آنے لگا۔ کنویں کی منڈیریں سونی ہونے لگیں اور ان کنوؤں کو بھرا جانے لگا۔ زمین کے اندر بچھے پانی کے پائپ کا کنکشن ہر گھر تک پہنچا دیا گیا۔ ستّر کی دہائی تک اس پائپ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گیس کا پائپ بھی ہر گھر کے باورچی خانے کی حدود میں داخل ہو گیا۔ ان ایجادات نے جہاں ایک طرف شہری زندگی کو سہولتیں مہیا کیں، وہیں دوسری طرف ہمارے معاشرے میں گھر کے تصور کو زک بھی پہنچائی۔

صنعتی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ شہر بھی بڑھتے اور پھیلتے چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی گھروں سے دفتروں اور کارخانوں کے درمیان فاصلوں میں اضافہ بھی ہوتا چلا گیا۔ پہلے لوگ پیدل ہی کام پر چلے جایا کرتے تھے، پھر سائیکلوں پر جانے لگے۔ اس کے بعد بسوں میں بیٹھ کر یہ فاصلے طے کیے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ بسوں میں لٹک کر دفتروں اور کارخانوں تک پہنچتے ہیں اور وہاں سے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ شہر جس رفتار سے پھیلے اور مواصلات کے نظام میں جس رفتار سے ترقی ہوئی، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے صنعتی شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ مواصلات کا یہ شدید سے شدید تر ہوتا ہوا مسئلہ بھی جدید ناول نگاروں کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔

جو قومیں صنعتی طور پر جدید ٹیکنالوجی سے روشناس ہو جاتی ہیں وہ اسے زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال کر کے ترقی کی رفعتوں کو پالیتی ہیں۔ صنعتی میدانوں میں جدید مشینوں کا استعمال، نئی ہنر مندیوں کا ظہور، جدید فارمولوں کا زیرِ استعمال آنا، ٹیکنالوجی کی پیش رفت، وہ ضروری جزو ہیں کہ جن کے بغیر آج کے دور میں معاشی ترقی کا تصور ممکن نہیں۔ جب تک مشرقی اقوام ٹیکنالوجی کے میدان میں معتدبہ پیش رفت کا مظاہرہ نہیں کرتیں، ان کے وسائل کا بھرپور استعمال محال رہے گا۔ بیل گاڑیوں میں سفر کے بجائے جدید ٹرین، ریل گاڑیوں کا اپنانا، بھاپ والے انجن کی بجائے مونو ریلوے کا انجن اور حیوانی طاقت کے بجائے شمسی توانائی کا استعمال ہی معاشی ترقی کے ثمرات کو عام کرنے کا سبب بنے گا۔ ٹریکٹرز کے استعمال سے ہمارے کاشت کاروں پر ایک خوش گوار اثر یہ بھی پڑا کہ بار برداری کے جانوروں میں کمی آگئی۔ ان کی نگہداشت کا فالتو بوجھ جو ہمارے کاشتکاروں پر تھا اس میں نمایاں کمی ہوئی۔

ٹریکٹر کے بعد دوسرے نمبر پر دیگر آلاتِ کاشت کاری کی تعداد بنتی ہے۔ یہ تمام آلات ہماری کاشتکاری میں بے حد ضروری ہیں۔ مگر پاکستان کے زیرِ کاشت رقبہ اور کسانوں کی تعداد کے مقابلہ میں ابھی ان کی تعداد بہت کم ہے اور ان میں اضافہ کی کافی گنجائش موجود ہے۔ کاشت کاروں کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں ٹیوب ویل نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سے ہماری زراعت کو مطلوبہ پانی فراہم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سیم اور تھور کی شدت میں کمی آتی ہے۔ ہماری حکومت اس بات کی کوشش میں ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے تاکہ ہماری زراعت کو درپیش گوناگوں مسائل سے نجات مل سکے۔ معاشی ترقی کے عمل کو تیز تر کرنے میں اشیاء خدمات کی پیدائش کے نئے طریقوں کی دریافت اور ان کا استعمال بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ ٹیکنالوجی سے مراد وہ باضابطہ علم ہے جو اشیاء و خدمات کی پیدائش کے فن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے یہ اشیاء و خدمات تخلیق میں کام آنے والے تمام ذرائع و وسائل مثلاً مشینوں اور آلات کے استعمال انسان کے بنائے ہوئے خام مواد سے استفادہ کرنے کے طریقِ کار اور توانائی کے نو دریافت وسائل کے استحصال وغیرہ پر محیط ہے۔ معاشی ترقی کے عمل میں ٹیکنالوجی کی اہمیت کو مندرجہ ذیل نکات سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اشیاء و خدمات وسیع پیمانے پر پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جدید مشینیں اور آلات پیدائش کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اشیاء پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت انسان بحر و بر اور فضا و خلاء کی قوتوں کو مسخر کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ نئی نئی ایجادات معرضِ ظہور میں آرہی ہیں، نئے حقائق منکشف ہو رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسانی اعضاء پر کام کے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔ بھاری

بھر کم دیو ہیکل کام مشینوں کی مدد سے محض بٹن دبانے سے انجام پا جاتے ہیں۔جدید ٹیکنالوجی نے نہ صرف زود پیداآوری اور کثیر پیداآوری کو ممکن بنایاہے بلکہ اس کی بدولت اشیاوخدمات کے مصارف پیدائش بھی کم ہوگئے ہیں۔جدید ٹیکنالوجی کی بدولت انسان کی زندگی میں سہولتوں اور آسائشات کا قابلِ قدر اضافہ ہواہے۔ اب موسموں کی شدت اور سفر کی صعوبت کا کوئی احساس باقی نہیں رہا،فاصلوں کی دوری سمٹ گئی ہے۔جدید ٹیکنالوجی کی بدولت انسان کے حالات کار اور شرائط کار ماضی کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہوگئے ہیں۔اس ساز گار ماحول نے اس کی قوت کارکردگی پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔جدید ٹیکنالوجی کے سامنے جغرافیائی فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔اقوام عالم ایک دوسرے کے قریب آگئی ہیں، نقل وحمل اور خبر رسانی کے ترقی یافتہ ذرائع نے انہیں باہم مربوط کر دیا ہے۔جدید ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس سے استفادہ کرنے کے لئے تعلیم و تربیت بنیادی اہمیت رکھتی ہیں،یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں ٹیکنالوجی اور تعلیم دوش بدوش چلتی ہیں۔

کاروانِ وجود:

سارہ جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے اور ناول میں ایک شادی شدہ عورت کے طور پر سامنے آتی ہے اور اسے اپنی نوکری کے سلسلے میں دوسرے ممالک کا سفر بھی کرنا پڑتا ہے۔وہ مختلف اجلاس اور کانفرنس میں شرکت کرتی ہے جہاں وہ عمدہ طریقے سے اپنے ملک کا دفاع کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کی نظر میں اکیسویں صدی میں مشینوں کی اہمیت دوگنا ہو گئی ہے ،اب انسانی زندگی کا دارومدار مشینوں پر ہے۔کیونکہ پہلے وقتوں میں صنعتوں کی جگہ افراد نے لی ہوئی تھی ،صنعتوں کے قیام نے افرادی قوت پر انحصار کم کر دیا ہے۔سارہ محسوس کرتی ہے کہ اجلاس میں شامل لوگ پسماندہ ملکوں کو ایک ذمہ داری سمجھتے ہیں۔سارہ واضح کرتی ہے کہ یورپ اور امریکہ سیاسی طور پر افریقہ اور ایشیا پر مسلط رہے ہیں اور مغرب نے اپنا فلسفہ طرزِ فکر اور طرزِ حیات ان معاشروں تک منتقل کیاہے۔اب پسماندہ ممالک کی ذمہ داری مغرب کی ہے۔کیونکہ اُن ممالک کے سامنے دوراستے کھلے ہیں یاتووہ مغرب کا سرمایہ داری نظام اپنالیں یاپھر مخالف اشتراکی کیمپ میں چلے جائیں:

"اس نے لمحہ بھر کو سانس لیا۔پھر اسی تیزی سے بولنے لگی"پورا ایک ہفتہ آپ لوگ بڑے اطمینان سے یہاں بیٹھے صنعتی ترقی کی کسوٹی پر ملک کو پرکھتے ہیں۔آپ بھولتے ہیں کہ کرہ زمین پر انسان ہزاروں سال مشین کے بغیر زندہ رہاہے اور کون وثوق سے کہہ سکتاہے کہ پانچ سویاہزار سال بعد وہ پھر سے ساری مشینوں کو دریابرد نہ کر دے گا؟۔۔۔یہ بات البتہ پکی ہے کہ بیسویں صدی میں اس ملک اور اس کمرے میں مشین کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ پوری تاریخ کی اہمیت کا دارومدار

ان صنعتی ترقی کی مقدار پر ہے۔"(۷۶)

زیرِ نظر اقتباس میں سارہ لوگوں سے کہتی ہے کہ آپ یہاں بیٹھ کر صنعتی ترقی کی کسوٹی پر ملک کو پرکھتے ہیں۔ انسان ہزاروں سال مشین کے بغیر زندہ رہا ہے آنے والے وقت میں بھی یہ مشینوں کو ختم کر سکتا ہے۔اس کے ساتھ بیسویں صدی میں مشین کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں صنعتی ترقی کا انحصار مشین پر ہے۔ انسان اپنی زندگی کو آسان بنانے کا خواہاں ہے اور اس کے لیے وہ صنعت سے فائدہ اٹھاتا نظر آتا ہے۔ صنعت کے قیام نے جہاں ایک طرف انسان کی زندگی آسان بنائی ہے وہیں دوسری طرف کئی انسانوں کا کام ایک مشین کم وقت میں کرنے لگی ہے جس کا نقصان بے روزگاری میں اضافے کی صورت میں ہوا ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

گاؤں کے مردوں کے باہر ملک جانے سے حالات میں بہت بدلاؤ آگیا ہے، پرانی تہذیب کی جگہ اب نئی تہذیب لیتی جا رہی ہے۔ دھنی بخش کی حویلی میں مردوں نے بہت سی چیزیں لاکر رکھی تھیں کہ عورتیں مصروف رہیں گی اور بے کار چیزوں کی جانب اُن کی توجہ نہیں جائے گی لیکن سب چیزیں بے کار پڑی تھیں۔پہلے وقتوں میں ہر چیز گھر میں پیسی جاتی، یہاں تک کہ آٹا بھی۔ لیکن جیسے جیسے دیہی زندگی پر شہری زندگی کا رنگ غالب آتا گیا تو لوگ تن آسان ہونے لگے۔ عورتوں نے گھر میں محنت کرنے کی بجائے باہر کی تیار چیزوں سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ پتھر کی سلیں اور بٹّے اور ہاتھ کی چکی کئی سال سے بے کار پڑی تھیں کیونکہ اب ڈبہ پیک مصالحہ جات گھر آتے تھے تو پھر کوئی گھر میں سل پر ہلدی، دھنیا، مرچ کیوں پیستی۔ گھر کے نوجوان اور عورتوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ فصل کب بوئی گئی اور کب کٹے گی۔ فصل کے گھر آنے پر عورتوں کو خبر ہوتی کی ایک موسم گزر گیا ہے اور دوسرا آنے کو ہے:

> "کچھ دن یہ کھیل منجھلے بیٹے علی بخش کی زندگی میں بھی چلا، پھر گیہوں بوریوں میں ٹریکٹر ٹرالیوں سے لایا جانے لگا۔ دھنی بخش کے گاؤں میں بھی مشینوں کا زمانہ آتو گیا تھا لیکن پوری طرح سے نہیں۔ ٹریکٹر اور تھریشر بے کار ہوتے رہتے تھے۔ بجلی کی چکی بھی کبھی کبھی بند رہتی تھی اور پھر سے بیلوں اور ہاتھ کی چکی کا زمانہ آجاتا تھا۔ گیہوں پر بچے کھیل سکتے تھے۔ بوریوں پر صرف چڑھنا اور وہاں سے کودنا ممکن تھا جو زیادہ بڑا کھیل نہیں ہے۔"(۷۷)

احمد بخش، دھنی بخش کا سلجھا ہوا بیٹا تھا اور علی بخش کے مقابلے میں عمر سے بھی بڑا تھا۔ وہ گاؤں کی بہتری کے لیے ولائیت سے کچھ دن کے لیے آیا تھا کیونکہ وہ گاؤں کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتا تھا اور اس

معاملے میں اس کی بیوی اولا بھی اس کے ساتھ تھی کیونکہ وہ دونوں گاؤں کے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے اس لیے احمد بخش ولائیت سے گاؤں آیا تھا اور ایک خط میں اس نے علی بخش سے اپنے حصے کی جائیداد گاؤں میں مستحق لوگوں کو دینے کے لیے بھی کہا تھا۔ ولائیت سے آنے کے بعد اگلی صبح اٹھ کے احمد بخش نے اپنی چیزیں کمرے میں پھیلا کر اپنی ضرورت کا سامان نکالا۔ جس میں ایک کیسٹ پلیئر ریڈیو بھی تھا اُس نے سوچا کہ واپس جاتے وقت وہ عبد الرحمن کو دے جائے گا۔ اس سے بڑھ کر ایک امام مسجد کے لیے کیا تحفہ ہو سکتا ہے اور بعد میں قرآن کے کیسٹیں کا پورا سیٹ بھیج دے گا۔ احمد بخش یہ باتیں خود سے کرنے کے بعد ہنس پڑا۔ اس نے سوچا کہ امام کے بچوں کو تحفوں کے لیے ابھی انتظار کرنا پڑے گا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی صحیح تعداد اور ان کی عمریں کیا تھیں۔ احمد بخش جب گاؤں سے واپس ولائیت جانے لگا تو اس کی نظر کچھ چیزوں پر پڑی جو کہ اس کے جانے سے پہلے بھی وہاں ہی موجود تھیں جہاں پر اب موجود ہیں، اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

> "پرانی شکستہ کار کو احمد بخش نے حویلی میں داخل ہوتے وقت ہی دیکھ لیا تھا۔ اپنا سامان ٹھیک سے لگانے کے بعد وہ باہر نکلا۔ کار آج بھی وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے امریکا جاتے وقت کھڑی دیکھ کر گیا تھا۔ اس کے نزدیک ہی چارہ کاٹنے کی بجلی کی زنگ خوردہ مشین پڑی تھی۔ مال مویشیوں کے لیے کُترّا اب ہاتھ کی مشین سے کاٹا جاتا ہو گا۔ وہیں کچھ حصے آٹا پیسنے کی بجلی کی چکی کے اور اس کے پتھر (پاٹ) پڑے تھے۔"(۷۸)

جدید چیزوں کے بازار میں آجانے سے جو کام عورتیں خوشی سے گھر میں کر لیا کرتی تھیں جو کہ گھریلو صنعت کا حصّہ تھا اب ناپید ہو چکا ہے۔ جہاں صنعت کے قیام نے زندگی کو آسان بنایا وہیں اس ناول میں بتایا گیا ہے کہ صنعتوں کے قیام سے لوگ تن آسان ہو گئے ہیں۔ آٹا پیسنے کی مشین آنے سے اب جندر خواب و خیال ہو گئے ہیں۔

روشن اندھیرے:

شجاع جو کہ ناول کا ہیرو ہے نائلہ سے اس کی ملاقات شوبز میں آنے کے بعد ہوتی ہے۔ نائلہ اپنا ذاتی کاروبار کرنا چاہتی ہے اور اس سلسلے میں شجاع اُس کی عامر سے ملاقات کرواتا ہے۔ کیونکہ عامر کی کچھ عورتیں دوست تھیں جن کے پاس کاروباری معلومات تھیں۔ اگلی صبح نائلہ بہت خوش تھی کیونکہ اُس کے خواب کی تکمیل ہونے جا رہی تھی اُس نے ناشتے پر بھی خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ شجاع اُس کی خوشی میں ہی خوش ہو رہا

تھا۔ شجاع نے نائلہ کو عامر کی طرف چھوڑا اور اس کے بعد وہ اپنے کام پر چلا گیا۔ اب وہ پوری توجہ اپنے کام پر دینا چاہتا تھا۔ اس دن کے بعد شجاع نے باقاعدہ طور پر اپنا کام سنبھال لیا، معمول کی میٹنگ کے بعد شجاع نے میگزین کے لوگوں کی ایک میٹنگ کی اور نئے سرے سے کام کرنے کی ٹھانی۔ کیونکہ شجاع چاہتا تھا کہ وہ اب پوری توجہ اپنے کام پر دے:

"عامر کے دوستوں میں خواتین بھی تھیں۔ وہ سب گارمنٹس کے ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کرنا چاہ رہے تھے، ساری تفصیلات ان کے درمیان طے پا چکی تھیں۔ عامر نے اپنی طرف سے نائلہ کو ان کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ وہ کاروباری باتیں کرتے رہے۔ جبکہ میں اور حسن محض ان کی سنتے رہے۔" (۷۹)

عامر نے نائلہ کی ملاقات اُن عورتوں سے کروائی جو کپڑوں کی ایک برانڈ متعارف کروانا چاہ رہی تھیں۔ زیرِ نظر اقتباس میں عامر نائلہ کی ملاقات کاروباری خواتین سے کرواتا ہے جو کہ اپنے کپڑوں کی ایک برانڈ متعارف کروانا چاہتی ہیں۔ صنعت کے قیام نے عورتوں کو بھی اُبھارا ہے کہ وہ بھی گھر کی زندگی سے نکل کر کاروبار کے میدان میں آئیں۔

صفر سے ایک تک:

ذکی جو کہ ناول کا ہیرو ہے وہ کافی عرصے بعد گھر آتا ہے تو اپنی ماں اور باقی گھر والوں کے ساتھ ملنے کے بعد باپ کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ والد صاحب کے کمرے کی صورتحال کچھ اس طرح کی ہے کہ جسے دیکھنے کے بعد لگتا ہے کہ جیسے والد صاحب کے کمرے میں تازہ تازہ چوری کی واردات ناکام ہوئی ہو۔ والد صاحب ایک طرف کمپیوٹر کے سامنے مونیٹر پر ایکسل کا پروگرام کھول کر اپنا کھاتہ دیکھ رہے تھے۔ اور وہ کاغذی حساب کتاب کو الیکٹرونک ڈیٹا میں بدل رہے تھے۔ ذکی کی آہٹ سن کر انھوں نے اُسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ آرام سے اُنہیں دیکھتا رہا۔ وہ ایکسل کے استعمال میں چند معمولی غلطیاں کر رہے تھے لیکن اُس سے اُن کی کارکردگی کافی متاثر ہو رہی تھی:

" کمرے میں بستوں والی الماری کھلی پڑی تھی اور بستوں میں سے برآمد ہونے والے پرانے ٹائپ کے جہازی رجسٹر اور بہی کھاتے جا بجا پڑے تھے بظاہر منظر ایسا تھا کہ جیسے کسی پٹوار خانے میں چوری کی تازہ تازہ ناکام واردات ہو چکی ہے۔"(۸۰)

منشی نے جب حیات سالار سے بات کی کہ اب وہ منشی گیری کا کام جاری نہیں رکھ سکتا تو حیات نے کہا کہ آگے تمھارا بیٹا یہ خاندانی کام کیوں نہیں سنبھال لیتا۔ کیونکہ تمھارے اور ہمارے خاندان کا سو سال کا ساتھ ہے۔ مُنشی نے انکار کر دیا اس دوران حیات بار بار کمپیوٹر کو شکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ منشی نے اپنے بیٹے ذکی کو اس ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ وہ یہ باتیں اپنے بڑے بھائی ثناء اللہ کو نہ بتائے۔ منشی نے ذکی کو بتایا کہ حیات تیرے کمپیوٹر کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اُس نے کہا ہے کہ منشی گیری اب تمھارے خاندان سے نکل جائے گی اور یہ ہمارے سارے کاغذ، پتر بھی واپس کر دینا۔ ذکی اپنے باپ سے کہتا ہے کہ ان دستاویزات کو کمپیوٹر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ سالار سے دوستی کی وجہ سے حیات سالار ذکی کا دشمن بن جاتا ہے:

> "مجھ سے اب یہ کام نہیں ہوتا" منشی گیری "کا۔ کمر رہ گئی ہے۔ ویسے رہی سہی کوئی نہیں۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"
>
> "جی اباجی۔ خدا کا فضل ہے آپ پر"۔ میں نے ہنس کر کہا۔
>
> "تو خیر وہ کافی پریشان ہوا۔ ہمیشہ ہی ہوتا ہے میری اِس بات پر۔ کہنے لگا۔ یار منشی پہلے تو یہی ہوتا تھا آگے بیٹا تمہارے خاندان کا کام سنبھال لیتا تھا۔ مگر اب ایک تمہارا کمپیوٹر مکینک بن گیا ہے۔ دوسرا جعلی پیر بن گیا ہے۔"(۸۱)

ٹیکنالوجی کی صنعت کے آنے سے گھنٹوں کا کام منٹوں میں سمٹ گیا ہے دنیا جہان کی معلومات پلک جھپکتے مل جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے نقصانات بھی ہیں جن میں سے ایک ہماری ثقافت میں بحران کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اب لوگ آپس کے تعلقات اور پیار بھری محفلوں سے دور ہو گئے ہیں۔ ذکی کا باپ بھی اپنے منشی گیری کے کام کو کمپیوٹر پر منتقل کرتا نظر آتا ہے۔

نولکھی کوٹھی:

ولیم کو ہندوستان کی ہریالی سے بہت پیار تھا وہ ہریالی کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ جب ولیم کی ہندوستان تعیناتی ہوئی تو وہ ایسے ہی وہاں کی ہریالی دیکھنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ ولیم گاؤں کے چوک میں پہنچ کر سرشار ہو جاتا ہے۔ چوک کے درمیان میں غلہ پیسنے والا خراس تھا، خراس کو چلانے کے لیے ایک اُونٹ مسلسل دائرے میں چل رہا تھا۔ جس کے کوہان کے ساتھ خراس کے آنکڑے بندھے تھے۔ اُونٹ کے دائرے میں گھومنے سے پتھر کے پُڑ گھومتے تھے۔ بالائی پتھر میں ایک سوراخ تھا جس میں غلہ یا گندم متواتر تھوڑی کر کے ڈالی جاتی جو آٹا

بن کر نیچے بوریوں میں گر تا جاتا۔ تھوڑا دور رہٹ چل رہے تھے، جن کو بیلوں کی جوڑیاں چلا رہی تھیں۔ بیلوں کے مسلسل دائرے سے کاریز کی ٹینڈیں کنویں سے صاف شفاف پانی بھر بھر کر نالیوں میں اُنڈیلتی جاتیں پھر یہ پانی چنے اور گندم کی فصلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا باغ کی کیاریوں میں بچھا جاتا۔ یہ سارا منظر دیکھ کر ولیم اپنے ماضی کی تمام کوفتیں بھول گیا۔ اس کے برعکس اگر اب دیکھا جائے تو ان تمام چیزوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے جہاں پر منٹوں کا کام سیکنڈوں میں ہو جاتا ہے۔ اور اب آدمیوں کی جگہ یہ کام مشینوں کی مدد سے کیا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف صنعتیں قائم ہیں:

"بیلنے پر ایک سکھ بیٹھا مسلسل گراریوں کے درمیان گنے ڈال رہا تھا۔ گنے کی ایک طرف سے روہ (جوس) بہہ کر پیپوں میں جا رہی تھی اور دوسری طرف سے گنے کا پیڑھ نکل کر اکٹھا ہو رہا تھا۔ دو بیل بیلنے کی گراریوں کو گھمانے کے لیے پنجابی میں جتے ہوئے مسلسل ایک چکر میں گھوم رہے تھے۔ انھیں وقفے وقفے سے ایک آدمی چھڑی مار کر ہنکاتا جاتا۔ ایک آدمی چُونبے کے کنارے بیٹھا کُڈھن سے اُس میں پیڑھ پھینک رہا تھا، جس کی تیز آگ کڑاھے میں پڑی ہوئی پت کو پکا رہی تھی۔"(۸۲)

ولیم نے اپنی تعیناتی کے بعد جلال آباد اور اس کے گردونواح میں بہت کام کروائے۔ ترقیاتی کاموں کے ساتھ اس نے صنعت کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ کیونکہ ولیم کو اس سرزمین سے بے حد پیار تھا اور اس کی خوشحالی اسے اپنے طرف کھینچتی تھی۔ اُس نے تحصیل کے بڑے زمین داروں سے رابطہ کر کے انھیں شہر میں گھر تعمیر کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ ہندو تاجروں کو اُکسایا کہ وہ اپنا سرمایہ یا پیسہ کپڑے، قالین بانی یا زرعی پیداوار کی خرید و فروخت پر لگائیں۔ جس کے لیے گورنمنٹ انہیں آسانیاں فراہم کرے گی۔ ولیم نے جانسن صاحب کی ہدایات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے رویے میں کافی تبدیلیاں کر لی تھیں لیکن جن کاموں کو وہ شروع کر چکا تھا اُن کی انجام دہی کے لیے اس نے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ تمام مالی اور نہری پٹواریوں سے زمینوں کے گوشوارے منگوائے اور انھیں کہا گیا کہ اگر انھوں نے دیئے گئے ٹارگٹ کے تحت اپنی زمینوں میں فصل کی کاشت اور شجر کاری نہ کی تو اُن کو جرمانے اور زمینوں کی ضبطی کی سزا دی جائے گی ولیم نے کاشت کاری کی صنعت کو فروغ دیا اور رہٹ لگوا کر پانی کا انتظام کیا:

"خاص کر تعلیم اور نہری نظام کے سلسلے میں کسی قسم کی رعایت سے کام نہ لیا۔ جو کام اُس نے انتہائی پھرتی سے مکمل کروا دیے اور کسی کو اُن کاموں پر اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا، اُن میں

سب سے پہلے ولیم نے تحصیل کمپلیکس میں دو تین رہٹ لگوا کر پانی کا انتظام کروا کے کمپلیکس کی راہداریوں اور ارد گرد دور تک ہزاروں ہی درخت لگوا دیے، جو پھل دار بھی تھا اور سایہ دار بھی۔"(۸۳)

ولیم نے جلال آباد میں ترقیاتی کاموں کے ساتھ صنعت کے فروغ کی طرف بھی خاص توجہ دی۔

ناتمام:

ناول میں اماں حاجن کا کردار ایک ایسی عورت کا ہے جو کہ محلے میں رہنے والی تمام عورتوں کی جان ہے اور تمام محلہ ان کو ایسے ہی پیار کرتا ہے جیسے ان کی اپنی ماں یا عزیز ہو۔ اگر وہ کچھ دن کے لیے اپنی بیٹی کے پاس چلی جاتی تو سب محلے والے اُداس ہو جاتے۔ اماں حاجن کو شہر میں فوج کی طرف سے مکان الاٹ ہوا تھا تو جیسے ان کی زندگی کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ پنشن بھی ملتی تھی جو زندگی کی گزر بسر کے لیے کافی تھی۔ کریم احمد بھی کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا تھا۔ چائے کا کھوکھا لگایا تو وہ نہ چلا۔ ریڑھی پر زنانہ کپڑا بیچا آخر میں ایک دوا ساز کمپنی میں بطور سیکورٹی گارڈ تعینات ہوا تو مالی حالات کافی بہتر ہو گئے لیکن کریم احمد پر باہر جانے کی دھن سوار تھی، کہ بس باہر جانا ہے اس ملک میں نہیں رہنا۔ کچھ پیسے خود جمع کیے، کچھ کا بندوبست اماں حاجن نے اپنا زیور بیچ کر کیا اور کریم احمد پاسپورٹ بنوا کر یورپ چلا گیا۔ جاتے ہوئے اماں حاجن کو خواب دکھا گیا کہ جاتے ہی تمہیں بھی بُلوا لوں گا۔ کیونکہ وہاں پہنچتے ہی کریم احمد کو مکان مل جانا تھا، جو ان کے موجودہ گھر سے ہزار درجے بہتر تھا۔ کریم احمد کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ وہاں پر بہت سی کمپنیاں موجود تھیں جہاں پر ملازمت کر کے خوب کمایا جا سکتا تھا:

"اماں کو تو وہ یورپ کے بارے میں کچھ ایسا ہی بتا کر گیا تھا کہ جیسے یہ ہندوستان کے پاس ہی کہیں واقع ایک آبادی ہو جہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے لگتے ہوں گے۔ وہاں ہزاروں کمپنیاں تھیں جو طرح طرح کی نوکریاں لوگوں میں بانٹنے میں جتی رہتی تھیں۔ جب کہ ایک معمولی نوکری سے بھی تنخواہ مل جاتی جتنی یہاں ایک اچھی نوکری بھی سال بھر میں نہ دے پائے۔"(۸۴)

زیرِ نظر اقتباس میں اماں حاجن کا شوہر ان کو چھوڑ کر یورپ اچھے مستقبل اور نوکری کی تلاش میں جاتا ہے۔ کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ یورپ میں بہت سی صنعتیں قائم ہیں جن کی وجہ سے اسے آسانی سے نوکری مل جائے گی۔ اچھے مستقبل کی لالچ میں وہ اپنی بیوی کو اکیلا چھوڑ جاتا ہے اور مرنے کے بعد ہی وطن واپس آتا ہے۔ دوا ساز کمپنی ایک صنعت ہے جس سے بہت سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

میر واہ کی راتیں:

نذیر کا باپ اُسے چاچے کے پاس بھیج دیتا ہے تا کہ وہ کوئی کام سیکھ لے اور آوارہ گردی سے بھی دور رہے لیکن صورتحال اس کے برعکس رہتی ہے۔اُسے وہاں پر ایک شادی شدہ لڑکی نظر آجاتی ہے اور وہ اُس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اس کے علاقے کے چکر لگانے لگتا ہے نذیر اُس کو جس آدمی کے ساتھ دیکھتا ہے اُس سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔نذیر اُس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے دونوں کے درمیان کافی ملاقاتیں ہونے لگتی ہیں۔ اگرچہ چاچے کا گاؤں چھوٹا ہے لیکن نشے کی تمام چیزیں کسی نہ کسی صورت میں مل ہی جاتی ہیں۔چائے خانے تک پیدل جاتے ہوئے نذیر نورل کو کُرید تا رہتا ہے تا کہ اُس لڑکی کے بارے میں معلومات مل جائیں۔چند بڑی گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ بازار سے گزر کر وسیع و عریض نہر کے بند پر واقع ایک چائے خانے تک پہنچے۔سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔چائے خانے کے مالک نے اس بات کا فائدہ اُٹھا کر سڑک پر کرسیاں بچھادی تھیں۔آس پاس کئی خستہ دُکانیں تھیں کسی دُکان میں حجام کام کر رہا تھا تو کسی میں بڑھئی کام کرتا نظر آرہا تھا:

> "نذیر فوراً بھانپ گیا کہ پکوڑا فروش نے اندر ضرور چرس یا بھنگ کا نشہ کیا ہے اسی لیے اس کی یہ درگت بنی ہوئی ہے۔نذیر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس سے چرس کا سگریٹ پلانے کی فرمائش کی۔اس کی فرمائش سن کر پکوڑا فروش نے قہقہہ لگایا اور کسی توقف کے بغیر جیب سے سگریٹ نکال کر اسے خالی کرنے لگا۔اس کے ہاتھ سرعت سے کام کر رہے تھے۔اس دوران وہ چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔چرس کا سگریٹ بنانے کے بعد اس نے اپنے ایک ہاتھ پر دیا سلائی اور دوسرے پر چرس کا سگریٹ رکھ کر اسے پیش کر دیا۔"(۸۵)

اس اقتباس میں چائے خانہ، حجام اور بڑھئی کی دُکان کا تعلق صنعت سے ہے۔ صنعت کا تعلق کسی بڑے کاروبار یا کارخانے سے نہیں ہے ہر وہ چیز جو روزگار کا ذریعہ بنے صنعت ہے۔

کوہِ گراں:

حلیم کو گاؤں واپس آتے ہی اپنا بچپن یاد آنا شروع ہو گیا کہ کیسے گاؤں میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔اُسے اپنے گھر کی وہ باتیں ستانے لگتی ہیں جب اُن کے ہاں ہر دوپہر کو دودھ کی کھیر پکتی جس میں دیسی چینی ڈالی جاتی تھی۔دالان کے پیچھے ایک کمرے کے فرش کو خوب صاف کر کے کھیر درجنوں پلیٹوں میں ڈال کر

فرش پر رکھ دی جاتی۔ کماد پیڑنے کے لیے ان کے دو بیلنے پوری سردیاں چلا کرتے تھے۔ ایک گڑھا کھود کر راب محفوظ کر لیا جاتا اور جانوروں کو کھلانے اور تمبا کو میں ملانے کے کام آتا، اور بعض اوقات یہ ملازموں کو بھی دی جاتی تھی۔ جتنا زیادہ پانی ڈالا جاتا چینی کا رنگ اُتنا ہی زیادہ صاف ہوتا تھا، یہ تناسب مشین کو چلانے والا ہی قائم رکھتا۔ مشین سے چینی نکال کر دریوں پر ڈال دی جاتی۔ دیسی چینی میں کِرک ہوتی تھی لیکن کھیر بدمزہ نہیں ہوتی تھی اور اب یہ کام مشینوں سے لیا جاتا ہے اور باقاعدہ الگ پلانٹ بنے ہوئے ہیں جن میں یہ پورا عمل ہوتا ہے۔ جس کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے جس سے سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

"کماد پیڑنے کے لیے اُن کے دو بیلنے پوری سردیاں چلا کرتے تھے۔ سردی شروع ہونے سے پہلے وہ دو اونٹ اور دھنی کے بیلوں کی ایک جوگ خرید لیا کرتے تھے۔ کڑاہ میں گنے کا رس جب شیرے میں تبدیل ہو جاتا تو اُسے ڈرموں میں ڈال دیا جاتا۔ اُن ڈرموں کو سارا دن کتے اور رات بھر گیڈر چاٹتے رہتے۔ ایک اونٹ چوبیس گھنٹے چلتا تو دوسرا سولہ گھنٹے اور بیلوں کی جوڑی آٹھ گھنٹے، اس طرح تینوں ایک چکر میں چلتے رہتے۔ اُس کا خاندان کم از کم ایک مربع کماد لگاتا۔ جب بیس کے قریب ڈرم شیرے سے بھر جاتے تو چینی بنانے کا عمل شروع ہو جاتا۔ شیرا ابالٹی میں بھر بھر کر مشین میں ڈال دیا جاتا۔ مشین کے ہتھی لگی ہوتی تھی جسے دو آدمی تیز تیز گھماتے۔ ہتھی گراری کو گھماتی جس کے اوپر فلٹر نما ڈرم تھا جس کے کناروں سے شیرا اچھک جاتا۔ چینی بنانے والا پچکاری سے فلٹر پر لگاتار پانی ڈالتا رہتا۔"(۸۶)

گڈو نے حلیم کو جب ناشتہ دیا تو اس کے ذہن میں گُم شدہ تہذیب گھوم گئی کہ کس طرح عورتیں آدمیوں کو ساڑوں کے بیچ میں بیٹھ کر کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ اُس کے خاندان نے جب پہلا ٹریکٹر خریدا تو جوڑی کے ساتھ ہل چلانے والوں نے بہت بُرا منایا تھا کئی گھنٹے ہل چلانے کے بعد جب ڈرائیور تیل، پانی دیکھ رہا ہوتا تو ہالی اُس کا مذاق اُڑاتے اور پوچھتے عطا محمد کیا ہوا؟ تم تھک گئے ہو یا یہ کنجر۔ اگر بیلوں کی جوڑی ہوتی تو ہم دونوں کو مزا آتا۔ یہ ٹریکٹر اپنے وزن سے زمین کو برباد کر رہا ہے بیل ہوتے تو اُن کے گوبر اور پیشاب سے اسی زمین کو زرخیز کرنا تھا۔ عطا محمد نے بھی اُن سے مقابلہ کیا اور کہا جتنی دیر میں تم ایک سیاڑ پورا کرتے ہو یہ ایک کنال میں ہل چلا لیتا ہے۔ جدید ترین ذرائع میں ایک ذریعہ ٹریکٹر بھی ہے اب دیکھا جائے تو لوگوں نے کھیتوں میں پرانے طریقے کو بالکل ختم کر دیا ہے پہلے وقتوں میں بیل ہی ہل چلانے کے کام آتے تھے لیکن اب ٹریکٹر کی مدد سے یہ کام لیا جاتا ہے ناول میں اس کی مثال عطا محمد کا کردار ہے:

"پھر ٹریکٹر مقبول ہونے لگا۔ لوگ عطا محمد سے درخواست کرنے لگے کہ وقت نکال کر اُن کے بھی دو سیاڑ لگا تا جائے۔ عطا محمد نیم شہری اور نیم دیہاتی پیشہ ور ڈرائیور تھا۔ اُس کی بیوی کھیتوں میں اس کا کھانا لے کر نہیں جاتی تھی۔ وہ ناشتہ کر کے ٹریکٹر لے کر نکلتا اور دوپہر کا کھانا گھر میں کھا کر کچھ دیر آرام کرتا۔ سورج غروب ہونے کے قریب وہ ہل چلانا شروع کرتا اور رات دیر تک مصروف رہتا۔ لوگوں کو احساس ہونے لگ گیا کہ کسی بھی نسل کے بیلوں کی جوڑی ٹریکٹر کی رفتار اور طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"(۸۷)

گاؤں میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں لوگوں کو روزگار فراہم کرتی تھیں۔ گنے کے رس سے گڑ بنا کر اسے میٹھے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جب یہی کام بڑی صنعتوں سے لیا جانے لگا تو گنے کے رس سے چینی بنانے کے لیے کیمیکل کا بھی استعمال ہونے لگا جو بہت سی بیماریاں بھی ساتھ لایا۔

دشتِ وفا:

ناول دشت وفا چونکہ بلوچستان کی کہانی ہے اس لیے ناول نگار نے وہاں کی زندگی کے ایک ایک پہلو کو جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چائے ذائقے میں اس قدر لاجواب ہوتی کہ پی کے فرحت کا احساس ہوتا لوگ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ہوٹل کے معیار کی چائے گھر میں کیوں نہیں بنتی۔ تان سین ہوٹل، مشنگ ہوٹل، سندھ مسلم ہوٹل، نرگس ہوٹل، دتو ہوٹل، وکٹری ہوٹل، حمید شاہ کا نشاط ہوٹل، توغی روڈ گلشن ہوٹل، لیاقت بازار کا جنکشن ہوٹل، آرچر روڈ کا شاہجہان ہوٹل، پرنس روڈ کا یزدانی ہوٹل اور بمباٹ ہوٹل، نیو مشن روڈ کا فردوسی ہوٹل، مشن روڈ کا نظام ہوٹل، صرافہ بازار کے ہنگامہ خیز ہوٹل۔ یہ سب ہوٹل ہونے کے ساتھ ساتھ ادارے، پناہ گاہیں، ہنسنے رونے اور گالیاں بکنے کے لیے زندگی کے خفیہ پارک تھے۔ وہاں مکمل آزادی اور خود مختاری تھی، ہر کوئی اپنی زندگی کا مالک تھا۔ لیکن شراب پینے پر پابندی تھی اس لیے لوگ باہر جا کر شراب اور چرس کے سگریٹ پیتے اور دوبارہ ہوٹل میں چلے آتے۔ ناول کے اس اقتباس سے اس کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے:

"کوئٹہ کی چرس کا چار وانگ ڈنکا بجتا۔ یورپ کے سیاح اور ہپی بھی چرس کے رسیا تھے۔ چرس پی کر شہر میں آنکھیں سرخ کئے گھومتے پھرتے۔ ذوق ایرانی اور حسن کے رسیا ان کے گرد دیوانہ وار منڈلاتے۔ چرس کے سگریٹ پیش کرتے۔ بہ اصرار بٹھاتے اور خاطر تواضع کرتے۔ کالے کالے توے جتنے پتھر کے ریکارڈ کسی بھی ہوٹل کی کامیابی کی ضمانت تھے۔ ہوٹلوں والے پانی میں ڈوڈا

پہلے ہی ابال کر شامل کر لیتے۔ سماوا میں بھنگ ملا پانی محفوظ رہتا۔"(۸۸)

زیرِ نظر اقتباس میں ہوٹل کو ایک صنعت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس سے بہت سے لوگوں کا روز گار جُڑا ہوا ہوتا ہے۔ ناول نگار نے بلوچستان کے بیشتر ہوٹلوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے ماحول کو بھی بیان کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قاری وہاں خود موجود ہے اور اپنے آپ کو ان ہوٹلوں میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ ناول میں ہوٹل کی صنعت کا ذکر ہے جس کی بدولت باہر کمانے والے مردوں کو گھر سے دور ہونے پر کھانے کی پریشانی نہیں ہوتی ساتھ ہی عورتیں بھی اگر گھر کھانا پکانا نہ چاہیں تو ہوٹل سے کھانا کھا سکتی ہیں۔ گھر میں مہمان نوازی اور خود کھانا بنا کر کھلانا ہماری ثقافت کا حصہ ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب ہوٹلوں میں کھانے کا رواج زور پکڑ چکا ہے۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

ناول چار درویش اور ایک کچھوا میں ناول نگار منڈی بہاؤ الدین کے نواح میں ایک گاؤں سے ناول کا آغاز کرتا ہے۔ جہاں کھیتوں کی حد بندی کے لیے ٹاہلی کے درختوں کی ایک لمبی قطار تھی جس کے دونوں جانب کھیت ہیں۔ اگر کوئی آسمان سے دیکھے تو یہ قطار کچھ عجیب سی لگے گی۔ کیونکہ ان علاقوں میں درختوں کی ایسی قطاریں سڑک یا نہر کے کنارے ہوتی ہیں۔ ٹاہلی کے درختوں سے ہٹ کر بد گر کا ایک درخت ہے۔ بر گد کا درخت بہت گھنا اور پرانا ہے، آسمان سے دیکھنے سے یہ درخت بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ ناول نگار نے دکھایا ہے کہ کیسے ٹریکٹر زمینوں کو نرم کرنے کے لیے کھیتوں میں چل رہے ہیں۔ یہ جدید ترین ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے کیونکہ پہلے کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے ٹریکٹر کی جگہ بیل کام آتے تھے، لیکن جیسے جیسے جدید ترین ذرائع آتے گئے لوگوں نے اپنی آسانی کے لیے انہیں اپنانا شروع کر دیا:

> "میں آپ کو منڈی بہاء الدین کے نواح میں ایک گاؤں کے کنارے لے آیا ہوں، جہاں ہر طرف کھیت ہیں۔ ان کھیتوں میں ان دنوں کوئی فصل نہیں۔ کڑی دوپہر ہے اور بس چند ہی کھیتوں میں ٹریکٹر سے زمین نرم کی جا رہی ہے۔ باقی دور دور تک بندہ ہے نہ بندے کی ذات۔ پرندے بھی اس وقت اپنے اپنے گھونسلوں میں جا گھسے ہیں۔ بس کچھ کوے ہیں جو اِدھر اُدھر کائیں کائیں کرتے پھرتے ہیں۔"(۸۹)

ٹریکٹر کی صنعت نے زراعت کے میدان میں بہت ترقی کی ہے۔ جس سے ہل چلانے میں مدد ملتی ہے لیکن ساتھ ہی پٹرول کے دھوئیں نے ماحول کو آلودہ کر دیا ہے۔ پہلے بیلوں کی وجہ سے کام بے شک دیر سے ہوتا تھا لیکن وہ ماحول دوست تھے ان کے فضلے سے کھاد کا کام بھی ہو جاتا تھا۔

پانی مر رہا ہے:

میاں اللہ یار کے گھرانے کا گاؤں میں کافی اثر و رسوخ تھا۔ گاؤں میں موجود بھوریوں کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے رقبے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا میاں اللہ یار کے چھیاسٹھ ایکڑ بھوریوں کے اس طرف تھے اور چوالیس ایکڑ دوسری طرف۔ درمیان میں چھ ایکڑ کا ریتلا ٹکڑا اگر قابلِ کاشت بنا لیا جاتا تو یہ خوبصورت ترین قطعہ اراضی بن سکتا تھا۔ اللہ یار کے تصور میں ہر وقت یہ خیال سمایا رہتا کہ وہ اس زمین کو ریتلے جسم والا ناگ تصور کرتا جس کے چمکتے بدن پر روسی ٹریکٹروں کی مدد سے ریت کی ٹرالیاں بھر بھر کر پہنچی جاتی اور پھر اس ناگ کی کینچلی کے نیچے سے اس کا جسم نمودار ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو اُن کھیتوں میں ایک مطلق العنان بادشاہ کی سی بے نیازی سے پھرتے ہوئے دیکھتا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس زمین کے بارے میں عجیب باتیں مشہور کر رکھی تھیں۔ میاں اللہ یار اپنی زمین کا جائزہ لینے کے لیے اپنے بیٹوں کے ساتھ جاتا تھا جہاں پر راستے میں باپ بیٹوں کی زمین کو لے کر بہت سی باتیں ہوتی تھیں:

> "اونئیں، اونئیں، ایسی کوئی جادوئی بات نہیں، جو تو مجھے اتنا چبا چبا کے بتا رہا ہے۔ بات ساری اتنی ہے کہ اس وقت ٹریکٹر نہیں تھے اور ٹریکٹر جب تک نہیں آئے تھے، زمیندار ٹنڈا تھا۔ کتنی جوڑیاں لگاتا ان ٹبوں کو سیدھا کرنے کے لئے؟ اور ٹوبے دیکھے ہیں؟ میرے، میرے جتنے تو گہرے ہیں۔ اتنی ریت کون کھینچتا؟ ورنہ عقل کی بات یہ ہے کہ بھئی پاگلو! زمین دو حصے کر رکھی ہے کیوں۔"(۹۰)

بیلوں کی جوڑی کی جگہ اب زمینوں میں ٹریکٹروں اور ٹرالیوں نے لے لی ہے جس کی مدد سے کم وقت میں زیادہ کام بہتر طریقے سے لے لیا جاتا ہے۔ لیکن ماحول دوست نہ ہونے کی وجہ سے نقصانات بھی ہیں۔ فصل کے کٹنے پر جو میلے کا سماں ہوتا تھا وہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔

گراں:

گاؤں میں دس گھرانے تھے، جہاں پر موجود عورتیں اپنے گھروں میں ہی چکی پر آٹا، مرچ اور باقی ضرورت کی چیزیں پیس لیا کرتی تھیں لیکن جیسے جیسے وقت بدلتا گیا ویسے ویسے جدت آتی گئی۔ گاؤں میں بھی

آٹا پیسنے کی مشین لگ گئی لوگوں نے آرام پسند ہونا شروع کر دیا اور گھر کی عورتیں بھی گھر کے کاموں سے بھاگنے لگیں۔ گھر میں محنت کرنے کی بجائے گندم کو مشین سے ہی پسوانا شروع کر دیا، جو چیزیں لوگ ایک عرصے تک استعمال کر رہے تھے ان کو ترک کر دیا گیا۔ گھروں میں چکی پیسنے کا رواج کم ہونے لگا۔ عورتوں کے سامنے ادھ کوٹے باجرے کے سٹے بکھرے تھے۔ عورتیں قصے ختم کر کے سٹوں کو کوٹ رہی تھیں۔ گندم کی بوری بوری ہر گھر میں بچ رہی تھی جو مہمانوں کے لیے سنبھال کر رکھنی تھی اور مکئی اور باجرے پر گزارا کرنا تھا۔ ان مہینوں میں گندم کی روٹی امیر لوگوں کو ہی دستیاب ہوتی تھی:

"کرانچی تیار کھڑی تھی۔ بیل سامنے جوت دیئے گئے تھے۔ گراں کے دس گھرانوں سے ایک ایک بوری مکئی اور ایک ایک باجرے کی رکھی جا رہی تھی۔ باوالہراسب یہ اناج جندر پر پسوائی کے لیے لے جا رہا تھا، جب سے پسائی والی مشین ساگری گراں میں لگی تھی۔ گھروں میں چکی پسینے کا رواج کم ہو چلا تھا۔ اور عورتوں کی ہتھیلیوں اور پوروں پے بنے گٹے اب چھوٹی چھوٹی گرہیں بن کر رہ گئی تھیں۔ اب صرف دالیں اور مرچ نمک ہی چکی پر پیسا جاتا تھا۔"(۹۱)

گاؤں کے لوگ جب تک باہر کے ممالک میں نہیں گئے تھے تو وہاں ہر طرف ہریالی تھی۔ کیونکہ وہاں پر موجود لوگ اسی پیشے سے منسلک تھے لیکن اب صنعتوں اور زراعت کو زوال آنے لگا تھا۔ پہلے کھیتوں میں بیل دیکھنے کو ملتے تھے لیکن اب ان کی جگہ جدید مشینوں نے لے لی ہے۔ گاؤں کی ہریالی ختم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے ان جگہوں پر ہوٹل اور دوسرے کاروبار شروع کر دیئے ہیں۔ بوڑھے اُن جگہوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں جہاں پر اب کوئی فصل نہیں اُگائی جا سکتی۔ جن کی قیمت کا تخمینہ لگانے کے لیے ادھر یورپی طرز کے نئے شہر اسلام آباد سے انوسٹر آنے لگے تھے۔ ناہموار ڈھلانوں اور بنجر زمینوں کی بھی قیمت لگنے لگی تھی۔ رہٹ خشک ہونے لگے تھے، ٹریکٹر اور موٹریں متعارف ہو گئیں تھیں۔ عورتیں اور بوڑھے پرانے وقتوں کو یاد کر کے دُکھی ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"محمد اکرم کو فسٹ کلاس میٹرک کا کچھ تو فائدہ پہنچنا تھا، جب بارہ ایکڑ زمین کو اُس نے "جٹ زرعی فارم" کا نام دیا تھا۔ اُس کی فصل کو ماڈل کھیت کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ جدید زرعی طریقے ٹریکٹر تھریشر کا اِستعمال گاؤں میں اُسی نے متعارف کروایا تھا۔ پتہ نہیں گھر کا پکا ہوا کھانا مُدتوں بعد ملا تھا، یا چاول اُنگلیوں سے کھا کر اُنھیں منہ سے صاف کرنے کا طریقہ کسی خفتہ یادگار کی بازیافت تھی۔ انکل NZD نے چاولوں کی پلیٹ ختم کی اور اُنگلیاں چاٹیں۔"(۹۲)

صنعتوں کے کچھ نقصانات کے باوجود فائدے بھی ہیں محمد اکرم اپنا زرعی فارم بنانے میں ٹریکٹر اور تھریشر کے استعمال سے ہی کامیاب ہوا ہے۔ محمد اکرم نے جدید زرعی طریقے ٹریکٹر تھریشر کا استعمال گاؤں میں متعارف کروایا اور اپنے بارہ ایکڑ زمین کو اُس نے جٹ زرعی فارم کا نام دیا۔

د۔ کمرشلزم و صارفیت:

کمرشلزم و صارفیت کو فروغ دینے میں ذرائع ابلاغ اور جدید ٹیکنالوجی نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اشتہار سازی اور مارکیٹنگ کے نت نئے طریقے لوگوں میں ضروریات اور خواہشات پیدا کرنے کے کا اہم ذریعہ ہیں اور پھر ان کے ساتھ ان خواہشات کی تکمیل کو مخصوص اشیاء کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ اکثر اشتہارات میں ہم Just do it کے الفاظ دیکھتے اور سُنتے ہیں۔ یہ الفاظ صرف اشتہارات کا حصّہ نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسے طریقے کی علامت ہوتے ہیں جو فرد کے اندر مخصوص امریکی مصنوعات کے لیے ضرورت اور خواہش پیدا کریں اور آج کے دور میں یہ ضرورت مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اور دیگر غیر ملکی ایجنسیاں اشتہارات کے ذریعے آئے روز نئی اشیاء کو نہ صرف متعارف کرواتی ہیں۔ بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ اگر ان کی مصنوعات کو نہ خریدا گیا تو ہم کوئی اہم چیز کا نقصان کر لیں گے۔ بروقت عوام کے ذہن میں اس خیال کو بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تشہیر کی جانے والی اشیاء ان کے لیے کس حد تک ضروری ہیں حالانکہ انسان کو خود اپنی ضروریات کا زیادہ اچھے سے اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک فرد اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نے کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنا ہے، کس شیمپو سے نہانا ہے اور ناشتے میں کیا لینا ہے۔ لوگ ایک جیسی چیزوں کے اشتہار ٹی۔ وی پر دیکھتے ہیں، روز کے اخبار میں آدھے صفحات ان اشیاء کے اشتہارات سے بھرے ہوتے ہیں۔ پھر دفتر، سکول، کالج یا یونیورسٹی جاتے ہوئے اکثر سڑکوں پر بڑے بڑے سائن بورڈ پر بھی یہی اشتہارات ہوتے ہیں جو کہ دیکھنے والے کو بتا رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں ان اشیاء کی اشد ضرورت ہے اور ایک فرد کی حیثیت عصرِ حاضر کے معاشرے میں محض صارف کی رہ گئی ہے جس کا مقصد صرف اشیاء پر خرچ کرنا ہے۔

پوری اشتہارات کی صنعت محض دھوکہ ہے، پراڈکٹ جو نہیں ہوتی، وہ زبردستی بنا کر پیش کی جاتی ہیں۔ اشتہار بازی کا اصل ہدف انسانوں میں ایک بے اطمینانی پیدا کرنا ہے جس کا حل پھر وہ پراڈکٹ ہوتی ہیں جس کو کوئی کمپنی بیچنا چاہتی ہے۔ مثلاً ایک کچن صاف کرنے کی پراڈکٹ کو اس طرح فروخت کیا جائے کہ ایک بہت ہی صاف ستھرا گھر دکھا کر کسی شخص کی صاف گھر کی محرومی کو اُجاگر کیا جائے اور پھر اس پراڈکٹ کو ایک

صاف گھر کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ اور اگر یہ حملہ کارگر نہ ہو تو اگلے مرحلے پر ثابت کیا جائے گا کہ اس کے کچن میں بڑے جراثیم ہیں۔ اسی طرح بڑی بڑی گاڑیاں لوگ اس لیے نہیں خریدتے کہ ان کو ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس لیے خریدتے ہیں کہ ان کو خریدنے والا انسان بڑا انسان ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر میرٹ پر دیکھا جائے تو نہ لوگوں کو ان گاڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ماحول اس کی اجازت دیتا ہے۔

اشتہارات کے ذریعے انسان کی ضروریات کو مزید بڑھایا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ کی وجہ سے تمام معاشروں کے افراد ٹی وی، موبائل فون، کارڈلیس، جینز، فاسٹ فوڈ اور اس کے علاوہ سب کچھ چاہتے ہیں جن کی تشہیر کی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں صارفین ہمیشہ اپنی ادھوری خواہشات کے جال میں الجھے رہتے ہیں، اسی وجہ سے عدم اطمینان اور بے سکونی بڑھ رہی ہے۔ باہمی احترام اور اقدار وروایات کی اہمیت اب افسانہ ماضی ہو چکی ہیں۔ تمام افراد ریس کے جانوروں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں اور ہر وقت ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ مارکیٹ میں موجود نئی نئی چیزوں کو حاصل کرنے کا حصول مسلمانوں میں عدم مساوات، لالچ اور احساسِ محرومی کو جنم دے رہا ہے۔ اشیاء کا حصول جب جائز طریقوں سے ممکن نہ ہو تو پھر بدعنوانی اور جرائم کا راستہ کُھل جاتا ہے۔ ہر روز اخبارات میں ڈاکے، چوری اور قتل وغارت کے متعدد واقعات شائع ہوتے ہیں۔ ان واقعات کے پیچھے زیادہ تر صارف کلچر سے پیدا ہونے والی خرابیاں مثلاً اخلاقی بے راہ روی، احساس محرومی، مادہ پرستی، نااُمیدی اور لالچ کارفرما ہوتی ہے۔

صحت کے معاملے پر بھی یہ صارفیت اثرانداز ہو رہی ہے، اب انسان کو صحت مند اور فٹ رہنے کے لیے منرل واٹر، جوگنگ شوز اور وٹامنز وغیرہ کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اور صحت کے لیے روایتی طریقے غائب ہو گئے ہیں۔ مارکیٹ میں بے فائدہ اور مصنوعی چیزوں کی بھرمار ہے۔ بچوں کے لیے ٹافیاں، بسکٹ اور چاکلیٹس کو صحت اور طاقت کا ذریعہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس طرح بچوں کے لیے بیکری کی اشیاء زیادہ پرکشش بن گئی ہیں اور ان بے فائدہ اور صحت کے لیے نقصان دہ چیزوں پر بے تحاشا پیسہ خرچ کر کے ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔ دوسری طرف خریدنے اور خرچ کرنے کے رجحان کو بڑھانے میں اہم کردار میڈیا ادا کر رہا ہے اس میں پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں طرح کا میڈیا شامل ہے۔ روز کے اخبار میں آدھے سے زیادہ صفحات مختلف اشتہارات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر فیشن میگزین، کھانے پکانے کی ترکیبوں اور آرائشِ حُسن کی کتابوں میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح الیکٹرانک میڈیا خصوصاً ٹی وی چینلوں پر اشتہارات کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ سامعین کو ایسے لگتا ہے کہ وہ کسی منڈی میں بیٹھے

ہوئے ہیں۔ کوکنگ شو جو کہ کبھی کسی ایک آدھ چینل پر لگتا تھا اور وہ بھی ہفتے میں کوئی ایک دن مقرر ہوتا تھا، لیکن اب کیبل، ٹی وی اور زیادہ چینلوں کی وجہ سے متعدد چینلز کوکنگ شو پیش کرتے ہیں اور ان کوکنگ پروگراموں میں کھانا پکانے کے لیے نت نئی چیزوں کا استعمال سکھایا جاتا ہے جو سب کی سب ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات ہوتی ہیں۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کمرشلزم وصارفیت اگرچہ تمام دنیا کے لیے نقصان دہ ہے لیکن مسلم دنیا کو فتنہ صارفیت کے ذریعے اخلاقی اقدار، مذہبی اقدار اور مقصدِ زندگی سے دور کیا جارہا ہے۔ مغربی مصنوعات کی فروخت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے جس کا تمام تر فائدہ مغربی ممالک اٹھا رہے ہیں۔

کاروانِ وجود:

ناول میں سارہ کا کردار ایک شادی شدہ اور بولڈ لڑکی کا ہے وہ اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں سے بھی بے حد پیار کرتی ہے۔ اسے اپنے شوہر کی وفا پر یقین ہوتا ہے اس لیے وہ کبھی اس پر شک نہیں کرتی۔ سارہ کی ایک دوست اُسے اُس کے شوہر کے بارے میں بتاتی ہے لیکن وہ پھر بھی اُس کی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ سارہ کانفرنس کے لیے باہر کے ملک جاتی ہے تو پیچھے سے رضا بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ شکیلہ جو کہ سارہ کی دوست ہے وہ اُسے رضا اور بچوں کے بارے میں پل پل کی خبر دیتی رہتی ہے اور اُسے بتاتی ہے کہ بچے ہارلکس بہت شوق سے پیتے ہیں۔ آج کل بچے اور بڑے دوسروں کی دیکھا دیکھی ڈبہ بند چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پہلے گائے کے دودھ کو ہی صحت کا ضامن سمجھا جاتا تھا لیکن میڈیا کے اثرات پڑنے سے مختلف چیزوں کو اشتہارات کے ذریعے سامنے لایا جانے لگا ہے اور لوگوں میں اس کا استعمال عام نظر آنے لگا ہے۔ شکیلہ سارہ کو بتاتی ہے کہ پھل کھانے سے اور ہارلکس پینے سے بچوں کی صحت اچھی ہورہی ہے اور رضا بھائی کے چہرے پر بھی رونق آگئی ہے۔ اس اقتباس سے اس بات کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے:

> "شکیلہ نے اتنے روز سارہ کو خط ہی نہ لکھا۔ ہارووڈ چھوڑنے سے پہلے سارہ کو اس کا خط ملا تو معلوم ہوا کہ مہمانوں اور مکان کی مرمت کی وجہ سے فرصت ہی نہ ملی۔ لکھا تھا "ہاں تو بھئی قصہ یہ ہے کہ کامران، سکندر اور رضا بھائی کی صحت بڑی اچھی ہورہی ہے۔ رضا بھائی ہنستے ہیں تو چشم بد دور چہرہ بالکل بدل جاتا ہے۔ کامران سکندر ہارلکس پیتے ہیں اور بڑی تیزی سے انگور اور انار سے شوق فرماتے ہیں۔"[۹۳]

زیرِ نظر اقتباس میں سارہ کی دوست شکیلہ اسے خط میں آگاہ کرتی ہے کہ بچے ہارلکس پیتے ہیں اور پھل کھاتے ہیں جس وجہ سے ان کی صحت اچھی ہو گئی ہے یہ سب کمرشلزم کی وجہ سے ہے۔ اپنی چیز بیچنے والا اس چیز کو اتنا دلکش بنا کر پیش کرتا ہے کہ صارف خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے:

ولائیت سے واپسی پر احمد بخش کا شاندار استقبال کیا گیا۔ جب احمد بخش ولائیت میں تھا تو اُس نے حویلی میں اپنے استعمال کے لیے واش روم بنوایا تھا تاکہ جب اُس کے بچے اور بیوی آئیں تو اُن کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ احمد بخش نہانے کے لیے غسل خانے میں گیا، اسے معلوم تھا کہ صفر نے اُس کا سامان کہاں رکھا ہو گا۔ چاچے سے تولیا لینے کے بعد وہ نہانے کے لیے چلا گیا غسل خانہ جدت کا شاہکار تھا اور اُس کی بڑی کھڑکی پر کوئی پردہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں پر کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ غسل خانے کی ہوا کو صاف رکھنے کے لیے پیچھے کھلی زمین چھوڑی گئی تھی۔ ایسا صرف دیہات میں ہی ممکن تھا اور وہ بھی ایک زمیندار کے گھر میں۔ جدید طرز پر بنا غسل خانہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی کافی جدت آگئی تھی وہاں پر بھی کافی دُکانیں کھل گئی تھیں جہاں پر ڈبوں میں بند گھریلو استعمال کی چیزیں مل جاتی تھیں جن میں سگریٹ، پان، پیسے ہوئے مصالحہ جات، آٹا اور بے شمار چیزیں شامل تھیں۔ یہ سب کمرشلزم و صارفیت کی دین تھا:

> "احمد بخش نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک نظر کھڑکی پر ڈالی جو اس رخ کھلتی تھی جدھر سے وہ حویلی میں آیا تھا اور جدھر بہت کچھ تھا، کھیت، جھونپڑیاں، کافی فاصلے پر اُگے ہوئے درختوں کی لائن جن کے بیچ میں نہر بہتی تھی اور اگر بنو کیولرز لے کر کھڑا ہو جائے تو مین روڈ پر الٹے ہاتھ کو وہ جگہ تھی جسے لوگ اسٹانڈ (stand) کہتے تھے، جہاں بسیں رکتی تھیں۔ بڑی نہر کے پاس مسجد تھی، سگریٹ پان کا ایک کیوسک تھا۔ ممکن ہے اب زیادہ ہوں۔ کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں تھیں اور ایک بنیے کی ریزگی کی دکان، ایک چکی اور مین روڈ سے ہٹ کر گاؤں اور حویلیوں کو جانے والے تانگے کھڑے ہوتے تھے۔"(۹۴)

گاؤں کے باہر دھنی بخش فروٹ فارم اور پولٹری فارم کے بورڈ لگے ہوئے تھے لیکن اب وہ بہت پرانے ہو چکے تھے کیونکہ دھنی بخش کے بعد وہاں نہ پولٹری فارم ہے اور نہ ہی کوئی فروٹ فارم۔ ڈالڈا گھی اور فارمی انڈوں کا اب ان لوگوں میں کوئی رواج نہیں تھا۔ احمد بخش گاؤں واپس آنے کے بعد کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا لیکن چائے پی لیتا تھا اور بنانے والے سے کہتا تھا کہ خوب گرم کر کے لاؤ تاکہ جراثیم مر جائیں۔ پھل وہ

رغبت سے کھاتا کیونکہ اُسے کافی عرصے بعد واپس آنے کی وجہ سے کھانے کی ہر چیز مسئلہ کر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ پینے کے پانی کے ٹن اپنے ساتھ لے کر آیا تھا تاکہ اُس کو یہاں رہنے میں کسی قسم کا مسئلہ نہ ہو۔ اپنے وطن کا پانی اُسے راس نہیں آرہا تھا اور جب وہ ٹن کھولتا تو سب کو حیرت ہوتی:

"یہ سب کو معلوم تھا اپنے وطن کا پانی اب اسے نہیں لگ رہا تھا اور آتے ہی وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ اپنے ساتھ وہ پینے کے پانی کے ٹن لے کر جاتا تھا جو یہاں پہنچنے کے بعد اس نے کراچی سے لیے تھے اور جنھیں کھول کر پانی پیتے دیکھ کر ہر گھر والا اس پر تعجب کرتا تھا لیکن اعتراض کسی کو نہیں ہوتا تھا۔"(۹۵)

احمد بخش وطن واپس آتا ہے تو وہ حویلی میں تمام اُن اشیاء کا استعمال کرتا ہے جس سے زندگی آسان ہو۔ اس کا جدید طرز پر بنا ہوا غسل خانہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اب عورتیں بھی گھر میں مصالحے پینے کی بجائے ڈبہ بند چیزوں کا استعمال کرتی ہیں جن کے اشتہار وہ الیکٹرانک میڈیا پر دیکھتیں ہیں۔ صابن تک وہ استعمال کیا جاتا ہے جو خوبصورت لڑکی کمرشل میں استعمال کرتی ہے صارف کی نفسیات کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ احمد بخش بھی بوتل کا پانی استعمال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

روشن اندھیرے:

ندیم شجاع کا دوست ہے اور اس کے ہی ادارے میں وہ بھی کام کرتا ہے۔ شجاع نے ندیم کو اپنے دوست سے باتیں کرتے سُن لیا تھا بعد میں شجاع نے اُس سے استفسار کیا تو ندیم شرمندگی کی وجہ سے پہلے تو چُپ رہا۔ لیکن شجاع کے بار بار اصرار کرنے پر اُس نے ساری بات بتا دی جس پر شجاع نے اُسے کہا کہ تمھاری کوئی غلطی نہیں بلکہ وہ لڑکی تم جیسے اچھے انسان کی قدر نہ کر سکی۔ ندیم نے شجاع سے کہا کہ میں اچھا آدمی بننے کی کوشش کروں گا اور وہ قریبی دُکان سے سوڈا لانے کے لیے چلا گیا۔ پھر دونوں میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ندیم نے شجاع کو دفتر چھوڑنے کا کہا تو اس نے گاڑی دفتر کی طرف موڑ لی۔ شجاع نے زارا کے گھر جانا تھا اُس کے بعد وہ زارا کے گھر گیا تو اُس کی ملازمہ نے اُسے زارا کے بیڈ روم میں بھیج دیا۔ زارا بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی دور سے ہی اُس نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ شجاع کو آصف نے ساتھ ڈنر پر چلنے کے لیے کہا لیکن اُس نے کہا کہ میں وہاں کیا کروں گا تمہارے تو وہاں دوست ہیں۔ ندیم اور آصف کا کردار ناول میں مختصر وقت کے لیے منظر عام پر آتا ہے، آصف شجاع کا بہت ہی پرانا اور اچھا دوست تھا اس کے لیے کسی بندے سے بات اگلوانا یا اغوا کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کھانے کے لیے انھوں نے آواری ہوٹل کا انتخاب کیا:

"اسی شام جب میں آفس سے نکلنا چاہ رہا تھا کہ عامر کا فون آ گیا۔ اس نے آواری میں اپنے چند ایسے کاروباری دوستوں کو ڈنر دینا تھا جنھوں نے حال ہی میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ میں اور حسن بھی اس ڈنر میں شامل ہو جائیں۔" (۹۶)

زیرِ نظر اقتباس میں عامر اپنے کاروباری دوستوں کو ہوٹل میں ڈنر کے لیے بلاتا ہے۔ ہوٹل والے بھی صارف کے اندر اشتہا بڑھانے کے لیے اپنی ایڈورٹائزنگ کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگ گھر میں کھانا بنانے کی بجائے ہوٹل میں دعوت کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

صفر سے ایک تک:

ناول میں ذکی ایک منشی کا بیٹا ہے جو کہ کمپیوٹر کی دنیا سے تعلق رکھنے والا ایک لڑکا ہے، جس کی انٹرنیٹ کے ذریعے ایک لڑکی سے دوستی ہوتی ہے جس کا نام زلیخا ہے جو کہ ناول کی ہیروئن ہے۔ زلیخا ناول میں زیادہ تر ای میل کی صورت میں ہی سامنے آتی ہے۔ مختصر وقت کے لیے وہ ذکی سے لاہور ملتی ہے اور ناول کے اختتام میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔ لاہور میں اُس کی ذکی سے ملاقات سالاروں کی ایک پارٹی میں ہوتی ہے۔ ذکی ای میل کے ذریعے اُس کو اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کے بارے میں بتاتا رہتا ہے اور زلیخا بھی اپنے دن بھر کے واقعات سے ذکی کو آگاہ کرتی رہتی ہے۔ زلیخا چاہتی ہے کہ ذکی اپنے پروفیشنل کام میں باقاعدہ دلچسپی لے تو ذکی ایک سافٹ ویئر ہاؤس میں نوکری کر لیتا ہے۔ ذکی زلیخا کو بتاتا ہے کہ میں ذاتی زندگی میں کافی پرانے خیالات کا مالک ہوں۔ ذاتی زندگی میں پرانے قسم کا ٹیلی فون استعمال کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا اگرچہ کمپنی کے تمام کاموں کے سلسلے میں اُسے درجنوں ای میل سے واسطہ پڑتا تھا لیکن وہ سب اُس کا سٹاف دیکھتا تھا۔ اس لیے چند دن تو اُسے زلیخا کی ای۔ میل کے بارے میں بھی پتہ نہ چلا۔ زلیخا کی اچانک پیرس روانگی کے بارے میں بھی ذکی کو سالار صاحب سے پتہ چلتا ہے:

"سب سے پہلے تو مجھے یہ واضح کرنا چاہیے کہ اگرچہ biome یعنی جس ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی میں میں کام کرتا ہوں اُس میں لوگ کافی کا کپ لینے یا پانی کا گلاس اُٹھانے میں بھی کسی نہ کسی طرح کمپیوٹر اور شاید انٹرنیٹ کا استعمال کر لیتے ہیں لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ میں اس معاملے میں ابھی تک کافی پرانے خیال کا آدمی ہوں۔" (۹۷)

کمرشلزم و صارفیت کی وجہ سے ہی لوگوں میں خود کو بہتر سے بہترین ثابت کرنے کی خواہش نے جنم لیا ہے۔ سالاروں سے متواتر تیسرے حملے کے بعد ذکی کچھ دن کے لیے اپنے بھائی جان ثناء اللہ کے پاس چلا جاتا

ہے۔ کیونکہ اُن حملوں کا اُس کے ذہن پر بہت بُرا اثر پڑا تھا ذکی کو ہر وقت وہ آوازیں تنگ کرتی تھیں۔ بھائی جان کے پاس جانے کے بعد وہ اُسے غسل خانے لے گئے تاکہ وہ تازہ دم ہو جائے۔ بھائی جان جب باہر چلے گئے تو پہلی دفعہ غسل خانے کی شان و شوکت کا ذکی کو احساس ہوا۔ غسل خانے میں فنِ تعمیر کی جانب سے مہیا کردہ ہر سہولت موجود تھی۔ رنگ برنگے قیمتی پتھروں سے بنی تسبیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ گاؤں میں موجود غسل خانے کی حالت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان باہر سے آنے والے خیالات کا کس قدر گرویدہ ہوتا ہے:

"غسل کی تمام ممکنہ سہولیات اور حالت غسل میں "مبتلا" اپنے جسم کو ہر سمت سے عیاں دیکھنے کے لیے آمنے سامنے نصب قد آدم آئینے یعنی واش بیسن کے وسیع و عریض آئینے کے علاوہ اور اُس کے دونوں جانب غیر ملکی کمپنیوں کے صابون۔ خوشبویات ہر قسم مردانہ وزنانہ۔ ہیر برش اور ہیر آئل۔ لیکن قیمتی تیلوں اور لوشنز کے پیچھے چُھپی ہوئی کوڑے تیل کی ایک شیشی بھی میں نے دیکھی۔ جو صاحب غسل خانہ کی ثقافتی اصل کی یاد دلاتی تھی۔"(۹۸)

کمرشلزم نے جہاں بہت سی چیزوں کو متعارف کروایا ہے وہیں صارف کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے ان کو اس قدر عادی کر دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں کے بغیر اُدھورا تصور کرتا ہے۔ ذکی اپنے بھائی کے گھر جاتا ہے تو ان کا غسل خانہ ان تمام چیزوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے جن کو وہ ٹی وی پر دیکھتا ہے۔

نو لکھی کوٹھی:

شاہ پور گاؤں شیر حیدر کی ملکیت تھا جس کو اس کے دشمنوں نے قتل کر دیا تھا اور شیر حیدر کے قتل کے بعد گاؤں کی دیکھ بھال کا کام اس کے بیٹے غلام حیدر کا تھا۔ غلام حیدر کو اُس کا باپ بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا لیکن اُس کی زندگی نے وفا نہ کی اور گاؤں کی ذمہ داری کا بوجھ غلام حیدر کے کندھوں پر آ گیا۔ شاہ پور، جلال آباد کے شمال میں دس میل کے فاصلے پر واقع تھا، اور اس کی آبادی تین سو کے قریب تھی ساری آبادی مسلمان تھی۔ پورا گاؤں شیر حیدر کی ملکیت ہونے کی وجہ سے جوں کا توں غلام حیدر کی طرف منتقل ہو گیا۔ غلام حیدر کا آبائی گھر بھی شاہ پور میں تھا۔ چھوٹی اینٹوں سے بنی قلعے جیسی حویلی تھی جس کا بیرونی دروازہ ہاتھیوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ گاؤں اردگرد کے تمام گاؤں سے زیادہ خوشحال تھا۔ گاؤں میں سکولوں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے غلام حیدر کو پڑھنے کے لیے شہر جانا پڑا۔ دیہات میں سکول نہ ہونے کے برابر تھے اور اگر تھا بھی تو سکول کے لیے کوئی مخصوص جگہ نہیں ہوتی تھی دیہات میں کھلی جگہ زمین پر ہی بچوں کو پڑھایا جاتا تھا لیکن بعد میں

باقاعدہ ایک حکمت عملی کے تحت سکول بننے لگے جس میں سکول کی عمارت کو باقاعدہ ایک مخصوص ڈیزائن کے تحت بنایا جانے لگا۔ یہی حال شاہ پور میں واقع سکول کا بھی تھا جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

"اسی گاؤں میں ایک پرائمری کے درجے تک اسکول بھی تھا۔ اسکول کی عمارت تین ہی کمروں پر مشتمل تھی لیکن اس عمارت اور سکول کی بیرونی دیوار سے بھی انگریزی وقار جھلکتا تھا۔ تمام عمارت پختہ سُرخ اینٹوں سے بنی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پاپولر اور سنبل کے بے شمار درخت بھی تھے، جن کی شاخوں اور چھاؤں کے گھیراؤ میں ساری عمارت چھپ گئی تھی۔ مگر مولویوں کی کرم فرمائی سے بچوں کی تعداد بیس سے نہ بڑھ سکی۔"(۹۹)

لوگ اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں میں پڑھانا اعزاز سمجھتے ہیں سکول داخلے کے وقت مالکان ٹی وی پر اپنے اشتہارات چلاتے ہیں اور لوگوں کو حسین خواب دکھاتے ہیں کہ آپ کا بچہ یہاں سے کامیاب انسان بن کر نکلے گا۔

ناتمام:

صائمہ کو کالج سے چھٹیاں تھیں تو ان دنوں میں اس نے ایک پاس کے بیوٹی پارلر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ جہاں اُس کی دوست کی باجی بھی کام کرتی تھیں۔ صائمہ کو سجنے سنورنے کا بے حد شوق تھا لیکن اُس کی باجی کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو ایک حد میں رہنا چاہیے شاید اُن کا یہ رویہ گھر سے ملنے والے ماحول کی وجہ سے تھا۔ صائمہ لپ اسٹک کو جادو کی چھڑی سمجھتی تھی کہ ہونٹوں پر لگاؤ اور بے رنگ تصویر میں رنگ بھر جائے۔ لپ اسٹک لگانے کے بعد صائمہ ہونٹوں کو اس طرح چپکاتی جیسا اُس نے ماسی نیاز کے گھر ٹی وی پر اشتہار میں دیکھا تھا۔ اُسے اپنی باجی سے اُلجھن ہوتی کہ جانے کیوں باجی کو لڑکیوں کے بن سنور کے رہنے سے نفرت ہے۔ حالانکہ اس کی دوست کی باجی اپنی چھوٹی بہن کے لیے طرح طرح کا میک اپ لاتی اور اُسے بھی سارے گُر سکھاتی تھیں۔ اور دوسری طرف صائمہ کی باجی جو ان تمام چیزوں سے کوسوں دور تھیں۔ دو ماہ میں صائمہ بیوٹی پارلر کا کام سیکھ گئی تو اُس کے مالک نے اس کی تنخواہ مقرر کر دی جس سے وہ اپنی ضرورت کا سامان خرید لیتی۔ وہ روز خوب بن سنور کر پارلر جاتی تھی:

"پارلر میں روز ایک ہی جیسی بدوضع اور بے ڈھنگے جسموں والی ڈھلتی عمر کی عورتوں کے چہروں کو رنگنا اور بالوں کو تراش کر جاذب نظر بنانے کا بے زار کن کام، روز صبح خاص وقت پر اُٹھنا، ہر روز یہ فیصلہ کرنے کا جھنجھٹ کہ کون سے کپڑے پہنے جائیں۔ کس جوڑے کے ساتھ کون سی جوتی،

کیسا میک اپ۔ بیوٹی پارلر میں وہی لڑکیاں اور گرسنہ نگاہوں سے ان سب کو دیکھنے والا پارلر کا مالک۔"(۱۰۰)

آج کل کے دور میں گلی محلوں میں ہی بے تحاشا بیوٹی پارلر کھل گئے ہیں، جہاں پر عورتوں کا ہجوم رہتا ہے اور ٹی وی پر اشتہارات کی اس قدر بھرمار ہے کہ آئے دن کوئی نہ کوئی نئی چیز مارکیٹ میں آتی رہتی ہے جس کو خرید کر لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔ ہماری ثقافت میں یہ چیزیں کمرشلزم وصارفیت ہی کی دین ہیں۔

صائمہ کا کردار ناول میں اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ناول کی تمام کہانی اسی کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ صائمہ جب وسیم کے ساتھ پکڑی جاتی ہے تو اُسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے جس کے بعد وہ کلینک کی نوکری اختیار کر لیتی ہے اور اس محلے سے ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہے وہ ایک فلیٹ میں رہنے لگتی ہے۔ صائمہ کو اس کی دوست نسرین ماں اور باجی کے بارے میں بتاتی ہے۔ جس کے بعد صائمہ اپنے محلے کا چکر لگاتی ہے جہاں صائمہ چاچے سے ملتے ہوئے نسرین کے گھر جاتی ہے۔ نسرین کا گھر تلاش کرنے میں صائمہ کو ذرا بھی دقت نہیں ہوتی کیونکہ ایک ہی گلی میں اُس کا سسرال اور میکہ بھی تھا، نسرین کی شادی اُس کی پھوپھو کے گھر ہوئی تھی۔ نسرین صائمہ کے بچپن کی دوست ہے، وہ اسے گھر کے اندر لے گئی۔ جہاں پر نسرین نے مشین لگائی ہوتی ہے وہ صائمہ کو پاس ہی کرسی پر بٹھا لیتی ہے اور وہ کپڑے نچوڑ کر تسلے میں رکھ رہی ہوتی ہے۔ صائمہ تسلے کو اُٹھانے میں اس کی مدد کرتی ہے اور وہ دونوں سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی چھت پر آجاتی ہیں۔ نچڑے ہوئے کچھ کپڑے کندھے پر ڈالے وہ تار پر ڈالنے جاتی ہے اور دونوں آپس میں باتیں کرتی ہیں:

> "نسرین نے اندر کھرے کے پاس ہی کرسی رکھی اور اسے بٹھایا۔ وہ کپڑے دھو رہی تھی۔ واشنگ مشین کی چمک دمک سے اندازہ ہوتا کہ نئی نئی خریدی گئی تھی۔ اس نے کپڑوں کا گٹھڑ مشین میں ڈال کر اوپر بڑا سا ڈھکن رکھا اور بٹن دبا دیا۔ اندر موٹر کی گھوں گھوں وقفے وقفے سے کم زیادہ ہوتی۔ مشین کے سامنے حصے میں گول شیشہ لگا تھا جس میں سے کپڑے کبھی دائیں اور کبھی بائیں گھومتے دکھائی دیتے۔"(۱۰۱)

آج کل ہر گھر میں مشین کا استعمال ایک عام سی بات ہے اب تو جدید ترین مشین کا بھی استعمال ہونے لگا ہے جس میں کپڑے خشک اور دھونے کے ساتھ ساتھ استری بھی ہو جاتے ہیں پہلے وقتوں میں عورتیں ڈنڈوں کی مدد سے اور صابن کا استعمال کرتے ہوئے کپڑوں کو دھویا کرتی تھیں جس میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی محنت بھی لگتی تھی۔ صائمہ اپنی سہیلی کے گھر ٹی وی میں ایک لڑکی کو لپ اسٹک لگاتے ہوئے دیکھتی ہے اور

اس کو بھی تیار ہونے کا شوق ہوتا ہے وہ اپنی باجی سے چڑتی ہے جو اسے سجنے سنورنے سے منع کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کوہِ گراں:

حفیظ چودھری حلیم کے بچپن کا دوست تھا۔ حفیظ بھی گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے چودھری کا ساتھ دینے والوں میں شامل تھا۔ باتوں کے دوران حفیظ نے حلیم کو سگریٹ کی پیش کش کی تو حلیم کو حفیظ کے ساتھ ماضی کی ایک ملاقات یاد آگئی جب وہ گھر والوں سے چُھپ کر سگریٹ پیتے تھے۔ اُسے یاد ہی نہیں تھا کہ اُس نے سگریٹ کب پینا شروع کیا تھا۔ تمباکو نوشی کا آغاز اُس نے حقہ پینے سے کیا تھا۔ چھٹیوں میں وہ صبح سویرے حویلی چلا جاتا۔ نوکر اُس وقت چارہ کاٹ رہے ہوتے اور وہ وہاں پر کھڑے ہو کر ماہیے اور ٹپے گاتا رہتا۔ امر تسریوں کی دُکان سے وہ ایک پیسے کے تین سگریٹ خریدتے جن میں سے دو سگریٹ حفیظ چُھپالیا کرتا تھا:

> "چالیس برس تمباکو نوشی کرنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا اور اُس نے ایک لمحے میں فیصلہ کر کے اگلے ہی لمحے تمباکو نوشی ترک کر دی۔ اب اچانک حلیم کے دل میں خیال آیا کہ وہ حفیظ کی پیشکش قبول کر کے پرانے وقتوں کی یاد میں ایک سگریٹ پی لے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ ایک کش تمباکو نوشی کا از سر نو آغاز ہی نہ ہو! میں سگریٹ نہیں پیتا۔۔۔ چھوڑ دیے ہیں۔" حلیم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "مجھے لت لگوا کر خود چھوڑ دیے۔" حفیظ چھوٹی سی ہنسی ہنسا۔ حلیم کو ہنسی اُس خشک کھانسی کی طرح لگی جس سے چھاتی میں درد ہوتا ہے۔
>
> یاد رہے کہ امر تسریوں کی ہٹی سے لمپ کا سگریٹ خریدا کرتا تھا۔ سگریٹ کے پیسے تم دیا کرتے تھے، ایک پیسے کے تین سگریٹ۔ میں دو سگریٹ چھپالیا کرتا تھا۔" حفیظ نے ہنسنا شروع کر دیا۔" (۱۰۲)

اس زمانے میں بھی سگریٹ کے برینڈ ہوا کرتے تھے اور اچھی کمپنیوں کے سگریٹ لوگ استعمال کرتے تھے۔

گڈو جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے اور وہ چودھری حلیم کے ساتھ جنسی تعلق استوار کرنے کی خواہش مند ہے، جبکہ چودھری کے پیشِ نظر گاؤں کو آباد کرنا ہے اس سے پہلے وہ ایسا کچھ سوچ بھی نہیں

سکتا۔ چودھری کے گاؤں میں دوبارہ آنے کی وجہ ہی وہاں کی بحالی ہے، جس کے لیے وہ شہر کی سہولیات کو چھوڑ کر گاؤں میں آبسا ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ چودھری حلیم اپنے کام میں بہت سنجیدہ ہے۔ امین خان جو کہ حلیم کے بچپن کا دوست ہے، گاؤں کی بحالی میں وہ بھی اُس کے ساتھ ہے اور وہ اُس کے لیے شیو کا تمام سامان لے کر آتا ہے جس کے ساتھ آفٹر شیو لوشن بھی ہے۔ جبکہ گاؤں آنے کے بعد چودھری حلیم ان تمام چیزوں سے یکسر محروم ہو گیا ہے۔ حلیم شیو کر کے تازہ دم ہو جاتا ہے اور اُس کے پاس سے ایک خاص خوشبو اُٹھ رہی ہے۔ امین اُس کے لیے شیمپو کی چند شیشیاں، صابن، بالٹی، مگا، ایک شلوار کُرتا بھی لے کر آتا ہے جو وارث نے اُس کے لیے تحفہ دیا ہے۔ حلیم چائے پی رہا ہوتا ہے تو چائے کی خوشبو اُس کو ماضی میں لے جاتی ہے کیونکہ ماضی میں وہ اس خوشبو کا عادی تھا:

"اُسی وقت گڈو تھال میں چائے کے دو پیالے لیے اندر داخل ہوئی۔ اُس کے کندھے کے ساتھ ایک تھیلا بھی لٹک رہا تھا۔ حلیم نے چائے کی طرف تعریفی اور تھیلے پر متجسس نظر ڈالی۔ امین نے اپنا پیالہ سنبھال لیا۔ حلیم کو چائے کی خوشبو ماضی کی کئی پُرپیچ گلیوں میں لے گئی۔ وہ جو یہاں چائے پیتا رہا تھا وہ کسی قسم کی خوشبو کے بغیر تھی۔ اِس خوشبو نے اُسے وہ دِن یاد دلا دیے جب وہ دو پیالے پیتے ہوئے انگریزی کا اخبار بھی پڑھا کرتا تھا۔ وہ اُسی خوشبو کا عادی تھا اور اب اُسے وہی خوشبو محسوس ہوئی۔"(۱۰۳)

چائے بیچنے کے لیے بھی کمرشل میں دکھایا جاتا ہے کہ دن بھر کی تھکن کا علاج ایک کپ چائے کی پیالی میں ہے۔ غرض زندگی گزارنے کے لیے کیا ہم پر اچھا لگے گا اور کیا لینا چاہیے یہ سب ہمیں کمرشل سے پتہ چلتا ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

حکیم رام لعل ایک ہندو تھا جو احمد پور میں پیدا ہوا اور کئی پشتوں سے اُس کا پیشہ حکمت تھا۔ صبح سویرے اپنے مطب میں جاتا اور مریضوں کا رش رات گئے تک اُس کے پاس لگا رہتا۔ حکیم صاحب کے پاس مطب پر ایک طرف عورتوں کی قطار اور دوسری طرف مردوں کی قطار ہوتی تھی اور درمیان میں پردہ ہوتا تھا۔ حکیم صاحب نبض دیکھ کر سب کو ایک جیسی ہی دوائی دے دیتے جب ایک دن فیاض نے یہ چیز دیکھی تو اُس نے حکیم صاحب سے کہا کہ یہ بے ایمانی ہے تو حکیم صاحب نے اسے کہا کہ یہ بے ایمانی نہیں بلکہ اس سے ہمارا بھی فائدہ ہو جاتا ہے اور کسی کا بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ فیاض کا دل چاہا کہ لوگوں کو بتائے کہ حکیم جھوٹا انسان

ہے اور جھوٹ بولنے والوں کی پردہ پوشی کرتا ہے لیکن اس کی آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔فیاض کی آنکھوں میں اپنی اس حالت کو دیکھ کر آنسو آگئے کہ وہ چاہ کر بھی حکیم کا سچ کسی کو نہیں بتا پایا:

"اس کشمکش میں فیاض کے پاؤں وہیں جم کر رہ گئے۔اُس نے گردن گھما کر حکیم رام لعل کے مطب کو دیکھا تو اُس کا دل بھر آیا۔ کتنی بڑی اُمید لے کر وہ یہاں آیا تھا اور کیا سمجھا تھا حکیم صاحب کو۔خالص اور کھرا انسان جس کے ہاتھ میں شفا تھی۔شفا تو واقعی اُس کے ہاتھ میں تھی مگر وہ خالص اور کھرا انسان کسی طرف سے بھی نہ تھا۔"(۱۰۴)

حکیم رام لعل کا نام بہت مشہور ہو چکا تھا دور دور سے لوگ اُس کے پاس آتے تھے۔ آگے چل کر فیاض نے بھی اُسی کا کام سنبھال لیا اور حکیم کا کاروبار چلایا۔ حکیم کی شہرت ہوتی ہے کہ اس کی دوا سے ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔لوگوں سے یہ خبر دوسروں کو ملتی ہے اور اس کا کاروبار چل نکلتا ہے۔ دوا مفت دینے سے بھی تشہیر ہو جاتی ہے جو کمر شلزم کا سستا ترین ذریعہ ہے۔

پانی مر رہا ہے:

میاں اللہ یار اپنے بیٹے اسرار کو پڑھنے کے لیے شہر بھیجتا ہے تا کہ وہ شہر میں رہ کر بڑا آدمی بن سکے۔ اسرار جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے جب وہ گاؤں واپس آتا ہے تو اس کی حالت شہر کے ماحول کے مطابق ہوتی ہے اُس کے رہن سہن اور لباس پر دوستوں کا اثر پڑا ہے۔دیکھنے میں وہ بالکل سانپ پکڑنے والے جوگی کی طرح لگتا ہے،اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔میاں اللہ یار نے اسرار پر بہت پیسہ خرچ کیا ایسے واہیات لباس اور لمبے لمبے بال دیکھ کر اُس کو غصّہ آتا ہے۔کیونکہ میاں اللہ یار کو اسرار سے ایسی اُمید نہیں تھی کہ وہ ایک دن ایسے سب کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا اور وہ اسے بہت بُرا لگتا ہے،اسرار ایک بہت ہی خوبصورت سیاہ رنگ کی کار سے نکلتا ہے۔اور اُس کے بھائیوں کو بھی کچھ اندازہ تھا کہ یہ فیشن ہے کیونکہ اس نے خود ٹی وی پر ایک بندے کو ایسے کپڑے پہنے دیکھا تھا۔ گاڑی اور سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اسرار کا لباس بھی دیکھنے کے قابل تھا جس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

"اوئے پاغل خانے!تجھے مجھے کیا پتا؟ یہ فیشن ہے۔میں نے کل خود ٹی پہ دیکھا تھا ایسے ہی ایک موٹا سا بندہ،ایسا ہی کرتا پہنے گانا گا رہا تھا۔"(۱۰۵)

زیرِ مطالعہ اقتباس میں اسرار شہر میں جا کر وہاں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ گاؤں آنے پر جب لوگ اسے واہیات لباس میں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو اس کے بھائی بتاتے ہیں کہ یہ فیشن ہے جسے انھوں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔ ضرورت کی اشیاء یا فیشن ہر چیز کی تشہیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔

شاہدہ کا کردار ناول میں عرفان صاحب کی بیوی کا ہے، شاہدہ کا تعلق امیر گھرانے سے ہونے کی وجہ سے وہ فیشن کی دلدادہ بھی ہے۔ محلے میں ہی اس کی ایک دوست بھی رہتی ہے جو کہ اس کے شوہر کو پسند کرتی ہے۔ شاہدہ کو بنگلہ اُس کے ماموں نے بنوا کر دیا ہے، باقی گھر کا سامان چچاؤں نے اٹلی اور امریکہ سے منگوا کر دیا ہے۔ ساگوان کے بڑے صوفہ سیٹ "تھامس چپ این ڈیل" کے تھے۔ یہ جوڑا اے۔ آر خاتون کے ناولوں میں دکھائی جانے والی زندگی گزارنے لگا۔ گورنس ان کے لیے چائے بستر پر ہی بھجوا دیتی، ڈھاکے سے آئی خوشبودار چائے جب پیالوں میں ڈالی جاتی تو پورا کمرہ مہک اُٹھتا۔ اور صبح صبح کھڑکی پر شکر خوروں کا غول موجود ہوتا جس کی آواز صبح کے وقت بہت ہی پر سکون محسوس ہوتی تھی۔ ناول میں شاہدہ کا کردار ایک امیرانہ زندگی گزارتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ اس کے استعمال کی تمام چیزیں باہر سے آتی ہیں جس وجہ سے مدھو عرف زینب بھی اس کی چیزوں کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی نظر آتی ہے جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

> "نہیں وہ وہی تھا۔ اسی طرح موٹی سی کھال، مجھے مگر مچھ کی پہچان ہے، ماما کے پاس اس کی کھال کا والٹ ہے، وہ تھائی لینڈ سے لائی تھیں، وہاں مگر مچھوں کو پال کے ان کی کھال، پرس اور جوتے وغیرہ بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔"(۱۰۶)

شاہدہ کا کردار بھی کمرشلزم سے متاثر نظر آتا ہے۔ ان کا جوڑا اے- آر خاتون کے ناولوں میں دکھائی جانے والی زندگی گزارتا نظر آتا ہے، جو کہ معاشرے میں طبقاتی تقسیم کو جنم دیتی ہے۔

گُل مینہ:

نصیب گُل طالبان کا ساتھی ہے اور فتح محمد کا کردار ناول میں ایک نوعمر لڑکے کا ہے جس کو طالبان اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مدرسے میں باقاعدہ اُس کو تربیت دی جاتی ہے، فتح محمد ناول کے مرکزی کردار زرجان اور گُل مینہ کا اُکلوتا بیٹا ہے۔ وہ طالبان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اُس کا مقصد اپنے باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے۔ جبکہ طالبان اُسے بم دھماکے میں استعمال کرنا چاہتے ہیں جس سے فتح محمد لاعلم ہے۔ نصیب گُل پورے راستے فتح محمد کا بہت خیال رکھتا ہے اور اسے شہر میں آنے کے بعد ہوٹلوں سے مہنگا کھانا کھلاتا ہے۔

ہر کھانے کے بعد وہ اسے سپرائٹ یا پیپسی کی بوتل ضرور پلاتا تھااور وہ اُسے ہوٹل تاج محل میں ٹھہراتا ہے۔ ہوٹل کی چوتھی منزل کی جیسے ہی فتح کھڑکی کھولتا ہے تو سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکراتا ہے تو باہر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ شہر کی چکاچوند اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ ارغنداب میں بجلی بھی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تو روشنی مدھم ہوتی تھی، فتح محمد نے اس سے پہلے اتنی زیادہ بتیاں نہیں دیکھی تھیں۔ یہاں تو جس طرف نظر دوڑاو رنگ برنگے اشتہاری بورڈ جل بجھ رہے تھے:

"اس کی نظریں خاص طور پر مشرق کی جانب ایک اونچی بلڈنگ پر لگے ایک بڑے اشتہاری نشان پر ٹک گئیں جس پر اردو میں 'جامِ شیریں' کے لہو رنگ حروف جگمگاتے تھے، اور پل بھر میں جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد اسی جگہ ایک بوتل ابھر آتی تھے، جس میں نیچے سے اوپر تک سرخ رنگ کی شربت بھرتی جاتی اور نیچے انگریزی میں سبز رنگ میں حرف بہ حرف Freshness,life لکھا جاتا جو اگلے ہی لمحے مٹ جاتا اور سرخ جامِ شیریں دوبارہ نمودار ہو جاتا۔"(۱۰۷)

ناول کے اقتباس سے اس بات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے کہ کس طرح ہماری ثقافت پر جدید تہذیب کے نشانات واضح طور پر ملتے ہیں۔ شہروں میں بڑے بڑے بورڈ پر چلنے والے اشتہارات کولڈ ڈرنک اور اس طرح کی دوسری چیزیں جدید تہذیب اور کمرشلزم وصارفیت کی واضح علامتیں ہیں۔ ٹی وی پر نظر آنے والے خوبصورت اشتہارات صارف کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اس میں موجود چیز کو لینے کی خواہش کو بڑھاتے ہیں۔

گراں:

ناول گراں میں موجود دس گھرانوں کے افراد نے جیسے بہتر مستقبل یا روزگار کے لیے باہر ممالک کا سفر شروع کر دیا تو ویسے ویسے پرانی تہذیب پر جدید تہذیب کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزوں نے لینا شروع کر دی، جس وجہ سے اب وہ اپنائیت بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ چکی کی گھوں گھوں مدت ہوئی نہیں سنائی دی کیونکہ اب آٹے کے تھیلے منڈی سے آتے ہیں۔ تُندور کے منہ ٹوٹے ہوئے ہیں روٹیاں اب گیس کے چولہوں پر پکتی ہیں۔ گھروں میں مرغیوں کے ڈربے اب پرانی بیٹھوں کی بدبو چھوڑتے تھے کیونکہ اب فارمی گوشت کھانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ گراں کی لڑکیاں ایم۔اے، ایم۔بی۔اے اور لاء جیسی بھاری بھرکم ڈگریاں حاصل کر چکی ہیں، لیکن لڑکے ولائیت کی کمائیوں پر اتراتے پھرتے ہیں۔ اور دامنِ کوہ اور شکرپڑیاں جیسی کئی تفریح گاہوں میں سیر کرتے ہوئے نظر آتے۔

انڈین، عربیین، ترکش، اٹالین اور چائنز فوڈز کی چینز دیسی ذائقے متروک کر گئی ہیں، یہ ملک پکوانوں کی اقسام میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ جین جیسی بڑی ایجاد بھی پہلی بار انھی ولائیتوں نے متعارف کروائی تھی:

"جین جیسی بڑی ایجاد بھی پہلی بار انھی ولائیتوں نے اِس علاقے میں متعارف کروائی تھی۔ جس طرح رنگین ٹیلی ویژن، فریج، کوکنگ رینج، ڈش انٹینا، اِسی طرح جین۔ باسہولت پائیدار اور فیشن ایبل لباس وبا کی طرح یہاں پھیل نکلا تھا۔ ان یورپی تراش خراش والے لڑکوں کے ساتھ شادی سے اِنکار کا حوصلہ بھی شاید اِن پڑھی لکھی لڑکیوں کو جدید لباسوں اور پکوانوں کی ایجادوں سے مِلا تھا کہ ملبوسات اور پکوانوں کے تبدیل ہوتے انداز، رویوں کے طور بھی بدل دیا کرتے ہیں۔"(۱۰۸)

زندگی بہت تیز ہو گئی ہے نوجوان نسل فاسٹ فوڈز پسند کرتی ہے۔ لڑکیاں جدید لباس پہنتی ہیں۔ پکوانوں کے انداز بھی بدل چکے ہیں اس بڑی تبدیلی کی وجہ بھی ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور دوسرے ذرائع ہیں جن کی وجہ سے نئے نئے خیالات لوگوں تک پہنچتے ہیں اور وہ انہیں اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گاؤں میں یہ رواج تھا کہ جب کسی گھر کی بیٹی شادی کے بعد پہلی بار میکے آتی تھی تو اس کی سارا گاؤں دعوتیں کرتا تھا۔ خزاں سنگھ کی بیٹی شادی کے بعد پہلی دفعہ میکے آئی تو دن کم تھے اور دعوتیں زیادہ تھیں۔ اتنے سوٹ جمع ہوئے کہ واپسی پر اضافی سامان کے پیسے ادا کرنے پڑے۔ اتنی محفلیں منعقد ہوئیں کہ شادی کی تقریب بھی دُھندلا کر رہ گئی۔ اُس نے فرمائش کر کے مانیاں بنوائیں، آٹے کو گھی شکر میں گوندھ کو خود ٹکیاں بنائی۔ غزل جان کا شوہر عثمان پہلی رات کی دلہن کا گھونگھٹ اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکا جیسے وہ یورپ سے درآمد کوئی مشین ہو کہ کہیں مشین خراب نہ ہو جائے۔ غزل جان سے شادی کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ بڑوں کا کہنا تھا کہ اُس کو باہر کا ویزہ دیا جائے گا۔ غزل جان کو بیوٹیشن کی طرف سے بہت خوبصورت تیار کیا گیا تھا جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے اور دوسری طرف یہاں پر کمرشلزم و صارفیت کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ اب کے دور میں کیسے بیوٹی پارلر سے تیار ہونا ایک فیشن بن گیا ہے:

"غزل جان بھاری لہنگا سیٹ اور طلائی زیورات کا بوجھ اُٹھائے سنگھار میز کے شیشے میں خود کو دیکھتی تھی۔ دنوں کی محنت سے منتخب کیا ہوا لباس اور زیورات جنھیں اُس کے بدن پر سجانے کو بیوٹیشن نے چھ گھنٹے صرف کیے تھے۔ پورے جسم کی تھریڈنگ مساج، سٹیم یعنی حسن نکھارنے کے نئے جدید طریقوں سے شعلہ سا بدن بنا دیا تھا۔"(۱۰۹)

ناول نگاروں نے جدید مواصلات کے انسانی زندگی پر اثرات کو بیان کیا ہے۔برق رفتار ترقی سے جہاں ایک طرف انسان فائدے اُٹھاتا نظر آتا ہے، وہی اُس کی زندگی خطرے کا بھی شکار ہے۔ بجلی اور دیگر مواصلات کے گاؤں میں آنے سے اب وہاں بھی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔کمرشلزم و صارفیت کی بدولت اب انسان عیش پرست ہوتا جارہاہے۔اپنی زندگی میں مشین کااستعمال عام کرتے ہوئے وہ تساہل پسند ہوتا جارہاہے۔ترقیاتی کام ہونے کی وجہ سے اب فاصلے سمٹ گئے ہیں۔اب ہر سہولت عوام کی دسترس میں ہے ایک طرف اس کے فائدے بھی ہیں قریب کے لوگ دور اور دور کے لوگ قریب ہو گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔عبدالحمید خان، جامع انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص:۱۴۳۹

۲۔مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اقبال اور ثقافت، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول جنوری ۱۹۸۶ء، ص۹۷

۳۔http://www.fincash.com/l/ur.basics/economics

۴۔حقی، شان الحق (مرتب)، فرہنگِ تلفظ (طبع چہارم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۳۵۳

۵۔مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر دارانہ کلچر، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱

۶۔ایضاً، ص ۲۳

۷۔ایضاً، ص ۱۲

۸۔ایضاً، ص ۳۵

۹۔علی عباس جلالپوری، سیّد، روحِ عصر، روہتاس بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۸

۱۰۔مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر دارانہ کلچر، ص ۱۴۳۔۱۴۲

۱۱۔مبارک علی، ڈاکٹر، المیہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۰۸

۱۲۔علی عباس جلالپوری، سیّد، تاریخ کا نیا موڑ، خرد افروز پبلشرز، جہلم، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹

۱۳۔اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد اوّل، مدیر اعلیٰ مولانا حامد علی خاں، شیخ نیاز احمد پبلشرز، لاہور، ص ۵۵۷

۱۴۔درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۱۵۔ساجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر، فرہنگِ علوم ادبی اصطلاحات، مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۵۸

۱۶۔سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۲۶۹

۱۷۔قاضی جاوید، وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵

۱۸۔غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب (شناخت کی نصف صدی)، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء، ص ۸۵

۱۹۔libbazmeurdu.net، ۱۳ اکتوبر، 12:00 pm

۲۰۔اشرف کمال، محمد، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۸

۲۱۔افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت کے اثرات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔اردو، مملوکہ: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۴۳

۲۲۔شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔اردو، مملوکہ: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان،۱۹۹۸ء، ص ۵

۲۳۔ایضاً، ص ۴۵

۲۴۔غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب(۱۹۴۷ تا حال)بک ٹاک،لاہور،۱۹۹۵ء، ص ۲۶

۲۵۔افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت کے اثرات، ص ۱۴۴

۲۶۔ The penguin dictionary of sociology, peng:m group, England -1994, Pag:13

۲۷۔www.faizghar.com ۱۳اکتوبر۲۰۱۸ء، 5:00 Pm

۲۸۔سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، ص ۲۷۰

۲۹۔مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ کی واپسی، تاریخ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء، ص ۱۳۳

۳۰۔ممتاز احمد خاں،ڈاکٹر، تین ناولوں کی مثلث آدرش کی اسیری اور نثار عزیز،ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا،۱۹۸۳ء، ص ۱۲

۳۱۔ سلطانہ بخش،ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد،۱۹۸۶ء، ص ۴۰۷

۳۲۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر، تین ناولوں کی مثلث آدرش کی اسیری اور نثار عزیز، ص ۲۵۳

۳۳۔ سلطانہ بخش،ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، ص ۴۰۷

۳۴۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، داستان اور ناول، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱ء، ص ۱۲۲

۳۵۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۲ء، ص ۲۶۷

۳۶۔روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز،لاہور، جون ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۶

۳۷۔ غفور احمد، نئی صدی۔نئے ناول، کتاب سرائے،لاہور،۲۰۱۴ء، ص ۱۳۰

۳۸۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ و تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،۲۰۰۵ء، ص ۶۲

۳۹۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء، ص ۳۴۵

۴۰۔ امجد سلیم منہاس، ایضاً،(بیک فلیپ) نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء

۴۱۔ آمنہ مفتی، مضمون:"عاصم بٹ کا فنِ ناول نگاری" حلقہ اربابِ ذوق،لاہور، یکم ستمبر ۲۰۱۵ء

۴۲۔ الیاس میر اں پوری، حفیظ خان: خان زمین زدگان، مشمولہ: حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۸۔۳۴۷

۴۳۔ شیخ حبیب الرحمنٰ بٹالوی، حفیظ خان: دھوپ میں چھاؤں جیسا، حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ص ۳۶۱۔۳۶۰

۴۴۔ جبار مفتی، محنتوں اور عظمتوں کا نشان، مشمولہ: حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ص ۱۸

۴۵۔طاہرہ اقبال (انٹرویو) از نگہت نورین، مشمولہ: طاہرہ اقبال کے افسانوں کا کرداری مطالعہ، مملوکہ: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو نجز، اسلام آباد، ص ۲

۴۶۔ تاج سعید، افسانے کی دنیا میں نیا نام، فکر و خیال، روزنامہ، آج، پشاور، مورخہ ۲۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء

۴۷۔ آصفہ نسیم، طاہرہ اقبال ادبی خدمات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل۔ اردو، مملوکہ: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان سیشن: ۱۶۔ ۲۰۱۲، ص ۲

۴۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵۰

۴۹۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۳۱

۵۰۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۹

۵۱۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، علم و عرفان پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۳۰

۵۲۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۲۷۔۲۲۶

۵۳۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۶

۵۴۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۹

۵۵۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۷

۵۶۔ آغا گل، دشتِ وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۷

۵۷۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۸۔۱۲۷

۵۸۔ کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، مکتبہ دانیال پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۲۱

۵۹۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ص ۱۰۱

۶۰۔ زیف سیّد، گل مینہ، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۸

۶۱۔ طاہرہ اقبال، گراں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۹۴

۶۲۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص۴۷۹

۶۳۔ ایضاً، ص۵۴۶۔۵۴۵

۶۴۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۹۳

۶۵۔ ایضاً، ص۳۰۸

۶۶۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۸۱

۶۷۔ رفاقت حیات، میر واہ کی راتیں، عکس پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء ص ۲۴

۶۸۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۱۳

۶۹۔ ایضاً، ص۱۲۸

۷۰۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۸

۷۱۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۱۲

۷۲۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۱۲۴

۷۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۷۴۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۸۵۔ ۸۴

۷۵۔ ایضاً، ص۱۹۶

۷۶۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، ص ۶۴۷

۷۷۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۴۵

۷۸۔ ایضاً، ص ۴۳۱

۷۹۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۱۴۲

۸۰۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۲۰۵۔ ۲۰۴

۸۱۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۸۲۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۱۸۰

۸۳۔ ایضاً، ص۲۶۹

۸۴۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۲۴

۸۵۔ رفاقت حیات، میر واہ کی راتیں، ص ۴۱

۸۶۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۴۵۔ ۴۴

۸۷۔ ایضاً، ص ۹۱
۸۸۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۲۲۔۲۱
۸۹۔ کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۱۸۷
۹۰۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۱۴
۹۱۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۴۴
۹۲۔ ایضاً، ص ۱۹۴
۹۳۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، ص ۵۷۷
۹۴۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۲۸
۹۵۔ ایضاً، ص ۴۹۴
۹۶۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۱۳۹
۹۷۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۱۷۴
۹۸۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۹۹۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص ۹۲
۱۰۰۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۵۵
۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۱۸
۱۰۲۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۷۷
۱۰۳۔ ایضاً، ص ۲۵۳۔۲۵۲
۱۰۴۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۶۴
۱۰۵۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۷
۱۰۶۔ ایضاً، ص ۱۰۴
۱۰۷۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۳۷۲
۱۰۸۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۱۳۷
۱۰۹۔ ایضاً، ص ۱۵۹

باب چہارم :

پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران کے دیگر پہلو

ہر ملک ہر معاشرے کی اپنی ایک خاص ثقافت ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سماج کا ہر فرد ایک دوسرے پر منحصر ہوتا ہے اور ہر شخص کی امیدیں دوسرے شخص سے وابستہ ہوتی ہیں اور ان ہی امیدوں کے دائروں اور لہروں کی بدولت ہر معاشرہ ایک خاص ثقافت کا پابند ہوتا ہے۔ ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی فرد پیدائشی طور پر کوئی خاص ثقافت لے کر نہیں آتا بلکہ وہ سماج میں رہ کر اُسی ثقافت کو اپناتا ہے جو اسے وراثت میں ملتی ہے، ثقافت جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انسان کی پہچان اس کی ثقافت سے ہوتی ہے ایک اکیلا شخص کسی ملک کی ثقافت کو نہیں بناتا بلکہ اس ملک کی پوری قوم ثقافت بناتی ہے۔ ثقافت انگریزی لفظ کلچر کے مترادف ہے، کلچر کے لیے اردو میں تہذیب و تمدن اور ثقافت جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن عام طور پر ثقافت کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر نبی بخش کے مطابق: ثقافت انسان کی تخلیق ہے۔ انسان اگر خدا کی تخلیق ہے تو ثقافت ہر وہ چیز ہے جو انسان نے پیدا کی ہے۔۔۔ ثقافت انسانی ماحول ہے۔ ثقافت رہن سہن ہے۔[1] ڈاکٹر بلوچ کے مطابق ثقافت کے تین پہلو ہوتے ہیں:

"۱۔ مادی پہلو: یعنی قدرتی ماحول

۲۔ عملی پہلو: یعنی نشت وبرخاست کے آداب، پیدائش، موت، شادی بیاہ اور وہ دوسری معاشرتی رسوم، غذا، لباس اور مجلس زندگی وغیرہ۔

۳۔ جذباتی پہلو: یعنی فنونِ جمیلہ اور فکر و جذبات کے اظہار کے دوسرے وسائل۔"[۲]

اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ثقافت میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ اس کا مفہوم سماج اور زندگی کی ہمہ جہتی، اصلاح و نشو و نما اور ارتقاء پر بھی حاوی ہے اور اس کا اطلاق کھانے پینے، رہنے سہنے، علم و ادب، فکر و فن، عملی سیاست، فلسفہ، مذہب، اعتقاد، معیشت وغیرہ غرض سماجی لوازم پر بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دور کی ثقافت کو ہم اس عہد کے ہمہ جہت ارتقاء کا آئینہ کہتے ہیں۔ عام بول چال میں کلچر (تہذیب و ثقافت) اور تمدن میں فرق نہیں کیا جاتا، لیکن ان اصطلاحات کے اندر فرق موجود ہے۔ ہمارا ہر عمل اور فعل کسی فکر اور عقیدے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم پہلے سوچتے ہیں پھر اس سوچ کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ انجنیئر پہلے

عمارت کا نقشہ بناتا ہے، بعد ازاں اس نقشے کے مطابق عمارت تعمیر کی جاتی ہے اسی طرح تہذیب نام ہے فکر، عقیدے و سوچ، خیالات اور تصورات کا اور اس بنیادی فکر اور تصور کے تحت جو اعمال و افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جو کردار اور سیرت تشکیل پاتی ہے اسے ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح تہذیب و ثقافت لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں باہم وہی رشتہ ہے جو روح اور جسم کا یا یوں سمجھیں کہ تہذیب انسان کا دل ہے جو تصورات اور خیالات کی آماجگاہ ہے اور ثقافت اس کے برگ و بار۔ درخت کی شاخیں اگرچہ مختلف سمتوں میں پھیلی ہوتی ہیں لیکن ان کا رشتہ جڑ سے ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ ثقافت کسی قوم کے تمام افراد کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں بلکہ پوری قوم کا مشترکہ ورثہ ہے۔ لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک زمانے اور ایک ہی علاقے میں مختلف معاشرے اپنا مختلف کلچر رکھتے ہیں۔

اسی طرح ثقافت سے تمدنی سلیقہ اور معاشرتی قرینہ مراد لیا جاتا ہے۔ ثقافت کے زمرے میں کسی قوم کی شائستگی، پختہ عادات و روایات، سماجی رسومات، اخلاقی اقدار اور معاشرتی معاملات وغیرہ آتے ہیں۔ ثقافت دستکاریوں، مصنوعات، رسوم، خیالات، عادات اور اقدار پر مشتمل ہے۔ مگر یہ ثقافت کے وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے اس کی ہیئت تشکیل پاتی ہے اور یہ بذات خود قوت نہیں بلکہ اس کی اصل قوت وہ علم ہے جو بنیادی طور پر ذہنی اور اخلاقی سوچ سے وابستہ ہے اور اس علم کا سرچشمہ مذہب، قوانین اور اخلاقی قواعد ہیں۔ چنانچہ تمدن کا اقتصادی نظم و نسق، قوانین اور تکمیل علم نیز مشاغل، آرائش و زیبائش حتٰی کہ ہر وہ چیز جو فرد یا معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے مفید نظر آئے ثقافت میں شامل ہے۔

ثقافت دفعتاً معرضِ وجود میں آنے والی چیز نہیں بلکہ اسے بننے سنورنے میں وقت لگتا ہے اور بعض اوقات صدیاں گزار کر ایک سوسائٹی اپنی ایک مخصوص ثقافت کو جنم دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ ثقافت کسی گروہِ انسانی یا کسی سوسائٹی یا قوم و ملک کی ایک نمایاں شناخت تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے بھی اپنے ایک مضمون "ہماری ثقافت اور اردو ادب" میں ثقافت کو سماج کا ایک شناختی وسیلہ قرار دیا ہے:

> "ثقافت بنیادی طور پر ایک ضابطہ حیات ہے۔ جو ایک فرد کی شناخت سے ہوتے ہوئے ایک گروہ، قوم، ملک کے مخصوص کارناموں، ان سے منسلک قدروں، مذہبی معمولات، رسوم و عقائد روایات و معمولات، مشروبات اور آدابِ نشست و برخاست سے متشکل ایک سماج کی شناخت کا وسیلہ بنتا ہے۔"(۳)

ہر قوم و ملک کی اپنی ایک الگ ثقافت ہوتی ہے ،نہ صرف قوم و ملک بلکہ مذاہب سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی بھی اپنی ایک منفرد ثقافت ہوتی ہے۔ گویا ثقافت وہ امتیازی وصف اور شناخت ہے جو ایک قوم وملک کو دوسرے قوم وملک سے ممتاز اور مختلف کرتی ہے۔ ثقافت کسی گروہ انسانی کے مجموعی عادات واطوار، رہن سہن اور بحیثیت مجموعی زندگی گزارنے کا وہ ڈھنگ ہے جس میں کسی حد تک یکسانیت ہو۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح ایک زبان دوسری زبان کے اثرات قبول کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح مختلف اقوام کے آپسی میل جول سے ثقافت بھی اپنے اندر مختلف اثرات قبول کرتی رہتی ہے۔

ناول جو کہ زندگی کا حقیقی عکاس اور ترجمان ہوتا ہے اگر دیکھا جائے تو بیشتر ناول اس معاملے میں اپنی ثقافتی خمیر کے ہی مظہرات معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ اگر زندگی کا کوئی ایک پہلو سمیٹتا ہے تو ناول بیک وقت کئی ایک پہلوؤں کو سمیٹتا ہے۔ افسانہ میں چونکہ وحدت تاثر ایک لازمی امر ہے اس لیے اس میں زندگی کی کھل کر اور وضاحت کے ساتھ عکاسی اور ترجمانی کسی قدر مشکل ہی ہوتی ہے لیکن ناول میں اس طرح کی کوئی قید نہیں۔ یہاں زندگی کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنے میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ جزئیات اور تفصیلات ثقافتی عناصر کی بوقلمونی کرنے کے حق میں رحمت ثابت ہوئی ہے۔ ناول میں ثقافتی عناصر کی وسیع پیمانے پر ترجمانی کی گئی ہے۔ مرد ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین ناول نگاروں نے بھی عصری ثقافت کے خاکے اپنے ناولوں میں پیش کیے ہیں۔ گویا ہر دور میں ہر کسی ناول نگار نے اپنی بساط بھر کوشش کے مطابق عصری زندگی کے متنوع ثقافتی پہلوؤں کو اپنے ناولوں کے صفحات میں محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کی حسین کوشش کی ہے۔ اپنے قوم و ملک کی ثقافت ان کی ناولوں کے رَگ و پےَ میں بسی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے۔

ا۔ سیاست:

سیاست سے مُراد ریاست اور حکومت کے مابین تعلق کا نام ہے، اِس کی ابتدا قدیم یونان کی شہری ریاستوں میں ہوئی۔ چنانچہ انگریزی لفظ "پالٹکس" سیاست یونانی زبان کے لفظ "پولس" سے نکلا ہے، جس کے معنی شہر یا شہری ریاست کے ہیں۔ قومی انگریزی اُردو لغت میں سیاست سے مُراد:

> "حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمتِ عملیاں اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد، اِن لوگوں کی ریشہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت، شان وشوکت،

منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد کے جویا ہوں۔" (۴)

سیاست عربی زبان کا لفظ ہے، فرہنگِ تلفظ میں سیاست کے معنی کچھ یوں ملتے ہیں: حکمرانی، حکمت عملی، ملکی اُمور، مصلحت اندیشی، حصولِ اقتدار اور تحفظ مفادات کے لیے جدوجہد ہے۔(۵) جامع علمی اُردو لغت میں سیاست کے معنی:

"(۱) حفاظت، نگہبانی، انتظام، معاملات ملکی (۲) ملک کی حفاظت، گہنگاؤں کی سزا (۳) رعب داب، دبدبہ (۴) سختی، قہر وغضب (۵) خوف، دہشت (۶) دھمکی، مارپیٹ، باز پُرس۔"(۶)

فرہنگِ آصفیہ میں لفظ سیاست کے لغوی معنی کچھ اس طرح ملتے ہیں: ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت و سلطنت، انتظام ملک، بندوبست اور نظم و نسق کے ہیں۔(۷) اصطلاحی اعتبار سے بھی یہ لفظ اِسی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے، بعض اوقات یہ حکمت و دانائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یونانی شہر سے مُراد ریاست state لیتے تھے کیونکہ قدیم یونان چھوٹی چھوٹی آبادیوں یا شہروں میں تقسیم تھا، جن کو شہری ریاستوں سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اِن ریاستوں کے افراد کے ہاں سیاست کا تعلق ہر اس امر سے ہے جو ریاست سے وابستہ ہو، یعنی جو علم ریاست سے متعلق ہوتا تھا اسے سیاست کہتے تھے۔ لیکن دورِ جدید میں لفظ سیاست کا مطلب بالکل مختلف انداز سے لیا جاتا ہے، اس سے مراد ایسا علم ہے جو ریاست اور حکومت کے سیاسی مسائل کو زیرِ بحث لائے۔

ارسطو کے نزدیک: سیاست ایک علم بھی ہے اور فن بھی۔(۸) گویا سیاست انسانی زندگی کا ایک ایسا طریقہ کار ہے جو کسی علاقے، ملک یا ریاست کے کاروبارِ حکومت کو سنبھالے اور سیاسی عمل ریاست اور عوام کے درمیان تعلق کا نام ہے اس سلسلے میں ڈیگارٹس کہتا ہے کہ: ریاست ایک مشین کی حیثیت رکھتی ہے اور شہری اِس کے پُرزے ہیں۔(۹) سیاست اپنے حقیقی مفہوم میں ایک ایسی قوت ہے جو انسانوں کو اجتماعی اور انفرادی زندگی میں ایک مخصوص راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کر سکے یا ترغیب دے سکے۔ معاشرتی وجود کی بنیاد سیاست ہے اور دو یا دو سے زیادہ افراد آپس میں ایک خاص وجہ سے جُڑے ہوتے ہیں اور وہ تعلق سیاست کا ہوتا ہے:

"سیاست ایک ایسا عمل ہے، جس میں لوگ اجتماعی طور پر فیصلہ لیتے ہیں۔ یہ عام طور پر حکومت یا ریاستی اُمور کو چلانے کا ایک فن یا سائنس (علم) ہے۔ یہ حکومتی معاملات میں طور طریقوں یا رویے کو بیان کرتا ہے۔ تاہم سیاست دوسرے باہمی معاملات میں بھی دیکھی جاسکتی ہے

جیسے کہ تعلیمی یا مذہبی اداروں میں اس میں حکام بالا یا طاقت کے معاشرتی تعلقات شامل ہوتے ہیں اور یہ سیاسی اکائی میں معاشرتی تعلقات کو بھی شامل کرتا ہے۔اس کے علاوہ پالیسی بنانے اور لاگو کرنے کے طریقے اور قوانین شامل ہیں۔"(۱۰)

سیاست ملک کے سیاسی حالات اور حکومت کے کاموں میں دُشواریوں سے متعلق ہوتی ہے جو کہ تمام ممالک میں ایک جیسی نہیں ہوتی اور سیاست محض اقتدار کے لیے کشمکش ہے اس میں ہمیشہ اولیت مفاد اور مصلحت کو ہوتی ہے۔ادب اور سیاست کے تعلق پر مبنی موضوعات کو ہمیشہ ناقدین ادب کی توجہ حاصل رہی ہے۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی اُتار چڑھاؤ، سماجی حالات و واقعات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور سماجی حالات ادب کے لیے خام مال کا کام کرتے ہیں۔جب ادب میں زندگی کا تنقیدی احساس پیدا ہوا تو ادیب نے سیاست کو ابہام سے نکال کر عوام اور عصری زندگی کے قریب رکھ کر دیکھنا شروع کیا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

"ادب میں سیاست کی بھی اتنی ہی گنجائش ہے جتنی فلسفے یا مذہب یا اخلاق کی۔مگر ادب کا طریقہ کار، سوال کرنے، سوالیہ نشان بنانے مسئلے پیش کرنے سے زیادہ سروکار رکھتا ہے۔جواب یا حل سے کم اور سیاست یا فلسفے یا مذہب کو حل کی فکر ہوتی ہے۔"(۱۱)

ہماری زندگی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سیاست سے بالکل محفوظ نہیں کیونکہ ہماری زندگی میں سیاست کا دخل اس قدر ہو چکا ہے کہ اس سے محفوظ رہنا ممکن نہیں۔ہمارا تمام نظام اس کا شکار ہے،سیاست ہر طرف اور ہر جگہ ہے۔سیاست کا تعلق ملک کے سیاسی حالات اور حکومت کے کاموں میں دشواریوں کے متعلق ہوتا ہے جو تمام ممالک میں ایک جیسی نہیں ہوتیں، بلکہ ہر ملک کا سیاسی نظام اور وہاں کے حالات دوسرے ملک سے مختلف ہوتے ہیں۔اسی لیے وہاں کے حالات و سیاسی نظام سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ادیب کا اپنی عصری زندگی سے گہرا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی عصری زندگی کے مسائل بنیادی طور پر سیاسی ہیں تو یہ مسائل بھی ادب میں جھلکتے ہیں۔کسی بھی عہد میں سیاست زندگی کے اہم پہلو میں شمار ہوتا ہے،اس لیے کوئی بھی ادیب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا اسی طرح ادب اور سیاست کا رشتہ زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔کیونکہ ہر زندہ ادب اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، معاشرتی و تہذیبی ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔اس لیے ادیب اپنے سماجی ماحول ،سیاسی حالات اور معاشی محرکات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک: حقیقی ادب تو شعور کی درست سیاسی، ثقافتی اور نظریاتی جہت ہی کی بدولت وجود میں آتا ہے۔(۱۲) ادب

کا اپنے ملک کی قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا فطری عمل ہے لیکن ادب کو کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہیں بنایا جاسکتا۔" ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ مشعل ہے جو سیاست کو راہ دکھاتی ہے۔ (۱۳)

ادب زندگی کی کسی بھی سرگرمی سے الگ رہنا برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اس کی رفتار محدود ہو جائے گی۔ کیونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اور اگر سیاست زندگی کا حصّہ ہے تو ادب اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔ سیاست سے کوئی بھی چیز الگ نہیں ہے، سیاست زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہو کر اسے متاثر کرتی ہے اور یوں ادب میں اپنے گردوپیش کا نہایت گہرا مطالعہ ہوتا ہے۔ ہماری ثقافت میں وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں دیکھا جائے تو پرانے وقتوں میں پنچائیت کا رواج تھا لوگ اپنے مسئلوں کے حل کے لیے گاؤں میں موجود پنچائیت کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جہاں ایک طرف ہمارے ہاں مسائل کا حل ہوتا تھا وہاں دوسری طرف اس سے ہمارے درمیان ایک پیار و محبت کی فضا قائم تھی۔ لوگ اس نظام کے تحت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نظام میں تبدیلیاں آتی گئی اور جو پیار و محبت کی فضا برقرار تھی اس میں بھی فاصلہ آتا گیا۔ دیکھا جائے تو آج کی سیاست خالی وعدوں کا نام ہے سیاستدان ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے ہوتے ہیں۔ سیاست دانوں کو لوگوں کے مسائل کا خیال صرف الیکشن کے دنوں میں آتا ہے۔

کسی بھی عہد میں سیاست زندگی کے اہم پہلو میں شمار ہوتا ہے، اس لیے کوئی بھی ادیب سیاست سے ماورا نہیں رہ سکتا۔ گویا سیاست زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے، اس لیے سیاست کو کسی طرح بھی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ادب زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے اور سیاست زندگی کا ایک شعبہ ہونے کی صورت میں ادب پر اثرانداز ہوتا ہے اس لیے ادب کا سیاست سے علیحٰدہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ سیاست ایک ایسا معاشرتی شعبہ ہے جس کے ذریعے کچھ لوگ یا گروپ اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ حکومت یا ریاست کی صورت میں سیاست ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے اور ہر معاشرے کے کچھ تنظیمی اُصول ہوتے ہیں جن میں اقتدار، کردار و عمل اور ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے۔ یہ اُصول و قوانین زبانی بھی ہوتے ہیں اور تحریری بھی۔ لیکن کچھ معاشروں میں تو ان قوانین پر سختی سے عمل ہوتا ہے اور کچھ میں تنظیم اتنی سخت نہیں ہوتی۔ سیاست میں کوئی برائی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی بُرا شعبہ ہے، یہ تو محض اپنے اختیارات کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ ہے تاکہ معاملات کو بہتر بنایا جائے۔ اس طرح ڈاکٹر مقصود جعفری نے سیاست کے معنوں میں

عوام کی فلاح و بہبود کے علاوہ عوامی رائے کی شمولیت کو بھی لازم ٹھہرایا ہے: سیاست کے لغوی معنی امورِ مملکت کی دیکھ بھال اور ریاست میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے عوامی رائے کی شمولیت ہے۔ (۱۴)

کاروانِ وجود:

سارہ کا کردار ناول میں ایک پڑھی لکھی خاتون کا ہے، جو اپنے ارد گرد کے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ سارہ کو اپنے کام کے سلسلے میں دوسرے ملک جانا پڑا تو اُسے اپنے ملک کی جمہوریت کا اندازہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں سارہ نے سیاست سے کنارہ کیا تو اُس عرصے میں اِس نے کتاب تک کو ہاتھ نہ لگایا۔ ۱۹۵۳ء میں انتخابات ہوئے تو کالج میں لیکچرار ہونے کی وجہ سے اُسے پولنگ سٹیشن پر پرایذائیڈنگ افسر مقرر کیا گیا تو اُسے قریب سے ہونے والی سیاست میں دھاندلیاں دیکھنے کا موقع ملا۔ شروع میں ایک گھنٹہ اُس نے سخت پہرہ بٹھایا اور چھان بین کے بعد ووٹ ڈالا جاتا رہا ایک پولیس والے کے ساتھ سارہ کی لڑائی ہوئی تو پولیس والا کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور الیکشن کمشنر کو بُلا لایا۔ جنہوں نے سارہ کو ڈانٹا، بوگس ووٹوں کو دیکھنا آپ کا کام نہیں بلکہ اُمیدوار کے نمائندے کا ہے۔ سارہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی اور ہجوم کو ووٹ ڈالتے ہوئے دیکھتی رہی جس میں دس برس کی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ جس سے سارہ کو اندازہ ہوا کہ کس طرح سیاست میں دھاندلی ہوتی ہے:

> "تب اس نے دیکھا کہ عیسوی کیلنڈر کے مطابق یہ حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد انیس سو تریسٹھواں سال ہے۔ تقسیم ہند اور آزادی کو سترہ سال ہو چکے ہیں۔ ملک پر صدر ایوب کی حکومت ہے اور راوی بہت سے لوگوں کے لئے چین لکھتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں سارہ نے ایک مرتبہ ملک کی سیاست سے روگردانی اختیار کی تو ان سترہ سالوں میں اخبار تک نہ اٹھا کر دیکھا۔ حکومتیں بنیں اور ٹوٹیں۔ وزیر آئے اور گئے۔ ۱۹۵۳ء میں انتخابات ہوئے تو کالج میں لیکچرار ہونے کی وجہ سے اسے پولنگ سٹیشن پر پرایذائیڈنگ افسر مقرر کیا گیا۔" (۱۵)

زیرِ نظر اقتباس میں الیکشن اور اُس میں ہونے والی دھاندلیوں کا ذکر ہے، جس کو ناول میں عُمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ سارہ کو بطور پریزائیڈنگ آفیسر الیکشن میں ہونے والی دھاندلیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے اپنے ناول کے ذریعے ہمارے سیاسی نظام کو بے نقاب کیا ہے۔ سیاستدان اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھنے کی بجائے اپنے آپ کو ان کا حاکم سمجھتا ہے اور کرسی حاصل کرنے کے لیے ہر اوچھے ہتھکنڈے کو اپناتے ہیں۔

دھنی بخش کے بیٹے:

دھنی بخش کے گھرانے نے اپنے اثر و رُسوخ کو استعمال کرتے ہوئے گاؤں کے بہت سے کام کروائے۔ خاص کر مسجد بنوائی باپ کے مرنے کے بعد احمد بخش کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ باپ کے مرنے سے پہلے جب وہ شہر پڑھنے جاتا تھا تو ایک دن پریکٹیکل کے لیے جاتے ہوئے اُسے اپنی موٹر سائیکل روکنی پڑی کیونکہ آگے ٹریفک جام تھا ایک سپاہی نے اُسے سڑک پر موٹر سائیکل لانے سے منع کر دیا، جب احمد بخش اُوپر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف پہرہ لگا ہوا ہے اور گاؤں کی عورتیں اور عام آدمی سپاہیوں اور افسروں کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک عورت کو اُس کے گھر والے ہسپتال لے کر جانے کے لیے چارپائی پکڑے کھڑے تھے۔ سب سڑک پار اپنے گاؤں جانا چاہتے تھے لیکن اُن کو اجازت نہ ملی۔ دور سے سائرن کی آوازیں آئیں۔ موٹر سائیکل اور کاروں کو دیکھ کر سپاہی سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد اور بہت سی گاڑیاں گزریں جس میں جیپیں اور ایک ایمبولینس بھی شامل تھی۔ ہماری سیاست میں بحران کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں پر پروٹوکول کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا ہے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے باعث عوام پریشانی سے دوچار بھی ہو سکتے ہیں۔ ناول میں اس کی عکاسی کچھ اس انداز میں سامنے آتی ہے:

> "پہلے دو دو کی تعداد میں بہت سے موٹر سائیکل سوار گزرے، پھر ایک لمبا خلا بنا اس کے بعد ایک آر مرڈ کار گزری، اس کے پیچھے کتنی جیپیں، پھر ایک ایمبولیس، پھر ایک ہی رنگ اور ایک ہی ماڈل کی چار کاریں گزریں۔ سب پر جھنڈا لہرا رہا تھا ان کے پیچھے جو کار تھی اس پر لکھا تھا موبائل ہسپتال۔ دورویہ کھڑے ہوئے لوگوں کی باتیں احمد بخش کو سنائی دے رہی تھیں۔ اب ان کے چہروں پر خوشی تھی۔ کسی نے کہا وزیر اعظم پہلی کار میں تھے، کسی نے کہا تیسری، کسی نے چوتھی۔"[۱۶]

گاؤں کی حالت کو سدھارنے کی غرض سے احمد بخش جو کہ دھنی بخش کا بیٹا ہے، وہ اولا کے کہنے پر گاؤں آتا ہے کہ وہاں لوگوں کے لیے کچھ کر سکے۔ احمد بخش کو دعوتی ملاقاتوں میں بہت سے ایسے لوگ ملے جو اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ صاحبِ حیثیت لوگ ہیں، اُس نے اُن لوگوں کو بھی مطمئن دیکھا جن کے تن پر میلے کپڑے اور پاؤں میں جوڑ لگے جوتے تھے۔ اُس کی ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جو ممبر قومی اسمبلی بننا چاہتا تھا اور اُس کے دعوے بہت بڑے بڑے تھے۔ وہ ایسے زچہ خانے بنوائے گا جو امریکہ میں بھی نہ ہوں۔ اس کی باتیں سُن کر احمد بخش ہنس پڑا اور سوچا کہ اپنی سڑک بنوانے میں ہی بیچارے کا سارا

وقت گزر جائے گا تو اسکول اور کلینک کیسے بن سکتے ہیں کیونکہ اسکول باقاعدہ بلڈنگ مانگتے ہیں،ڈیسک اور بینچز، بجلی اور پانی اور کلینک کو ایمبولینسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر لوگوں کی ضرورت فوری طور پر پوری ہو جائے تو پھر انھیں نہ حکومت سے شکایت ہوتی ہے نہ اس کے اداروں سے،ضرورت صرف انھیں جگانے کی ہے:

"اب یہی بات لے لو دو دن پہلے جو بزرگ ملے تھے وہ قومی اسمبلی کے ممبر بننا چاہتے تھے اور ان کا پروگرام تھا کہ ممبر بن کر اپنی دیہات کی حویلی سے لے کر مین روڈ تک پکی سڑک بنوائیں گے۔کیوں کہ ان کے مقابل رئیس نے یہی کام ممبر بن جانے پر کیا تھا اور اُس پانچ فرلانگ سڑک کا نام اس نے اپنے نام پر رکھا تھا ان کا ارادہ اس سے سوا تھا۔ٹریکٹر ٹرولی سے اپنی حویلی کے آس پاس کے مکانوں کا کوڑا مقابل کی کوٹھی کے سامنے ڈلوانے کا تھا۔"(۱۷)

زیر نظر اقتباس میں احمد بخش کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوتی ہے جو بتاتا ہے کہ وہ قومی اسمبلی کا ممبر بننے کے بعد گاؤں کے لوگوں کی فلاح کے لیے بہت سے کام کرے گا۔دیکھا جائے تو وسائل کی موجودگی کے باوجود سیاستدان کوئی کام نہیں کرتے وعدے بہت کرتے ہیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد وعدے بھول جاتے ہیں جو کہ اگلے الیکشن میں ان کو پھر یاد آتے ہیں۔

روشن اندھیرے:

کنول جیت کا کردار ناول میں عارضی طور پر نظر آنے والے کرداروں میں سے ایک کردار ہے،جو کہ مختصر وقت کے لیے نمودار ہوتا ہے۔شجاع جو کہ ناول کا ہیرو ہے اس کی کنول جیت سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اُسے اپنے بیتے ہوئے حالات کے بارے میں بتاتی ہے کہ اُس کا بھائی خالصتان تحریک کا زبردست حامی تھا وہ امرتسر سے ہوشیار پور آیا اور انقلابیوں کا ساتھ دینے لگا۔ایک دن جب کنول جیت کالج سے گھر آئی تو اُس کی ماں سمیت تینوں بہن، بھائیوں کو قتل کیا جا چکا تھا وہ اپنے پیاروں کو خون میں نہایا ہوا نہ دیکھ سکی اور بے ہوش ہو گئی۔بظاہر یہ ایک ڈکیتی کی واردات تھی لیکن کچھ دنوں بعد اُس کے باپ کو معلوم ہوا کہ یہ خالصتان تحریک کی حمایت کرنے کی سزا ہے۔کنول جیت نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا کہ جب کبھی وہ اتنی طاقت حاصل کرے گی تو اپنے اَن دیکھے دشمنوں سے انتقام ضرور لے گی۔دہلی جو کبھی اس کے لیے دیارِ غیر ہی تھا،وہاں سیٹ ہو جانے میں خالصتان تحریک کے پُر جوش جیالوں نے اُس کا بھرپور ساتھ دیا:

"ان دنوں کنول جیت کالج میں پڑھتی تھی۔وہ جوانی کی پُر بہار وادی میں قدم رکھ چکی تھی۔

اس کے ارد گرد خوشیاں تھیں، زندگی تھی اور قہقہے تھے۔ وقت بڑے سکون میں گزر رہا تھا، وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایک اس سے بڑا، ایک چھوٹی بہن اور پھر بھائی۔ اس کا بڑا بھائی امر تسر میں جاب کرتا تھا اور خالصتان تحریک کا زبردست حامی تھا، یہی جرم تھا جو اس کی زندگی کے خاتمے کا باعث بنا۔" (۱۸)

خالصتان تحریک کا تعلق سیاست سے ہے جو کہ ہندوستان میں ایک مخصوص طبقے یعنی سکھوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ خالصتان تحریک کا تعلق سیاست سے ہونے کے ساتھ انقلاب سے بھی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول ہوئی کیونکہ اس کا مقصد سکھوں کے حقوق حاصل کرنا تھا۔

صفر سے ایک تک:

منشی نے اپنے بیٹے ذکی کو گاؤں آنے پر سالار حیات کی آمد کے بارے میں بتایا کہ سالار سمجھتے ہیں کہ تو اُن کے بیٹے فیضان کو خراب کر رہا ہے۔ مُنشی نے کہا کہ وہ مُنشی گیری کا کام آگے لے کر چلنا نہیں چاہتا کیونکہ اُس کے بیٹے یہ کام آگے نہیں کرنا چاہتے۔ تو حیات سالار کہتا ہے کہ وہ یہ سب فائلیں واپس لے کر جانا چاہتا ہے، اُسے کمپیوٹر کو دیکھ کر بھی غصّہ آتا ہے وہ اِس بات سے بے خبر ہے کہ ذکی نے تمام دستاویزات کمپیوٹر میں محفوظ کر لیے ہیں۔ سالار کا کردار ناول میں اپنا اثر و رُسوخ دکھاتا نظر آتا ہے جو اپنے سے کمتر کسی شخص کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے اُس کی مثال فیضان اور ذکی کی دوستی ہے جسے حیات سالار پسند نہیں کرتا اور وہ سمجھتا ہے کہ ذکی اُس کے بیٹے کو خراب کر رہا ہے۔ منشی کو سالار کی باتوں پر غصّہ آتا ہے، اور وہ ذکی سے کہتا ہے کہ یہ سب کیا دھرا تیری اِس مشین کا ہے نہ میں تیری باتوں میں آکر اس میں اپنا کھاتا کھولتا اور نہ ہی مجھے پریشانی ہوتی۔ حیات سالار کا کردار ایک ایسے انسان کے طور پر سامنے آتا ہے جو کہ غریب کے بچوں پر اپنا حق سمجھتے ہیں اور اُن کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ آج کل دیکھا جائے تو کچھ یہی مثال ہمارے سیاستدانوں کی ہے جو اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے باہر کے ممالک بھیج دیتے ہیں لیکن غریب کے بچوں کے لیے تعلیمی سطح پر ایسی کوئی سہولیات میسر نہیں کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کر سکیں:

"مجھے لگتا ہے کہ یہ سب فساد اس مشین، اِس کمپیوٹر نے ڈالا ہے۔ بڈھے بندے کو اور خاص طور پر میرے جیسے بڈھے بندے کو اِس سے دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ نہ یہ نامراد آتا نہ میرے دماغ میں یہ بھوت پھیری آتی کہ کوتل کے سالاروں کے منشی کو بھی تو اپنا کوئی آخری کھاتا کھولنا چاہیے۔ آخری بستہ باندھ لینا چاہیے۔ میں بھی لگا رہتا جیسے ہماری جدی پشتی بزرگ وفادار تھے۔ پر ہم نے

بھی کیا کیا بس فائیلیں ہی بنائیں۔ سی ڈیاں ہی بنائیں۔ پھر سب کچھ واپس کر دیا۔۔۔ جا کر دیکھ لو بستوں والی الماری خالی پڑی ہے۔"[۱۹]

سالار گاؤں کے بااثر افراد ہیں وہ کسی بھی شخص کو اپنی برابری کرتا نہیں دیکھ سکتے۔ بااثر افراد عام شخص کو کیڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ حیات سالار جب ذکی کے گھر جاتا ہے تو ان کے گھر میں کمپیوٹر دیکھ کر اسے غصہ آتا ہے۔

نولکھی کوٹھی:

شیر حیدر کی اچانک موت کے بعد اس کے بیٹے غلام حیدر کے کندھے پر گاؤں کی تمام ذمہ داری آگئی، سب کی نظریں اُس پر تھیں کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح علاقے کا انتظام سنبھال لے گا۔ گاؤں میں رواج تھا کہ بااثر گھرانہ ہی تمام لوگوں کے مسائل سُنتا اور اُن کو حل کرتا، بڑے زمیندار کچھ تو اپنی ذیلداری کا بھرم رکھنے کے لیے اور کچھ گورنمنٹ کی نظروں میں اعتبار پانے کی غرض سے اپنی رعایا کے فیصلے عام طور پر خود ہی عدل سے چکا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر ایسے علاقوں میں امن و امان رہتا اگر کسی کے ساتھ زور زیادتی ہو بھی جاتی تو وہ صبر کر لیا جاتا اور گورنمنٹ تک بات نہ پہنچتی کیونکہ اتنے بڑے رقبے میں رہنے والی رعایا سے گورنمنٹ بے نیاز ہی رہتی۔ مکمل خبر گیری کرنا آسان نہ تھا سب سے بڑی مشکل تھی کہ غلام حیدر کو تجربہ بھی نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کہ رفیق پاؤلی جو کہ شیر حیدر کے خاص بندوں میں سے تھا اُس کو تمام کام سونپ کر لاہور چلا جائے۔ کیونکہ شیر حیدر کی زندگی میں نوے فی صد کام رفیق پاؤلی ہی کرتا تھا اور اُس سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی کوئی نہ تھا:

"اب شیر حیدر کی دفعتاً موت واقع ہوئی تو اس کا اکلوتا وارث ہونے کی وجہ سے غلام حیدر پر کافی ذمہ داریاں آگئیں۔ چار ہزار ایکڑ رقبے کو سنبھالنا اور علاقے کے بُرے بھلے کی خبر رکھنا آسان کام نہ تھا۔ زمینداری اور زمینوں میں کام کرنے والی رعایا اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے بیسیوں جھگڑوں کا بار بھی غلام حیدر کے سر آپڑا۔ عمومی طور پر قتل اور ڈکیتی کی واردات کے علاوہ اتنے بڑے رقبے میں رہنے والی رعایا سے گورنمنٹ بے نیاز سی ہو جاتی۔"[۲۰]

جس طرح ہمارے معاشرے میں سیاست مَورُوثی ہے کہ باپ کے بعد بیٹا اُس کی جگہ سنبھالتا ہے۔ اِسی طرح ناول میں شیر حیدر کی موت کے بعد اُس کا بیٹا اپنے باپ کا جانشین بنتا ہے۔ لیکن اس کو سیاست

کا کوئی تجربہ نہیں اور وہ عیش و عشرت کا عادی ہے یہی ہماری سیاست کا حال ہے برسوں سے سیاست کچھ خاندانوں کے ہاتھ میں ہے۔ سیاست دانوں کو عوام کی فلاح سے زیادہ اپنی موروثیت کی فکر ہے۔

ناتمام:

ناول میں اماں حاجن کا کردار محلے کی ایک ایسی عورت کا ہے جو سب کی جان ہے اور ایک فوجی کی بیوہ ہے، جو برما کے محاذ پر لڑنے والے سپاہیوں میں سے زندہ لوٹ آنے والے چند سپاہیوں میں شامل تھا۔ اماں حاجن کا نکاح جنگ پر جانے سے پہلے ہو چکا تھا اور رُخصتی جنگ سے لوٹنے پر ہوئی۔ کریم احمد لڑائی میں داہنی ٹانگ کٹوا آیا تھا اور اس کی جگہ لکڑی کی ٹانگ لگی تھی، کریم احمد اپنی مصنوعی ٹانگ کو یورپ کا جادو کہتا تھا۔ اس طلسماتی دنیا میں جانے کے لیے بے تاب تھا اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلتا بنا۔ جنگ سے آنے کے بعد وہ تھوڑا عرصہ گاؤں رہا ان دنوں لاہور میں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی ہر طرف بن کے رہے گا پاکستان کے نعرے گونجتے تھے۔ وہ اپنے مسلمان ساتھیوں کی عقل پر ماتم کرتا کہ جن لوگوں نے اُن کو سیاست اور مثالی زندگی کے اُصول سکھائے تھے انہی کو اپنے دیس سے نکالنا چاہتے تھے:

> "جنگ سے لوٹنے کے بعد وہ تھوڑا ہی عرصہ گاؤں میں رہا۔ پھر لاہور آ گیا۔ تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ 'بن کے رہے گا پاکستان' کے نعرے ہر طرف گونجتے تھے۔ لیکن یہ ساری ہاؤ ہُو اسے ایک آنکھ نہ بھاتی۔ وہ اپنے مسلمان ساتھیوں کی عقل پر ماتم کرتا کہ یہ اپنے ہی محسنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہی کو دیس سے نکالنے کے درپے تھے جنہوں نے اپنی اعلی تہذیب اور سائنس کی طاقت سے اس خطے اور یہاں کے باشندوں کی قسمت بدل دی تھی اور ان کو سیاست اور مثالی زندگی کے اصول سکھائے۔"[۲۱]

ہماری سیاست کا یہ تاریک پہلو تصور کیا جاتا ہے کہ مختلف پارٹیاں لوگوں کے حقوق کے لیے کھڑی ہو جاتی ہیں اور عوام سے ہمدردی کے ساتھ ساتھ اپنے فائدے کا سوچتے ہوئے اپنے ووٹ پکے کرتی ہیں کچھ جھوٹے اور خالی وعدوں کے ذریعے آج کل یہ رجحان اپنے عروج پر ہے اس کی عکاسی ناول میں اوپر دیئے گئے اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے۔

کوہِ گراں:

ناول کا کردار چودھری حلیم ایک بااثر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ گاؤں واپس آنے کے بعد وہ باقاعدہ حکمت عملی کے تحت منصوبہ بندی کرتا ہے کہ گاؤں کو گوبر سے پاک کرنے کے بعد فضلے سے بھی پاک

کرنا ہو گا۔ گاؤں میں یہ رواج تھا کہ گاؤں کا ہر مرد گھر سے باہر فارغ ہوتا تھا۔ صبح کی روشنی ہونے سے لے کر سورج نکلنے تک گاؤں کے آدمی اِرد گرد فصلوں اور خالی کھیتوں میں فارغ ہوتے۔ عورتیں اندھیرا ہونے کے بعد ٹولیوں میں نکلتی اور خالی کھیتوں میں فارغ ہوتیں۔ وقت گزرنے کے بعد گھروں میں غسل خانے اور ڈبلیو۔ سی متعارف ہو گئے لیکن باہر فارغ ہونے والے ختم نہیں ہوئے۔ حلیم نے بتایا کہ گاؤں کو فضلے سے پاک کرنے کے لیے ہر گھر میں ڈبلیو۔ سی اور نکاس کا زیرِ زمین بندوبست کرنا ہو گا۔ بارش کے پانی کو گاؤں سے باہر لے جانے کے لیے ایک نالہ تعمیر کیا جائے گا۔ حلیم کا گھرانہ اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے گاؤں کے تمام فیصلے کرتا تھا۔ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے یہ کام حلیم نے شروع کیا اور باقاعدہ حکمت عملی بنائی۔ تعمیرِ نو کے بعد گاؤں کے مسائل طے کرنے کے لیے ایک ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو ایک سال تک قائم رہے گی اور اُس کے ممبران ہر سال انتخاب کے ذریعے چُنے جائیں گے:

"گاؤں کے مسائل کا حل اُس کے خاندان کی ذمے داری رہا تھا۔ اِن معاملات کو نمٹاتے ہوئے وہ اکثر جانب دار ہو جاتے اور فیصلہ متعدد مفادات اور خود غرضیوں کو ذہن میں رکھ کر کیا جاتا۔ اِن میں جوہڑوں کو مٹی سے بھر کر گھر تعمیر کرنے کی اجازت دینا بھی شامل تھا تاکہ گاؤں میں داخلے اور باہر نکلنے کے لیے راستے ختم ہو جائیں اور لوگ ایک نئی مشکل سے دوچار رہیں۔ تعمیرِ نو کے بعد گاؤں کے مسائل طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی نامزد کی جائے گی جو ایک سال تک قائم رہے گی اور اِس کے ممبران ہر سال انتخاب کے ذریعے چنے جائیں گے۔"(۲۲)

آج کے وقتوں میں ایسے کام باقاعدہ حکومت کے ذریعے سرانجام پاتے ہیں لیکن پہلے وقتوں میں گاؤں میں اثر ورسوخ رکھنے والا گھرانہ ہی اس قسم کے فیصلے کرتا تھا اور گاؤں میں ایسا گھرانہ اجڑنے سے پہلے چودھری حلیم کا تھا۔ اسی لیے دوبارہ گاؤں کی بحالی کے لیے اس سے ہٹ کر تمام لوگ اسی کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ کمیٹی کی نامزدگی اور انتخاب کے ذریعے چناؤ کا طریقہ آج کا سیاسی طریقہ ہے۔

گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے سب چودھری حلیم کے منتظر تھے کیونکہ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنا ایک لمبا عمل تھا، اس کے لیے حلیم ایک نظام بنانا چاہتا تھا اور اس نظام میں ہر مسئلے کو مشورے سے حل کیا جاتا۔ گاؤں کے فیصلے کا حق چودھری کو نہیں ہو گا بلکہ ایک کونسل کے ذریعے انتخاب کیا جائے گا جس میں ذات، پات کی کوئی تقسیم نہیں ہو گی بلکہ اہلیت کی بنیاد پر لوگوں کو موقع دیا جائے گا۔ ہمارے سیاسی نظام کی تباہی کی وجہ ذات پات کا نظام تھا، اسی وجہ سے حلیم نے اپنے خاندان کے اثر ورسوخ کو پہلے ختم کیا:

"گاؤں کی ایک کونسل ہوگی۔پہلے سال اُس کونسل کو میں نامزد کروں گا۔"حلیم، حفیظ کے
رِدعمل کے لیے رُکا۔
"پھر ہر سال یہ کونسل منتخب ہوا کرے گی۔اِس کونسل میں ذات پات کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔
ہمارے سیاسی نظام کی تباہی کی وجہ ہی ذات پات کا نظام تھی۔برادریاں اور قبیلے ہر نظام سے
زیادہ طاقت ور ہوگئے تھے۔میرا خاندان بھی اُس کی طاقت کے ستونوں میں سے ایک تھا۔
اب انھیں کمزور کرنے کا آغاز میں کروں گا۔"(۲۳)

حلیم کا گھرانہ گاؤں کا بااثر خاندان ہے۔ حلیم گاؤں والوں کی بہتری چاہتا ہے اور اس کے لیے کچھ اقدامات کرتا ہے۔وہ ایک ایسا نظام متعارف کروانا چاہتا ہے جس میں تمام لوگوں کو یکساں اپنی رائے دینے کے مواقع ملیں۔ذات برادری کی برتری کو ختم کرنے کے لیے حلیم نے اپنے خاندان کے اثر ورسوخ کو ختم کیا اور ایک کونسل کا قیام کیا جس کے ارکان ایک سال کے لیے منتخب ہوں گے۔

دشتِ وفا:

ناول کا مرکزی کردار نجیب کا ہے اور خورشید اُس کا دوست ہے۔جو ناول میں اپنے باپ کی موت پر نظر آتا ہے اور اُس کے دوستوں کا خیال ہے کہ اُس نے اپنے باپ کے مُنہ پر تکیہ رکھ کر اُسے مارا ہے۔خورشید باپ کے مرنے کے بعد جب ہوش میں آتا ہے تو اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ خورشید ہاؤس کے دروازے تم لوگوں کے لیے کھلے ہیں تم لوگوں کو روٹی اور کپڑا ملے گا۔خورشید اپنے دوستوں کے سامنے وزیر اعظم کا پسندیدہ نعرہ لگاتا ہے،سیاست دان بھی عوام کو روٹی، کپڑے اور مکان کا لالچ دیتے ہیں۔خورشید بھی اپنے ذہن میں کہیں اقتدار کا مزہ لینا چاہتا ہے کیونکہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد وہ ہر فیصلہ لینے میں آزاد ہے:

"اس نے وزیر اعظم کا پسندیدہ نعرہ دہرایا۔اپنی جماعت کی طرح مقتدر اپنے نعرے بھی
لاتے ہیں۔حرامی بچوں کی طرح نئے نئے نعرے بھی جنم لیتے رہتے ہیں جنہیں کوئی نہیں
روک سکتا۔ سوسائٹی میں جگہ دینی ہی پڑتی ہے۔"(۲۴)

زیر نظر اقتباس میں خورشید اپنے باپ کی موت کے بعد اقتدار کے نشے میں اپنے دوستوں کے لیے گھر کے دروازے کھول دیتا ہے اور سیاستدانوں کی طرح نعرے لگاتا ہے کہ تم کو روٹی، کپڑا اور مکان ملے گا۔کیونکہ سیاستدان بھی عوام کی دکھتی رگ سے واقف ہوتے ہیں اور اقتدار میں آنے کے لیے یہی نعرے لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ہماری سیاست میں یہ چیز شامل ہے کہ عوام سے ووٹ لینے کے لیے پہلے اُن سے بڑے بڑے

وعدے کیے جاتے ہیں کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گے لیکن اقتدار میں آنے کے بعد وہ عوام سے کیے گئے اپنے وعدے بھول جاتے ہیں۔ آغا گل نے خورشید کے کردار کے ذریعے ہمارے سیاسی نظام پر چوٹ کی ہے کہ کس طرح وہ سادہ لوح عوام کو جھوٹے وعدوں کا آسرا دے کر خود اقتدار کا مزہ لیتے ہیں۔

ادھ ادھورے لوگ:

فیاض جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے اُس نے اپنے باپ کا ہاتھ بٹھانے کی بجائے حکمت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اُس کے ساتھ وہ سیاست میں بھی حصہ لیتا رہا جس کی وجہ سے اُسے جیل بھی جانا پڑا۔ جب ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو فیاض جیل میں تھا، فیاض سمیت ون یونٹ کے خلاف تحریک چلانے والے سبھی کارکنوں کو یقین تھا کہ ایوب خان ون یونٹ کو توڑ دے گا لیکن وہ اپنی کُرسی کو بچانے کی کوششوں میں لگ گیا۔ فیاض کو اپنی آس ٹوٹنے پر ایوب خان سے بہت نفرت ہو گئی اتنی تو اُسے ون یونٹ بنانے والوں سے بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ وہ سیاست سے الگ تھلگ ہو گیا تھا اُس نے حکیم صاحب کو چھوڑنے کے بعد لاڑی اڈے کے قریب دُکان بنا لی۔ اُسے اب بھی چوبارے والے حکیم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا وہ جب کبھی ایوب خان کے خلاف کسی جلسے، جلوس کی خبر سُنتا تو اُس کا دل چاہتا کہ جلوس میں پہنچے اور ایسی تقریر کرے کہ لوگ راولپنڈی پہنچیں اور ایوب خان کے ایوانِ صدر کو آگ لگا دیں، جس نے پاکستان کی چھوٹی ثقافتوں کی خاک ہوتی ہوئی شناخت کو بچانے کی بجائے اُلٹا راکھ کر چھوڑا تھا:

> "ایوب خان کے خلاف نفرت کا کوئی ایک دہانہ یا گزر گاہ نہیں تھی۔ لوگ جس چیز سے نالاں ہوتے اُس کا رخ نفرت کی علامت کے طور پر ایوب خان کی طرف موڑ دیتے۔ چینی چار آنے مہنگی ہوئی تو بُرا ایوب خان اور آٹا دو آنے مہنگا ہوا تو نفرین ایوب خان پر۔ ۱۹۶۷ء کے آتے آتے شہر شہر بستی بستی اچھے بھلے جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ اِن کی شروعات سکول اور کالجوں سے ہوئی، پھر یہ نفرت گلی گلی محلے محلے پھیلتی چلی گئی۔"(۲۵)

زیر نظر اقتباس میں سیاستدانوں کے ایک ایسے چہرے کو دکھانے کی کوشش کی ہے جو بہت بھیانک ہے ان کو اپنی کرسی سے غرض ہوتی ہے پہلے وہ اپنا ایک نظری نعرہ بلند کرتے ہیں۔ لوگ اس نظریے میں ان کو اپنا لیڈر مان کر جنون کی حد تک ان کی پیروی کرتے ہیں مگر جب لوگوں کو ان کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے تو یہ عقیدت نفرت کا روپ دھار لیتی ہے یہی سب ایوب خان کے ساتھ ہوا۔ سیاسی طور پر لوگ اپنے لیڈر سے اِس

حد تک متنفر ہو چکے تھے کہ نفرت کی علامت کے طور پر جس چیز سے نالاں ہوتے اُس کا رُخ ایوب خان کی طرف مُوڑ دیتے پھر یہ نفرت سکولوں، کالجوں سے ہوتے ہوئے گلی گلی، محلے محلے پہنچ گئی۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

لیاقت باغ راولپنڈی میں بے نظیر کا بہت بڑا جلسہ تھا جہاں پر باقاعدہ حکمت عملی کے تحت دھماکے کے بعد کسی نے جیمر آن کر دیئے تا کہ جلسے کے قریب رپورٹر موبائل فون پر کسی سے رابطہ نہ کر سکے۔ ذوالفقار بی بی کے قافلے سے کافی دور چائے پی رہا تھا، اُس نے جاوید کو کال ملائی تو ساتھ ہی دوسرا دھماکا ہو گیا۔ جاوید کی گاڑی نیچے ہی کھڑی تھی وہ کیمرہ مین اور ڈرائیور کے ساتھ جُلوس کی جگہ گیا۔ سیاسی جلوسوں میں دھماکوں کا ہونا عام سی بات بن گئی تھی۔ پہلے وقتوں میں گاؤں میں معزز لوگ آپس میں بیٹھ کر مسائل کا حل تلاش کرتے تھے لیکن جیسے ہر چیز میں تبدیلی آتی گئی ایسے ہی ہر نظام پیچیدہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ بے نظیر کی جان لینے کو بھی معمولی خیال کیا جانے لگا۔ اور اِس کی مثال ناول میں بے نظیر پر ہونے والا حملہ ہے:

> "ہجوم چھٹ چکا تھا لیکن سڑک پر جو منظر اُس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ بیان سے باہر تھا۔ رات کی ٹھنڈک سے خنک سڑک پر ہر طرف آدمی بکھرے پڑے تھے اور پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اپنے چاروں طرف اور کبھی اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ بعض کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں، لیکن لگتا تھا کہ انھیں کوئی بڑا زخم نہیں لگا۔ سڑک کے ایک کنارے پر بے نظیر بھٹو کا ٹرک کھڑا تھا جسے اس جلوس کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا اور پاکستان کی کوئی سواری جس سے مشابہ نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے پکا یقین ہے کہ پرویز مشرف القاعدہ والوں کو پاکستان میں پناہ دے رہا ہے۔ اللہ کرے یہ بات غلط ہو، لیکن اگر صحیح ہوئی تو امریکہ القاعدہ والوں کی تلاش میں پاکستان میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔"(۲۶)

زیرِ نظر اقتباس ایک رکشہ ڈرائیور کی زبانی بیان ہو رہا ہے جس کی سیاست پر اِس قدر گہری نظر ہے کہ اُسے پختہ یقین ہے کہ بے نظیر کا قتل مشرف نے کروایا ہے اور مشرف ہی القاعدہ والوں کو پاکستان میں پناہ دے رہا ہے اور امریکہ القاعدہ والوں کی تلاش میں پاکستان میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔

آفتاب اقبال ناول کے نمائندہ کردار جاوید اقبال کا بڑا بھائی ہے وہ اپنی ماں کے ساتھ راولپنڈی میں رہتا ہے۔ جاوید کا دوست اپنے خواب میں دیکھے جانے والے شخص کی تلاش میں راولپنڈی آتا ہے اور اُسے مری روڈ کے کسی مزار پر ڈھونڈنے جاتا ہے جس روز بے نظیر کا قتل ہوا آفتاب اقبال بھی وہاں موجود تھا اُسے

بے نظیر سے بہت ہمدردی تھی۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ بے نظیر کیا سوچتی ہو گی کہ جس شہر سے اُس کے باپ کی لاش لاڑکانہ بھیجی گئی وہاں کے لوگ آج بھی اُس سے ہمدردی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بے نظیر کو راولپنڈی میں دو سے زیادہ نشتیں نہیں ملیں گی، اُس کا خیال تھا کہ یہ جلسہ کامیاب نہیں ہوا۔ جلسے میں حاضرین کا جُوش بڑھانے کے لیے بے نظیر اپنی طاقت سے زیادہ کوششیں کر رہی تھی۔ جلسے سے نکل کر وہ لیاقت باغ لائبریری کے پاس پہنچا ہی تھا کہ زور دار دھماکے کی آواز آئی۔ آفتاب بھاگتا ہوا دھماکے کی جگہ پہنچا اور زخمیوں کو ایمبولینسوں میں سوار کروانے لگا۔ وہاں بے نظیر کی گاڑی بھی موجود نہیں تھی لیکن لوگ کہہ رہے تھے کہ دھماکہ بے نظیر کی گاڑی کے پاس ہوا ہے۔ بے نظیر پر ہونے والے حملے سے پہلے جلسے کی صورتحال کچھ اس انداز سے ناول نگار نے پیش کی ہے:

"لیاقت باغ میں جلسے کے دوران آفتاب اقبال نے حاضرین کی تعداد جاننے کے لیے کئی بار کھڑے ہو کر جلسہ گاہ پر نظر دوڑائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ جلسہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ لیاقت باغ جسے نوے کی دہائی میں بے نظیر دور دور تک بھر دیتی تھی، کئی جگہوں سے خالی پڑا تھا۔ جلسے کے شرکا میں بھی ویسا جوش وخروش نہیں تھا اور ملک بھر میں جلسوں سے خطاب کر کر کے اپنا گلا خراب کر بیٹھنے والی بے نظیر حاضرین کا جوش بڑھانے کے لیے اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کر رہی تھی۔"(۲۷)

سیاست میں سیاستدان اپنا پورا زور لگا کر اپنے ووٹر کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُن کے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کرتا ہے اس کے لیے وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا جیسا کہ ناول میں بے نظیر کے ساتھ ہوا۔ سیاست کے میدان میں کامیاب جلسے کے بغیر چلنا مشکل ہے جس کے لیے وہ لوگوں کو اپنے نعروں کے ذریعے اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ بی بی کے جلسے میں بھی یہی تھا وہ راولپنڈی کے جلسے کو کامیاب کرنے کے لیے پورا زور لگا رہی تھی جس میں ان پر حملہ ہو گیا اور بہت سی قیمتی جانوں کا بھی ضیاع ہوا۔

پانی مر رہا ہے:

اسرار کا کردار ناول میں ایک بہت جاندار کردار کے طور پر سامنے آتا ہے، کیونکہ اللہ یار کا گھرانہ کافی اثر ورُسوخ رکھتا ہے اور اسرار اپنے بھائیوں کی نسبت اپنے باپ کا لاڈلا بیٹا ہے۔ اپنی ہر ادا سے ثابت کرتا ہے کہ وہی اللہ یار کا اصل سپوت ہے۔ وہ اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کے لیے گاؤں کے لوگوں کو دعوت پر بلاتا ہے۔ اسرار کی دعوت پر آئے ہوئے لوگوں نے خوب پلاؤ، زردے کھائے۔ کامے ہاتھ دھلانے اور حقے تازہ کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں میں کھانا دینے چلے گئے۔ مہمان ٹاہلیوں اور دھریکوں کی چھاؤں میں پیٹ بھر

کے کھانا کھانے کے بعد اُس خمار میں خوشی سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ مہمان نوازی سے وہ بہت خوش ہوئے لیکن اندر ہی ان کے یہ خوف پڑ گیا کہ کیا وہ بھی ایسی دعوت کر سکیں گے۔ وہموں کو ٹالنے کے لیے وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگے۔ اسرار نے بنا کسی تمہید کے انہیں آج کی دعوت کے بارے میں آگاہ کرنا شروع کیا:

> اسی وقت اس نے ایک دعوت کا اعلان کیا جس میں وہ علاقے کے سرکردہ لوگوں کو بلا کے اپنے فیصلے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔
>
> اسرار کی دعوت پہ آئے ہوئے سب لوگ خوب سیر ہو کے پلاؤ زردہ کھا چکے تھے۔ کامے ہاتھ دھلانے اور حقے تازہ کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں میں کھانا پہنچانے چلے گئے تھے۔"(۲۸)

پہلے وقتوں میں گاؤں کے مسائل کا فیصلہ پنچائیتوں وغیرہ کے ذریعے ہوتا تھا یا گاؤں کے برسرِ اقتدار لوگ یہ کام سرانجام دیتے تھے۔ ناول میں اس کی مثال اللہ یار کا گھرانہ تھا کہ کس طرح اسرار نے اپنے فیصلے کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے ایک دعوت کا اہتمام کیا تاکہ وہ لوگوں کو جمع کرنے کے بعد اپنا فیصلہ سنا سکے۔ کیونکہ گاؤں میں اللہ یار کا گھرانہ دوسرے گھرانوں کے مقابلے میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اسی طرح الیکشن سے پہلے سیاستدان اپنی جیبوں کے منہ کھول دیتے ہیں خاص و عام کے لیے کھانے کا عام اہتمام ہوتا ہے سب کے مسئلے سنے جاتے ہیں کچھ کو حل کر دیا جاتا ہے اور کچھ کو الیکشن کے بعد حل کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔

گلِ مینہ:

گُل مینہ کے دادا اور ماں نے برادری کے خلاف جا کر اُسے سکول بھیجا، لیکن گلِ مینہ کی قسمت نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ کیونکہ یکے بعد دیگرے اُس کے سکول کی اُستانیاں سکول چھوڑ کے جاتی رہیں جس کی وجہ سے سکول کو تالہ لگ گیا۔ دادا کو جب علم ہوا تو انھوں نے جا کر ملک عطاء اللہ کو سخت سست کہا لیکن وہ مُکر گیا کہ اُستانیوں کے جانے میں اُس کا کوئی کردار نہیں۔ قبائلی علاقوں میں رواج تھا کہ وہاں عورت کو بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا یہی حال گُل مینہ کے علاقے کا بھی تھا۔ وہاں پر اثر رُسوخ رکھنے والا آدمی ملک عطاء اللہ موجود تھا جو کہ وہاں پر پڑھانے آنے والی لڑکیوں کو تنگ کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ اس علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ہماری سیاست کا یہ حصّہ ہے کہ اثر و رُسوخ رکھنے والے لوگ ہمیشہ اپنے سے نچلے طبقے کو تنگ کرتے ہیں۔ ناول میں اِس کی مثال ملک عطاء اللہ کا کردار ہے:

> "سہیلیوں نے بتایا کہ مس فرزانہ کو علاقے کے ملک عطا نے دھمکی دی تھی کہ سکول آنا چھوڑ دے

ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ لڑکیوں کو خراب کر رہی ہے۔ مس فرزانہ نے پشاور کے کالج سے پوری بارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔ اس کا باپ وہاں کسی محکمے میں افسر تھا، اور ریٹائر ہونے کے بعد واپس شوال آبسا تھا۔ اسی نے دوڑ دھوپ کر کے علاقے میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کے لیے سکول کھلوایا تھا۔ بعد میں گل مینہ کو معلوم ہوا کہ ملک عطا نے مس فرزانہ کو کسی دن سکول جاتے ہوئے دیکھا اور اسی شام اس کے باپ سے رشتہ مانگا تھا۔ انکار پر اس نے سکول ہی بند کروا دیا۔"(۲۹)

بے نظیر کے مرنے کی خبر سنتے ہی پورے ملک میں عجیب انتشار پیدا ہو گیا، کیونکہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لیکن یہ سب چیزیں ہماری سیاست کا تاریک پہلو اُجاگر کرتی ہیں۔ گُل مینہ کو جب اپنے بیٹے فتح محمد کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ فدائی بن گیا ہے تو وہ اپنے دادا کی پستول بیچ کر اپنے بیٹے کو تلاش کرنے نکلتی ہے۔ جب وہ راولپنڈی پہنچتی ہے تو اُسے بے نظیر کے بم دھماکے میں قتل کی خبر ملتی ہے۔ ڈرائیور بھی غصّے سے بولتا ہے کہ ایک ہی تو لیڈر تھی جسے مشرف نے مروا دیا ہے پہلے اُس کے باپ، بھائیوں کو مارا اور اب بھٹو کی آخری نشانی کو بھی ختم کر دیا۔ اب اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے یہاں ایک عام شخص کا بھی سیاست سے تعلق دیکھا جا سکتا ہے:

"ایک سفید رنگ کی سیاہ شیشوں والی بڑی گاڑی جب پھاٹک سے نکلی تو لوگوں نے نعرے لگانا شروع کر دیے"

'بھٹو دے نعرے وجن گے۔'

کمانڈر نے فتح خان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگا۔

'جیے جیے جیے بھٹو۔'

اب کمانڈر نے فون جیب میں رکھ لیا تھا۔ آس پاس لوگ جمع ہونے لگے، ان میں سے بیشتر نے ہاتھوں میں جھنڈے، بینر اور ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے جن پر باتصویر کارڈ لگے ہوئے تھے۔"(۳۰)

قبائلی علاقوں میں سیاست اقتدار کی صورت میں عوام کا استحصال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عطااللہ کا کردار اس کی نمایاں مثال ہے جو عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہے اور اس کے خوف کی وجہ سے کوئی بھی استانی سکول میں چند دن سے زیادہ نہیں رکتی۔ گل مینہ جب اپنے بیٹے کو ڈھونڈتی ہوئی شہر پہنچتی ہے تو اسے ڈرائیور کی

زبانی بے نظیر پر حملے کی خبر ملتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی بھی سیاست پر گہری نظر رکھتا ہے۔

گراں:

چودھری محمد اکرم اور این زیڈ ڈی ان دونوں کرداروں کی مدد سے جدید تہذیب اور دیہی تہذیب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ این زیڈ ڈی اپنے دوست چودھری محمد اکرم کو یاد کر رہا ہے جو کہ اب گاؤں میں کافی اثر ورسوخ رکھتا ہے۔ چودھری محمد اکرم دیہی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے، جبکہ نذیر احمد جدید تہذیب کو پیش کر رہا ہے۔ گاؤں کی ساری برادریاں اُس کے فیصلوں کی تائید کنندہ ہوا کرتیں تھیں۔ وہ گاؤں کے سرپنچ کی حیثیت سے ہر خوشی، غمی میں سب سے پہلے پہنچتا ہے اور آخر میں اُٹھ کر آتا۔ ہر تقریب کا وہی منتظم اعلیٰ ہوتا اُس کے فیصلوں کی وجہ سے اب گاؤں کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہوگئ تھی۔ گاؤں کی رابطہ سڑکیں، پلیاں اور گلیاں بھی پختہ ہو چکی تھیں، چھوٹی مسجد اب جامعہ مسجد میں تبدیل ہوگئ تھی۔ جنازہ گاہ اور قبرستان کو بھی بڑا کر دیا گیا ہے، ہر شخص یہی کہتا کہ یہ سب چودھری محمد اکرم نے بنوایا ہے۔ چودھری کا سیاستدانوں کی طرح دل خوش ہو جاتا، الیکشن میں ووٹ دینے کا فیصلہ اُسی کے ڈیرے پر پنچائیتوں میں ہوتا تھا۔ ناول کے ایک اقتباس سے اس کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے:

> "میں ابھی بے روزگار ایم۔اے پاس نوجوان تھا، جب وہ خاندان کا سرپنچ قرار پا چکا تھا۔ میرا کتابی علم بڑھتا گیا اُس کا تجربہ بڑھتا گیا۔ وہ گاؤں کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے لگا۔ اُس کی رائے صائب اور فیصلے قابلِ قبول ہوتے۔ کس اُمیدوار کو الیکشن میں ووٹ دینے ہیں کونسے ترقی کے منصوبے منظور کروانے ہیں۔ کہاں نالیاں پلیاں پختہ کروانی ہیں راجباہ، موگھوں پانیوں کے مسائل حل کروانے ہیں۔"(۳۱)

چودھری گاؤں کا سرپنچ قرار پا چکا تھا اُس کے فیصلے قبول کیے جاتے اُسی کی رائے سے الیکشن میں اُمیدواروں کو ووٹ دیا جاتا۔ زیر نظر اقتباس میں اثر ورسوخ رکھنے والے شخص کی اہمیت کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ یہ بھی ہماری سیاست کا تاریک پہلو ہے کہ اثر ورسوخ رکھنے والے آدمی کی ہر بات کو مانا جاتا ہے۔ چودھری محمد اکرم کا کردار بھی ایسا ہی ہے ووٹ دینے کی غرض سے کون سے منصوبے منظور کروانے ہیں ان تمام کا فیصلہ چودھری ہی کرتا ہے۔

ب۔ تعلیم:

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ملک ہے، اس اعتبار سے تعلیم کے مقاصد، غرض وغایت اور اُصولِ تعلیم کے بنیادی نکات اسی فکری جہت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں علم اور حصول علم کی فضیلت پر بہت زُور دیا گیا ہے۔ تاریخ اسلام میں حصول علم کی عظمت کا راز تقدس میں پوشیدہ ہے، تقدس کو تعلیم میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ احترامِ اُستاد بنیادی معاشرتی اقدار میں شامل ہے۔ اسی لیے شاگرد کے بارے میں سنجیدگی کے علاوہ موادِ علم کو مقدس جاننے کا احساس بھی عام تھا:

> "علم کو معاشرتی زندگی میں ایک امتیازی مقام اور رُتبہ حاصل تھا، جس کی بنیاد پر سماجی زندگی کے مختلف مظاہر میں تعلیمی ہماہمی ایک خاص اعتبار اور اعتماد کی چیز بن گئی تھی۔ اس سے نفسیاتی سطح پر معاشرے میں علوم کی گرفت مضبوط رہی۔ اور عُلوم کے بارے میں تجزیے، تفکر اور قیاس کی اہمیت ایک سنجیدہ طرزِ عمل قرار پاکر اعلیٰ روحانی اور مادی اقدار کے حصول کا باعث ہو گئی۔"(۳۲)

تعلیم انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے اور چونکہ زندگی کے مختلف تصورات ہیں، اس لیے تعلیم کے معنی و مقصد میں اختلاف کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر زندگی کو مایا جال، بھرم اور دھوکا سمجھا جائے تو تعلیم کا مقصد اس بے ثبات زندگی سے نجات حاصل کر کے حیاتِ جاوداں کی تلاش ہو گا۔ اور اگر زندگی کو ایک حقیقت تصّور کیا جائے تو پھر تعلیم اُسے تمام مادّی امکانات سے لطف اُندوز ہونے کے وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے گی۔ غرض، تعلیم کے مقاصد کا اختلاف دراصل آئینہ ہے اِس اختلاف کا جو لوگوں میں حیاتِ انسانی کے تصّور سے متعلق پایا جاتا ہے:

> "ہر زمانے میں تعلیم کا ایک مخصوص منصب اور اس کا ایک متعین کردار رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی طبقہ یا فرقہ پورے سماج پر حاوی رہا ہے۔ اور اس نے اس قسم کی تعلیم دی، جو اس کے اثر اور اقتدار کو قائم رکھنے میں مدد و معاون ہو سکے۔"(۳۳)

تعلیم دراصل تہذیبی و ثقافتی سرمایے کی منتقلی کا عمل ہے جن ذرائع اور وسائل کی مدد سے کوئی سماج اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے کو ایک نسل سے دوسری نسل کے سپرد کرتا رہتا ہے، وہ سب کے سب معلم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں ریڈیو، اخبار، سینما، جلسے، جلوس وغیرہ نے تعلیم کے میدان میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اِن کے ذریعے تہذیبی و ثقافتی عناصر کو بہت موثر انداز میں لوگوں تک پہنچایا جاتا

ہے۔ اگرچہ گھر اور خاندان، برادری اور مذہبی جماعتیں اور اسی قسم کے دوسرے ادارے بھی جن سے فرد کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آج کا پاکستان سیاسی، معاشرتی، فکری، تعلیمی، معاشی اور روحانی طور پر جہاں کھڑا ہے اور جس افراتفری، شدت پسندی اور انتہا پسندی کا شکار ہے اسی نظامِ تعلیم کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ ڈاکٹر انجم رحمانی اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

"کسی قوم کے عُروج وزوال میں اس کے مرتب کردہ نظام کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر ایک ملک اپنے مقرر کردہ مقصدِ حیات کے مطابق نظامِ تعلیم رائج کرتا ہے مگر افسوس کہ ہم وہ بد قسمت قوم ہیں جس کا نظام تعلیم ہادی عالم ﷺ کی تعلیم، مقصدِ حیات، اُخروی نجات و فلاح سے بالکل ناآشنا ہے۔ اور ہمارے قلبِ و نظر میں پاکیزگی اور طہارت کی بجائے ثقافت کی آلودگی پیدا کرتا ہے۔"(۳۴)

قومی و نظریاتی پہلوؤں کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارا نظامِ تعلیم ناکامی کی طرف تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ڈاکٹر عبد القیوم کہتے ہیں:

"ہماری تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ قومی نکتہ نگاہ سے اس میں کوئی بھی فریم ورک موجود نہیں ہے۔ اور اس میں قومی سطح پر عمومی مقاصد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تعلیمی ترجیحات قومی مقاصد کے پیشِ نظر متعین نہیں کی گئیں۔ کیونکہ ہمارے نظامِ تعلیم کی تعمیر و اصلاح کے مسائل کا بنیادی تقاضا نوعیت کے اعتبار سے روحانی ہے مادی نہیں، جس کے حل کے لیے ضروری ہے کہ قومی سطح پر تعلیم کے مقاصد کا تعین کیا جائے اور ان مقاصد کی روشنی میں تعلیمی ترجیحات کو ترتیب دیا جائے۔"(۳۵)

ہمارا نظامِ تعلیم جو ہمیں ورثے میں ملا تھا، اس نظام نے ہمارا رشتہ ہمارے شاندار ماضی سے توڑ دیا ہے۔ ہماری اسلامی اقدار و روایات اور تاریخ جو کہ ایک بہت عظیم ورثہ تھی۔ پاکستانی قوم کی ایک خاص نوعیت کی تاریخ تھی لیکن موجودہ نظامِ تعلیم نے ہمارا رشتہ اس تاریخ سے توڑ دیا ہے۔ پروفیسر محمد عثمان کہتے ہیں:

"ہمارے نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یا خامی یہ ہے کہ اگرچہ طالب علم کو معلومات بھی دیتا ہے۔ بعض اوقات علم بھی دیتا ہے، بے شمار صورتوں میں پیشہ ورانہ مہارت بھی، لیکن اگر نہیں دیتا تو طالب علم کو اس کا ذاتی اور قومی تشخص نہیں دیتا۔"(۳۶)

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ پاکستان کی سلامتی اور بھرپور طریقے سے دُنیا کے ساتھ آگے بڑھنے کا انحصار اچھے نظامِ تعلیم پر ہے۔ لیکن یہ اسی صُورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس قابل ترین، پُر

خلوص، تحقیق کا جذبہ رکھنے والے قابلِ رشک سیرت و کردار کے مالک اساتذہ،ڈاکٹر و سائنسدان، سیاستدان، صحافی ہوں اس کے بغیر ہم کسی طرح ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتے۔ جہاں اور بہت سی چیزوں میں ہماری ثقافت میں تبدیلی آئی ہے وہاں پر ہی تعلیمی نظام میں بھی ہماری ثقافت میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ پہلے بہت کم لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے زیادہ تر لوگ قرآن پاک کی تعلیم ہی حاصل کرتے تھے اور سکول کی تعلیم حاصل کرنے کا رواج بہت کم تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے تعلیم کی طرف بھی دھیان دینا شروع کیا۔ پہلے گاؤں میں ٹاٹوں کے سکول ہوتے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی تعلیم کے نظام کی طرف توجہ دی گئی اور لوگ گاؤں سے تعلیم کے حصول کے لیے شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگے اور اب تو تعلیم کا رجحان اتنا بڑھ گیا ہے کہ لوگ بہتر تعلیم کے لیے باہر ممالک کا بھی رُخ کرنے لگے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ تعلیم اپنے وسیع تر معنوں میں وہ چیز ہے جس کے ذریعے لوگوں کے کسی گروہ کی عادات اور اہداف ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ اپنے تکنیکی معنوں میں اس سے مراد وہ رسمی طریقہ کار ہے جس کے ذریعے ایک معاشرہ اپنا مجموعی علم، ہنر، روایات اور اقدار ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتی ہیں۔

تعلیم ہر انسان چاہے وہ امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت کا بنیادی حق ہے اور اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ تعلیم حاصل کرنے کا مطلب صرف سکول، کالج، یونیورسٹی سے کوئی ڈگری لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ تعمیر اور تہذیب سیکھنا بھی شامل ہے تاکہ انسان اپنی معاشرتی روایات اور اقدار کا خیال رکھ سکے۔ تعلیم کی ضرورت بہت اہمیت کی حامل ہے چاہے زمانہ کتنا ہی ترقی کر لے۔ حالانکہ آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے ایٹمی ترقی کا دور ہے سائنسی اور صنعتی ترقی کا دور ہے مگر اسکولوں میں بنیادی عصری تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، انجنیئرنگ، وکالت، ڈاکٹری اور مختلف جدید علوم حاصل کرنا آج کے دور کا لازمی تقاضہ ہے۔

کاروانِ وجود:

کاروان وجود میں ثمر اور سارہ دو دوستوں کا کردار نبھاتے ہوئے نظر آتی ہیں جو کہ ایک ساتھ مختلف جگہوں پر نمودار ہوتی ہیں یہاں تک کہ ثمر، سارہ کے شوہر سے خفیہ طور پر نکاح کر لیتی ہے۔ تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو اُن کے کالج میں ایک انگریز اُستانی ان کو پڑھاتی تھی جو کہ ثمر سے کافی لگاؤ رکھتی تھی اور مختلف مواقع پر اُس کو سمجھاتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ کلاس میں مِس لڑکیوں کو انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ کر آنے کو کہتی تو بیشتر لڑکیاں آٹھ، دس صفحوں سے آگے نہ نکل پاتی۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے سہارے تھیں

کہ کلاس کا وقت گزر جائے گا۔ خیبر کالج میں اُستانی کو آئے ہوئے اتنا عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اپنی عادات کی وجہ سے وہ طالبات کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ وہ انگریز تھیں اور چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ان کی عمر ہو گی:

"اس روز پہلی کلاس انگریزی زبان کی تھی۔ ثمر کلاس کے کمرے کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں ہی گھنٹی بج گئی۔ ادھر سٹاف روم سے مس این ہار کورٹ بر آمد ہوئیں۔ لڑکیاں ذرا مضطرب تھیں کیونکہ دو ہفتے ہوئے مس ہار کوٹ نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی کوئی انگریزی کی کتاب پڑھ کر آئیں۔ اور کلاس میں اس کے بارے میں تاثرات بتائیں۔"(۳۷)

زیر نظر اقتباس میں انگریز استانی طالب علموں کو ایک انگریزی کتاب پڑھ کر آنے کا کہتی ہے لیکن بچیاں اس کو نہیں پڑھ پاتی۔ ہمارے ہاں معیار تعلیم انگریزی کے بغیر مقرر نہیں کیا جا سکتا جبکہ طالب علم اس زبان کو مشکل تصور کرتے ہیں۔

دھنی بخش کے بیٹے:

ناول میں احمد بخش کا کردار دھنی بخش کے بیٹے کا ہے جو کہ تعلیم کے حصول کے لیے شہر گیا اور پھر وہ وہاں سے باہر کے ملک چلا گیا۔ اُن کے خاندان کا کوئی بھی لڑکا پڑھا لکھا نہیں تھا وہ واحد لڑکا تھا جو تعلیم کے حصول کے لیے اسکول جاتا تھا۔ خاندان والے اُسے کہتے تھے کہ اُس کے اطوار عام لڑکوں سے مختلف تھے کیونکہ اس میں کسی قسم کی بُرائی نہ تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ نہ اس نے سگریٹ پی تھی اور نہ ہی اس کا نام جواریوں کی فہرست میں تھا اور نہ ہی رئیس زمین داروں کے لڑکوں کی طرح چھٹی ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے اُسے کسی بھی قسم کی شراب کی پہچان تھی۔ اور یہ سب پڑھائی کا ہی اثر تھا کہ وہ ایک اچھے اخلاق کا مالک تھا:

"وہ اسکول میں پڑھ رہا تھا، خاندان کے لڑکے اسکول نہیں جاتے تھے۔ وہ امتحانوں میں اپنی محنت سے، بغیر وسیلے کے، بغیر نقل کیے پاس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پڑھنے والوں کی زندگی میں وہ جانتا تھا یہ کامیابی بار بار آنے والی خوشی تھی۔"(۳۸)

احمد بخش گاؤں سے روز شہر پڑھنے کے لیے آتا جس کے لیے اُسے گھنٹوں سفر کرنا پڑتا۔ اُس کے گھر والوں نے اُس کی آسانی کے لیے اُسے شہر میں فلیٹ لے دیا تاکہ وہ شہر میں رہ کر آسانی سے تعلیم حاصل کرے۔ کالج میں آنے کے بعد احمد بخش تنہا رہنے کی عادت بھول چکا تھا، اب اُس کا ملنا جلنا بہت سے لڑکوں سے ہو گیا۔ پہلے وہ اگلی رو میں بیٹھتا تھا پھر اُس نے جلد ہی فکشن کلاسکس نے اُسے آخری رو میں پہنچا دیا جہاں وہ

ڈیسک کھول کر ناول پڑھتا۔ طلبہ کی زیادہ تعداد کالجوں اور یونیورسٹیوں سے غیر حاضر رہتی اور جو کالج میں موجود ہوتے تھے وہ لیکچر دینے والے پر احسان کرتے تھے اگر وہ کلاس میں نہ آتے تو کلاس قبرستان کا منظر پیش کرتی تھی۔اس کے برعکس دیہات میں خواتین کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا جس کے باعث دھنی بخش کے گھرانے کی خواتین بھی دینی اور دنیاوی تعلیم سے بھی دور تھیں۔ یہاں تک کہ بنیادی دینی فرائض کی ادائیگی سے بے بہرہ تھیں، لڑکے بھی تعلیم کے حصول کے لیے شہروں کا رُخ کرنے لگے جس کا ذکر ناول میں کچھ اس انداز ملتا ہے:

"خوش قسمتی سے ایک کرسچین کولج کے پوسٹ گریجویٹ ہوسٹل میں احمد بخش کو ایک کمرہ مل گیا۔ وہ خوش تھا وہاں نہ ساری رات شادیوں کے بیماروں کو جگائے رکھنے والے میوزک بینڈ ہوں گے نہ فلمی طرز پر لاؤڈ اسپیکرز پر گائے جانے والے مذہبی نغمے۔یعنی پڑھائی اطمینان سے ہو گی۔"(۳۹)

ناول میں مصنف نے دھنی بخش کے بیٹے کا تعلیم کے حصول کے لیے پہلے شہر اور پھر باہر کے ملک سفر بیان کیا ہے کہ کیسے اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشکلات پیش آتی ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے، وہیں مردوں کی تعلیم بھی کوئی خاص نہیں ہے جس کی وجہ سے شہروں میں نقل مکانی کرنی پڑتی ہے۔

روشن اندھیرے:

ناول میں زارا کا کردار بھی مختصر وقت کے لیے نمودار ہوتا ہے وہ شجاع کو اپنی زندگی کے بارے میں بتاتی ہے کہ اُس کی ماں طوائف ہے لیکن اُس کو پڑھانا چاہتی تھی۔ پرانے وقتوں میں کوٹھے والیاں، گانے بجانے کے علاوہ مردوں کو لُبھانے کی تعلیم حاصل کرتی تھیں اور یہی اُن کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا لیکن وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ جدت ضروری تھی۔ دام کھرے کرنے کے لیے اسکول اور کالج کی تعلیم بھی ضروری سمجھی گئی۔ زارا کی ماں علامہ اقبال ٹاؤن آ گئی لیکن باقاعدہ اپنے اڈے پر بھی جاتی رہی، اُس کا کافی اثر ورُسوخ تھا۔ اُس نے زارا کا کالج میں داخلہ کروا دیا جہاں زارا کی ملاقات صفدر نامی آدمی سے ہوئی جو جھنگ کے کسی گاؤں کا تھا۔ اُن دونوں کو آپس میں پیار ہو گیا پھر یوں ہوا کہ صفدر کو زارا کی اصلیت کا پتہ چل گیا لیکن وہ اُس کے ساتھ مخلص تھا اِس وجہ سے اُسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ لیکن زارا کی ماں اپنی بیٹی کو بھی طوائف بنانا چاہتی تھی، اس لیے زارا کے علم میں لائے بغیر صفدر کو منظر سے ہٹا دیا جس کا زارا کو بہت بعد میں علم ہوا:

"میں ان دنوں کالج میں ہی تھی کہ صفدر گم ہو گیا۔ میں نے پاگلوں کی طرح اسے تلاش کیا لیکن وہ مجھے نہ مل سکا۔ وہ اپنے گاؤں بھی نہیں رہا تھا، بس یہی پتہ چلا کہ وہ مزید پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا۔"(۴۰)

ناول میں زارا کا کردار ایک طوائف زادی کا ہے۔ جس کو اس کی ماں پڑھنے لکھنے کے لیے کالج بھیجتی ہے تا کہ وہ زمانے کے ساتھ چلنے کے گر سیکھ سکے۔ تعلیم کی اہمیت سے کسی طور انکار نہیں ہے زارا کی ماں بھی سمجھتی ہے کہ اگر میری بیٹی تعلیم حاصل کرے گی تو اس کی شخصیت میں نکھار آجائے گا۔

صفر سے ایک تک:

ناول میں فیضان کا کردار سالاروں کے بیٹے کا ہے اور یہ ذکی کا دوست ہے۔ ذکی ناول کا مرکزی کردار ہونے کے ساتھ ساتھ سالاروں کے منشی کا بیٹا ہے اور فیضان کے گھر والوں کو ذکی کے ساتھ اس کا بات چیت کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ فیضان اور ذکی کوٹل سالاراں کے قریبی قصبے بھالیکے کے ہائی اسکول سے بہت اعلیٰ نمبروں میں میٹرک کر کے لاہور آجاتے ہیں۔ دونوں کا شہر میں داخلہ ہو جاتا ہے، ذکی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے گھر کے مالی حالات کی وجہ سے وہ یہ خواب پورا نہیں کر سکتا اور والد صاحب اِس صورتحال پر آزردہ تھے مگر مجبور تھے۔ ڈاکٹری کی انتہائی مہنگی تعلیم کو تو خیر سب نے اتفاق رائے سے رد کر دیا کہ انسان خود بھی مریض بن جاتا ہے۔ بالآخر وہ کمپیوٹر کالج میں داخلہ لے لیتا ہے اور فیضان کا اٹچیسن کالج میں داخلہ ہو گیا جو ڈیڑھ صدی سے اعلیٰ جاگیرداروں کی ہر نئی نسل کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا آیا ہے لیکن ذکی کی قسمت میں کمپیوٹر کالج میں پڑھنا ہی لکھا تھا۔ یہاں داخلے کی وجہ یہ تھی کہ جب اس نے میٹرک کیا تو گھریلو مالی وسائل اور بہنوں کی شادیوں کی وجہ سے اُس کی مہنگی تعلیم کے اخراجات والد صاحب پورے نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر تعلیم کے حصول کے لیے ذکی گاؤں سے شہر کا رخ کرتا ہے:

"میں اُس وقت سے بھی شروع کر سکتا ہوں جب فیضان اور میں کوٹل سالاراں کے قریبی قصبے بھالیکے کے ہائی سکول سے بہت اعلیٰ نمبروں میں میٹرک کر کے لاہور آئے فیضان نے اٹچیسن کالج میں داخلہ لے لیا اور میں نے ایک مشکوک قسم کے کمپیوٹر کالج میں اب فیضان کا اٹچیسن کالج میں داخلہ تو ہر کسی کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ یہ ادارہ ڈیڑھ صدی سے اعلیٰ جاگیرداروں کی ہر نئی نسل کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا آیا ہے۔"(۴۱)

فیضان اور ذکی دو الگ الگ طبقوں کے نمائندے ہیں۔ فیضان امیر ہے اور ذکی غریب ہونے کی وجہ سے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ تعلیم بھی اب کاروبار کی شکل اختیار کر گئی ہے زیرِ نظر اقتباس میں مصنف بتاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جاگیرداروں کی ہر نئی نسل کی اجارہ داری ہے۔

نولکھی کوٹھی:

غلام حیدر کو اس کا باپ تعلیم کے حصول کے لیے گاؤں سے دور شہر بھیج دیتا ہے، اُس کا خواب تھا کہ میرا بیٹا بڑا افسر بن کر گاؤں لوٹے لیکن شہر کی زندگی میں کھو کر وہ اپنے باپ کے خواب کو فراموش کر دیتا ہے وہ اُسے اقدار کی بلندیوں تک لے کر جانا چاہتا تھا۔ بڑے اور پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھنے کے آداب اُسے گاؤں سے دور رہ کر ہی آسکتے تھے۔ اِسی بات کے پیشِ نظر اُس کے لیے لاہور کوٹھی بنوائی گئی۔ لاہور کے طویل قیام سے غلام حیدر کے مزاج میں ایک تہذیبی رچاؤ داخل ہو گیا۔ پیسے کی ریل پیل کی وجہ سے اُس کا امیر لوگوں اور کلبوں میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اُسے پیسے کی کمی نہیں تھی جس کے سبب اعلیٰ سوسائٹی اور کلبوں میں آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا:

> "شیر حیدر کی خواہش تھی اُس کا بیٹا غلام حیدر کلکٹر بنے۔ اس سلسلے میں اسے میٹرک کے بعد لندن بھی بھیجا گیا مگر غلام حیدر نے وہاں کامیابی حاصل نہ کی اور دو سال بعد ہی لوٹ آیا۔ ویسے بھی ہندوستانیوں کا اِس معیار پر پورا اُترنا کچھ خالہ جی کا کھیل نہ تھا۔ البتہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کر گیا۔"[۴۲]

ولیم جو کہ انگریز افسر ہے اس نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی وہاں کے تمام کاموں کو بخوبی احسن طریقے سے ادا کیا۔ مولوی کرامت کو سکولوں میں بچوں کے داخلے کے کام پر لگا دیا کیونکہ وہ مسجد میں امام تھا وہ یہ کام احسن طریقے سے سر انجام دے سکتا تھا۔ ولیم نے اُس کے بڑے بیٹے کو لاہور کالج میں داخل کروا دیا، اور ایک دن اُس کی محنت رنگ لے آئی جب اُس کا بیٹا بھی بڑا افسر بن گیا۔ جلال آباد میں موجود سکولوں کا بھی ولیم نے جائزہ لیا تاکہ بہتر نظام تعلیم لایا جاسکے۔ سکولوں کی تعداد معلوم کروائی کہ وہاں پر پرائمری، مڈل اور اپر درجے کے کتنے اسکول ہیں۔ مولوی کرامت کے بیٹے کے لاہور کالج میں پڑھنے نے اُسے بابو بنا کر رکھ دیا تھا، جب وہ چھٹی پر جلال آباد آتا تو لوگ اُسے دیکھنے آتے کہ مولوی کا بیٹا کوئی بڑا انگریز بنتا جا رہا ہے:

> "سرکار یہ گورنمنٹ کے سکول کی عمارت ہے، موتی لعل نے پہلو میں چلتے ہوئے کہا۔ ولیم کمرے میں داخل ہوا تو چکرا گیا۔ وہاں صرف خالی دیواروں پر نہایت بوسیدہ چھت تھی، جو بجائے آنکڑوں کے

سرکنڈوں کے گٹھوں سے تیار کی گئی تھی اور اب اُس میں بھی جگہ جگہ چھید نظر آرہے تھے۔ کمرے کو ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سوا نہ وہاں ڈیسکیں تھیں۔ نہ کرسی، نہ خدا کی بھری پُری کائنات میں سے کچھ اور چیز، جو اُس تیس ضرب پندرہ فٹ چار دیواری میں موجود ہوتی۔"(۴۳)

زیر نظر اقتباس میں ایک والد کی اپنے بیٹے کی تعلیم میں دلچسپی کو بیان کیا گیا۔ شیر حیدر کی خواہش ہے کہ اس کا بیٹا کلکٹر بنے۔ اس کے لیے وہ بیرون ملک جاتا ہے لیکن ہندوستانیوں کے لیے کلکٹر بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ عام شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ولیم، مولوی کرامت کے بیٹے کو لاہور کالج میں داخل کروا دیتا ہے اور وہ ایک بڑا افسر بن کر لوٹتا ہے۔ ولیم جب ایک سرکاری سکول کی عمارت کا دورہ کرتا ہے تو اس کی مخدوش حالت دیکھ کر چکرا کر رہ جاتا ہے۔

ناتمام:

ناول ناتمام میں صائمہ کے گھرانے میں اُس کی ماں اور باجی شامل تھے، باپ کی وفات بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ گھر کا گُزر اوقات باپ کی پینشن اور باجی کی وجہ سے ہوتا تھا۔ محلے والے بھی صائمہ کے گھرانے کا خیال رکھتے تھے لیکن چونکہ باجی خوددار قسم کی خاتون تھیں اس لیے اُن کو لوگوں سے لینا پسند نہ تھا۔ صائمہ کی تعلیم کو ماں اور باجی نے کسی صورت ختم نہ ہونے دیا۔ اسکول ختم ہونے کے بعد جب کالج میں داخلے کا وقت آیا تو اُس نے گرلز کالج میں اپنے فارم جمع کروا دیئے کیونکہ اُس کو پڑھائی کا شوق تھا۔ باجی ٹیوشنیں پڑھاتی اور اُس کی تعلیم کے اخراجات اٹھاتی، باجی کے ساتھ ساتھ ماں بھی محلے والوں کے کپڑوں کو سلائی کڑھائی کر کے کچھ کما لیتی تھیں۔ صائمہ کی تعلیم اور ماں کا علاج، بجلی گیس کے بل اور باورچی خانے کے اخراجات وغیرہ یہ سب باجی ہی چلاتیں تھیں۔ باجی اسکول کی مصروفیات سے ہٹ کر محلے کے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتیں۔ کالج کے ساتھ ہی صائمہ نے پارلر میں کام شروع کر دیا تاکہ وہ اپنی بہن پر بوجھ نہ رہے۔ تعلیم کی اہمیت سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا، جس کے حصول میں ہمیں صائمہ سرگرداں نظر آتی ہے:

> "ایف اے کے داخلے شروع ہوئے تو کسی خاص ارادے کے بغیر اس نے عامرہ کے ساتھ دیو سماج گرلز کالج میں فارم جمع کرا دیئے۔ لسٹ میں دونوں کا نام آ گیا۔ کلاسیں شروع ہوئیں تو اس کا دن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ صبح کالج: نہایت بور کن لیکچرز، استانیاں، لڑکیاں، روٹین کے دبے دبے قہقہے، بجھی بجھی شرارتیں۔ اور شام کو بیوٹی پارلر۔"(۴۴)

وسیم کا کردار ناول میں مختصر وقت کے لیے نمودار ہوتا ہے۔ وسیم اپنے رشتے دار کے گھر پڑھنے کے لیے رہنے آتا ہے۔ تاکہ وہ کسی اچھے کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے، وسیم کا باپ کاروباری شخص ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا کاروبار سیکھے لیکن وسیم آگے پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کی ضد کے آگے اُس کے باپ کو ہار ماننا پڑتی ہے کہ اگر وہ کامیاب نہ ہوا تو کاروبار میں اُس کی مدد کرے گا۔ اس کے بعد وہ شہر آجاتا ہے اور اس دوران اُس کی ملاقات صائمہ سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان تعلقات استوار ہوتے ہیں اور ایک دن وہ دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ وسیم کو واپس اپنے ماں، باپ کے پاس جانا پڑتا ہے۔ یہی وہ دن تھے جب کالجوں میں داخلے شروع ہوئے تھے وہاں کسی بھی کالج میں تھرڈ ڈویژن میں بھی اُس کا نام نہیں آیا اس لیے وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ وہ اپنے باپ سے اپنی شادی کی بات کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اُس کا فلپائن میں ایک یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا وہ صائمہ کی زندگی سے غائب ہو گیا اور تعلیم کے حصول کے لیے باہر ملک چلا گیا:

> "اس واقعے کے فوراً بعد وسیم منظر سے غائب ہو گیا اور کوئی مہینہ بھر بعد، جس دوران وہ صائمہ سے شادی کے بارے میں اپنے باپ سے بات کرنے کا مناسب موقع تلاش کرتا رہا، اس کا فلپائن کی ایک یونیورسٹی میں کمپیوٹر انجینئرنگ کے کورس میں داخلہ کروا دیا گیا۔ ملک سے باہر جا کر پڑھنا اس کا دیرینہ خواب تھا۔ تین سال کا کورس تھا۔ باپ نے وعدہ کیا کہ وہ تعلیم مکمل کرلے پھر جہاں چاہے گا، اس کی شادی کرا دی جائے گی۔" (۴۵)

اس ناول میں صائمہ کا کردار مشکل مالی حالات میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرگرداں نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں طبقاتی نظام موجود ہونے کی وجہ سے تعلیم بھی دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ صائمہ بہت مشکل حالات میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ دوسرا کردار وسیم کا ہے جو صائمہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ لیکن جب اس کے باپ کو پتہ چلتا ہے تو اس کو باہر کے ملک بھیج دیتا ہے کہ وہ واپس آکر اس کی پسند سے شادی کروا دے گا۔

کوہِ گراں:

حلیم گاؤں سے بہتر مستقبل کے لیے شہر چلا جاتا ہے اور گاؤں کے اُجڑنے کے بعد وہ اُس کی دوبارہ بحالی کے لیے آتا ہے۔ گاؤں واپس آنے کے بعد اس کو اپنا اسکول یاد آتا ہے۔ جو اب کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا ہے، مولوی تاج محمد حلیم کا اسکول ماسٹر تھا، اسکول دو کمروں پر مشتمل تھا۔ چھوٹا کمرہ دفتر اور بڑا کمرہ بارش

کے دنوں میں پانچوں جماعتوں کے بیٹھنے کے کام آتا۔ اُستاد گاؤں سے بائیسکل پر آتا اور اسکول سے تھوڑے فاصلے پر تہہ بند اُتار کر شلوار پہن لیتا اور تہہ بند چھٹی کے وقت کے لیے سنبھال لیتا۔ اس اقتباس سے گاؤں میں موجود اسکول کی صورتحال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

"دوسری اور چوتھی جماعت کے بچے ایک قطار میں اور تیسری اور پانچویں کے اُن کی طرف منہ کیے دوسری قطار میں کھڑے ہو جاتے اور اِس طرح پہاڑوں کا مقابلہ شروع ہو جاتا۔ کچی، پکی اور پہلی جماعت کے بچے اپنے ٹاٹوں پر بیٹھے اِس مقابلے کے ناظر اور ماسٹر منصف ہوتا۔ پہاڑے پہلے سیدھے پڑھے جاتے اور پھر اُلٹے۔ ہر بچے نے پوری قوت کے ساتھ چلا کر پہاڑے پڑھنا ہوتے۔"(۴۶)

حلیم کا دوست، حاجی حفیظ اُس سے ملنے آتا ہے اور دونوں گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ گاؤں میں پرائمری اسکول نہیں تھا اس لیے وہ اپنے ننھیال کے گاؤں کے ایک اسکول میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک سال کے بعد گاؤں میں بھی اسکول بن جاتا ہے۔ ٹاٹوں کے اسکول کی تعلیم نے حلیم کے اندر ایک محرومی کو جنم دیا لیکن اس محرومی نے حلیم کو دوسروں کے لیے مددگار بنا دیا۔ اُس کو کتابوں کی کمی محسوس ہونے لگی کیونکہ شہر میں وہ ان چیزوں کے درمیان رہنے کا عادی تھا۔ مسجد، چوک اور گلیاں اُس کے منصوبے میں شامل تھے لیکن جہالت کو دور کرنے کے لیے لائبریاں نہیں تھیں اچانک اُس کو اپنے کالج کے دنوں کی لائبریریاں یاد آ گئیں۔ بہتر تعلیم کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"میرے خاندان کے کچھ لوگ شہروں میں مہنگی فیسوں والے سکولوں میں بھی پڑھے ہیں۔ اور وہ ابتدائی تعلیم سے آگے نہیں جا سکے۔ میں نے ابتدائی تعلیم ٹاٹوں پر حاصل کی۔ کچھ عرصہ تمھارے گاؤں کے سکول میں بھی پڑھا ہوں!" وہ حفیظ سے مخاطب ہوا۔ "تمھارے اُن دنوں کی وجہ سے ہی ہم دونوں آج اکٹھے ہیں۔"(۴۷)

اس ناول میں حلیم دوبارہ گاؤں آنے پر سکول کی مخدوش حالت دیکھتا ہے جو کبھی اس کے بچپن میں آباد تھا گو اس کی حالت اس دور میں بھی کچھ خاص اچھی نہ تھی۔ وہ ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھا تھا جس نے اس کے اندر مددگار بننے کی رمق پیدا کی۔ زیرِ نظر اقتباس میں حلیم بتاتا ہے کہ میرے خاندان میں مہنگے سکولوں میں پڑھنے والے بھی تعلیمی سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔

دشتِ وفا:

ناول میں نجیب کا کردار ہیرو کا ہے اور اس کا تعلق انقلابیوں سے ہے وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے پہاڑوں پر اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر لڑ رہا ہے۔ بلوچستان میں جب خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی تو نجیب کو ایک کورس کے سلسلے میں اسلام آباد جانے کے احکامات ملے۔ آرگنائزیشن کے چیئر مین نے پیغام بھیجا کہ کورس پر ضرور جاؤ، ہمیں اپنے افسروں کی ضرورت ہے تم جیسے نالائق ہی سہی۔ نجیب کو فکر تھی کہ ان حالات میں اُس کے چلے جانے سے انقلابیوں کے لیے دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ رُخسانہ بھی بضد تھی کہ اُسے یہ کورس کرنا چاہیے، وہ اپنے ساتھیوں کا ساتھ دینا چاہتا تھا نہ کہ اُن کو اکیلا چھوڑ کر کورس پر جانا چاہتا تھا۔ لوگ بہتر تعلیم یا روزگار کے لیے دوسرے شہروں یا ملکوں کا سفر کرتے ہیں اس کی مثال ناول میں نجیب کا کردار ہے جو کہ نہ چاہتے ہوئے بھی رُخسانہ اور اپنے دوستوں کے کہنے پر کورس کرنے کے لیے اسلام آباد چلا جاتا ہے:

"تم یہ کورس کر لوگے تو ترقی بھی جلدی مل جائے گی۔"

چیئر مین بلوچستان اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن کے اور فیلڈ کمانڈر خیر جان نے پیغام بھجوایا۔"

کورس پہ ضرور جاؤ۔ ہمیں اپنے افسروں کی ضرورت ہے۔ تم جیسے نالائق ہی سہی۔"[۴۸]

نجیب دوستوں اور رخسانہ کے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسلام آباد کورس کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نجیب کو چھوڑنے اس کے دوست بھی اس کے ساتھ آئے اس کے دوست خوشگوار موڈ میں تھے، ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور نجیب کو بھی مجبور کر رہے تھے کہ وہ بھی ہنسے ۔ نجیب نے جہاز کی آخری سیڑھی سے مُڑ کر رُخسانہ کو دیکھا جو ٹیرس سے اس کے لیے ہاتھ ہلا رہی تھی وہ بوجھل قدموں سے جہاز کی سیٹ پر آبیٹھا۔ اُس نے پہاڑوں کی طرف دیکھا اُسے ایسا لگا جیسے وہ بھی اُس سے پوچھ رہے ہوں کہ واپس کب آؤ گے۔ اُس نے سوچا کہ سرداری، نوابی نظام صرف جہالت میں بن سکتا ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۷۲ء میں ٹیچروں، پروفیسروں اور ماہرینِ تعلیم کو باہر کر دیا گیا۔ اسمبلی میں دوبارہ سردار ہی آئیں گے اور انہی کے بچے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ جبکہ دنیا کا ہر ترقی یافتہ ملک اُستادوں کو بلاتا ہے، مراعات بھی دیتا ہے لیکن اس کے برعکس بلوچستان میں یہ ہوا کہ استادوں کی بڑی تعداد کو صوبہ بدر کر دیا گیا۔ تعلیم کے حوالے سے بلوچستان کی صورتحال افسوسناک تھی جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے کہ کس طرح بڑے لوگوں کے بچوں کو پڑھنے یا آگے بڑھنے کا حق حاصل تھا:

"ہر شام جب ڈوبتے ہوئے سورج کے وقت پوری کائنات پہ خدا کا جلال طاری ہوتا ہے۔ وہ

اکیلے میں بیٹھ کر حالات کے بارے میں سوچا کرتا، اسے یقین تھا انقلابی کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے، اسمبلی میں دوبارہ سردار ہی آئیں گے یا پھر نواب۔ تمام سرداروں اور نوابوں کے بیٹے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے۔ عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔"(۴۹)

نجیب ناول کا مرکزی کردار ہے جو کہ ملک کی حفاظت کے لیے پہاڑوں پر لڑ رہا ہے۔ وہ کورس کے لیے اسلام آباد جانا چاہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ جب تک جہالت کا نظام رہے گا تب تک سردار اور نواب ہی اپنے بچوں کو تعلیم دلوا سکے گے عام آدمی تک تعلیم کی رسائی نہ ہو سکے گی۔ دنیا استادوں کو ایک بلند مقام دیتی ہے جبکہ بلوچستان میں استادوں کی ایک بڑی تعداد کو صوبے سے نکال دیا ہے ۔ بلوچستان میں تعلیم کی صورتحال تشویشناک ہے۔ نجیب کے کردار کے ذریعے تعلیم اور اس کی صورتحال کو واضح کیا گیا ہے۔ سردارانہ نظام میں عام آدمی تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ سردار تعلیم کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں کہ عام شخص اُن کی برابری کرنے لگے گا۔ اسی لیے بلوچستان میں استادوں کو صوبہ بدر کر دیا گیا تا کہ عام آدمی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کا خواب نہ دیکھ سکے۔

ادھ ادھورے لوگ:

فیاض کا کردار ناول میں بہت پُر اثر نظر آتا ہے جو ساری زندگی ریاست کی شناخت کے لیے لڑتا ہے۔ مارشل لاء کے دوران ون یونٹ تحریک اُٹھتی ہے تو فیاض بھی اُس تحریک کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جلوس میں جب ہر بونگ مچتی ہے تو اُس کی زد میں اسکول کے کئی لڑکے اور وہاں گزرنے والے راہ گیر بھی آتے ہیں اُن کے سر پھٹ جاتے ہیں۔ فیاض کی بائیں کلائی پر لاٹھی کے وار نے ہڈی کو کڑ کا کر دو ٹکڑے کر دیا۔ ہماری سیاست کا یہ تاریک پہلو ہے کہ سیاست دان اپنے مفاد کے لیے بچوں، اسکولوں کے لڑکوں کو بھی استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں یا تعلیم پر بھی اس کے اثرات نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں اس کی عمدہ نمائندگی اس اقتباس سے ہوتی ہے:

"فیاض کے دوست تو ناکام لوٹ گئے مگر ایک روز کچھ ایسا ہو گیا کہ جس نے اُسے بارِ دگر کسی اور انداز میں سوچنے کی راہ پر لگا دیا۔ اُس روز بھی کئی دنوں کی طرح احمد پور کے مرکزی چوک میں صادق عباس ہائی اسکول کے لڑکوں اور اُن کے ساتھ وکلاء نے صدر ایوب خان کے خلاف جلوس نکالا ہوا تھا۔ جلوس کی نعرہ بازی روکنے اور اِسے منتشر کرنے کے لیے پولیس نے ہائی اسکول کے لڑکوں پر اندھا دھند اور وحشیانہ لاٹھی چارج کیا۔"(۵۰)

ہائی سکول کے طلبا ذہنی بالیدگی کی اُس سطح پر نہیں پہنچے ہوئے کہ اپنا اچھا برا سمجھ سکیں۔اس لیے سیاسی مقاصد کے لیے جلسے جلسوں میں اُن کا استعمال زیرِ نظر اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پانی مر رہا ہے:

ناز نین ناول کی ہیروئن ہے جس کی آمد یونیورسٹی کی طالبہ کے طور پر ہوتی ہے۔ یہ لاہور کی رہنے والی آزاد خیال لڑکی ہے،ماں باپ کی طرف سے اس پر کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں۔یونیورسٹی میں اسرار سے اُس کی پہلی ملاقات لائبریری میں ہوتی ہے اور وہ اُس کو اپنی سالگرہ پر مدعو کرتی ہے۔دیکھا جائے تو یہ تعلیم کا ہی اثر ہے کہ جس وجہ سے لوگ پرانے خیالات سے آزاد ہو کر نئے خیالات کو اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو آج کی نوجوان نسل ان حوالوں سے کچھ زیادہ ہی آزاد خیال نظر آتی ہے جس کی مثال ناول میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔اسرار جس کا تعلق ایک گاؤں سے ہے اور وہاں اس سے ہٹ کر کوئی بھی تعلیم حاصل کرنے شہر میں نہیں آیا،وہ اپنے گاؤں کا پہلا لڑکا ہے۔ناز نین،نام ہی کی ناز نین نہیں تھی۔اس کی خوبصورتی کے لیے کوئی بھی لفظ استعمال کیا جاتا،کم ہی تھا۔ناز نین،اسرار کو دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئی تھی اور کیوں نہ ہوتی کیونکہ پوری یونیورسٹی میں اسرار کے جوڑ کا کوئی دوسرا نہ تھا۔ناز نین کے ماں باپ کو اس پر اندھا اعتماد تھا اسی اعتماد کے تحت وہ بڑی جلدی پارٹی سے اُٹھ کے چلے گئے تھے اور اب تک غالباً سو بھی چکے تھے:

> "یونیورسٹی لاء کالج میں وہ سب سے حسین لڑکی،اسرار پہ عاشق ہو گئی اور خبر ایک برقی رو کی طرح پورے کیمپس میں پھیل گئی کہ باؤ اسرار جو کسی زمیندار کا بیٹا تھا اور اپنی ذاتی کار پہ ہاسٹل سے یونیورسٹی آتا تھا اس کے کندھوں پہ عشق کا ہما آ بیٹھا ہے۔"(۵۱)

اسرار کی گاؤں سے شہر ہجرت قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر تھی لیکن گاؤں واپسی پر اُس کے حلیے کو دیکھ کر گاؤں والے حیران رہ جاتے ہیں اُن کے لیے وہ کسی عجوبے سے کم نہیں۔ناز نین جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے اس کے ہاں عجیب الخلقت بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کا شوہر اسے طلاق دے دیتا ہے۔وہ واپس اپنے ماں باپ کے گھر آ جاتی ہے جہاں پارٹی میں اس کی ملاقات اپنے باپ کے دوست سے ہوتی ہے جس میں وہ شاہ دولا کے چوہے اور اپنی بیٹی کی بیماری کے بارے میں اس سے بات کرتی ہے کہ لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں اس لیے وہ اس بیماری کو کوئی اور رنگ دے دیتے ہیں جبکہ یہ بچے ابنارمل ہیں۔یہ لوگ جو خود کو سادھو،ولی،رشی،جوگی اور پتا نہیں کیا کیا بتاتے ہیں یہ لوگ خود شدید قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار ہیں جس وجہ سے

ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے سائنس پڑھی ہے میں جاہل نہیں ہوں رُخسانہ میوٹیٹ وائرس کا شکار ہے اور زکا وائرس سے شاہ دولا کے چوہے پیدا ہوتے ہیں:

"میں نے سائنس پڑھی ہے۔ میں جاہل نہیں ہوں، یہ سب پیری فقیری، سادھو مہنت، یہ کہانیاں، کمائی کے دھندے ہیں۔ رخسانہ میوٹیٹ ہے یا کسی وائرس کا شکار جس طرح، زکا وائرس سے چھوٹے سر والے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ لوگ انہیں شاہ دولہ کے چوہے بتاتے ہیں۔ حالانکہ اب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ سب ایک بیماری ہے۔"(۵۲)

نازنین کے والدین عجیب و غریب واقعے کے اثر سے آزاد کروانے کے لیے اپنی بیٹی کی شادی کروا کر اُسے لندن بھیج دیتے ہیں لیکن یہ ہجرت بھی اُس کے کام نہیں آتی اور وہ عجیب الخلقت بیٹی کے ساتھ طلاق کا دھبہ لگوا کر واپس آ جاتی ہے۔ شہروں میں مخلوط تعلیمی نظام ہونے کی وجہ سے نازنین اسرار کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نازنین اپنی سالگرہ پر اسرار کو گھر مدعو کرتی ہے۔ تعلیم نے نوجوان نسل کو آزاد خیال کر دیا ہے۔ نازنین اپنی تعلیم ہی کی بدولت اپنی بیٹی کی بیماری کے بارے میں بتاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ معاشرے میں موجود لوگ بہت سی بیماریوں کو توہمات سے منسوب کر دیتے ہیں جب کہ نازنین اپنے علم کی وجہ سے اُن کو مدلل جواز دیتی ہے۔

گلُ مینہ:

گُل مینہ جو کہ ناول کی ہیروئن ہے اُس کے دادا اور ماں چاہتے تھے کہ وہ تعلیم حاصل کرے۔ اُس کے علاقے میں اثر و رُسوخ رکھنے والے لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ ماں اسکول جانے سے پہلے اُسے تیار کرتی، اس کا منہ صابن سے رگڑ رگڑ کر دھوتی، دانتوں کو دنداسہ مل مل کر خوب چمکاتی تاکہ گل مینہ سب بچوں میں سب سے پیاری لگے۔ آسمانی رنگ کی قمیض اور سفید رنگ کی شلوار پہناتی، گُل مینہ کندھے پر بستہ لٹکائے، ہاتھ میں تختی تھامے اسکول کی طرف جاتی تو ماں اسکول کے احاطے میں داخل ہونے تک دیکھتی رہتی۔ گُل مینہ پرائمری اسکول کے لیے ساتھ والے گاؤں جاتی، چوتھی جماعت میں ریاضی میں اُس نے دس میں سے دس نمبر لیے تو اُستانی بہت خوش ہوئی اور اُسے خاص طور پر شاباش دی تھی:

"اسی نے ضد کر کے اور اپنے بیٹوں سے لڑ بھڑ کر گل مینہ کو سکول میں داخل کروایا تھا۔ اس کام میں دادا نے بھی گل مینہ کی ماں کا ساتھ دیا۔ پہلے تو وہ تین جماعتوں تک گاؤں سکول میں پڑھتی رہی۔ لیکن جب ساتھ والے گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول کھل گیا تو دادا نے اسے وہاں

تیسری جماعت میں داخل کروادیا۔"(۵۳)

دادا اور ماں کے انتقال کے بعد گُل مینہ جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے رات کے اندھیرے میں زرجان کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور بھاگ کر دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ دادا اپنی زندگی میں ہی گل مینہ کا رشتہ زرجان سے کر دیتا ہے لیکن زرجان اپنے گھر والوں کو تب لے کر آتا ہے جس دن دادا کا قل ہوتا ہے۔ زرجان کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ دادا کا انتقال ہو گیا ہے۔ فتح خان کا کردار ناول میں گل مینہ کے بیٹے کا ہے، گھر سے بھاگنے کے بعد گل مینہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن کا بیٹا فتح محمد ہے جس کے بڑے ہونے پر گُل مینہ اُس کا اسکول میں داخلہ کروادیتی ہے۔ ارغنداب سے انگوراڈا آنے پر زرجان چاہتا ہے کہ اُس کا مدرسے میں داخلہ کروادیا جائے لیکن گُل مینہ ضد کرتی ہے کہ پہلے وہ اسکول کی تعلیم حاصل کرے جس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ فتح محمد جب پہلی بار ملیشیا کی وردی پہن کر باپ کے ہمراہ اسکول جانے کے لیے تیار ہوتا ہے تو گُل مینہ اُسے ماتھے پر بوسہ دیتی ہے۔ سارا دن بے چینی سے اُس کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ واپس آتا ہے تو دوڑ کر اُسے گلے سے لگا لیتی ہے:

> "جب وہ انگوراڈا آئے تو اس وقت فتح خان ارغنداب کے سکول میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ زرجانان اسے انگوراڈا کے مدرسے میں داخل کروانا چاہتا تھا۔ لیکن گل مینہ نے ضد کی کہ پہلے یہ سکول کی تعلیم مکمل کرلے، پھر بے شک اسے مدرسے بھیج دینا۔ علاقے کا اکلوتا مڈل سکول حالات خراب ہونے کی وجہ سے کئی مہینے بند رہا۔ آخر جب مارچ کے آخر میں وہ کھل گیا تو زرجانان فتح خان کو چوتھی جماعت میں داخلہ دلوانے لے گیا۔"(۵۴)

اس ناول میں مصنف نے قبائلی علاقوں میں موجود عورتوں کی استحصالی کو بیان کیا ہے۔ گل مینہ کے بھائی اس کی پڑھائی کے خلاف ہیں لیکن دادا اور ماں بھائیوں سے بغاوت کر کے اسے سکول بھیجتے ہیں گل مینہ کو تعلیم سے بہت لگاؤ ہے وہ اپنے بیٹے کو سکول کی تعلیم دلوانا چاہتی ہے۔

گراں:

گاؤں میں تعلیم کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے بچپن ہی میں رشتے جوڑ دیئے جاتے ایسا ہی ایک گھرانہ فاطمہ کا تھا۔ جس کی بات اظہار الحق سے اُس کے بچپن میں ہی کر دی گئی تھی لیکن وہ بہتر تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اپنے اندر چھپی صلاحیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ گاؤں میں لڑکے، لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ وہاں کے مرد اور لڑکے روزگار کی تلاش کے لیے بڑے شہروں یا ممالک کا رُخ کرتے تھے اور گراں میں

عورتوں کی زندگی اپنے منگیتروں کا انتظار کرتے گزر جاتی تھی۔ گاؤں کے لوگ بہتر تعلیم یا مستقبل کے لیے اپنی عورتوں کو انتظار کی اذیت دے کر گاؤں سے دور شہروں یا دوسرے ممالک کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ کرداروں میں ایک کردار اظہار الحق کا بھی ہے:

"صابرہ نے کھڑکی میں لیمپ رکھے کتاب پڑھتے ہوئے اظہار الحق کے بازو کو کھینچا۔ اُس نے بہن کی اس جسارت پر احتجاج کیا۔

"کیوں وقت ضائع کرتی ہو بی ایس سی کے پرچے دینے ہیں۔ کسوں میں کپڑے کوٹتے اور میرّے میں مونگ پھلی کھودتے عمر نہیں گزارنی مجھے۔"(۵۵)

گاؤں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی اور لڑکے اپنے باپوں کے بھیجے پیسے پر عیش کرنے لگے۔ اور پکوانوں کی ورائٹی میں ترقی آتی چلی گئی، اور اس وجہ سے فاسٹ فوڈز لوگوں کے پسندیدہ ہو گئے۔ ولائیتوں نے اِس علاقے میں جین جیسی ایجاد پہلی بار متعارف کروائی تھی، جس طرح رنگین ٹیلی ویژن، فریج، کوکنگ رینج، ڈش انیٹنا۔ تعلیم ہی نے لڑکیوں کو شعور بخشا کہ انہوں نے اَن پڑھ لڑکوں سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ غزل جان میں بھی پڑھ جانے کی وجہ سے اتنی ہمت آگئی تھی کہ وہ شادی کی رات ہی گاؤں کو چھوڑ کر باہر اپنے والد کے پاس چلی گئی جہاں جاکر اس کو باہر رہنے والوں کی زندگیوں کا احساس ہوا۔ وہاں جسبیر کورے جو کہ اُس کی سوتیلی ماں تھی جس سے اکثر اس کی گاؤں کے حوالے سے بات ہوتی رہتی تھی۔ جسبیر کورے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے غزل جان کو بتاتی ہے کہ وہ سکول ساگری گراں میں پڑھنے کے لیے داخل ہوئی لیکن پڑھ نہ سکی۔ اور غزل جان اُسے بتاتی ہے کہ اب وہ پرائمری سکول ہائی سکول میں تبدیل ہو گیا ہے اور جو داخل ہوتا ہے وہ پڑھ کر نکلتا ہے:

"اس گراں میں عجب تبدیلی آئی تھی کہ ان پڑھ لڑکیوں سے پلو چھڑا بھاگ نکلنے والے لڑکے اب خود ان پڑھ رہنے لگے۔

لڑکیاں ایم۔اے، ایم۔بی۔اے اور لاء جیسی بھاری بھرکم ڈگریاں حاصل کر چکی تھیں، لیکن لڑکے ولائت کی کمائیوں پر اِتراتے، امپورٹڈ گاڑیاں بھگاتے، اِسلام آباد میں تعمیر شدہ بنگلوں کا کرایہ ایمبیسیوں سے ڈالروں میں وصول کرتے اور باقی ہر علم میں چاہے پچھڑ گئے ہوں لیکن پیسہ اور بینک کے معاملات کو خوب سمجھنے لگے تھے۔"(۵۶)

تعلیم سے دوری کی وجہ سے بچوں کے رشتے ان کے بچپن میں ہی طے کر دیئے جاتے ہیں۔ لڑکے باہر کے ملکوں میں جانے کی وجہ سے رشتوں سے انکار کر دیتے ہیں۔ لڑکیاں انتظار میں ہی بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ گاؤں میں تبدیلیاں آنے سے لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ غزل جان میں تعلیم ہی کی وجہ سے ہمت آتی ہے کہ وہ شادی کی رات ہی گاؤں چھوڑ کر اپنے والد کے پاس باہر چلی جاتی ہے۔

ج۔ ہجرت:

آغازِ آفرینش سے ہی ہجرت انسان کا مقدر رہا ہے۔ اگر مذہبی کتابوں کے حوالے سے اس پہلو کا جائزہ لیا جائے تو انسانی تاریخ میں پہلی ہجرت حضرت آدمؑ اور حواؑ کی تھی جو جنت سے زمین کی سطح پر آکر رُکی اور آدمؑ اور حواؑ دو الگ الگ جگہوں پر اتار دیئے گئے۔ گو کہ بعد میں دونوں کو فراق کے صدمے سے نجات حاصل ہوئی اور وہ آخر کار وادی عرفات میں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ مگر ان کو جنتِ گم گشتہ کا خیال ہمیشہ دامن گیر رہا۔ بعد کی مذہبی ہجرتوں میں حضرت نوحؑ کا واقعہ بھی سامنے آتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا بھی جب انہیں عراق چھوڑ کر فلسطین کی جانب روانہ ہونا پڑا تھا۔ پھر حضرت موسیٰؑ کا واقعہ بھی جب وہ اپنی قوم کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کا مکے سے مدینے کی طرف کوچ کا واقعہ بھی اسی سلسلے کی ایک بہت اہم کڑی ہے۔ یہ تمام ہجرتیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ماضی بعید میں کی گئی تھیں اور اگر اب ہم آگے بڑھ کر اپنے عہد میں پہنچ جائیں تو ماضی قریب اور زمانہ حال میں دور دور تک ہی مہاجرین کی خیمہ بستیاں نظر آتی ہیں۔

> "ہجرت" عربی کے لفظ "ہجر" سے مشتق ہے جس کے معنی جدائی اور مفارقت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں ہجرت سے مراد اپنی مٹی، علاقے، گاؤں، شہر، قریے، ملک سے جدائی اور مفارقت کے ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا اپنے احباب و پیروکاروں کے ساتھ مکّہ سے مدینہ جانے کے عمل کو "ہجرت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔"(۵۷)

دراصل انسانیت کو ہجرت کا یہ مسئلہ جس طرح بیسویں صدی میں در پیش رہا ہے، پہلے کبھی نہیں تھا۔ غرض کہ دنیا میں انسانی ہجرتوں کی داستانیں بہت طویل اور سمندروں جیسی گہری ہیں اور جو ان کی غواصی میں پانیوں میں اترا اسے مشکل ہی سے تہہ نظر آتی ہے۔ لہٰذا مزید ان سمندروں میں غوطے کھانے کی بجائے میں اپنے موضوع کی طرف لوٹ آنا چاہوں گی، ناولوں اور افسانوں میں ہجرت کے مسئلے کو موضوع بنا کر جس طرح اسے برتا گیا ہے اور ہجرت کے واقعات کی جس طرح تصویر کشی کی گئی ہے، اس کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کروں گی۔

جہاں ایک طرف تلاشِ معاش کی خاطر اور بیشتر صورتوں میں ہوسِ زر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی سرزمین کو چھوڑ کر سمندر پار کے ملکوں کو جانے کا سلسلہ شروع ہوا، وہیں دوسری طرف دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کا ایک رجحان بھی پیدا ہوا۔ جب اکہری شخصیتوں والے سیدھے سادھے دیہاتی اپنی پہچان کا سرمایہ لیے صنعتی شہروں میں داخل ہوئے تو انہیں بھی لٹنے میں دیر نہ لگی۔ بے چہرہ لوگوں کی بھیڑ میں کب اور کس طرح ان کی گٹھڑی غائب ہو گئی، اس کا انہیں علم بھی نہ ہو سکا۔ پھر ہر قدم پر نئے تجربات اور نئے تقاضوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اپنی شخصیت کو بیک وقت مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ گئے۔ جس کے نتیجے میں وہ اور تو سب کچھ بنتے رہے لیکن پھر کبھی وہ نہ بن سکے جو وہ اصل میں تھے۔ اب ان کے خالی ہاتھوں میں ان کی پہچان کے لیے کبھی کارخانوں میں ملازمت کی پرچی تھی، کبھی راشن کارڈ، کبھی مکان کے کرائے کی رسید اور کبھی بسوں اور ٹراموں کے ٹکٹ تھے۔

> " ہجرت " کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ " اپنے آبائی وطن، علاقے یا پشتینی جگہ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر کسی دوسری جگہ جا بسنا ہجرت ہے، حالانکہ عام طور سے اپنے آبائی ملک کو خیر باد کہہ کر کسی دوسرے ملک میں جا بسنے کو ہی ہجرت کہا جاتا ہے۔ اور اپنے ملک میں ہی کسی دوسری جگہ جا بسنے کو ہجرت سے موسوم نہیں کیا جاتا ہے۔ "[۵۸]

شہروں کی آبادی میں اضافے کا سبب جہاں ایک طرف روزی کی تلاش میں لوگوں کی دیہاتوں سے شہروں کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی نقل مکانی ہے، وہیں دوسری طرف اس کی ایک اور وجہ شرحِ تولید میں قابلِ تشویش حد تک اضافہ بھی ہے۔ جب یہ وجوہات سماجی اور معاشی ترقی کی اس بڑھتی ہوئی شرح کا ساتھ دینے سے قاصر ہو گئی تو حکومتوں کے کان کھڑے ہوئے اور اس کی روک تھام کے لیے سرکاری سطحوں پر غور و غوض کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور لوگوں کو معاشی اور سماجی اعتبار سے اس کے تباہ کن نتائج سے باخبر کرنے کے لیے ادارے قائم کیے گئے۔ شرحِ تولید پر قابو پانے میں یہ مہم کس حد تک کارگر ثابت ہوئی اس کا علم نہیں مگر اس حوالے سے جو منظر فنکاروں کی آنکھوں نے دیکھا اس کی جھلکیاں ناولوں میں ضرور دیکھی جاسکتی ہیں۔

شہروں کے پھیلنے اور فاصلوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں وقت کی کمی کا احساس بھی شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ منہ اندھیرے گھر سے نکلا ہوا شخص دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہنے کے بعد جب بسوں میں دھکے کھا کے رات شروع ہونے پر گھر پہنچتا تو اس میں اتنی سکت باقی نہ رہتی کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی وقت دے سکے اور ان کی التوا میں پڑی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دوبارہ گھر

سے باہر نکلے۔ لہٰذا اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ ان التوا میں پڑے کاموں کو اپنی اگلی چھٹی کے دن تک کے لیے اٹھا رکھے۔ اس طرح چھٹی کا دن آتا تو چھوٹی چھوٹی ضرورتوں ، گھر والوں کے پروگراموں اور بچوں کی فرمائشوں کی فہرست اس قدر طویل ہوتی کہ انہی کو پورا کرنے میں چھ دنوں کے طویل انتظار کے بعد آنے والا چھٹی کا یہ ساتواں دن آنکھ جھپکتے ہی گزر جاتا۔ اس صورتِ حال نے رفتہ رفتہ اسے سماجی سرگرمیوں اور مذہبی فرائض سے بھی دور کرنا شروع کر دیا اور وہ اپنی ذات اور اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گیا۔

گو کہ صنعتی ترقی کا عمل برصغیر میں مسلسل جاری رہا اور روزگار کے نئے مواقع بھی سامنے آتے رہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آبادی میں اضافے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آبادی میں روز افزوں اضافے کا منفی نتیجہ یہ سامنے آیا کہ روزگار کے مواقع رفتہ رفتہ محدود سے محدود ہوتے گئے اور آخر کار قومی لیبر مارکیٹ میں طلب اور رسد کا توازن بگڑا کہ ایک ایک آسامی کے لیے سو سو امیدوار ہاتھ پھیلائے کھڑے نظر آنے لگے۔ جہاں ایک طرف یہ صورتِ حال بے روزگاری کے تناسب میں خطرناک حد تک اضافے کا سبب بنی، وہیں دوسری طرف فراہمی روزگار اور تقرری کے سلسلے میں امیدواروں کی لیاقت اور قابلیت کو دیکھنے کی بجائے رنگ و نسل، رشتہ داری اور سفارش کو پیشِ نظر رکھنے کے منفی رویے کو بھی اس نے جنم دیا۔ اور اس طرح معاشرے میں خود غرضی، کنبہ پروری اور حق داروں کی حق تلفی کی لعنت کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مادّیت پرستی کی جڑیں بھی مضبوط ہوتی گئیں، آدمی ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر اس پستی پر آ گیا جہاں پہنچ کر جھوٹ، فریب، ہیرا پھیری، رشوت اور بدکاری کوئی برائی برائی نہیں رہ جاتی بلکہ حصولِ زر کی راہ میں کار آمد حربہ ثابت ہوتی ہے۔ غرضیکہ اس نے اپنی زندگی کے سر سے شرم و حیا کی چادر اٹھا کر اپنے گھر کے ایک کونے میں کھونٹی پر ٹانگ دی اور گلے میں دیانتداری اور سچائی کی مالا اتار کر طاق پر رکھ دی۔ پھر جب باہر نکلا تو دولت کے حصول کی راہ میں اس سے ایسی گھناؤنی حرکتیں سرزد ہوئیں جنہوں نے معاشرے میں غلاظت اور گندگی کا ڈھیر کھڑا کر دیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ اس گندگی کے ڈھیر کا حصہ بن گیا۔ نتیجے کے طور پر ہر گلی کوچے اور بازار میں، حتیٰ کہ ڈرائنگ روموں تک یہ تعفن پھیل گیا اور جو اس کا حصہ بن چکے تھے وہ بڑے اطمینان سے اس غلاظت کے ڈھیر میں گھومتے پھرتے اور سانسیں لیتے رہے، مگر جو اس کا حصہ نہیں بن پائے ان کا دم گھٹنے لگا۔

دھنی بخش کے بیٹے:

احمد بخش جانتا تھا کہ ہوسٹل میں رہ کر پڑھنا مشکل تھا، جب اُس کی کار کی خواہش پوری نہیں ہوئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب شہر میں فلیٹ لے کر رہے گا جیسے شہر میں اور بہت سے لڑکے ہوسٹل میں رہ کر پڑھتے ہیں۔ اتنی دور سے روز آنے جانے میں اُس کا آدھا دن نکل جاتا تھا جس کا اُسے شدت سے احساس ہوتا تھا۔ کیونکہ گاؤں سے شہر کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ احمد بخش گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جس کو شہر میں جا کر پڑھنے کی اجازت ملی تھی۔ یوں احمد بخش نے گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کی تاکہ وہ بہتر تعلیم حاصل کر سکے اور اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے باہر ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے:

"احمد بخش کے پہلی بار گھر چھوڑ کر ایک دوسرے شہر میں جا کر رہنے اور پڑھنے کی خبر اِس طرح سارے علاقے میں پھیل گئی تھی جیسے وہ پہلا شخص تھا جو اس جنتِ ارضی کو جس میں دھنی بخش کا گاؤں بھی تھا، چھوڑ کر جہنم میں جا رہا تھا جس کا سب کو افسوس تھا۔ کچھ کے ذہن میں اس کی یہ روانگی ہمیشہ کے لیے تھی، کہیں جنگل میں رہے گا۔"(۵۹)

امریکا آنے کے بعد شروع کے دنوں میں احمد بخش کو اپنے چھوڑے ہوئے ملک کی ہر چیز کی یاد آتی تھی۔ گلی، کوچے تک جن میں کیچڑ تھی اب اُسے یہی چیزیں پیاری لگنے لگی تھیں۔ خوانچے والوں کی چیزیں جن کو وہ کبھی بُرا سمجھتا تھا اب اس کو اِن سے گھن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پاکستانی اخباروں کی اُسے شدت سے یاد ستاتی تھی اُس نے کسی بھی امریکی اخبار کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ اپنے ملک یا اپنے پیاروں سے دور ہوتا ہے تو اُسے اُن سب کی یاد زیادہ آتی ہے ناول میں کچھ یہی مثال احمد بخش کی بھی ہے جس کو اپنے وطن سے دوری کا احساس ستا رہا ہے اور اپنے وطن میں رہتے ہوئے جن چیزوں سے وہ نفرت کرتا تھا پردیس آنے کے بعد انہی چیزوں سے اُسے محبت ہونے لگی تھی:

"یہاں تک سوچ جانے کے بعد وہ کسی نہ کسی چیز میں ٹھوکر مار بیٹھتا تھا اور جس خیال کو روک رہا ہوتا تھا وہ اچانک سامنے آ جاتا تھا، تنہائی کی موت۔

'نہلایا نہیں جاؤں گا' بس چہرہ اور گردن گیلے کپڑے سے پونچھ دیے جائیں گے۔ میرا بہترین سوٹ اور جوتے مجھے پہنا کر لوگ قبرستان لے جائیں گے۔ نماز نہیں ہوگی، نہ سروس کیوں کہ میں کسی چرچ سے وابستہ نہیں ہوں۔ بس ایک بے نام قبر میں میرا تابوت اتار دیا جائے گا۔"(۶۰)

ہجرت آسان عمل نہیں ہے چاہے وہ تعلیم ہی کی خاطر ہو۔ احمد بخش پہلی ہجرت تعلیم کی خاطر شہر کی طرف کرتا ہے اور دوسری ہجرت وہ وطن سے باہر کرتا ہے۔ وہ وطن سے دور رہ کر بھی وطن کی یادوں سے جڑا رہتا ہے۔ وطن سے دوری کا احساس انسان کو بے چین رکھتا ہے۔

روشن اندھیرے:

شیخ حیدر جو کہ ناول میں شجاع کا دوست ہے اور کچھ سالوں سے دبئی میں مقیم ہے، وہ بہتر روزگار کے لیے دبئی کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ شجاع کو اُس پر شک ہے کہ وہ دو نمبر کام کرتا ہے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ ناول کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حیدر دہشت گرد تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے ملک کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ شیخ حیدر نے شجاع کو بتایا کہ وہ پچھلے چار سال سے دبئی میں مقیم ہے۔ تین سال پہلے اُس کے کفیل نے ایک نیا کاروبار شروع کر دیا ہے اور اُسے اپنے ہوٹل میں برابر کا شراکت دار بننے کی پیشکش کی ہے۔ شیخ حیدر نے شجاع کو بتایا کہ باہر کے ممالک میں ہوٹلوں اور مختلف ہال میں تفریح کے نام پر بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ ہوٹل اور ہال آئے دن پاکستان، بھارت سے آنے والے طائفوں کی وجہ سے خوب کماتے ہیں۔ سب انتظامات وہاں پر موجود پروموٹر کرتے ہیں، اُس کے کفیل نے اُسے پروموٹر بننے کو بھی کہا ہے ساری سرمایہ کاری اُسی کی ہو گی لیکن کام شیخ حیدر کو کرنا ہو گا:

> "میں چار سال قبل دوبئی گیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ میرا کفیل بہت اچھا آدمی ہے۔ میں نے وہاں سیلز مین کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ میں نے بھرپور محنت کی یا میں ماحول کو جلدی سمجھ گیا، بہر حال میں ٹھیک ٹھاک کمانے لگا۔ مجھے اپنا پیسہ پاکستان بھجوانے کی مجبوری نہیں تھی، الحمد اللہ سب کھاتے کماتے ہیں۔ میرا اپنے کفیل کے ساتھ اچھا تعلق بڑھتا گیا۔ میں نے اپنا بزنس بھی شروع کر لیا۔"(۶۱)

شیخ حیدر بہتر روزگار کے لیے دبئی کی طرف ہجرت کرتا ہے جو اس کے لیے بہتر ثابت ہوتی ہے۔ کفیل اسے کافی فائدہ پہنچاتا ہے اور اپنا کاروبار کر لیتا ہے۔

صفر سے ایک تک:

ناول میں ذکی سالار کے ساتھ پہلی بار گھر سے لاہور جانے کے لیے نکلتا ہے۔ ناول میں ذکی کی یہ پہلی ہجرت ہے جو کہ وہ تعلیم کی غرض کے لیے کرتا ہے۔ جب فیضان سالار کے ساتھ ذکی پہلی بار لاہور جانے کے لیے بس پر سوار ہوتا ہے تو اُس کی جیب میں صرف سو روپے ہوتے ہیں اور بھائی کی دی ہوئی سونے کی انگوٹھی

ہوتی ہے جو کہ اُنھوں نے انتہائی ضرورت کے لیے دی ہوتی ہے۔ کنڈکٹر کو کرایہ دینے کے لیے فیضان اپنا بٹوہ نکالتا ہے جس میں سبزی مائل سبز نوٹ تھے وہ ایک نوٹ ذکی کو دیتا ہے۔ ذکی کو کہتا ہے کہ سارا خرچہ تم کرو میں شام کو حساب کر لوں گا۔ لاہور پہنچ کر ذکی سالار منزل کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مستطیل، لمبی، مربع، اونچی نیچی دیواریں اپنے اپنے گلابی، آسمانی، کریم رنگوں کو مل ملا کر عمارت اِس طرح کا منظر پیش کر رہی تھی کہ عمارت رہنے کی بجائے دیکھنے کی چیز لگ رہی تھے۔ ذکی کے لیے سالار منزل کو دیکھ کر حیرت زدہ ہونے کا کافی جواز موجود تھا کیونکہ وہ سالار منزل میں پہلی دفعہ آیا تھا لیکن فیضان بھی اپنے اُس شہری ماحول میں آ کر کچھ مرعوب ہو گیا تھا:

> "سالار منزل کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ فیضان کبھی کبھی "لاہور میں ہماری کوٹھی" کا ذکر کرتا تھا لیکن میرے "دیہاتی لڑکے کے تخیل" میں وہ کوٹ سالاراں میں اُن کی حویلی کی ہی ایک نسبتاً بڑی اور اونچی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن لاہور کے "ماوراء النہر" اشرافیہ اور امراء کے روایتی علاقوں میں ایک جگہ واقع وہ عمارت سالاروں کی دیہاتی حویلی سے رقبے میں کافی چھوٹی ہونے کے باوجود ایک دم نظروں میں کُھب جاتی تھی۔"(۶۲)

ذکی تعلیم کی غرض سے لاہور کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ وہاں جا کر سالار منزل دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے، جس کو دیکھ کر وہ مرعوب ہوتا ہے۔ اس کے گاؤں میں سادہ گھر اور سادہ طرزِ زندگی ہے لیکن شہر آ کر وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نولکھی کوٹھی:

ولیم جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے اُس کو ہندوستان اس لیے پسند ہے کہ وہاں ہریالی ہی ہریالی ہے۔ ولیم اپنے ملک کی مٹی سے بے حد پیار کرتا ہے لیکن اُس کا باپ اُسے تعلیم کے لیے باہر کے ملک بھیجنے پر بضد ہے۔ کیونکہ ولیم کے باپ، دادا ہندوستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اُس کا باپ چاہتا ہے کہ ولیم بھی بیوروکریسی کے مزے لوٹے۔ لیکن ولیم ہندوستان کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جانا چاہتا۔ ایک دن ولیم کا باپ اُسے بتاتا ہے کہ اب اُسے اپنی تعلیم کے سلسلے میں انگلستان جانا ہو گا تو وہ باپ کے اس فیصلے پر بہت رویا، پیٹا۔ لیکن باپ نے اپنی ضد کو پورا کیا اور آٹھ سال گزرنے کے بعد ولیم کو اپنے باپ کا فیصلہ ٹھیک نظر آ رہا ہے۔ اُسے آٹھ سال کا عرصہ ایسے لگ رہا تھا جیسے پلک جھپکتے گزر گیا ہو:

> "ولیم کو انگلستان سے آئے ایک سال کے قریب ہو گیا لیکن ابھی تک اُسے خاص جگہ تعینات نہیں

کیا گیا تھا۔ مختلف کمشنروں کے دفتروں میں ہی چھوٹے موٹے کاموں کی تربیت میں مصروف رکھا تاکہ کام پر نکلے تو پورے حساب میں ہو۔ ایک سال کے بعد جب اُس کے باقاعدہ پوسٹنگ آرڈر تیار ہوئے تو وہ فیروز پور کی تحصیل جلال آباد میں بطور اسسٹنٹ کمشنر کے تھے۔ "[۶۳]

مولوی کرامت کو جب ولیم نے سرکاری فرائض کے لیے منتخب کیا تو اس کو اپنا گاؤں چھوڑتے ہوئے کافی دکھ ہوا کیونکہ اس گاؤں میں اس کا باپ، دادا برسوں سے مسجد کی خدمت کے فرائض ہی انجام دیتے آ رہے تھے۔ نماز ختم ہونے کے بعد مولوی کرامت نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ گڑگڑا کر دُعا کروائی ۔ ہر ایک شخص کا نام لینے کے بعد اُن کی ضروریات کی تمام چیزیں دولت، صحت اور ایمان تک مولوی صاحب نے اللہ سے مانگیں، دُعا کو مولوی نے اتنا لمبا کر دیا کہ سب فکر مند ہو گئے۔ دُعا کرنے کے بعد نمازیوں کی طرف منہ کر کے رُوتی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا ۔ مولوی صاحب کو پہلے بھی ایک دو دفعہ شہر کی مسجدوں سے پیش امامت کی پیش کش ہوئی۔ مولوی صاحب نے انہی سہولیات کے باعث وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر اب معاملہ بالکل مختلف تھا، ایک طرف انگریزی سرکار کی نوکری، دوسری طرف رحمت بی بی کی دس ایکڑ زمین کی سنبھال۔ مولوی کرامت نے سوچا اُسے چاہے مشکل پیش آئے ، مگر فضل دین کا مستقبل ضرور سنور جائے گا۔ یہ ایک باپ کی اپنی اُولاد کے بہتر مستقبل کے لیے ہجرت ہے، مولوی کرامت کی پیدائش اِسی گاؤں میں ہوئی تھی اس لیے اُن کا دل بھر آنا ایک فطری عمل تھا:

> "گاؤں والوں! خدا تم کو سلامت رکھے اور اس گاؤں پر کبھی کوئی مصیبت نہ آئے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت دُکھ ہو رہا ہے کہ میں آج یہاں سے ہجرت کر جاؤں گا۔ تم نے میری اور میرے باپ دادا کی بہت خدمت کی۔ اس مٹی میں جتنا ہمارا رزق تھا، وہ ہم نے کھالیا۔ اب آگے کا دانہ پانی اللہ نے کہیں اور لکھ دیا ہے۔ اب دعاؤں کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔ "[۶۴]

ولیم ہندوستان سے بہت محبت کرتا ہے لیکن اسے اپنے باپ کی خواہش پر ہندوستان جانا پڑتا ہے۔ مولوی کرامت بھی اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کی خاطر ہجرت کرتا ہے مولوی کرامت ہجرت کرتے ہوئے بہت اداس ہے اور وہ گاؤں والوں سے روتے ہوئے رخصت لیتا ہے۔

ناتمام:

وسیم کا کردار ناول میں صائمہ کے محلے میں چند دنوں کے لیے نمودار ہوتا ہے۔ وہ ضد کر کے شہر میں اپنے رشتے داروں کے گھر پڑھنے کے لیے آتا ہے کیونکہ وہ شہر میں داخلہ لینا چاہتا ہے، پر وسیم کا باپ چاہتا تھا

کہ وہ کاروبار میں اس کا ساتھ دے۔ وسیم ملتان میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا، یہاں پر ہجرت تعلیم کے حصول کے لیے سامنے آتی ہے۔ وسیم کی ضد کے آگے اُس کا باپ ہار تو مان جاتا ہے لیکن ساتھ ایک شرط بھی رکھتا ہے کہ اگر لاہور میں کہیں داخلہ نہ ملا تو وہ گھٹنے ٹیک دے گا اور واپس ملتان آکر کاروبار سنبھالے گا۔ کیونکہ اُس کے باپ کو پورا یقین تھا کہ اتنے نمبر پر شہر میں اُس کے بیٹے کا داخلہ ہونا ناممکن ہے:

"وسیم اپنے والدین سے ضد کر کے آیا تھا کہ پڑھے گا تو بس لاہور ہی میں۔ اس کے باپ کا ملتان کے میں بازار 'صدر میں وسیع وعریض رقبہ میں پھیلا ہوا ڈیپار ٹمنٹل سٹور تھا جو خوب چلتا تھا۔ باپ کی مرضی تھی کہ لڑکا کاروبار کو غیر معمولی طور پر بڑھانے کی خواہش کو پورا کرنے میں اس کا ساتھ دے۔"(۶۵)

ڈاکٹر وقاص کا کردار ناول میں جب صائمہ کلینک میں بطور نرس نوکری کی شروعات کرتی ہے تو سامنے آتا ہے۔ اُن کے والدین کا تعلق گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا۔ پڑھ جانے کے بعد انھوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس شہر بُلا لیا تاکہ اُن کی خدمت کر سکیں۔ والدین نے بہت تکلیفیں دیکھی تھیں۔ اُن کے والد گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اکیلے ڈاکٹر تھے، کمائی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر وقاص کے میٹرک کرنے کے بعد انھیں لاہور بھیج دیا گیا۔ ایم بی بی ایس کے امتحانات میں پوزیشن لینے پر اسکالرشپ ملا تو لندن سے گائناکولوجی میں ماسٹرز کرنے کے بعد رائل کالج آف میڈیکل سائنسز کی فلیوشپ لی اور وہاں ہی ملازمت اختیار کر لی اچھی تنخواہ تھی اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی تھے۔ کچھ سال تو انگریزوں کا علاج کیا، دل میں وطن کی محبت اُٹھی تو واپس چلے آئے یہاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں نوکری کی تو ماں کو بھی یہاں پاس بلا لیا اُنھوں نے اپنے برسوں کے خواب کی تعبیر پاتے ہی فوراً رشتہ دیکھنا شروع کر دیا:

"لڑکی برادری سے ہی تھی۔ اور لڑکی کا باپ ڈاکٹر صاحب کے والد کا سکول کے زمانے کا ہم جماعت۔ جوانی میں دیار غیر چلا گیا تھا۔ خوب پیسہ کمایا۔ لیکن اولاد جوان ہوئی تو وہی پرانی کہانی کہ وطن کی یاد آئی۔ اپنی جڑیں، اپنا کلچر، اور بچے تھے کہ اجنبی کلچر میں، جو اتنے برسوں میں بھی اس کے لیے اپنا نہیں ہو سکا، رنگے جا رہے تھے۔"(۶۶)

بہتر رزق کی تلاش میں انسان کسی بہتر جگہ ہجرت کرتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر وقاص کا کردار لیکن اس ہجرت کی خاطر بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو بڑھاپے میں آگے بڑھنے کے بہتر مواقع کی وجہ سے اکیلا چھوڑنے پر مجبور ہے۔

میر واہ کی راتیں:

نذیر کا کردار ناول میں لااُبالی نوجوان کا ہے، جسے اپنے اچھے بُرے کا کچھ علم نہیں تھا وہ ہمیشہ اپنے باپ کی ڈانٹ ہی سُنتا تھا۔ اُس کی دن بدن بڑھتی ہوئی حرکات کی وجہ سے اُس کا باپ اُسے اپنے بھائی کے پاس ٹھری میر واہ بھیج دیتا ہے۔ پانچ برس کی عمر میں جب اُسے سکول داخل کروایا گیا تو ایک لنگڑے اُستاد نے بغیر وجہ کے اُس کی پٹائی کر دی۔ یہ طبیعت کا من موجی پن ہی تھا کہ آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکا اور آوارہ گردی کرنے لگا سارا دن میر پور ماتھیلو کے گلی، محلوں کی خاک چھانتا۔ اُس کا والد میر پور ماتھیلو کا مشہور حلوائی تھا اور اُس کی بہت بڑی دُکان تھی اُس کے بھائی، باپ کی دُکان پر کام کرتے تھے وہ لڑکیوں کو دیکھتا رہتا۔ ایک دن اُس کے والد نے پچاس ہزار بینک میں جمع کروانے کے لیے دیئے لیکن وہ رقم لے کر چکلے پر پہنچ گیا۔ اُس کے باپ کو کہیں سے خبر مل گئی اُس نے وہاں جا کر لڑکی سے سارے پیسے نکلوائے اور نذیر کو مارتے ہوئے گھر لے آئے۔ اُس کی حرکتوں سے نالاں ہو کر نذیر کو اُس کے چاچے کے پاس میر واہ بھیج دیا گیا۔ ہجرت چونکہ انسان کی فطرت میں شامل ہے وہ ہمیشہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے ہجرت کرتا ہوا نظر آتا ہے ناول میں کچھ یہی صورت حال نذیر کے کردار کو درپیش ہے جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

> "نذیر کو میر پور ماتھیلو سے ٹھری میر واہ آئے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اسی لیے یہاں زیادہ لوگوں سے اس کی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی آٹھ اولادوں میں چوتھے نمبر پر تھا، اس لیے اس کے حصے میں ماں باپ کا اتنا پیار نہیں آ سکا جتنا اس کے سب سے بڑے بھائی اور سب سے چھوٹے بھائی کا حصے میں آیا تھا۔"(۶۷)

نذیر میر پور ماتھیلو سے نکلنے کے بعد چاچے کے پاس ٹھری میر واہ میں اُس کی دکان پر کام شروع کر دیتا ہے تاکہ وہ کچھ سیکھ سکے اور آوارہ گردی سے دور رہ کر اچھا انسان بن سکے۔ یہ ہجرت نذیر کے بہتر مستقبل کے لیے تھی تاکہ وہ ایک ٹھیک انسان بن سکے کیونکہ اپنے شہر میں وہ آوارہ گردی میں مشغول رہتا تھا جس کہ وجہ سے اس کے گھر والے بہت تنگ تھے۔ نذیر کا باپ اسے اپنے بڑے بھائی جو کہ میر پور ماتھیلو میں رہتا تھا ایک مرتبہ اُس کے پاس بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے وہ سوچ رہا تھا کہ اُس نے نذیر کو گالم گلوچ کر کے نکال دیا تو اس کی بہت جگ ہنسائی ہو گی اور پوری برادری میں اس کی ناک ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گی۔ کیونکہ نذیر کا باپ اُس کی عادات کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ ایک آزاد طبیعت کا مالک تھا اور لااُبالی پن اُس میں کوٹ کوٹ

کر بھرا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے باپ کو ڈر بھی تھا کہ کہیں نذیر چاچے کے پاس جا کر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور اُس کے لیے بدنامی کا باعث بنے:

> "ناشتہ کرتے ہوئے نذیر کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا۔ اسے دکان کی طرف سے تغافل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرپور ماتھیلو سے شہر بدر ہوتے ہوئے اس کے والد نے اسے نصیحت کی تھی کہ ٹھری میر واہ جا کر درزی کے کام میں دل لگانا۔ آدمی کے پاس کوئی ہنر ہو تو اس کی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔"(۶۸)

نذیر کا باپ اس کے لااُبالی طبیعت کو ٹھیک کرنے کے لیے اس کو چاچے کے پاس بھیجتا ہے یہ ہجرت تربیت کی خاطر ہوتی ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس کے برعکس وہ اخلاقی پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔

کوہِ گراں:

کوہ گراں ناول ایک شکستہ حال گاؤں کی داستان ہے، جس کو دوبارہ سے آباد کرنے کا خیال چودھری حلیم کے ذہن میں آتا ہے اور وہ شہر سے واپس گاؤں کی بحالی کے لیے ہجرت کرتا ہے، جس کی صورتحال ناول نگار نے کچھ یوں بیان کی ہے۔ دیسو چودھری کو گاؤں کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے فاقہ زدہ لوگ ہجرت پر مجبور ہوئے، یہاں ہجرت گاؤں کی تباہی کی وجہ سے سامنے آتی ہے۔ آدھی رات کو لوگ گھروں سے نکلتے اور کسی رشتے دار یا مختلف قصبوں میں چلے جاتے۔ فاقہ زدہ لوگ کیا کر سکتے تھے کیونکہ پانی نے اُن کا ساتھ نہ دیا جب قحط یقینی ہو گیا تو دیسو نے اُن کو گاؤں سے نکلنے میں مدد کی۔ اُس نے بتایا جس طرح بڑے چودھری صاحب ہندوستان سے حفاظت سے لوگوں کو نکال کر لے آئے تھے میں نے اُسی طرح حفاظت سے سب کو وہاں سے نکالا۔ میں گاؤں کا محافظ ہوں اور آپ گاؤں کے مالک ہیں، اب آپ اپنی ذمہ داری سنبھالیں۔ گڈو کی ماں اپنے سسرال میں تھی جب اُسے گاؤں کے اُجڑنے کی خبر ملی تو وہ رُوتی ہوئی پہنچی اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی آخری سانس تک یہاں ہی رہے گی۔ دیسو حلیم کو سب بتاتے ہوئے ہتھیلی سے زمین کو صاف کر رہا تھا، اور حلیم کو وہ یہ سب باتیں کرتے ہوئے بے چین لگا:

> "موگھے کے دوسری طرف، تھوڑے فاصلے پر، بیر والہ کھوہ تھا۔ وہاں چند رہائشی گھر، جانوروں کے لیے ایک لمبی کھرلی اور دو کڑھیں ہوتی تھیں۔ یہاں پٹیالہ سے ہجرت کر کے آنے والا ایک خاندان آباد ہوا کرتا تھا۔ وہ چھوٹے مالک تھے اور خاندان کے تمام افراد اپنے رقبے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اُن کی زندگی وہاں غیر محفوظ تھی، سال میں ایک آدھ بار اُن کے مویشی چوری

ہو جایا کرتے تھے۔"(۶۹)

جب انسان کو بنیادی ضروریات نہ مل رہی ہوں تو وہ اپنے آبائی علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پانی کی کمیابی کی صورت میں گاؤں والے ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ ہجرت ایک مشکل عمل ہے جس میں بعض اوقات اپنی پسندیدہ چیزوں کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔

دشتِ وفا:

یہ کہانی بلوچستان کی ہے جہاں پر حالات بہت خراب ہیں۔ نجیب کا کردار ناول میں انقلابیوں کا ہے جو کہ پہاڑوں میں اپنے وطن کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ رُخسانہ بھی نجیب کے ساتھ انقلابیوں کی مدد کے لیے پہاڑوں پر چلی جاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ بھی ہجرت ہے کیونکہ کسی کام کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہجرت کہلاتا ہے۔ انقلابیوں کا ساتھ دینے کے علاوہ وہ دونوں مختلف مزاروں پر دعائیں مانگنے کے لیے بھی جاتے۔ کبھی وہ پیر پنجہ چلے آتے جہاں سے پیدل پہاڑوں میں ضروری ادوایات پہنچاتے اور اس کے ساتھ ساتھ عزیزوں کے خطوط کا تبادلہ بھی ہوتا۔ سبھی انقلابی رُخسانہ کی دل سے عزت کرتے تھے۔ نجیب کو کبھی کبھی اُلجھن سی ہونے لگتی تھی کہ آخر اِس قتل و غارت کا کیا انجام ہو گا۔ جو انقلابی پہاڑوں پر لڑ رہے تھے اِن کے گھرانوں کے لیے یہ قیامت کی گھڑی تھی۔ کالج سنسان پڑے تھے کیونکہ نجیب کے تمام کلاس فیلو پہاڑوں پر لڑ رہے تھے۔ رُخسانہ کو یہ سب ایسے لگتا تھا جیسے پکنک منائی جا رہی ہو:

> "انقلابیوں کی مدد میں رخسانہ بھی ساتھ دینے لگی۔ اب اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ ایک تو تفریح رہا کرتی۔ یوں لگتا مانو پکنک منائی جا رہی ہو۔ ساتھ ہی ساتھ کام بھی ہوتا رہتا۔ عمومی تاثر یہ پیدا ہوتا کہ ایک نوبیاہتا جوڑا پکنک پہ جا رہا ہے۔ پہاڑوں میں فوٹو گرافی کر رہے ہیں۔ دریائے سندھ میں بوٹنگ کرنے سکھر جا رہا ہے۔ سادھو بیلا دیکھنے جا رہا ہے۔ شیر جان آغا کے مزار پہ حاضری ہے۔ خواجہ ابراہیم یک پاسی یا شیخ ابراہیم دوپاسی کے مزار پر منت مانگنے جا رہے ہیں۔"(۷۰)

نجیب اور رخسانہ انقلابیوں کی مدد کے لیے پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں یہ ہجرت وطن کی بہتری کے لیے ہوتی ہے لیکن رخسانہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر نجیب کے ساتھ پہاڑوں میں پکنک مناتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

ناول میں ہجرت کا پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب حکیم صاحب کو خبر ملتی ہے کہ پاکستان بننے والا ہے۔ فیاض اور تُلسی نے جب آخری بار ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیونکہ

انھیں تھا کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو کبھی بھی نہیں دیکھ سکیں گے،اس کے ساتھ حکیم صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ حکیم کی بیوی بہت پریشان تھی کیونکہ بھرا پرا گھر چھوڑ کر مہاجر ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ حکیم صاحب کی بیوی نے بہت سمجھایا کہ ابھی جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے نواب صاحب کے فیصلے کا انتظار کر لیں مگر حکیم کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ جمعدار کی خبر سننے کے بعد حکیم صاحب حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی صندوقچی کھول کر اسٹامپ پیپر نکال کر فیاض کے ہاتھ میں رکھ دیئے انھوں نے مکان اور دُکان دونوں فیاض کے نام کر دی تھیں۔ اور کہا کہ سب کچھ تمہارا ہے، قسمت میں ہوا اور اگر واپسی ہوئی تو پھر دیکھا جائے گا۔ کاغذات لیتے وقت فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو حکیم صاحب بھی رُو دیئے۔ ہجرت کرنا اور اپنے پیاروں کو چھوڑنا آسان کام نہیں اور یہ صورتحال ناول میں حکیم کے گھرانے کو درپیش ہے:

"۱۴ اگست کی دوپہر کو جب جمعدار محمد نواز کے مشورے پر حکیم رام لعل نے روہی کی طرف سے بارڈر پار کر کے ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا تو سوڈھی مل اور وِشنو اُسی وقت سے گردنیں جھکائے اور دَم سادھے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ احمد پور سے آتے ہوئے سوڈھی اپنا پیسہ ٹکا ساتھ لیتا ہوا آیا تھا اور اب تو بس ایک دَم تھا اپنا اور دوسرا بیٹے کا۔"(۷۱)

پاکستان بننے کی خبر سننے کے بعد حکیم کا گھرانہ اور چاچا سوڈھی کا گھرانہ وطن چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور تھے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ سب غیر مذاہب کے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر جا رہے تھے سب بے یقینی کا شکار ہو چکے تھے، اس وقت سب اپنے گھر بار کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ وطن چھوڑنے والوں کے منہ پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا کیونکہ سب پہلے ہی ہتھیار پھینک چکے تھے۔ فیاض کو الوداع کہتے ہوئے حکیم صاحب کی آنکھیں آنسو سے بھر گئی اُن کی آنکھوں میں اِس کے علاوہ وطن نصیب اور شناخت یافتہ ہونے کی آرزو تھی۔ اپنے ہم وطنوں سے چوری چھپے یہ افراد جیپ میں بیٹھ کے ایک نئے سفر پر روانہ ہوئے۔ جیپ میں اُن کے علاوہ ایک سپاہی موجود تھا جس نے ان لوگوں کو منزلِ مقصود پر پہنچا کر واپس آنا تھا:

"رادھی یہ سب دیکھ کر بالکل ہی گنگ، اُلٹا سہم کر بیٹھ گئی۔ حکیم صاحب کوٹھے سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ اُس کا دوست محمد نواز جمعدار پولیس کی جیپ لے کر مطب کی عقبی جانب آ چکا ہے۔ رام لعل نے فیاض کو گلے سے لگایا تو آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ جب

کہ تُلسی، رادھی، وشنو اور سوڈھی مل کے چہروں پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔"(۴۲)

پاکستان بننے کی خبر سنتے ہی حکیم رام لال ہجرت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اپنے بھرے ہوئے گھر اور کاروبار کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔ ایک جگہ بہت عرصہ رہنے سے اپنے پیاروں کو چھوڑنا بھی آسان نہیں ہے لیکن حکیم اور سوڈھی کا گھرانہ فکر مند ہے کہ ان کے ساتھ جانے کیسا سلوک کیا جائے گا۔

پانی مر رہا ہے:

گاؤں کی فضا میں دھول اڑاتی نیلے رنگ کی گاڑی داخل ہوتی ہے جسے دیکھ کر سارے گاؤں والے حیران ہو جاتے ہیں۔ گاڑی میاں اللہ یار کے گھر آ کر رُکتی ہے اور اُس میں سے باؤ اسرار نکلتا ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر گیا ہے۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد سب لوگ اُسے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جسے سب گاؤں والوں نے مشترکہ فیصلے سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر بھیجا تھا جو شہر جا کر بہت پڑھا کو ہو گیا کہ چھٹیوں میں بھی گاؤں واپس نہ آتا۔ لیکن گاؤں اُس کی آمد سے سب لوگ حیران تھے کیونکہ وہ حلیے سے پڑھا لکھا ہونے کی بجائے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی سانپ پکڑنے والا جوگی ہو۔ اسرار اپنے بھائیوں اور گاؤں کے لڑکوں میں پہلا لڑکا تھا جسے پڑھنے کے لیے اُس کے باپ نے شہر کے ہاسٹل میں بھیج دیا تھا:

"اسرار جو کہ اللہ یار کی دوسری بیوی کی واحد اولاد تھی، سترہ سال کی عمر میں ہاسٹل بھیج دیا گیا۔
مسمی اسرار وہاں جماعتوں پہ جماعتیں پاس کرتے گئے اور اتنے پڑھاکو ہو گئے کہ چھٹیوں میں
بھی گھر نہ آتے بلکہ وہیں ہاسٹل میں بڑے بڑے نامی گرامی وکیلوں سے ٹیوشن لیتے۔"(۴۳)

نازنین کے ساتھ والی کوٹھی میں پارٹی کی رات ہونے والے عجیب و غریب واقعے کے بعد اس کی ماں نے دوستوں سے فون پر اُس کے رابطے پر پابندی لگا دی اور اُس کا یونیورسٹی جانا بھی بند کر دیا تھا کیونکہ اُس واقعے کے بعد نازنین عجیب ڈری ڈری سی رہتی تھی۔ نازنین کے والدین نے اُس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے سے کروا دی۔ وہ لاہور سے لندن چلی گئی وہاں اُس نے ایک ابنارمل بچی کو جنم دیا جس کی وجہ سے اُس کے شوہر نے اُسے طلاق دے دی اور خود وہاں سے عُمرہ کرنے چلا گیا۔ جس رات نازنین کے ہاں بچی پیدا ہوئی اُسے اسرار کے ساتھ بیتی ہوئی وہ رات یاد آ گئی جس کے بعد وہ اُس سے کبھی بھی نہیں ملی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی زندگی میں آگے چل کر یہی ہو گا، نازنین اِس کے بعد اپنے ماں، باپ کے پاس پاکستان لوٹ آئی۔ پاکستان سے لندن جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا نازنین کے لیے ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف ہجرت تھی:

"نازنین اپنی بیٹی کو لے کر پاکستان چلی گئی۔ اس کا شوہر عمرہ کرنے روانہ ہو گیا۔ جانے سے

پہلے وہ اپنے وکیل سے بات کر گیا تھا پاکستانی قانون کے مطابق وہ ناز نین کو طلاق دے رہا تھا۔" (۷۴)

ناز نین کے والدین عجیب و غریب واقعے کے اثر سے آزاد کروانے کے لیے اپنی بیٹی کی شادی کروا کر اُسے لندن بھیج دیتے ہیں۔ یہ ہجرت بھی اُس کے کام نہیں آتی اور وہ عجیب الخلقت بیٹی کے ساتھ طلاق کا دھبہ لگوا کر واپس آجاتی ہے۔

گل مینہ:

گھر سے بھاگنے کے بعد زر جان اور گُل مینہ نے ارغنداب میں رہائش اختیار کر لی۔ اِن نو سالوں میں ان کے ہاں دو بچوں کی پیدائش ہوئی بیٹی تو بخار کی وجہ سے زندہ نہ رہ سکی۔ ارغنداب کے حالات زیادہ بہتر نہیں تھے وہاں ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا۔ ارغنداب سے انگوراڈا آنے کے بعد یہاں پر بھی زر جان جیپ ہی چلاتا تھا اور یہاں پر بھی حالات اچھے نہیں تھے۔ یہاں پر زر جان طالبان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ارغنداب میں آسمان پر ہر وقت جنگی جہاز اُڑتے تھے اور وہ پہاڑوں پر تیزی سے بم برسا کر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے۔ ایک رات زر جان ایک ڈانسن پک اپ لے کر آگیا اور گُل مینہ کو کہا کہ اب ہمیں پاکستان جانا ہو گا۔ باقی باتیں بعد میں سوچیں گے، فتح محمد کی چیزیں اُٹھاؤ۔ اپنی جان بچانے کے لیے گُل مینہ اور زر جان پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ گھر سے بھاگنے کے بعد پورے ناول میں گُل مینہ کو کسی نہ کسی علاقے میں ہجرت کرتے ہوئے ہی دکھایا گیا ہے۔ ناول کے اختتام تک اُس کی زندگی مشکلات کا شکار ہوتی ہی نظر آتی ہے:

"گل مینہ اب یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں رہی۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے ہیں، ملا داؤد بھی جہاز کے حملے میں شہید ہو گئے ہیں۔ ہمیں پاکستان جانا ہو گا۔ 'پاکستان میں کہاں؟ 'فی الحال تو نکلنے کی کرو، باقی کی بعد میں سوچیں گے۔ فتح خان کی چیزیں اٹھاؤ، باقی سامان میں گاڑی میں لادتا ہوں۔" (۷۵)

صدیق جو کہ فتح خان کا دوست ہے وہ گل مینہ کے پاس فتح محمد کا بتانے کے لیے آتا ہے کہ خالہ وہ ایک فدائی بن گیا ہے کیونکہ وہ اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اُس سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے وہ ہر وقت آپ کو اور اپنے ابا کو یاد کرتا ہے۔ زر جان کو فدائی مار دیتے ہیں فتح محمد اپنے باپ کے لیے ہر وقت روتا رہتا ہے اور اُن سے بدلہ لینے کے لیے وہ طالبان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ گُل مینہ کو جب فتح محمد کے دوست صدیق سے سب حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ اپنے دادا کی نشانی بیچ کر رات کے اندھیرے میں سفر کرتی ہے۔ گُل مینہ چونکہ

پہلی بار پاکستان آئی ہے اِس وجہ سے دُکاندار اُس کی لاعلمی کا فائدہ اُٹھا کر اُس سے سستے داموں اس کی دادا کی آخری نشانی خرید لیتے ہیں۔ راستے میں اُسے سارا اپنے بچپن سے لے کر فتح محمد کے سکول جانے تک کا وقت یاد آتا ہے، گُل مینہ سفر کرتے ہوئے پیرودھائی پہنچتی ہے وہاں اُسے بے نظیر کے قتل کے بارے میں خبر ملتی ہے۔ فتح محمد تو دھماکا کرنے کے بعد ابدی نیند سو جاتا ہے لیکن گُل مینہ کو زبان کے فرق کی وجہ سے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اُس سے سوالات کیے جاتے ہیں:

> "گل مینہ اس سے پہلے کبھی پاکستان نہیں گئی تھی۔ اس نے صبح اٹھ کر انتظار کیا کہ بازار کھل جائیں۔ سورج خاصا اوپر چڑھ آیا تو اس نے صحن میں سے دیکھا کہ بازار میں لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی ہے۔" (۷۶)

زرجان اور گل مینہ بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں لیکن ان کو ایک جگہ ٹک کر رہنا نصیب نہیں ہوتا اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے رہتے ہیں اُس دوران اِن کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زرجان کو فدائی مار دیتے ہیں فتح محمد کو فدائی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ گل مینہ فتح محمد کی تلاش میں افغانستان سے پہلی بار پاکستان کی طرف ہجرت کرتی ہے۔

گراں:

گراں میں یہ رواج تھا کہ والدین اپنے بچوں کو باہر ملک ویزے کا لالچ دے کر بچپن میں ہی اُن کے رشتے کر دیتے تھے۔ یوں شادی کر کے جانے والے لڑکے اپنی بیگمات اور منگیتروں کو بھول جاتے تھے، اُن کی عمریں انتظار میں گزر جاتی تھیں وہ اِسی انتظار میں ہی بوڑھی ہو جاتی تھیں۔ گاؤں میں ہر گھرانے میں یہ ایک ڈیل تھی کہ لڑکوں کو باہر ممالک کے ویزے کا لالچ دے کر اُن کے رشتے طے کر دیئے جاتے تھے اور لڑکے اِس لالچ میں اپنے گھر والوں کی بات مان بھی جاتے تھے لیکن لڑکیوں کی ساری زندگی انتظار میں گزر جاتی تھی۔ یہی مسئلہ اظہار الحق کا تھا جو پچھلے پانچ برس سے کراچی میں نوکری کر رہا تھا اور گاؤں کا راستہ بھول گیا تھا۔ فاطمہ اُس کے حافظے سے نکل چکی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ جیسے شعور آتا گیا گاؤں کی لڑکیوں نے پڑھنا شروع کر دیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے باپوں کے پاس یورپ ہجرت کی جس کی نمایاں مثال غزل جان ہے:

> "اَن پڑھ ماؤں کی یہ پڑھی لکھی لڑکیاں اب اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے باپوں کی نیشنیلٹی لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں اپلائی کرنے اور گرین کارڈز ہولڈرز بننے لگی تھیں اور ان گراؤں کو چھوڑ رہی تھیں جو یرقان کے مرض میں جکڑا گیا تھا اور پرانی نسل زرد رو ہو کر مر رہی تھی۔" (۷۷)

غزل جان گر اس سے بنا کسی کو بتائے اپنے والد کے پاس پردیس چلی جاتی ہے، جہاں پر اس کی دوسری ماں بھی موجود ہے۔ وہاں جا کر غزل جان کو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسے گاؤں میں پردیس لگتا تھا یہ تو بالکل اس کے برعکس ہے۔ پردیس میں لوگوں کی زندگی مشین کی طرح ہے، پردیس میں اُسے وطن اور اپنوں کی یاد زیادہ آتی ہے۔ غزل جان کو اُس کی سوتیلی ماں بتاتی ہے کہ پچھلوں کی تو وہاں پر ٹھور بن جاتی ہے لیکن یہاں پر اکثر ہمارا سامنا فاقوں سے بھی پڑتا ہے۔ بعض دفعہ پچھتاوا بھی ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں کم سہی لیکن سکون کی روٹی ملتی تھی۔ کبھی کبھی تو بہت پچھتاتے کہ وطن کیوں چھوڑا کیونکہ جس دن کام پر نہ جاتے گھر پر فاقے پڑتے تھے۔ اس کی باتیں سُن کر غزل جان کو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنا ملک جیسا بھی ہے بہتر ہے وہاں پر سب اپنے مشکل میں آس پاس تو موجود ہوتے ہیں۔ غزل جان کو جب پردیس میں شکیلہ جان کی موت کی خبر ملتی ہے تو وہ پاکستان جانے کے لیے اپنی ٹکٹ کروانے کے لیے ٹریولنگ ایجنسز کو فون کرنے شروع کر دیتی ہے:

> "سو اُس نے ٹریولنگ ایجنسیز کو فون کرنے شروع کر دیئے۔ کہیں سے تو ایسا ٹکٹ دستیاب ہو سکتا تھا کہ وہ ابھی اُسی وقت بیگ اُٹھا کر باہر نکل جائے اور چانس کے انتظار میں ایئرپورٹ کی بھیڑ بھاڑ میں خود کو گم کر دے۔ اَن گنت بجتی ہوئی پٹڑیوں کی سنسناہٹ اور شور کی اُنگلیاں کانوں میں ٹھونس کر انتظار کرتی رہی۔ اگرچہ وہ اگلی صبح ہی پنڈی ایئرپورٹ پر لینڈ کر گئی تھی۔"(۷۸)

تعلیم نے لڑکیوں کو بھی باشعور کر دیا ہے اور اس کی واضح مثال غزل جان کے کردار کی صورت میں سامنے آتی ہے جو اپنے بہتر مستقبل کے لیے اپنے والد کے پاس ہجرت کر جاتی ہے۔ لیکن اپنے وطن سے دوری اسے خود ترسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ ہر وقت سوچتی رہتی ہے کہ اس کے وطن کی تمام رسوم اچھی ہیں، اسے اپنے وطن اور سہلیوں کی یاد آتی ہے۔

د۔ مذہب:

مذہب کا انسانی زندگی کے ساتھ بہت گہرا اور ہمہ گیر تعلق ہے۔ انسانی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو انسانوں کے رہن سہن، طرزِ بود و باش اور معاشرتی نظام غرض ہر ایک عمل میں فرق واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سوائے ایک قدر مشترک کے اور وہ ہے انسانوں کا کسی ایک ہستی کو برگزیدہ مان کر اس کے حضور سربسجود ہونا اور اس کو اپنا حاجت روا اور نجات دہندہ ماننا۔ اس کرہ ارض پر کوئی ایسا شہر نہیں جس میں کسی دیوتا یا مندر کی کوئی نہ کوئی صورت نہ ہو، کوئی مسجد یا کلیسا موجود نہ ہو یا لوگ کسی ہستی کے حضور اپنی منتیں نہ مانتے

ہوں اور دعائیں نہ کرتے ہوں، لوگوں کی اسی خاصیت اور طرز عمل کا نام مذہب ہے۔ مذہب کی کوئی ایک جامع ومانع تعریف ممکن نہیں۔ انگریزی میں اس کے لیےReligionکا لفظ آیا ہے جس کا مفہوم عقیدے اور پوجاپاٹ کا ایک نظام ہے لیکن اس پوجاپاٹ کے لیے بھی کسی ٹھوس ہستی کا ہونا ناگزیر ہے۔ اسلام نے مذہب کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معانی مکمل ضابطہ حیات کے ہیں۔ گویا اس کی ذیل میں محض پوجا پاٹ اور طرزِ عبادت ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام جملہ اقدار و امور آجاتے ہیں۔ جس میں انسان کا عقیدہ، عبادت، سیاست، طرزِ معاشرت سب شامل ہیں گویا زندگی کے تمام روحانی، مادی و ثقافتی معاملات دین کی تعلیم کے مطابق ہونے چاہییے۔

مذہب انسانی فطرت میں شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان فطری طور پر مذہب کو اپنی زندگی کے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب کی سب سے بڑی غرض وغایت فطرت انسانی کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔ اِن تقاضوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک مادی و ثقافتی اور دوسرا روحانی۔ مادی و ثقافتی تقاضوں کا تعلق انسانی ضروریاتِ زندگی سے ہے، اس دنیا میں متوازن اور خوشگوار رہن سہن کے لیے بے شمار ضروریاتِ زندگی اہم قرار پائی ہیں جن کے بغیر احسن زندگی کا گمان بھی ممکن نہیں۔ ان مادی تقاضوں کا تعلق انسان کی معاشی اور معاشرتی اُمور سے ہے۔ مذہب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ان معاملات کے بارے میں انسان کو مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے تاکہ انسان کی زندگی باضابطہ، خوشگوار اور متوازن ہو۔ مختلف لغات میں اس لفظ کا بیان کچھ یوں ملتا ہے۔ نور الغات میں مذہب "مذہب (ع) لغوی معنی راہ، راستہ، طریقہ ہے۔ اس کی جمع مذاہب، مذکر:۔ مجازاً، دین، ایمان، آئین، عقیدہ۔"[۷۹] فیروز الغات میں مذہب کے معانی کچھ یوں ملتے ہیں: مذہب۔ مذہب (ع۔ ا۔ مذ) راستہ، طریقہ (۲) ایمان، دھرم، عقیدہ (۳) ملت، مشرب (۴) جمع مذاہب۔[۸۰] اظہر اللّغات میں مذہب کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے: مذہب (ع) راستہ، دین، عقیدہ اصل (ج)، مذاہب، جانا، گزرنا۔[۸۱] نئ اُردو لغت میں مذہب کی تعریف اِن الفاظ میں ملتی ہے: مذہب (ع) مذکرّ، راستہ، طریقہ (۲) دین، عقیدہ، آئین (۳) ملت، کیش، مشرب۔[۸۲] قومی انگریزی اُردو لغت میں مذہب کی تعریف اِن الفاظ میں ملتی ہیں:

> "مذہب سے مراد طریقہ، دھرم، عقیدہ، راستہ یا کسی انسان کا کسی مافوق الفطرت قوت کی اطاعت، عزت اور عبادت کے لیے بااختیار تسلیم کرنے کا عمل ہے۔ اس قسم کی مختار قوت کو تسلیم کرنے والوں کا یہ احساس یا روحانی رویہ اور اس کا ان کی زندگی اور طرزِ زیست سے اظہار متبرک یا

مقدس رُسوم ورواج یا اعمال کے سر انجام دیئے جانے کا عمل، اعلیٰ ترین ہستی (خدائے واحد و مطلق) یا ایک سے زیادہ دیوتاؤں پر ایمان لانے اور ان کی عبادت کا ایک مخصوص نظام، کسی مذہبی تنظیم یا فرقے کے ارکان کا طرزِ زندگی (کسی بھی چیز سے) وفاداری اور باضمیر ہونے کا عمل۔"(۸۳)

قاموس مترادفات میں مذہب کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے: مذہب، دین، ملت، طریقہ، پنتھ، مسلک، عقیدہ، دھرم، شیوہ، مشرب، ایمان۔(۸۴) مذہب کی یہ تمام تعریفیں مختلف لغات میں درج ہیں، اس کے علاوہ جب ہم تاریخِ انسانی پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں اس زمین کا کوئی ایسا خطہ نظر نہیں آتا جہاں مذہب کا عمل دخل نہ ہو۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جو دنیا کے ہر حصّے میں موجود ہے اس کے علاوہ کوئی بھی قدر نسلِ انسانی میں مشترک نہیں۔ تمام دنیا کے انسانوں کے رسم ورواج، ان کی شادی بیاہ کا طریقہ، جینا مرنا غرض ہر ایک چیز دوسرے سے مختلف رنگ ڈھنگ میں پائی جاتی ہے لیکن جو چیز ان سب میں مشترک ملتی ہے وہ مذہب ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں انسانوں نے کوئی ایک ہستی ضرور ایسی بنائی ہوتی ہے جس کو اپنے اعمال کا مختارِ کُل تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے وہ اپنا سر جُھکاتے ہیں جس کو خوش رکھنے کے لیے وہ طرح طرح کے طریقے استعمال کرتے ہیں۔

مذہب کی اس قدر مقبولیت کے باوجود یہ بات حیران کُن ہے کہ آج تک اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا کہ مذہب کسے کہتے ہیں۔ بڑے بڑے مورخین، مصنفین یا مفکرین بھی کسی ایک سوچ پر متفق نہیں نظر آتے۔ انھوں نے مذہب کی جو بھی تعریفیں کی ہیں نہ تو ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور نہ ہی ان میں سے کوئی ایسی جامع اور متفقہ تعریف کا درجہ حاصل کر سکی جو مذہب کے جملہ اُمور کا احاطہ کر سکے۔ ذیل میں چند اہلِ دانش کی مذہب کے بارے میں آراء دی گئی ہیں، سیف الدین بوہرہ مذہب کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ: "مذہب نام ہے انسان کے احساس، بیچارگی اور کسی ایک بار متعدد اعلیٰ قوتوں کے اعتراف و پرستش کا۔"(۸۵) مولانا وحید الدین مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "دوسرے ذہنی اعمال کی طرح مذہب بھی محض ایک ذہنی عمل ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"(۸۶) ڈاکٹر مظفر حسن ملک "بشریات مذہب" میں مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "ہمارے تصورات کائنات ہی کو مذہب کا نام دیا جاتا ہے۔"(۸۷) یورپی اہل قلم مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں، ولیم جیمز کا کہنا ہے: "مذہب خدا کی یاد یا دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک فن ہے۔"(۸۸) کانٹ کے نزدیک مذہب یوں ہے: "مذہب کا کام یہ ہے کہ تمام فرائض خدائی احکام کے

طور پر تسلیم کیے جائیں۔"(۸۹) فلسفہ مذہب کے مصنف امور رنجن مہاپتر مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کوئی بھی اُصول، جو ہمیں بحیثیت مجموعی باہم باندھتا ہے، وہ مذہب ہے۔ یہ محض عقیدہ ہی نہیں بلکہ طرزِ عمل بھی ہے، صرف یقین کُلی ہی نہیں بلکہ شعار بھی، صرف ایمان نہیں بلکہ وظائف کی ادائیگی بھی۔ مذہب میں ساری شخصیت ملوث ہے۔"(۹۰)

مندرجہ بالا تعریفوں پر غور کریں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تعریف ایسی نہیں ہے جو مذہب کے سب گوشوں کو اپنے دائرے میں لاتی ہو۔ بعض کچھ خاص حصّوں کو اپنی تحویل میں لیتی ہیں اور باقی حصّہ کو چھوڑ دیتی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے درمیان ایک مشترکہ تصور پایا جاتا ہے جو کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت کے بارے میں ہے۔ اسی ہستی کو عام طور پر خدا کہا جاتا ہے۔ مذہب اتحاد اور ہم آہنگی کا نام ہے۔ کوئی بھی اُصول جو بحیثیت مجموعی باہم لاتا یا "باندھتا" ہے، وہ ہی "مذہب" ہے۔ مذہب صرف عقیدے کو ہی نہیں کہتے بلکہ عمل کرنے کا نام بھی ہے۔ یہ صرف یقین کرنے کی چیز ہی نہیں بلکہ شعار بھی ہے، یہ صرف ایمان ہی نہیں بلکہ وظائف کی ادائیگی بھی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب میں انسان کی پوری شخصیت شامل ہوتی ہے۔ مذہبی سطح پر اگر ثقافتی بحران کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کئی عوامل کار فرما ہیں سب سے بڑی وجہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہے۔ پرانے وقتوں میں یا پرانی ثقافت میں مذہب ایک اہم عنصر سمجھا جاتا تھا اور لوگ مذہب کی طرف خاص دھیان دیتے تھے۔ لوگ فجر سے دن کا آغاز کرتے تھے اور قرآن پاک کی تلاوت سے باقاعدہ دن کی شروعات ہوتی تھی جو کہ ہماری ثقافت کا اہم حصہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مغرب کی تقلید میں ہم لوگ مذہب سے دور ہوتے گئے۔ لوگوں کی تعداد جو کہ ایک وقت میں بہت زیادہ ہوتی تھی اور اس وجہ سے لوگوں میں باہمی پیار و محبت برقرار رہتا تھا وہ بھی ختم ہوتا گیا۔ پہلے لوگ خاص موقعوں پر ایک دوسرے کی طرف جاتے تھے اور مذہبی تہواروں کو پرجوش طریقے سے منایا جاتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ تمام چیزیں مفقود ہوتی گئی۔ اب موبائل نے وہ تمام چیزیں اپنے اندر سمیٹ لی جہاں پہلے لوگ قرآن پاک کو ہاتھوں میں لے کر پڑھنا اپنے لیے باعثِ ثواب سمجھتے تھے اور دن کا آغاز ہی اس کی تلاوت سے کرتے تھے اب اگر کسی کو پڑھنا ہو تو وہ موبائل پر ہی پڑھ لیتا ہے۔ اب تہواروں کا بھی لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا ہم آہستہ آہستہ کر کے مذہبی حوالے سے بھی بحران کا شکار ہوتے گئے۔ کچھ لوگوں نے مذہبی

تفرقہ بازی کو ہوا دی جس نے لوگوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا۔ غربت کے باوجود لوگ نذرو نیاز بانٹنے کے لیے قرضہ لے کر اپنے اوپر ایک بوجھ لاد لیتے ہیں۔

دھنی بخش کے بیٹے:

احمد بخش نے باہر ملک جا کر ایک غیر مذہب عورت اولا سے شادی کر لی کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ اولاد کے بڑا ہونے پر ان کو مذہبی خدشات لاحق ہوئے کیونکہ امریکہ ایک انگریز ملک تھا کہیں اُن کے بچوں میں انگریزوں کی طرح جنسی رجحان نہ پیدا ہو جائے۔ میاں بیوی نے وطن واپسی کا فیصلہ کیا کہ وہ کسی اور ملک چلے جائیں۔ مسجد میں جانے کا کام اُس نے اپنے ملک میں بھی عید، بقر عید سے ہٹ کر نہیں کیا تھا۔ یہ کام گاؤں میں زمین مالک اور کسان ہمیشہ سے کرتے چلے آرہے تھے اور کر رہے تھے۔ اُس کے گھر میں تو جائے نماز بھی موجود نہ تھی۔ اولا سے شادی کے وقت اُس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اُس کی مذہب سے دوری کی وجہ سے وہ اُسے لامذہب سمجھتی ہے۔ اُسے یاد آتا ہے اُس کے ایک دوست نے اُسے قرآن کا ایک نسخہ پہلی بار گاؤں چھوڑ کر یونیورسٹی جا کر رہنے کے موقع پر دیا تھا جو کہ مسجد کا امام تھا جو اب کہاں ہے اُسے نہیں معلوم۔ امریکا آنے کے بعد شروع کے دنوں میں اُس نے قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ بھی خرید لیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس میں طلاق اور خودکشی کے بارے میں اسلام، بھاگودگیتا اور بائبل کیا کہتے ہیں:

> "اس کا خیال تھا اس معاملے میں اس کی بیوی غیر جانب داری برت رہی تھی کیوں کہ اس کے ملک میں مذہب ایک شخصی شناخت کی چیز رہ گیا تھا۔ چرچ سے مختلف کام لیے جاتے تھے اور سال میں وہ چند ہی بار عبادت گاہ کے طور سے استعمال ہوتا تھا۔ دونوں نے اکثر ایک دوسرے سے کہا تھا۔ بڑے ہو کر بچے خود اپنے لیے مذہب کا انتخاب کریں گے یعنی اگر اس کی انھیں ضرورت پیش آئی تو۔ رہا مسجد جانا تو یہ کام نہ اس نے کبھی، اپنے یہاں کیا تھا، سوائے عید کے اور وہ بھی کبھی کبھی، نہ یہاں کی مسلم کمیونٹی کے ساتھ مل کر۔"(۹۱)

مونگا جو کہ ناول میں علی بخش کا کام کرنے والا ہے وہ علی بخش کی حالت دیکھ کر اسے ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں پر حاضری دینے سے بھی اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جس مزار پر اُسے مونگا لے کر گیا تھا وہاں سے واپسی پر اُس کے چہرے پر کسی قسم کا سکون دیکھنے کو نہیں مل رہا تھا۔ علی بخش نے مزار پر حاضری کے وقت قسم کھائی تھی کہ وہ اب کبھی شراب نہیں پیئے گا۔ اور پوری زندگی ان شیطانی کاموں سے دور رہے گا لیکن اُس کو تھا کہ جب کام نہیں ہوا تو کیوں نہ پیوں۔ علی بخش نے اپنی قسم توڑ دی تھی کیونکہ جب

اُس کا مزار سے واپس آنے کے بعد مسئلہ حل ہی نہیں ہوا تو وہ کیوں ہر کام چھوڑے۔ یہ مونگے کے ساتھ پہلا واقعہ تھا کہ کوئی اس کے بتائے ہوئے مزار پر جا کر وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ مونگا پریشان بھی تھا اور حیران بھی کہ یہ سب ہوا کیا ہے، اس نے جلالی وظیفوں کو الٹتے سنا تھا لیکن کسی مزار پر حاضری کو بگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ حرمت بھی طشتریوں میں زعفران سے لکھوائی کروا کر اُسے پلاتی ہے مگر اثر نہیں پڑتا:

"ناشتے کے بیچ میں حرمت اسے دیکھنے آئی اور کہہ گئی، "میں نے تشتریاں لکھنے کو دی ہیں۔ انھیں ساتھ دن صبح و شام تجھے پلاؤں گی۔"

علی بخش نے پوچھا، "تشتریوں کو؟"

حرمت نے کہا، "نہیں۔ ان میں لکھے کو۔ لوگ اب ہار سنگھار کے پھولوں کے ڈنٹھلوں سے لکھواتے ہیں میں نے زعفران سے لکھوائی ہیں۔" پھر اس نے باہر جاتے ہوئے کہا، "ان تشتریوں کے سامنے لاڈلی کا علم کیا کر سکتا ہے۔"(۹۲)

زیرِ نظر اقتباس میں مصنف نے خوبصورت انداز میں باہر ملک رہنے والے احمد بخش کو نمائندہ کردار کے طور پر متعارف کروایا کہ کیسے وہ غیر ملکی عورت سے شادی کرنے کے بعد خود ہی مذہب سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ یہی بیگانگی بچوں کو بھی مذہب سے دور لے جاتی ہے۔ مذہب کے نام پر قرآن مجید کا نسخہ گھر میں موجود ہے لیکن اس کو پڑھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ دوسرا کردار علی بخش کی صورت میں سامنے آتا ہے جو اپنا کام ہونے کے لیے مزاروں کا رُخ کرتا ہے اور تمام گناہوں سے توبہ کا ارادہ کرتا ہے لیکن کام نہ ہونے پر وہ دوبارہ برے کام شروع کر دیتا ہے۔

روشن اندھیرے:

شجاع کی آنکھ معمول کے مطابق صبح سویرے ہی کھل گئی منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ چائے بنانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تو دروازہ کھولنے کے بعد اُسے موسیقی کی آواز آئی۔ آواز کا تعاقب کرتے ہوئے وہ نچلی منزل تک گیا، جہاں پر ایک لڑکی ناچ رہی تھی۔ کمرے میں ایک طرف پڑے ڈیک سے ہندوستانی موسیقی بر آمد ہو رہی تھی۔ اس لڑکی کی ساری توجہ کا مرکز کرشن دیوتا کا بت پر نام تھا۔ وہ چھوٹا سا بت کارنس پر رکھا ہوا تھا، اُس پر تازہ پھولوں کے ساتھ ساتھ اگربتیاں جل رہی تھیں۔ لڑکی نے کمرے کو مندر کا ماحول بنا رکھا تھا۔ وہ لڑکی پوجا کرنے میں مگن تھی وہ لڑکی کرشن دیوتا کی مورتی کے سامنے دیا لہرانے لگی۔ وہ لڑکی بڑبڑاتے ہوئے

کچھ گا رہی تھی اور ایک چھوٹی سی گھنٹی بجا رہی تھی۔ اُس لڑکی نے اُسی کمرے کو مندر کے ماحول میں ڈھال دیا تھا اور وہ اُس بت کے سامنے بڑی دیر تک ساکت کھڑی رہی:

"میں نے بڑی توجہ سے اس موسیقی کی سمت کا اندازہ کیا تو نچلی منزل کے کسی کمرے سے آ رہی تھی وہ خالص ہندوستانی موسیقی تھی جیسے بھجن وغیرہ گاتے ہوئے بجائی جاتی ہے مجھے اچنبھا ہوا کہ یہ یہاں، اس گھر میں یہ کیسی ہندوستانی موسیقی؟ بنگلا دیشی باورچی تو مسلمان تھا۔ وہ ایسی موسیقی سن رہا ہے۔ یا پھر کون اور ہے؟ اسی تجسس کی وجہ سے میں مجبور ہو کر آہستہ قدموں سے نچلی منزل پر آیا تو دائیں طرف راہداری کے ایک کمرے میں سے وہ موسیقی بر آمد ہو رہی تھی۔"(۹۳)

ہر مذہب کی اپنی رُسومات ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس میں ہندو مت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کا اپنے مذہب کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ لڑکی ہندو ہونے کے باوجود اپنی رسومات ادا کرتی نظر آتی ہے لیکن شجاع کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ تو اپنے مذہب سے جڑے ہوئے ہیں لیکن ہم بحیثیت مسلمان اپنے دین سے بیگانہ ہیں۔

صفر سے ایک تک:

ذکی کا بڑا بھائی ثناء اللہ ماں باپ کی مرضی سے شادی کے بعد لڑکی کو طلاق دے دیتا ہے جس کی وجہ سے لڑکی کے بھائی اُس کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ثناء اللہ کو گاؤں چھوڑ کر فرار کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے وہ جعلی پیر بن جاتا ہے۔ اُس کے آستانے پر صبح سے شام تک کافی رش ہوتا ہے کیونکہ لوگ اُس کو کافی بڑا اور پہنچا ہوا پیر مانتے ہیں۔ جب یہ بات ذکی کو معلوم ہوتی ہے تو وہ اپنے بھائی کو کہتا ہے کہ آپ کے مرید کہتے ہیں آپ جعلی پیر ہیں۔ ثناء اللہ ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ لوگ خود دھوکہ کھاتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ اُس کے آستانے پر لوگ نذرانے اور نیازیں چڑھا کر جاتے تھے وہ تمام پیسے غریب اور ضرورت مند لوگوں پر خرچ کر دیتا کوئی ضرورت مند کبھی بھی اُس کے آستانے سے خالی نہیں جاتا تھا:

"اس کے بعد ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو "گندے پلید پیسوں" کے موضوع پر چل نکلی اور مجھے اُس "جعلی پیر" کے "جعلی روحانی ڈیرے" کی کامیابی کا راز سمجھ میں آ گیا۔ وہاں جو کچھ بھی کمائی کے نام پر آتا تھا۔ نذرانے، نیازیں، چڑھاوے، منتیں مرادیں، وہ سب کچھ بانٹ دیتے تھے۔ کوئی سائل کوئی حاجت مند، کوئی بے سہارا، کوئی یتیم، کوئی بیوہ، کوئی مفلوک الحال مفلس

اگر آجاتا تھا تو کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے والا معاملہ تھا۔"(۹۴)

ذکی کو شہر میں سالاروں کی طرف سے دوسری بار اغوا کر کے نامعلوم مقام پر رکھا جاتا ہے اور اُس کو اذیت سے دُوچار کیا جاتا ہے تاکہ وہ فیضان سالار سے دور رہے۔ ذکی کے ذہن میں سالاروں کی طرف سے دی گئی اذیت کچھ عرصہ رہتی ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے بڑے بھائی ثناء اللہ کے پاس گاؤں آجاتا ہے۔ بھائی ثناء اللہ کے کہنے پر ذکی گاؤں میں کمپیوٹر سینٹر کھول لیتا ہے۔ لیکن وہاں پر گاؤں میں موجود مسجد کا مولوی یاسین جو کہ بطور مولوی اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے وہ مذہب کا سہارا لے کر ذکی کے خلاف علمائے کرام کے ذریعے فتویٰ لگوا دیتا ہے۔ ذکی کو مولویوں کی طرف سے دھمکیاں ملنی شروع ہو جاتی ہیں کہ اس بدمعاشی کے اڈے کو بند کیا جائے۔ کیونکہ مولوی یاسین نے علمائے کرام کے ذریعے یہ فتویٰ لگوایا کہ یہاں کمپیوٹر سینٹر میں ننگے فوٹو دیکھے جاتے ہیں۔ اِس سب واقعے کے بعد بھائی ثناء اللہ نے ذکی کو مشورہ دیا کہ وہ لاہور شفٹ ہو جائے اور سب گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ وہاں پر بھائی ثناء اللہ کا آنا جانا بھی آسان ہو جائے گا اور وہ سارے گھر والوں کو کوٹھی کرائے پر لے دیں گے۔ لیکن ذکی جانتا تھا کہ اباجی اتنی بڑی تبدیلی پر راضی نہیں ہوں گے اور نہ ہی ذکی اپنا گھر، علاقہ اور کام چھوڑ کر کہیں جانا چاہتا تھا:

"لازم تھا کہ میری ذات۔ میرا حال میرا مستقبل بھی ہمارے درمیان زیرِ بحث آتا کیونکہ ہمارے ابتلا کے اصل اسباب سے میرے بعد وہی سب سے زیادہ آگاہ تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ "آواز" نے ابھی بھی مجھے فراموش نہیں کیا۔ اور خاص طور پر جب سے کمپیوٹر سینٹر خوب چل نکلا ہے اور لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ مجھ سے سیکھے کچھ نوجوانوں کو نوکریاں بھی ملنی شروع ہو گئی ہیں اور ایک طرح سے میں علاقے کی خدمت ہی کر رہا ہوں۔ مجھے پھر دھمکیاں ملنی شروع ہو گئی ہیں مولوی یاسین نے ایک سے زائد مسجدوں میں علمائے کرام سے یہ کہلوایا ہے کہ یہاں کمپیوٹر سینٹر میں ننگے فوٹو دیکھے جاتے ہیں۔ اس بدمعاشی کے اڈے کو بند کیا جائے ورنہ جس طرح اس کے بھائی کی بدمعاشی بند کی گئی تھی اُسی طرح یہ بھی بند کر دی جائے گی۔"(۹۵)

ذکی کا بھائی اپنے عشق میں ناکامی کے بعد جعلی پیر بن جاتا ہے اس کا کام چل نکلتا ہے۔ یہ سب لوگوں کے اندھے اعتقاد اور مذہب سے بیگانگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ گاؤں کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانا آسان ہوتا ہے۔ ذکی کو فیضان سے دور کرنے کے لیے سالار مذہب کا سہارا لے کر اس کے خلاف فتویٰ لگوا دیتے ہیں۔

نولکھی کوٹھی:

مولوی کرامت کا کردار ناول میں مسجد کے امام کا ہے جو کہ شادی شدہ مرد ہے اور ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔ گاؤں کے لوگ اسی لیے اُس کی عزت کرتے تھے کہ وہ مسجد کا امام ہے اور اس کا بیٹا پورا دن گاؤں میں موجود مختلف گھروں سے جا کر روٹی وغیرہ جمع کرتا تھا۔ مولوی کرامت سے پہلے اس کا پردادا مولوی خدایار اسی مسجد میں امامت کرواتا تھا، خدایار نے ایک سال کسی درس میں لگایا تھا۔ اس وجہ سے کچھ قرآن کی سورتیں یاد ہو گئیں اور نماز بھی آتی تھی، اسی سہارے امامت شروع کر دی خود بخود گاؤں کا مولوی بن بیٹھا اور مسجد کی عملی شکل ترتیب پانے لگی۔ اُس کے مرنے کے بعد مولوی کرامت کا باپ احمد دین جانشین بنا۔ مولوی احمد دین نے اپنے بیٹے کرامت کو ابتدائی قاعدے کے سپارے پڑھا کر درس میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا تاکہ اُن کی نسل میں یہ پیشہ چلتا رہے اور یہ کر کے اُس نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، مولوی کرامت نسل دو نسل یہیں کے ہو کر رہ گئے:

> "مولوی کرامت پچھلے تیس سال سے اس چھوٹے سے گاؤں کی مسجد کا پیش امام تھا۔ گاؤں کیا؟ یہی سو پچاس گھروں کی چھوٹی آبادی تھی۔ پہلے پہل مولوی کرامت کا پردادا خدایار چندہ مانگنے اور گدا گری کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ تب یہ مسجد خالی پڑی تھی۔ اُس نے اسی احاطے میں اپنی گُدڑی جما دی اور نماز پڑھنے لگا۔ گاؤں والے اول اول ترس کھا کر اُسے دو وقت روٹی دے دیتے۔ پھر رفتہ رفتہ دو چار لوگ اور بھی وہاں اُس کی دیکھا دیکھی نماز پڑھنے لگے۔"(۹۶)

ولیم کے بعد ناول میں غلام حیدر کا کردار اہم ہے جس کی سودھا سنگھ سے دشمنی چل رہی ہے کیونکہ اس نے غلام حیدر کے باپ کو قتل کیا ہے۔ گاؤں کی مسجد میں فجر کی نماز کو چھوڑ کر باقی چار نمازوں میں نمازیوں کی تعداد پندرہ بیس سے کبھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ فجر کی نماز میں چالیس پچاس فرد ہر صورت موجود ہوتے تھے۔ یہ اُصول اسی گاؤں کی مسجد کا نہیں تھا بلکہ پنجاب کے جتنے بھی دیہات یا شہر ہیں، وہاں کے نمازیوں کی یہی حالت ہے۔ وہاں کے لوگ صبح کی نماز کو عموماً ترجیح دیتے ہیں اور باقی کو اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ غلام حیدر نے اپنے باپ کے ختم پر نیاز دی اور پھلوں اور چاولوں کی پراتوں کو ریشمی غلافوں سے ڈھانک دیا۔ مولوی صاحب نے قرأت اس قدر سوز سے کی کہ غلام حیدر سمیت تمام لوگ تازہ حادثے کو بھول گئے۔ شام کو غلام حیدر کے سر پر پگڑی باندھی گئی:

> "اِسی عالم میں دو بج گئے۔ صحن میں دور تک دریاں اور چاندیاں بچھ گئیں۔ ختم نیاز کے لیے پھل

اور چاولوں کی پراتیں الگ تھیں۔ جنھیں کاڑھے ہوئے ریشمی غلافوں سے ڈھانک دیا گیا۔ مولوی صاحب بھی آچکے تھے۔ غلام حیدر سامنے بیٹھ گیا تو مولوی نے سورہ الحمد سے تلاوت شروع کی۔ تمام خلقت جو کم سے کم چھ سو کے لگ بھگ تھی، چاندنیوں پر بیٹھ گئی۔ آیات کی تلاوت نے پوری خلقت اور خاص کر غلام حیدر کے دل میں سوز کی کیفیت پیدا کر دی۔"(۹۷)

زیرِ نظر اقتباس میں مسجد میں نمازیوں کی تعداد کے بارے میں بتا کر آگاہ کیا ہے کہ نمازیوں کی تعداد برائے نام ہے۔ مذہب کا استعمال لوگ ایک دوسرے کو نصیحت کی حد تک کرتے ہیں۔ مذہب کے فرائض سے ان کا کوئی واسطہ نہیں مرنے والے کے لیے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پڑھنے سے ہٹ کر کھانے پینے کا زیادہ رواج ہے۔

میر واہ کی راتیں:

نذیر جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے وہ اپنے باپ کی نصیحت پر اپنے چاچے کے پاس آجاتا ہے اور اس کا پیشہ سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ نذیر اپنے گوٹھ میں آوارہ گردی میں مشغول نظر آتا ہے۔ چاچا غفور درزی پیشے سے منسلک ہے نذیر جب اُس کے پاس آتا ہے تو وہ اُسے روز اپنے ساتھ صبح سویرے اپنی دُکان پر لے جاتا ہے۔ ناول میں چاچے کی دُکان کا منظر قاری کے سامنے کچھ اِس انداز میں سامنے آتا ہے۔ نذیر صبح سویرے دُکان پر آتے ہی کرسیوں ، میزوں اور سلائی مشینوں کے نیچے سے کچرا صاف کرتا ہے۔ وہ لیروں، دھاگوں اور بیڑی کے ٹکڑوں کو جمع کرنے کے بعد اخبار سے سب چیزوں کو سمیٹ کر اخبار کو دُکان سے باہر پھینک دیتا ہے۔ نذیر کے ساتھ چاچا کی دکان پر یعقوب کاریگر بھی صفائی کرتا ہے۔ یعقوب کاریگر بیڑی ختم کرنے کے بعد اگر بتی جلاتا ہے، یعقوب کے لیے دکان کھولتے ہی اگر بتی جلانا ایک مقدس رسم کی طرح تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کی خوشبو سے دُکان پر پڑنے والا ہر قسم کے شر کا سایہ چھٹ جاتا ہے۔ یعقوب کاریگر روز ہی اگر بتی کو میز کے کاؤنٹر اور دوسری طرف دیوار کے رخنے میں اٹکا دیتا ہے:

"یعقوب کاریگر آستینیں چڑھاتا دکان میں داخل ہوا اور اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں کرسی پر سکیڑ لیں اور مزے سے بیڑی کے کش لیتا رہا۔ بیڑی ختم ہونے پر اس نے اسے چپل کے نیچے مَسل دیا۔ اس کے بعد میز کی دراز سے اگر بتّی کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے دو اگر بتیاں نکال کر اس نے دیا سلائی کی مدد سے جلائیں، پھر زور سے پھونک مار کر اس نے اگر بتیوں کے شعلے کو بجھایا اور ان کے خوشبو دار دھویں میں لمبے سانس بھرنے لگا۔"(۹۸)

نذیر کی ملاقات شمیم سے ایک ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی، وہ اُسے ڈھونڈتا ہوا ان کے گوٹھ تک آ گیا اور اس کے ہمسائے نورل کے ذریعے وہ اُس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نذیر کے لیے اگرچہ اُس تک پہنچنا مشکل کام تھا لیکن شمیم بھی نذیر سے ملنا چاہتی ہے اور اُس کے لیے بھی یہ آسان کام نہ تھا۔ نورل سے نذیر کی دوستی ہو جاتی ہے اور نورل اُسے اپنی اندھی عقیدت کے جوش میں چند روز پہلے رونما ہونے والے معجزے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے چہرے پر نور ہی نور ملا تھا اور اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ سیہون شریف کے بعد اب سیٹھار جہ اور پیروسن میں بھی امام عالی مقام کی شبیہ نظر آئی ہے، اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے:

"نورل جوگی اپنی اندھی عقیدت کے جوش میں چند روز پیشتر گردونواح میں رونما ہونے والے ایک معجزے کا ذکر کرنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ معجزہ قیامت کے نزدیک آنے کی علامت تھا۔ وہ جوشِ عقیدت سے کہہ رہا تھا، "ہم ظالم لوگ ہیں، ظالم لوگ! سادات خاندان کے معصومین پر ہونے والے جبر کو چپ چاپ سہہ گئے۔ ہم باطل کی آواز ملاتے رہے۔ پہلے سیہون شریف میں سیاہ عَلم پر حضرت امام حسین کا سر دکھائی دیا ہے۔"(۹۹)

اس اقتباس میں نورل کے کردار کے ذریعے گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کی اندھی عقیدت کو واضح کیا گیا ہے کہ کیسے وہ سنی سنائی باتوں کے ذریعے فوراً یقین لے آتے ہیں اور جھوٹے پیر ان کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھا کر مال سمیٹتے ہیں۔

کوہِ گراں:

عرس کے دنوں میں عارضی طور پر ہوٹل شامیانوں اور قناتوں سے کھڑے کیے جاتے وہاں بھی کھانے والوں کا رش نظر آتا تھا۔ اِن دنوں میں کھانے کی چیزیں بیچنے والے بھی ٹھیلے لگا لیتے تھے اور اُن پر کافی رش بھی دیکھنے کو ملتا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی رات میں گاؤں کے باہر گانے والے اور گانے والیاں اپنی اپنی ٹولیاں بنا لیتے تھے، اُن کی وجہ سے جیسے میلے کو ٹانگیں لگ جاتی تھی اور یہ سلسلہ صبح تک چلتا تھا۔ بھڑی شاہ رحمان میں حضرت شاہ رحمان نوشاہی قلندری کا سالانہ عرس ہوتا تھا جو اُن کے عقیدت مندوں کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں قوال، صوفیانہ کلام گانے والے، سرکس، بازارِ حسن کی گانے والیاں، تھیٹر، عوامی اور لوک گائیک، کھانے پینے کی دُکانیں اور کُرتب دکھانے والے آتے۔ یہ سب ٹرکوں، ریڑھیوں، بیل گاڑیوں اور

کاروں میں پہنچ کر اپنے ٹھکانے قائم کرتے تھے۔ عقیدت مند میلہ دیکھنے گھوڑوں، تانگوں، بیل گاڑیوں اور بسوں میں آتے تھے اور مزار کے احاطے میں صوفیانہ کلام کے ساتھ ساتھ قوالیاں گائی جاتی تھیں:

"بھڑی شاہ رحمان کا قدیم نام رنگن پور تھا۔ اُس کے ویران ہونے کے بعد اُسے رنگن پور والا تھے کہنے لگے۔ غیر آباد جگہ کو پنجابی میں بھڑ کہتے ہیں۔ جب یہاں دوبارہ آبادی ہوئی تو اِسے بھڑی کہنے لگے اور بعد میں حضرت شاہ رحمان نوشاہی قلندری کے طفیل اِس گاؤں کو بھڑی شاہ رحمان کے نام سے جانا جانے لگا۔ حضرت شاہ رحمان نوشاہی قلندری کا سالانہ عرس عقیدت مندوں کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔"(۱۰۰)

زیرِ نظر اقتباس میں بھڑی شاہ رحمان کے گاؤں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کا نام کیسے پڑا اور عُرس اپنے عقیدت مندوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بازارِ حسن کی گانے والیوں، تھیٹر اور لوک گائیکی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں لیکن عقیدت منداس کو بھی عرس کا لازم اور ملزوم حصہ تصور کرتے ہیں اور عرس کو مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں۔

دشتِ وفا:

خورشید جو کہ قاضی اور نجیب کا دوست ہے، وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد تینوں دن مرنے کے بعد کی رُسومات کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اُس کے دوست اُس کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ اگر تمھارے والد اپنے سوئم کا شاندار کھانا کھاتے تو بہت خوش ہوتے اور اتنے لوگوں کو اپنے لیے سپارہ پڑھتے دیکھ کر اُن کو دِلی خوشی ہوتی۔ قاضی نے بھی خورشید کو مذاق بھرے انداز میں کہا کہ آہ اگر حاجی غلام مرتضٰی اپنے مرنے کا شاندار کھانا کھاتے تو وہ کتنا خوش ہوتے اُس کی بات پر باقی تمام دوست بھی ہنسنے لگے۔ رات میں دوست فرح ہوٹل میں بیٹھے کافی پی رہے ہوتے اور اُن کی آپس کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ خورشید نے اپنے باپ کو خود مارا ہے۔ خورشید کی دو تین لڑکیاں جو دوست تھی وہ بھی اُس کو دلاسہ دینے ایک ساتھ اُس کے گھر میں آگئی اور تعزیت کے لیے آنے والوں کی وجہ سے اُس نے تین دن سے شراب نہیں پی:

"مگر گوشت کچھ سخت رہ گیا ہے، میرے باپ کے دانت نقلی تھے۔ مزید خفا ہوتے"، بناء پیئے خورشید جی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے تین روز کسی نہ کسی طرح اس نے نیند کی گولیاں کھاتے گزار دیئے، اتنے لوگ فاتحہ کے لیے آرہے تھے۔ انفرادی طور پر خورشید سے گلے مل کر تسلی دیتے ہوئے اگر شراب کے بھبھکے محسوس ہوتے تو کافی سبکی ہوتی۔"(۱۰۱)

رُخسانہ جو کہ ناول کی ہیروئن ہے وہ قاضی کے بعد نجیب کے پیار میں صرف اس کی دولت کے لیے گرفتار ہوئی ہے، کیونکہ اس کے سامنے بہتر مستقبل کے خواب ہیں جنہیں وہ ہر حال میں پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہے۔ رُخسانہ نے نجیب کے ساتھ جینے مرنے کی بہت سی باتیں کی، اس نے بتایا کہ وہ قاضی کو محض ہمدرد دوست سمجھتی تھی۔ رُخسانہ نجیب کو مزید بتاتی ہے کہ وہ قاضی کو دوست سے زیادہ کچھ بھی نہیں سمجھتی وہی اُس سے شادی کے لیے سنجیدہ ہوا پھرتا ہے۔ رُخسانہ کو یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں نجیب قاضی کی باتوں میں نہ آجائے اور اُس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ رُخسانہ نجیب کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہتی ہے کہ میں تمھیں کھونا نہیں چاہتی ہم دونوں دوست بن کر بھی تو رہ سکتے ہیں۔ کیا شادی کرنا بہت ضروری ہے نجیب اُسے کہتا ہے کہ شادی معاشرے کا اجازت نامہ ہے۔ نجیب رُخسانہ سے بناء غرض کے محبت کرتا ہے اور اپنی محبت کو معاشرے میں ایک نام دینا چاہتا ہے، لیکن رُخسانہ ہمیشہ نجیب کی اِس بات کو ٹال دیتی ہے کیونکہ وہ صرف اپنے خوابوں کی تکمیل چاہتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سب چیزیں ہمارے مذہب کے خلاف بھی ہیں کہ مرد عورت بنا کسی جائز رشتے کے ایسے کھلم کھلا ملیں۔ جبکہ آج کل کے معاشرے میں یہ بیماری بڑھتی جارہی ہے ناول میں اِس کی مثال رُخسانہ کا کردار ہے:

> "میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کیوں نہ ہم صرف دوست رہیں ایک ساتھ اور ساتھ ساتھ۔ شادی بہت ضروری ہے کیا؟"
>
> "نہیں یہ ایک رسم ہے۔ جس لڑکی پہ یہ لیبل لگ جائے پھر اس کے لیے کھلم کھلا چھپنا چھپٹی نہیں ہوا کرتی۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا یہی تو ایک طریقہ ہے۔ شادی دراصل معاشرے کا اجازت نامہ ہے بیوی یوں ہے جیسے ممنوعہ بور کا لائسنس یافتہ اسلحہ جسے ہر وقت ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ میں تمہارا لائسنس حاصل کرنا چاہتا ہوں میں اپنی تکمیل چاہتا ہوں۔"[۱۰۲]

رخسانہ کا کردار ایک لالچی عورت کے طور پر سامنے آتا ہے جو مردوں سے دوستی کر کے فائدے اٹھاتی ہے نجیب کی دولت حاصل کرنے کے لیے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ نجیب جب اسے شادی کرنے کا کہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہم شادی کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔ یہ سب مذہب سے دوری ہی کی وجہ سے ہے۔ خورشید کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں وہ شراب کا رسیا ہے لیکن اپنے باپ کے مرنے کے بعد وہ تین دن ختم کا اہتمام کرتا ہے اور شاندار کھانے پکواتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں والدین کی زندگی میں اگر اُن کی قدر نہ بھی کی جائے تو مذہب کی آڑ لے کر اپنا نام اونچا رکھنے کے لیے نذرونیاز کا اہتمام کیا جاتا

ہے۔دوسری طرف رخسانہ نجیب کے پیار میں اس کی دولت کی خاطر گرفتار ہوتی ہے۔ نجیب بھی دوستی کو برا تصور نہیں کرتا لیکن رخسانہ نکاح کے لیے تیار نہیں ہوتی وہ سمجھتی ہے کہ نکاح کے بغیر بھی تعلق استوار ہو سکتا ہے۔ نجیب بھی مذہب کا سہارا صرف اپنی پسندیدہ عورت کو حاصل کرنے کے لیے لیتا ہے۔

ادھ ادھورے لوگ:

بہار کی آمد آتے ہی میلوں ٹھیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا،لوگ بہت دور دور سے ہر سال میلوں میں آتے تھے۔میلے کا سلسلہ ہر سال دیکھنے کو ملتا تھا، گاؤں کے لوگ پیروں پر بہت یقین رکھتے تھے۔ چنن پیر کے میلے کی رُت آتے ہی ہر طرف رُونق لگ جاتی ،اُس دن ڈیرہ نواب صاحب کے بازار کی آدھی سے زیادہ دُکانیں بند ہو جاتی تھیں۔فیاض کے ابا، چچازاد اور خالہ زاد صبح سویرے چنن پیر چلے گئے لیکن فیاض کسی کے کہنے پر بھی اُن کے ساتھ نہیں گیا تھا۔فیاض کے حافظے سے یہ بات نکل گئی تھی وہ تو بازار کی حالت دیکھ کر خیال آیا اور وہ سر پکڑ کر رہ گیا کہ اُس کے حافظے کو کیا ہو گیا ہے۔میلہ دیکھنے کے شوقین افراد اونٹوں کی طویل قطاریں بنا کر چلتے اور جہاں کوئی کھلا میدان نظر آتا وہاں ڈیرہ لگا لیتے۔میلے کے دنوں میں ہر ایک کے چہرے پر خوشی عیاں ہوتی تھی اور ہر طرف جشن کا سماں ہوتا تھا۔ریاست بہاول پور کے قلب احمد پور میں بہار کی آمد کے ساتھ ہی میلوں ٹھیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا جن میں سے تین میلے بہت ہی خاص ہوتے تھے:

> "اُس دن کچھ عجیب ہوا۔ صبح سویرے نہیں بلکہ دن چڑھے تک بھی ڈیرہ نواب صاحب کے بازار کی آدھی سے زیادہ دوکانیں بند تھیں۔واد ھونہ دھچرا اور نہ ہی خیسا تماخوں والا۔یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی دیو پھر گیا ہو بازار میں۔ کسی نے بتایا کہ اِس بار روہی میں چنن پیر کے میلے کا پانچواں جمعہ ہے اور سبھی لوگ جمعرات کی صبح ہوتے ہی ٹولیوں کی صورت میں روہی کی جانب روانہ ہو چکے ہیں اِس لیے کہ میلے کا عروج پانچویں جمعہ کو ہوا کرتا ہے۔"(۱۰۳)

گاؤں کے سادہ لوح عوام پیروں پر اس قدر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ چنن پیر کے میلے کی رُت آتے ہی تمام کاروبار بند ہو جاتے اور ہر طرف ہو کا عالم ہوتا میلے میں شرکت کو لازمی تصور کیا جاتا۔

چار درویش اور ایک کچھوا:

ناول میں صادق بھائی کا کردار زرینہ کے شوہر کا ہے جو کہ مزارات کو بہت پسند کرتے ہیں اور مزاروں وغیرہ پر جاتے رہتے ہیں۔ناول میں اس طرح کی مثالیں مختلف مواقع پر ملتی ہیں جہاں صادق بھائی کسی

نہ کسی مزار پر نظر آتے ہیں۔ زرینہ جاوید کو بتاتی ہے کہ اُسے منگھو پیر میں حضرت سخی سلطان منگھو پیر کا مزار بہت پسند ہے۔اِس کے علاوہ بلوچستان میں جیئے شاہ نورانی اور لاہوت لامکان کے مزاروں پر جاتا رہتا ہے۔ ایک صبح صادق اپنی موٹر سائیکل پر نکلتا ہے تو جاوید اُس کا پیچھا کرتا ہے اُس کو لگتا ہے کہ صادق بابا عالم شاہ بخاری کے مزار پر جارہا ہے۔ رش کم ہونے کی وجہ سے صادق بھائی اُسے جلد ہی نظر آجاتے ہیں، جس عمارت کے سامنے وہ رُکتا ہے وہاں پر مائی کا تازیہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ عجیب جگہ تھی، جہاں سے دس محرم کو مائی اپنا تعزیہ نکالتی ہے اور ہری پگڑی والوں نے اپنے ہرے جھنڈے بھی لگا رکھے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ جگہ اصل میں ایک مندر تھی اور اس کے بیچوں بیچ شیو جی کا لنگم بھی دھرا تھا:

"صادق بھائی اکثر صبح سویرے گھر سے نکل کر کسی مزار کا رُخ کرتے اور وہاں تادیر بیٹھے رہتے۔ اس سلسلے میں کراچی کے کئی مزار ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ ان میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے علاوہ جاوید اقبال نے انھیں جامع کلاتھ پر بابا عالم شاہ بخاری کے مزار اور کارساز کے قریب پیر بخاری کے مزار پر جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔"[۱۰۴]

زرینہ کا شوہر صادق مزارات سے بہت عقیدت رکھتا ہے وہ مائی کا تازیہ پر جاتا ہے جو کہ اصل میں ایک مندر کی جگہ ہے۔ یہ سب مذہب سے دوری ہی کی وجہ سے ہے کہ اللہ سے مانگنے کی بجائے انسان ہر در سے مانگے۔

پانی مر رہا ہے:

گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کا پیروں، فقیروں پر بہت یقین تھا۔ اور پیر کی نیاز بہت اہتمام سے دلوائی جاتی اگر گھر میں کچھ کھانے کو نہ ہوتا تو مانگ تانگ کر نیاز کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ناول میں مینے کا کردار باؤ اسرار کے بھائی کا ہے۔ مینے کی بیوی شاماں اپنے سسرال والوں کا ایک بیٹی کی طرح خیال رکھتی ہے۔ گاؤں کے لوگ بھوریوں کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ ابا اور مینہ بھوریوں کی طرف گئے تھے اور واپسی پر مینے نے کچھ عجیب مناظر دیکھے اور رات مینہ ڈر بھی گیا تھا۔ جب یہ سب باتیں شاماں کو معلوم ہوئیں تو اُس نے پورا دن نیاز کی تیاری کرتے ہوئے گزار دی کیونکہ آج گھر میں بڑے پیر کی نیاز تھی۔ اُس کے بڑوں کا اعتقاد تھا کہ نذر و نیاز سے بلائیں اور آفات دُور ہو جاتیں ہیں۔ رات سوتے وقت مینے کے دل میں بہت سے سوالات تھے، جیسے ننھے ننھے سنپولئے کلبلاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ شاماں نے پیر کی نیاز اِسی لیے دلوائی کہ اُس کے گھر سے بُری بلائیں اور آفات دور رہیں:

"شاماں نے آج بڑے پیر کی نیاز دلوائی تھی۔ صبح سے نیاز کا سامان منگانے، نیاز پکانے اور برتانے میں اتنی مصروف تھی کہ مینا کب گیا اور کب آیا اسے علم ہی نہ ہو سکا۔ ڈھلتی راتوں کا چاند جو دن بھر آسمان پہ کہیں ٹنگا، نظر سے پوشیدہ رہا تھا، اب بکائنوں کے اوپر چمک رہا تھا۔"(۱۰۵)

راہ خدا میں خرچ کرنے کی بجائے گاؤں کے سادہ لوح لوگ پیروں، فقیروں کی نیازیں اہتمام سے دلواتے نظر آتے ہیں۔ جس کے لیے وہ مانگنے تانگنے میں بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔

گل مینہ:

گھر سے بھاگنے کے بعد گُل مینہ اور زرجان راستے میں گزرتے ہوئے ایک مزار کے پاس سے گزرے جو کہ شاہ بلوط کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ گُل مینہ کو وہ وقت یاد آجاتا ہے جب وہ اپنی ماں کے ساتھ قبر پر منت مانگنے آتی تھیں۔ گھر سے بھاگنے کے بعد وہ خوفزدہ تھی کہ جانے آنے والی زندگی کیسی گزرے گی، کہیں زرجان اُسے گھر سے بھاگنے کے طعنے ہی نہ دیتا رہے۔ شیر مل چوٹی بھی شاہ بلوط کے درختوں سے گھری ہوئی تھی، میدان کے بیچ میں شاہ بلوط کا ایک صدیوں پرانا درخت موجود تھا جس کی شاخیں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی جس کو دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لنگڑا دیو کھڑا ہو۔ اِسی اثناء میں اُن کا گزر اُسی مقام سے ہوتا ہے اور اُس کے دل میں خیال آتا ہے کہ وہ دونوں مزار پر رُک کر اپنے اچھے مستقبل کے لیے دُعا مانگیں۔ لیکن گُل مینہ کسی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیتی ہے۔:

"اس پیڑ کے عین نیچے پست دیواروں والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے اندر نور پیر بابا کی کئی گز لمبی قبر تھی۔ گل مینہ جب چھوٹی سی تھی تو ایک بار اپنی ماں اور گاؤں کی چند دوسری عورتوں کے ساتھ قبر پر منت مانگنے اور شاہ بلوط کی شاخوں پر رنگ برنگے کپڑے کی جھنڈیاں باندھنے آئی تھی۔ مزار کا احاطہ ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا اور مشہور تھا کہ رات کو شیر آکر اپنی دموں سے یہاں جھاڑو دیتے ہیں۔"(۱۰۶)

گل مینہ کو زرجانان احمد شاہ ابدالی کا مزار دکھانے کے لیے لے جاتا ہے عمارت کے ہر طرف خوبصورت ٹائیلیں لگی تھیں کہ اُن پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ گُل مینہ نے ایسی عمارتیں تصویروں میں تو ضرور دیکھی تھیں لیکن کبھی سامنے ایسی عمارت نہیں دیکھی تھی جو اس قدر خوبصورت اور پروقار ہو۔ اُس کے بعد وہ قریب ہی واقع خانقاہ خرقہ شریف دیکھنے جاتے ہیں تو اُس کی آنکھیں عقیدت سے بھیگ جاتی ہیں۔ گُل مینہ یہ

سنتے ہی زر جان سے اندر چلنے کو کہتی ہے کہ چلو، اندر چل کر اس کی زیارت کرتے ہیں، اس نے فوراً ہی زر جان سے اُس کی فرمائش کر ڈالی:

> "زر جان گل مینہ کو احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ دکھانے لے گیا۔ گل مینہ نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ احمد شاہ ابدالی افغانستان کے بانی ہیں اور سرحد کے دونوں اطراف کے پشتون عقیدت سے انھیں بابا ابدالی کہتے ہیں۔ گل مینہ کو فیروزی گنبد والی ہشت پہلو عمارت نہایت پسند آئی جس کے ہر پہلو پر ایک بلند مینار ایستادہ تھا اور ہر مینار کی چوٹی پر مرکزی گنبد جیسا مگر اس سے کہیں چھوٹا گنبد یوں نصب تھا جیسے انھوں نے اپنے سروں پر خوشنما پگڑیاں باندھ رکھی ہوں۔"(۱۰۷)

زیرِ نظر اقتباس میں زر جان اور گُل مینہ کی مزاروں اور خانقاہوں سے عقیدت دیکھی جا سکتی ہے یہ عقیدت اُن کی اولیا کی وجہ سے ہے جو یہاں مدفن ہیں۔ وہ ان مزارات پر دعائیں بھی مانگتے ہیں۔

گراں:

آج جب کہ ہم اتنی ترقی کر چکے ہیں پھر بھی ہم لوگ مزاروں، پیروں فقیروں سے باہر نہیں نکلے آج بھی کوئی مشکل ہو تو لوگ مزاروں اور پیروں فقیروں کا رخ کرتے ہیں۔ لوگ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں یہی حال گراں کے لوگوں کا بھی ہے۔ ہر پہاڑی پر برگد کے درخت کے نیچے ایک مزار تھا جہاں لوگ چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانتے۔ گراں کے لوگوں کی زندگی میں مزاروں اور قبرستانوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انکل NZD غزل جان کو اپنی زندگی کے مذہبی پہلو سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے کیرن سے مسجد میں بھی نکاح کیا اور چرچ میں جا کر بھی شادی کی۔ اللہ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ایک ہی مذہب اُتارا ہے جس کی بنیاد فلاح اور نجات ہے۔ تمام خدائی کتابیں بھی ایک ہی درس دیتی ہیں یہ بندوں کا بنایا ہوا فرق ہے۔ ایسا ہم دونوں کا خیال تھا نہ میں نے کبھی قرآن پڑھا اور نہ کبھی کیرن نے بائبل پڑھی۔ الماری میں قرآن اور بائبل ایک دوسرے کے اوپر نیچے پڑے تھے۔ اُس کی ترتیب میں اور کیرن تبدیل کرتے رہتے تھے اور اُنھوں نے اپنے بچوں کو بھی فطرت کے سُپرد کر دیا کہ جو چاہے مذہب اپنائیں:

> "شادی چرچ میں عیسائی رواج کے مطابق ہوئی۔ ویسے بھی تمام مذاہب کی بنیاد تو ایک ہی ہے۔ مذہب الہامی ہے یہ رسومات تو زمینی اور انسانی ہیں تو ہر معاشرے نے اپنے جغرافیائی ماحول کے تحت خود کو کچھ رواجوں میں پابند کر لیا ہے۔ شادی جس طریقے سے ہو مقصد تو دو افراد کا ملاپ ہے۔ وہی ایک خدا وہی پیغمبر اور الہامی کتابیں، کوئی کسی سلسلے، کسی کڑی پر مطمئن ہو گیا کوئی اخیر تک جا کر مطمئن

ہوا۔ وہی اصل یعنی نیکی اور عبادات کا تصور۔ ہم دونوں خلقِ خدا کو نبیوں پیغمبروں کے ناموں میں تقسیم کرنے کے قائل نہ تھے۔"(۱۰۸)

زیر نظر اقتباس میں انکل این۔ زیڈ۔ ڈی غزل جان کو اپنی زندگی کے مذہبی پہلو کے بارے میں بتاتے ہیں کہ شادی کسی بھی طرح سے ہو ہے تو دو روحوں کا ملاپ۔ انکل ایک ایسا کردار ہے جو غیر ملک میں جا کر غیر مذہب کی عورت سے شادی کر کے مذہبی شناخت کھو بیٹھتے ہیں ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انکل کی اولاد بھی اس کشمکش میں کوئی مذہب نہیں اپنا سکتی کیونکہ ان کے والدین میں سے کوئی ایک بھی اپنے مذہب پر کار بند نہیں ۔زیرِ تحقیق ناولوں میں سیاست، تعلیم اور مذہب پر بحث ہوئی ہے۔امن و امان کی خراب صورتحال کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ دہشتگردی میں گھروں کے اُجڑنے کے دُکھ کو بہت دلکش پیرائے میں ناول نگاروں نے بیان کیا ہے۔ دوسری طرف مذہب پر بھی جدید تہذیب کے اثرات بیان کیے ہیں کہ کیسے ایک ہی مذہب کے ماننے والے مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ہر شخص انگریزی تعلیم کے حصول میں سر گرداں نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ادب کلچر اور مسائل (پاکستانی ثقافت کے مسائل)، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۲، ص:۳۲۶

۲۔ ایضاً، ص:۳۲۶

۳۔ قاضی افضال حسین، ہماری ثقافت اورادب، مشمولہ "بازیافت" (سالنامہ) شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ،۲۰۱۶ء، ص:۶۷

۴۔ قومی انگریزی اردو لغت، موئلف ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، طبع اوّل، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص۱۵۱۱

۵۔ فرہنگِ تلفظ، مرتبہ شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان، طبع سوم، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص۶۴۸

۶۔ جامع علمی اردو لغت، موئلف وارث سرہندی، علمی کتاب خانہ لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۳ء، ص۹۳۶

۷۔ فرہنگ آصفیہ، مرتبہ: مولوی سید احمد دہلوی، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ لاہور بار اوّل، ۱۹۸۶ء، ص۱۴

۸۔ ارسطو، سیاسیات ارسطو"، (مترجم) سیّد نذیر نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۵۰

۹۔ ڈیگارٹس بحوالہ اسلام سندیلوی، ماحول اور مزاج، سفینۂ ادب، لاہور، س۔ن، ص۱۴۹

۱۰۔ http://www.wikipedia.org

۱۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، بحوالہ، معاصر ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۳۲

۱۲۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ادب اور نفی (مضامین)، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۹

۱۳۔ قمر رئیس، پروفیسر/عاشور کاظمی، سیّد (مرتبین)، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۲

۱۴۔ مقصود جعفری، ڈاکٹر، چراغِ افکار، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء، ص۶۹

۱۵۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۶۷۹

۱۶۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص۱۷۳

۱۷۔ ایضاً، ص۴۹۵

۱۸۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، جولائی ۲۰۱۰ء، ص۳۱۵

۱۹۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۳۴۲

۲۰۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص۳۵

۲۱۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۲۴

۲۲۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۸۶، ۸۷

۲۳۔ ایضاً، ص۱۵۹

۲۴۔ آغا گل، دشتِ وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۲۵۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۸۔۲۰۹

۲۶۔ کاشف رضا، سیّد چار درویش اور ایک کچھوا، مکتبہ دانیال پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۲۸۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفصیل ناشران و تاجرانِ کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، ص ۱۱۱

۲۹۔ زیف سیّد، گل مینہ، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۹۴۔ ۳۹۳

۳۱۔ طاہرہ اقبال، گراں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۹۵

۳۲۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، تعلیم کے بنیادی مباحث، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳

۳۳۔ سلامت اللہ، ڈاکٹر، تعلیم، فلسفہ اور سماج، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، مئی ۱۹۷۴ء، ص ۴۳۔ ۴۲

۳۴۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر، پاکستان میں تعلیم تحقیقی جائزہ، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۵۲

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۵۴

۳۶۔ عثمان محمد، پروفیسر، اسلام پاکستان میں، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۰۸

۳۷۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، ص ۲۰۸

۳۸۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۷۵

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۱۸

۴۰۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۸۷

۴۱۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۱۱

۴۲۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۳۴

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۴۴۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۵۴

۴۵۔ ایضاً، ص ۶۶

۴۶۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۱۰

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۴۸۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۱۲۳

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۵۰۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۲۱۰

۵۱۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۹۵

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۵۳۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۶۸

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۱۸

۵۵۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۳۳

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۵۷۔ شاہد وہاب، خان، اُردو فکشن میں ہجرت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۲۰، ۲۱

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۹۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۲۲۹

۶۰۔ ایضاً، ص ۳۴۹۔۳۴۸

۶۱۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۱۷۵

۶۲۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۱۹۔۱۸

۶۳۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۲۴

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۵۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام، ص ۵۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۶۷۔ رفاقت حیات، میرواہ کی راتیں، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء ص ۴۳۔۴۲

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۶۹۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۹۸

۷۰۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۸۹

۷۱۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۱۳۲

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔ ۱۳۴

۷۳۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۴

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۷۵۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۲۵۸

۷۶۔ ایضاً، ص ۳۱۵

۷۷۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۱۰۰

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۷۹۔ نور الحسن نیرّ، مولوی، نور اللّغات (دوئم)، نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۰۰

۸۰۔ فیروز الدین، الحاج مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۲۳

۸۱۔ محمد امین بھٹی (مرحوم) الحاج، اظہر اللّغات، عربی سے اردو، فارسی سے اردو، اظہر پبلشرز، لاہور، س ن، ص ۶۹۴

۸۲۔ نجیب رامپوری، نئی اردو لغت، (جامع) ملک بک ڈپو، اردو بازار، لاہور، س ن، ص ۸۷۲

۸۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۶۷

۸۴۔ وارث سرہندی، مولّف، قاموسِ مترادفات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۹۸۱

۸۵۔ سیف الدین بوہرہ، زمین انسان اور مذہب، مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵۹

۸۶۔ وحید الدین خان، مولانا، مذہب اور سائنس، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۸۷

۸۷۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، بشریات مذہب، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۶۷

۸۸۔ ولیم جیمز، نفسیاتِ وارداتِ روحانی، مترجم، خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۷

۸۹۔ ایڈون اے برٹ، مولّف، فلسفہ مذہب، مترجم، بشیر احمد ڈار، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵۴

۹۰۔ امورر نجن مہاپتر، فلسفہ مذاہب، ترجمہ یاسر جواد، فکشن ہاؤس، ۱۸۔ مزرنگ روڈ لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵

۹۱۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۱۰

۹۲۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۹۳۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، ص ۲۳۶

۹۴۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، ص ۲۲۷، ۲۲۸

۹۵۔ ایضاً، ص ۳۸۲

۹۶۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۱۲

۹۷۔ ایضاً، ص ۴۲

۹۸۔ رفاقت حیات، میر واہ کی راتیں، ص ۲۰۔۱۹

۹۹۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۰۰۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، ص ۱۵

۱۰۱۔ آغا گل، دشتِ وفا، ص ۱۲۔۱۱

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۰۳۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص ۶۸

۱۰۴۔ کاشف رضا سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، ص ۳۵

۱۰۵۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، ص ۲۱

۱۰۶۔ زیف سیّد، گل مینہ، ص ۱۹

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۰۸۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۱۹۸

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

ناول نگار اپنے تجربات اور مشاہدات سے وہ حقائق بیان کرتا ہے جو انسانی زندگی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ناول میں زندگی کی توانائی موجود ہوتی ہے،ناول انسانی معاشرے کی عکاسی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی سطحی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔اگر ناول میں انسانی زندگی کی ترجمانی نہ ہو تو ناول کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ناول قصّہ نگاری کی ترقی یافتہ شکل ہے، ناول میں انسان کرداروں کی حیثیت سے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ناول میں کردار نگاری کے فن کا تعلق معاشرتی و سماجی زندگی سے ہوتا ہے۔معاشرے میں بہت سی نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد موجود ہوتے ہیں۔اُردو ادب کے حوالے سے داستان کے بعد ناول نے موجودہ معاشرے کے خدوخال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ارتقائی سفر میں افرادِ معاشرہ کی داخلی کیفیات اور پیچیدہ رویوں کی گرہ کشائی بھی کی ہے۔ادیب معاشرے کا سب سے زیادہ حساس فرد ہوتا ہے وہ اپنے اردگرد تمام تبدیلیوں اور مسائل کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور ان تمام مسائل کو اپنے کرداروں کے ذریعے منظرِ عام پر لے کر آتا ہے۔دُنیا کا کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے سے الگ رہ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔

اُردو ناول کے ابتدائی دور سے ہی ثقافتی صورتحال کی عکاسی بہت طاقت کے ساتھ اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔نذیر احمد ہوں یا سرشار، رسوا ہوں یا پریم چند ہر ناول نگار کے ہاں ثقافتی عناصر کی عکاسی نمایاں طور پر بیان ہوئی ہے۔تقریباً ایک صدی سے زائد کے سفر میں ناول میں ثقافتی سطح پر تبدیلیاں ہوتی نظر آتی ہیں۔ادیب معاشرے کا انتہائی باشعور، حساس اور وسیع ذہنیت کا حامل فرد ہوتا ہے۔ادیب کسی بھی معاشرے کا چہرہ تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ثقافت ہی دراصل کسی معاشرے کا اصل چہرہ ہوتا ہے، ثقافت سے ہمیں اُس معاشرے میں موجود رسم و رواج، رہن سہن اور لوگوں کی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔

معاشرتی حوالے سے یہ سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کہ کوئی بھی سماج محض افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہوتا بلکہ اگر معنوی وسعت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ رابطے اور تعلق کا وہ جوڑ ہے جو بہت سے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھتا ہے۔اُردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز ایسے عہد میں ہوا جب برصغیر

میں سیاسی سطح پر بڑا انقلاب نمودار ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستان میں خارجی ماحول میں نمایاں حد تک تبدیلی آچکی تھی۔ مسلم اقتدار کا خاتمہ اور برطانوی اقتدار کا تسلط حکومتوں کی تبدیلی نہ تھی بلکہ اس نئے غیر ملکی نظام کے قائم کردہ نئے معاشی رشتوں اور سائنسی علوم و ایجادات کے تعارف کے باعث پرانے رویئے نئی اقدار سے متصادم ہو رہے تھے اور برسوں سے اپنے معیارات قائم کرتی ایک تہذیب کے خارجی اور باطنی سطح پر اپنی شناخت قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس موڑ پر مسلم معاشرے کی رہنمائی کے لیے سرسید تحریک منظر عام پر آئی۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو علمی، دینی اور اقتصادی سطح پر نئے تقاضوں سے روشناس کرایا۔ تہذیب الاخلاق کا اجرا اور علی گڑھ کالج کا قیام انھی مقاصد کا پیش خیمہ ہیں۔ چنانچہ اس دور میں اصلاحی اور عقلی روئیوں کے فروغ نے ادیبوں میں زندگی کو ایک نئے انداز اور تناظر میں دیکھنے پر مجبور کیا۔ جس کے باعث یہاں سے ادب میں کچھ نئے اسالیبِ بیان اور نئی ہیئتوں کا تصور اُبھرا۔ یہ اردو ناول کا آغاز تھا، نذیر احمد نے سرسید تحریک کے اس مشن کو فروغ ناول کے ذریعے دیا۔ ان کے فن کی تمام تر اساس اجتماعی مقصدیت پر قائم تھی۔ انھوں نے سماجی مسائل کو ناولوں میں بنیاد بنا کر معاشرے پر تنقید اور تعمیر کی بنیاد قائم کی، یہی وجہ ہے کہ آغاز ہی سے اردو ناول میں معاشرتی اصلاح کا رجحان غالب رہا ہے۔ مولوی نذیر احمد، عبد الحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا اور علامہ راشد الخیری کے ناول اسی پس منظر میں اپنی پہچان آپ ہیں۔

مولوی نذیر احمد نے اردو ناول کی کہانی کو مافوق الفطرت عناصر اور غیر حقیقی مناظر کی تصویر کشی سے نکال کر زندگی کے حقائق سے جوڑا۔ غرض ان کے ناول "مراۃ العروس"، "بنات النعش"، "توبتہ النصوح"، "ابن الوقت" اور "فسانہ مبتلا" ایسے ناول ہیں جو مختلف سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسِ انسانی کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام ہے۔ ان کے ناول "فسانہ آزاد" کے دو اہم کردار خوجی اور آزاد ہیں جو اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت اور روزمرہ زندگی میں زوال آشنا معاشرے کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ سرشار کے بعد عبد الحلیم شرر نے سماج کو تاریخ کے آئینوں میں دیکھا اور موجود منظرنامے کو ناموجود سے ملانے کی کوشش کی۔ لیکن عبد الحلیم شرر کے معاشرتی ناولوں میں اس عہد کا سماج اور اس کے مسائل کی واضح طور پر عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے بعد مرزا ہادی رسوا نے "امراؤ جان ادا" لکھ کر اردو ناول کو ایک نیا موڑ دیا۔ فنی اور فکری لحاظ سے یہ ناول نہایت عمدہ ناول ہے جس میں اودھ کی معاشرت اور مسلم زوال کے مختلف زاویوں کو کہانی کی صورت میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ان

تمام ادیبوں کے پیشِ نظر مقصدیت غالب تھی۔ سجاد حسین، ہادی رسوا اور راشد الخیری کے بعد اردو ناول نگاری کا اہم نام پریم چند ہے، پریم چند نے دیہی زندگی اور اس کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔

پریم چند وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے دیہاتی زندگیوں کی مشکلات و مصائب کسانوں اور معاشرے کے نچلے طبقوں کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ناول نرملا، گوشہ عافیت، میدانِ عمل اور گؤدان ہندوستانی دیہی معاشرت کو نہایت قریب سے دیکھتے اور زندگی کے مسائل کی حقیقی تصویر کشی کی بہترین مثالیں ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے نذیر احمد سے شروع ہونے والا اردو ناول کرشن چندر تک آتے آتے ایک واضح صورت اختیار کر چکا تھا۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، ہادی رسوا اور پریم چند کے بعد کرشن چندر اور عزیز احمد ایسے ناول نگار ہیں، جنھوں نے دیہی معاشرت کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات کو برتا اور ناول کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس وجہ سے قیام پاکستان تک اردو ناول میں زندگی کی متعدد حقیقتوں کو سامنے لایا جا چکا تھا۔ جن میں دیہی اور شہری زندگی کے مسائل ، نفس انسانی کے داخلی معاملات وغیرہ اس دور کے ناولوں کے اہم موضوعات تھے۔

۱۹۴۷ء کا ہنگامہ تاریخِ ہندوستان میں ایک سانحہ کی حیثیت سے رونما ہوا۔ جس کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر پاکستان اور بھارت دو آزاد مملکتیں معرض وجود میں آئیں۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں لکھے جانے والے اردو ناولوں میں فسادات اور ہجرت کے المناک موضوعات کو سمویا گیا۔ اگر دیکھا جائے تو ادب ایک سماجی عمل ہے اور ادیب کسی نہ کسی معاشرے میں رہ کر ہی ادب تخلیق کرتا ہے اور طبعی میلانات کی تشکیل میں خارجی عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں اس طرح کسی بھی قوم کی زندگی میں رونما ہونے والا واقعہ اس قوم کے ادب کو متاثر کرتا ہے۔ ادیب اپنی حساس طبیعت کے پیشِ نظر معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت معاشرے کے حالات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ تقسیمِ ہند کے اہم واقعہ نے بھی ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کو متاثر کیا۔ اردو ادب میں قیام پاکستان کے بعد فسادات اور ہجرت کے موضوعات ایک خاص پہلو سے اُجاگر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ناول نگاری کی سمت میں دوسرا رویہ / دوسری جہت تاریخی ناول نگاری ہے جس کی نمائندگی نسیم حجازی کے ناول کرتے ہیں۔ اس عہد میں ناول نگاری کی تیسری جہت جو واضح ہوئی وہ تقسیمِ ہند کے پسِ پردہ محرکات، ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت، مختلف تہذیبی اور معاشرتی رویوں اور قیامِ پاکستان کے ابتدائی منظر نامے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے منتخب ناولوں میں لوگوں کے اعتقادات، نوجوان طبقے کے لااُبالی پن، اُن کی مذہب سے دوری، عیش و عشرت اور لغویات میں اُن کی مشغولیت اور اُن کے اخلاقی و مذہبی زوال کی پوری تصویر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اُس عہد کے نوجوان کے لباس، اُن کی وضع قطع، اُن کی مصروفیت کے ذرائع، مشترکہ خاندان میں آپسی رشتے اور جاگیردارانہ عہد کے چاپلوس اور چرب زبان کردار اور اس سماج کا کھوکھلا پن سبھی کچھ پیش کر دیا گیا ہے۔ طاہرہ اقبال کے ناول "گراں" میں اس عہد کے سماجی حقائق اور ثقافتی صورتحال کی خوبصورت عکاسی ہوتی ہے۔ ان ناولوں میں عورتوں کی سماجی و تہذیبی صورتحال، سماج کی زوال پذیر اخلاقی اقدار، بچوں کی تعلیم و تربیت کے تئیں ماں باپ کا رویہ، مشرق و مغرب کے مابین تہذیبی تصادم اور قدیم اور جدید اقدار کے درمیان کشمکش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ عورتیں اپنے منگیتروں کے انتظار میں اپنی عمر ضائع کر چکی ہیں۔

اکیسویں صدی کے سبھی لکھنے والوں کی تحریروں میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو ناول نگاری کے لیے ضروری ہیں۔ انہوں نے معاشی پہلوؤں کو اپنے ناولوں میں اس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ سبھی نقادوں نے بجا طور پر اُسے سراہا ہے۔ خالد فتح محمد کے ناول "کوہِ گراں" میں چودھری حلیم کا کردار بہتر انداز میں اپنے گاؤں والوں کی معاشی بہتری کے لیے کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ گاؤں کی دوبارہ آباد کاری ہو تاکہ لوگ معاشی طور پر خود کفیل ہوں اور اپنے آبائی گھروں میں رہ سکیں۔ قدیم معاشرت کا ایک پہلو توہمات کی وہ دنیا ہے جو افرادِ معاشرہ کو ماورائی تصورات کا اسیر رکھتی ہے۔ ایک طرف یہ تصوران کی نفسیاتی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک خوف کا ہالہ تخلیق کرتے ہیں جو انھیں بے سمت ہونے سے روکتا ہے۔ اسی لیے توہمات اور ماورائی تصورات ہر روایتی معاشرے کا لازمی جزو ہیں خواہ وہ مذہب کے نام پر ہوں یا ثقافتی اقدار کے طور پر۔ یہ ماورائی تصورات ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں خواہ ان کا منبع کوئی بھی ہو۔ آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" میں جابجا ہمیں یہ توہمات دیکھنے کو نظر آتی ہیں۔ حسن منظر کے ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں علی بخش کا خادم اُسے لاہور مختلف پیروں کے پاس دم درود کے لیے لے کر جاتا ہے جس میں اُس کا پیروں پر اندھا اعتقاد دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک تاریک پہلو ہے کہ لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے پیروں کے آستانے پر جاتے ہیں۔ ثقافتی بحران کے حوالے سے اکیسویں صدی کے ناولوں میں پیش کردہ اہم پہلوؤں میں ثقافتی بحران کے سماجی پہلو، معاشی پہلو اور دیگر پہلو شامل ہیں۔

ثقافتی بحران کے پہلوؤں کی جو صورت ان ناولوں میں نظر آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح جدید تہذیب کے اثرات ہماری ثقافت اور اس کے ساتھ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس میں جدید تہذیب و تمدن کی متنوع صورتیں اپنے بھرپور رنگ میں نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر وہ چیزیں جنھیں ترقی یافتہ معاشروں میں عمومی سماجی منظرنامے میں بہ افراط دیکھا جاسکتا ہے جو یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ عریانی، جسم فروشی، کلب کلچر، شراب نوشی اور اس طرح کے دیگر معاملات جو معیوب سمجھے جانے کے باوجود جدید معاشرتوں کا لازمی جزو ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں شامل ناولوں میں جابجا دیکھے جاسکتے ہیں، ان ناولوں کے اکثر کردار ہجرت کا شکار ہیں۔ ہجرت کی مختلف وجوہات ہیں، کچھ لوگ بہتر مستقبل کے لیے اپنے شہروں اور ملکوں کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جابسے ہیں۔ حسن منظر کے ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں احمد بخش کا کردار بہتر معاش کی تلاش میں بیرونِ ملک چلا جاتا ہے اور طاہرہ اقبال کے ناول "گراں" میں غزل جان اپنی سوتیلی ماں اور باپ کو فکر معاش میں مصروف دیکھتی ہے۔ زیف سیّد کے ناول "گُل مینہ" میں زرجان اور گُل مینہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر ہجرت کرتے ہیں۔

میڈیا چونکہ ثقافتی پھیلاؤ کا اہم ذریعہ ہے اس لیے امریکی طاقتوں نے اپنے مفادات کو تحفظ دینے اور مخصوص عالمی ثقافت کو پھیلانے کے لیے میڈیا پر اجارہ داری اور کنٹرول کرنا اوّلین ترجیح قرار دیا ہے تاکہ اس کو اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق استعمال کر سکیں۔ مثال کے طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ کچھ عرصہ قبل دنیا کے بہت سے خطوں کے عوام مغربی ثقافت اور صارفیت سے ناواقف تھے۔ چونکہ یہ افراد براہِ راست کیبل نیٹ ورک کے زیرِ اثر نہیں تھے اس لیے عالمی ثقافتی رجحانات کے بارے میں بے خبر تھے اور ان کی اپنی صاف ستھری ثقافت موجود تھی لیکن جیسے ہی غیر ملکی سرمایہ کاری نے پرنٹ میڈیا کا رُخ کیا، تو پریس کا کام افراد کے مسائل و مشکلات کو بیان کرنا نہیں رہا بلکہ صرف ہالی ووڈ کی خبریں، فورڈ، میکڈونلڈ کے اشتہارات اور اسی طرح دیگر کارپوریشنوں کی تشہیر ہی رہ گیا ہے۔ مرزا اطہر بیگ کے ناول "صفر سے ایک تک" میں ذکی کے کردار کی کمپیوٹر سے وابستگی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میڈیا اور ٹیکنالوجی کا انسان کی زندگی پر کس قدر اثر ہے۔

اللہ نے دنیا میں ہر طرح کی مخلوق پیدا کی، ان تمام مخلوقات کے رہن سہن کا طریقہ بھی ایک دوسرے سے جُدا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف قسم کے جانور مختلف طریقوں سے رہتے ہیں۔ بعض پہاڑوں میں، بعض جنگلوں میں، جب کہ بعض انسانی آبادی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح قدرت نے انسانی معاشرہ بھی بنایا، حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک انسان مختلف قبائل اور دنیا کے مختلف ممالک میں رہتے ہیں، ان کا رہن

سہن ، تہذیب و تمدن اور ذہنی و فکری دھارے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور رسم ورواج الگ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے رویے بھی مختلف انداز لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ پاکستان کے لوگوں کی زندگی گزارنے کے اپنے طریقے ہیں،ان کے اقدار، روایات اور رسم و رواج بلکہ زندگی گزارنے کے تمام طریقے ایک کلچر کے تابع ہیں۔زیرِ نظر مقالہ میں انسانی معاشرے کی انہی خوبیوں ،خامیوں ،تاریخ و ثقافت ،تہذیب و تمدن اور حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مقالہ پاکستانی ناولوں میں ثقافتی بحران کے حوالے سے ہے،اس لیے اس میں خاص طور پر پاکستانی قوم کی ثقافت کا ذکر کیا گیا ہے۔عالمگیریت کی وجہ سے دنیا کا ایک کونے سے دوسرے کونے تک رابطہ تیز تر ہو گیا ہے ، سفر کی سہولتوں پر بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ہوائی جہاز کی وجہ سے ایک خطے سے دوسرے خطے میں جلد ہی انسان پہنچ سکتا ہے۔اب دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں بات کی جا سکتی ہے۔ویڈیو کال نے اس سلسلے میں اور بھی آسانیاں پیدا کر دی ہیں،اب حقیقت میں دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے جس میں رابطہ سہل اور تیز ہو گیا ہے اور اب شہر پھیلتے جا رہے ہیں۔ نثار عزیز بٹ کے ناول "کاروانِ وجود" میں دیکھا جا سکتا ہے کہ سارہ اتنی دور بیٹھے ہوئے بھی اپنے خاندان کے بارے میں باخبر رہتی ہے اور یہ انٹرنیٹ ہی کی بدولت ہے ۔

عالمگیر تہذیب نے گاؤں کی تہذیب و ثقافت پر بھی اثر ڈالا ہے،ہماری خوبصورت اقدار کو گرہن لگتا جا رہا ہے۔اب مشرق کی خوبصورت اقدار کی جگہ جدید تہذیب کی اقدار لے رہی ہیں۔جب تہذیبی سطح پر عالمی منظر نامہ اتنی تیزی سے بدل رہا ہے تو گہری نظر رکھنے والا تخلیق کار کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔معاصر ناول میں بھی اب ہماری پرانی تہذیب کا نوحہ بیان کیا جاتا ہے۔سادگی نام کی خوبصورت قدر جو ہماری مشرقی تہذیب کے ماتھے کا جھومر تھی اب بدل چکی ہے اب اُس کی جگہ بناوٹ اور غیر فطری انداز نے لے لی ہے۔لوگوں کے رہن سہن میں بھی واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔گھروں کے نقشے بدل گئے ہیں جتنا خرچہ گھر پر ہوتا ہے اُس سے زیادہ باتھ رُوم پر کیا جاتا ہے۔احمد بخش کا کردار "دھنی بخش کے بیٹے" میں اِس بات کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔پرانے زمانے کا انسان سادہ زندگی گزارتا تھا اپنے ہاتھ سے کام کرتا تھا اور بیماریوں سے دُور رہتا تھا اور دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو جہاں بہت سی سہولیات دی ہیں وہیں پر اُن کے منفی اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیماریوں کے جس قدر علاج دریافت ہوئے ہیں اور اُن کے علاج کے لیے جدید مشینری تیار کی گئی ہے وہاں ہی دوسری طرف بیماریوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

کتاب کلچر کو بھی جدید ٹیکنالوجی نے کافی حد تک متاثر کیا ہے اب زیادہ مطالعہ لیپ ٹاپ، موبائل اور ٹیپ پر کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے کتاب سے محبت کرنے والے کُڑھتے ہیں۔ جدید تہذیب نے گاؤں کے کلچر کو بھی بہت متاثر کیا ہے ،اب جدید مشینری اور ٹیکنالوجی گاؤں اور دیہات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔"صفر سے ایک تک" میں منشی کا کردار بھی اس ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھاتا نظر آتا ہے وہ اپنے سارے کھاتے کو اپنے بیٹے ذکی کے ساتھ مل کر کمپیوٹر میں محفوظ کرلیتا ہے۔ گاؤں اور شہروں کے درمیان اب کچھ خاص فرق نہیں ہے، گاؤں کے بدلتے ہوئے کلچر کو معاصر ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔ محمد حفیظ خان نے اپنے ناول "ادھ ادھورے لوگ" میں اس ثقافت کو دکھایا ہے کہ کس طرح جدید مواصلات کے ذرائع نے سادہ زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ دیہاتوں میں بجلی کے پہنچ جانے سے دیہات کی زندگی بھی آسان ہوگئی ہے۔

اغیار کی تہذیب و ثقافت ہم پر غالب آرہی ہے اب ماڈرن بننے کے چکر میں ہم مغربی تہذیب کو اپناتے جارہے ہیں۔ تعلیم کی غرض سے لوگ مغرب کا رُخ کر رہے ہیں اور وہاں ہی شادی بھی کرلیتے ہیں جس کا اندازہ ہمیں احمد بخش اور اوڈلا کی شادی سے ہوتا ہے۔ مغرب میں ناجائز رشتے بنانے کو معیوب تصّور نہیں کیا جاتا۔ مغرب کی دیکھا دیکھی یہ رجحان ہمارے ہاں بھی سرایت کر رہا ہے ،اس کی عکاسی رفاقت حیات کے ناول "میر واہ کی راتیں" میں شمیم اور چاچی خیر النساء کا کردار ہیں۔ فلموں نے بھی ہماری تہذیب و ثقافت پر اثر ڈالا ہے، اب عورتوں اور مردوں کا اختلاط بڑھتا جارہا ہے۔ جامعات میں یہ فرق بالکل ختم ہوتا جارہا ہے، جبکہ ہماری تہذیبی و ثقافتی روایات میں مرد و عورت کو کھلم کُھلا اس بات کی اجازت نہیں کہ ایک دوسرے سے ملیں۔ لیکن اب اس سے بڑھ کر ہو رہا ہے ،اس کی عمدہ مثال آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" میں نازنین کے گھر میں ہونے والی مخلوط پارٹیاں ہیں۔ آغا گُل کے ناول "دشتِ وفا" میں رُخسانہ کا کردار ہے جو کہ جنسی بے راہ روی کا شکار ہے۔ ناول نگار نے ہمیں ہمارے معاشرے کی تلخ تصویریں دکھائی ہیں، عورت اور مرد اگر دونوں ایک گناہ میں شریک ہیں تو عورت کو زیادہ گناہ گار ٹھہرایا جاتا ہے اگر کوئی عورت کسی مرد کی مرضی سے اُس کے ساتھ شادی کر کے اپنا گھر چھوڑ دے تو اُس کے باوجود اُسے طعنے ملتے رہتے ہیں۔ نفسا نفسی نے لالچ، مادیت پرستی اور جھوٹ کو ہوا دی ہے۔ اب دوسروں کا حق مارنا ہم جائز سمجھتے ہیں، نوکریوں کے معاملے میں بیوروکریسی اقرباء پروری سے کام لیتی ہے۔ اعلیٰ ٹھیکے بھی رشوت پر دیئے جاتے ہیں، اور پھر ان میں کروڑوں روپے کے گھپلے کیے جاتے ہیں۔ علی اکبر ناطق کا ناول "نو لکھی کوٹھی" میں مولوی کرامت ولیم کا منظورِ نظر ہے، لوگ اپنے کام ولیم سے کروانے کے لیے مولوی کی خوشامد کرتے نظر آتے ہیں۔

اُردو ناول کے ابتدائی دور سے ہی ثقافت کی عکاسی ہر مصنف کے ہاں بڑی طاقت کے ساتھ اُبھرتی نظر آتی ہے۔ناول انسانی معاشرے کی سچی تصویر ہے کسی بھی معاشرے کی پہچان اس میں رہنے، بسنے والے انسان ہوتے ہیں۔ مذہب کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ادب اور تہذیب و ثقافت میں لازم وملزوم کا رشتہ ہے ایک طرف ادب، تہذیب و ثقافت کا ایک مظہر ہے تو دوسری طرف ادب کی مختلف اصناف میں تہذیب و ثقافت کی عکاسی کی جاتی ہے۔ناول "میر واہ کی راتیں" میں رفاقت حیات نے اندرونِ سندھ کا مزاج، ثقافت، رہن سہن اور طور اطوار کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ دیہاتی معاشرے کی توہم پرستی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔اور اُس کے ساتھ جنسی موضوع کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا نام سنتے ہی ہر طرف تھو تکار، الزام تراشی، لعنت ملامت اور ناپسندیدگی کے اظہار کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے بعد قاری کسی بھی تحریر کو پڑھنا وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ جنس پر بات کرنا یا کسی بھی انفرادی یا اجتماعی رویئے پر جس کا کوئی جنسی پہلو نکلتا ہو سوال کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

میر واہ کی راتیں ایک نوجوان نذیر کی جنسی اور اخلاقی حصّوں میں بٹی ہوئی سوچوں کی کہانی ہے، جس میں ایک دیہاتی نوجوان نذیر نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جنسی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ شمیم اور خیر النساء کا کردار دیہی زندگی میں کم عمر لڑکیوں کی بوڑھے مردوں سے بے جوڑ شادی کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو سامنے لاتا ہے۔ شمیم کی نسبت خیر النساء کا کردار ایک نمازی اور پرہیز گار خاتون کا ہے جو نذیر کی قربت بھی چاہتی ہے لیکن نماز میں کوتاہی سے بھی بچنا چاہتی ہے۔ لیکن جنسی خواہشات اِس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ وہ وقتی طور پر ہی سہی اخلاقی اقدار وروایات اور مذہب کی لگائی گئی قدغنوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔رفاقت حیات نے اپنے اس ناول میں معاشرے کی اخلاقی پستی کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ ثقافتی بحران کی ایک اہم وجہ ثابت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

آغا گُل کی ناول نگاری بھی اہمیت کی حامل ہے انھوں نے اگرچہ طویل ناول نہیں لکھے، تاہم اُن کے ناولوں میں پلاٹ مضبوط، کردار بلوچستان کی معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے والے، مکالمہ جاندار اور منظر کشی بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔دشتِ وفا آغا گُل کا ایک اہم ناول ہے یہ ناول بلوچستان کی حالیہ دہشتِ گردی اور علیٰحدگی پسندی کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ناول کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے آدمی کوئٹہ کے گلی بازاروں میں پھر رہا ہو وہاں کے ہوٹلوں پر بیٹھا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر رہا ہو اور ساتھ چائے پی رہا ہو۔اس ناول میں کوئٹہ کی ثقافتی زندگی کے بہت سے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آغا گُل نے اپنی تحریر میں مختلف ثقافتوں، اقدار

اور رُسوم کو اُجاگر کیا ہے۔ آغا گُل نے اپنے ناولوں میں بلوچستان کے تاریخی اور سماجی واقعات کو کہانی میں پہلو بہ پہلو منضبط طریقے سے پیش کیا ہے۔ آغا گُل نے دشتِ وفا میں تہذیب و ثقافت کے حوالے سے غریب طبقے کی نفسیات کو اُجاگر کیا ہے کہ جب ناول میں ہیروئن رُخسانہ ہیرو نجیب کو اپنے غریب گھر سے متعارف کرواتی ہے تو وہ سکتے میں چلا جاتا ہے۔رُخسانہ غریب ہونے کے باوجود اپنا پہناوا امیرانہ رکھتی ہے، نجیب کو جب معلوم ہوتا ہے کہ رُخسانہ تین بچوں کی ماں ہے تو وہ یقین نہیں کرتا۔ آغا گُل نے دشتِ وفا میں عورت کی بے راہ روی کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ اپنے مطلب کے حصول کے لیے اپنی نسوانیت کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔اِس ناول میں ہمیں رُخسانہ بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ عشق کا کھیل رچاتی ہوئی نظر آتی ہے۔بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کا ایک اہم عنصر مہمان نوازی ہے۔ دشتِ وفا میں منظر نگاری عروج پر نظر آتی ہے آغا گُل نے کوئٹہ شہر کی زندگی کی بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔

زمینداروں کے مسائل کے حوالے سے لکھے جانے والے ناولوں میں سے علی اکبر ناطق کا ناول "نو لکھی کوٹھی" بھی اہم ناول ہے۔اس میں مغربی ثقافت کے حوالے سے بتایا گیا ہے، یہ ناول اگرچہ ایک نوجوان انگریز افسر ولیم کے گرد گھومتا ہے۔ تاہم اس میں ناول نگار نے چھوٹے کاشت کاروں اور مزارعوں کے مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ناول میں انگریز افسروں کی ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے کہ وہ کالے لوگوں کو مُنہ لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔اُن کے خیال میں اُن کی غلامی کا سبب جہالت تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام باشعور ہو کر اپنے لیے آزادی مانگے۔ ناول میں الیکشن کے دن ہونے والے فراڈ، سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی ہلاکت اور غریبوں پر ووٹ دینے کے لیے ڈالے گئے دباؤ کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ علی اکبر ناطق نے اپنے ناول میں ہماری سیاست کے ایک تاریک پہلو کی طرف نشاندہی کی ہے کہ رشوت اور بے ایمانی کے بغیر کوئی کام ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔لوگ خوشامد کی وجہ سے بڑے افسروں سے اپنے کام نکلواتے ہیں۔

مرزا اطہر بیگ کا دوسرا ناول "صفر سے ایک تک" میں مغربی تمدن کے ایک بے حد اہم مظہر یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز پیش رفت کو اپنے ماجرے کا حصّہ بناتا ہے۔ناول انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے آئی-ٹی میں بڑے پیمانے پر رونما ہونے والی ترقی کے نتیجے میں عہدِ جدید کی زندگی اور معاشرے پر مرتب ہونے والے اس کے گہرے اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔ناول میں کمپیوٹر وانٹرنیٹ کا عام زندگی کو اپنے حصار میں لے لینے کا عمل دراصل سائنس وٹیکنالوجی کی بالادستی اور غلبے کا ثبوت ہے۔ جس نے نہ صرف مغرب میں زندگی کے ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ اس کے اثرات اب دوسرے معاشرے تک بھی پھیل رہے

ہیں۔ ذکی کے والد منشی عطاء اللہ بھی کمپیوٹر کی برتری تسلیم کرتے ہوئے اس کی دنیا میں قدم رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذکی نوجوان ہے اور اس کے لیے اس میدان میں سیکھنے، جاننے اور کرنے کو بہت کچھ تھا اور وہ اپنی اتنی مہارت فیضان سالار پر اَن دیکھے غلبے کے لیے بخوبی استعمال کرتا ہے۔ جدید مغربی تمدن کے اہم مظہر انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اُردو ناول میں موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی بھی معاشرہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی دنیا سے دور نہیں رہ سکتا اور مقامی معاشرہ بھی اس سے الگ نہیں۔ ناول نگار نے بڑی خوبی سے اس مشین کا اپنے عہد کی زندگی سے تعلق دکھایا ہے۔ مصنف نے کمپیوٹر کو کہانی کے آغاز سے لے کر اختتام تک ناول کے کرداروں کے درمیان نمایاں رکھا ہے۔ ذکی کے کردار کے علاوہ ناول میں ہیروئن کا کردار زلیخا نے ادا کیا ہے۔ زلیخا کا کردار ناول کے بیانیے میں دو تین دن کے لیے لاہور کی سرزمین پر اُبھرتا ہے۔ مصنف نے پیغامات کے ذریعے جدید دور میں ٹیکنالوجی کی مدد سے فاصلوں میں آنے والی کمی کو دکھایا ہے کہ کیسے دو مختلف جگہوں پر رہنے والے ایک دوسرے سے جُڑے رہ سکتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں ناول نگاری کا آغاز کرنے والے حسن منظر نے اپنے ناولوں میں مغربی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کو بھی شامل کیا ہے اُن کے ناولوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ خون کے رشتے بھی اپنی اہمیت کھونے لگے ہیں وہ دھنی بخش کے بیٹے میں عقلی مادیت پر مبنی رویوں کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ لوگوں کے نزدیک مال و زر ہی سب سے بڑی حقیقت ہے، جہاں کسی کی موت سوگ کی بجائے خوشی کا پیغام لے کر آتی ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں مادی فوائد ملیں گے۔ حسن منظر کا شمار اُردو کے افسانوی ادب کی اہم تخلیقی شخصیت کے حوالے سے ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب "خاک کا رُتبہ" کو بہترین نثری کتاب کا مولوی عبدالحق ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔ دھنی بخش کے بیٹے میں سندھ کے دیہات اور امریکہ کی معاشرت کو موضوع بنایا گیا ہے ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے دیہی معاشرت کی مکمل عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ناول کی پیش کش میں پلاٹ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ پلاٹ کے ذریعے سے ہی ناول کا تانا بُنا جاتا ہے جو کہ ناول کے تاثر کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پلاٹ واقعات کے پورے ڈھانچے کا نام ہے۔ ایک معیاری پلاٹ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے واقعات کے درمیان ربط و تسلسل اور ہم آہنگی برقرار رہے۔ دھنی بخش کے بیٹے اپنے پلاٹ کی جامعیت اور اثر انگیزی کے لحاظ سے کامیاب ناول ہے۔ ناول میں جدید اور روایتی تکنیک کے تجربات کا موثر استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف نے ناول میں مختلف واقعات کو کرداروں کے درمیان ہم آہنگی اور ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں دلچسپی کی کیفیت شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ احمد بخش کے

واپس آنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُسے یہاں کی ہوا سے، لوگوں سے، میلوں ٹھیلوں سے، عرسوں سے محبت تھی لیکن اپنے ملک کی ہر چیز سے اُٹھنے والی فرسودگی نے اُسے اتنے عرصے سے اپنے وطن واپسی سے روک رکھا تھا۔ بچوں کے بڑے ہوتے ہی اُسے بے حیائی اور دہشت گردی کی زندگی سے خوف آنے لگا اور اُس نے وطن جانے کا فیصلہ کیا۔ دھنی بخش کی وفات کے بعد جاگیرداری کا سارا نظام مکمل طور پر اُس کے بڑے بیٹے خدا بخش نے احسن طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ زمانے میں بھی تبدیلی آگئی روایتی طریقوں سے ہٹ کر مشینوں کا زمانہ آگیا، ہل کی جگہ ٹریکٹر نے لے لی۔ احمد بخش گاؤں کے حالات ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔ حسن منظر نے گاؤں کی ثقافت کے مسائل کی نہایت عمدہ پیرائے میں منظر کشی کی ہے۔

طاہرہ اقبال کا ناول "گراں" بھی پوٹھوہاری تہذیب و ثقافت کا عکاس ہے۔ ناول میں ریل گاڑی کو بطورِ علامت استعمال کیا گیا ہے جس کی جگہ اب ہوائی جہاز نے لے لی ہے۔ جہاز اور ریل گاڑی یہاں اُمید اور انتظار کی علامت ہیں۔ کسی کے آنے کا انتظار، کسی سے ملنے کا انتظار، کسی سے تعلق استواری کی اُمید، فوج اور بیرونِ ملک مقیم اُس کردار کی آمد کی اُمید ہی کے نام پر یہاں کی عورتیں اپنی عمریں گزار دیتی تھیں۔ طاہرہ اقبال کا ناول پوٹھوہاری تہذیب و ثقافت کا نمائندہ ناول ہے جس میں تغیر پذیر پوٹھوہاری تہذیب کو موضوع بنایا گیا ہے کہ مرد کمانے کے لیے دوسرے ملکوں میں مزدوری کے لیے چلے گئے ہیں۔ جہاں کی ثقافت کا رنگ وہ اپنے خاندانوں میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس کو مصنفہ نے اپنے ناول میں بتدریج دکھایا ہے کہ گاؤں کی عورتوں نے اب خود کام کرنے کی بجائے آسانیاں ڈھونڈھ لی ہیں اور اپنے بچوں کو بھی انگریزی اسکولوں میں ڈلوا دیا ہے، گھروں کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔

خالد فتح محمد نے اپنے ناول "کوہِ گراں" کا بنیادی موضوع ایک ایسے گاؤں کو بنایا ہے جو قحط سالی کی وجہ سے اُجڑ چُکا ہے اور ناول کا ہیرو چودھری حلیم گاؤں کی بحالی کے لیے واپس آتا ہے۔ خالد فتح محمد نے اپنے ناول میں دیہی زندگی کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی دیہی زندگی کے متعلق گہرے مشاہدے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مصنف کا مطالعہ گاؤں کی زندگی اور اُس کی آبادکاری کے بارے میں بہت وسیع ہے۔ لکھنے کا انداز اتنا اُچھوتا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اُس ناول کا حصّہ محسوس کرتے ہوئے لوگوں کی تکلیف کو محسوس کرتا ہے کہ کیسے وہ قحط سالی کی وجہ سے اپنے گھروں سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔

زیف سیّد کے ناول "گُل مینہ" میں پاکستان میں کھیلے جانے والی آگ اور خون کی ہولی کی عمدہ طریقے سے عکاسی ملتی ہے۔ اس کے اثرات نے جس بے رحمی کے ساتھ لوگوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں، یہ ناول اسی

فضا، اس کی سفاکی اور بے حسی کی مختلف پرتیں کھولتا ہے۔ مصنف نے قبائلی علاقوں میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کی نشاندہی کی ہے وہیں ایک لڑکی کو مضبوط دکھایا ہے جو اپنی روایات سے ٹکرا جاتی ہے اور رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ جاتی ہے قبائلی لوگوں کی رسموں کا ذکر بھی ناول میں ملتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی بدنظمیوں کو مصنف نے کھل کر ناول میں بیان کیا ہے کہ کیسے سیاستدان اپنے مفادات کے لیے لوگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ بے نظیر کے قتل کے واقعے کو احاطہ تحریر میں لایا ہے۔

نثار عزیز بٹ کے ناول "کاروانِ وجود" میں مغربی تہذیب، رہن سہن، لباس، زبان، گھر کی آرائش وغیرہ کو مقامی معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے دکھایا ہے اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی زندگیوں کو تبدیلیوں کے عمل سے گزارا گیا ہے۔ اس ناول میں پاکستان بننے کے بعد کی صورتحال کی عکاسی بڑے عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ اس ناول کا بنیادی کردار سارہ کا ہے، جو اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہے۔ اپنے شوہر اور بچوں کی خاطر قربانی دیتی ہے لیکن دوسری طرف مصنفہ نے مرد کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے شوہر کی دوسری شادی کو دکھایا ہے جس سے سارہ لاعلم ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے، سارہ کی دوست ثمر نکاح نامے میں اپنی مرضی سے نکاح ختم کرنے کی شق لکھواتی ہے جو کہ ہماری ثقافت کے منافی ہے۔

آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" کی کہانی اسرار اور نازنین کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں مصنفہ پُر اسرار باتوں کا ذکر کرتی ہے، جن کا اصل زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہر حال تجسس کے ہاتھوں قاری ناول کے آخر تک اُس کو پڑھنے پر مجبور ہے۔ مصنفہ نے بکری اور اُس کے میمنوں کا ذکر کیا ہے جو جنگل میں پہنچ کر خوفناک درندے بن جاتے ہیں۔ مدھو جب شاہدہ سے ملنے اُس کی کوٹھی میں آتی ہے تو بادل کے گرجنے کی وجہ سے وہ عرفان سے لپٹ جاتی ہے آسمان سے بارش کے ساتھ مچھلیاں برسنے لگتی ہیں اور اُس کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔ پُر سراریت کو بیان کرتے ہوئے مصنفہ نے تخیلاتی باتوں سے کام چلایا ہے جس کا اصل زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

محمد عاصم بٹ کے ناول "ناتمام" کی کہانی مختلف کرداروں کے گرد گھومتی ہے جس سے ناول میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے اور قاری کرداروں کو اپنے اردگرد محسوس کرتا ہے۔ اس ناول کا ایک جاندار کردار صائمہ کا ہے جو اپنے باپ کے انتقال کے بعد اپنی تمام ناتمام خواہشات کی تکمیل کے لیے مختلف طریقے اپناتی ہوئی نظر آتی ہے اُس کی بڑی بہن اپنی طلاق کے بعد نوکری کر کے گھر کے خرچوں کو پورا کرتی ہے اسی دوران

صائمہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتے ہوئے محلے کے ایک آوارہ لڑکے وسیم سے محبت کرنے لگتی ہے۔وسیم اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اُسے تنہا چھوڑ کر بیرونِ ملک چلا جاتا ہے۔صائمہ اپنے گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے کے لیے نرسنگ کا کورس کر کے ایک نجی کلینک میں نوکری شروع کر دیتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر وقاص سے ہوتی ہے جو کہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا اور صائمہ سے محبت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔اپنے مقصد کے حصول کے لیے اُسے ایک فلیٹ لے کر دیتا ہے لیکن جیسے ہی اُس کی بیوی کو معلوم ہوتا ہے تو وہ صائمہ کو چھوڑ دیتا ہے۔یہ تمام واقعات صائمہ کو نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں اور ناول کے آخر میں وہ خود کشی کر لیتی ہے۔اس ناول کے ذیلی کرداروں میں اماں حاجن کا کردار انتہائی اہم ہے جو اپنے شوہر کے بیرونِ ملک چلے جانے کے بعد اکیلے زندگی گزارتی ہے اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے محلے کے تمام لوگوں کے دُکھ درد میں شرکت کرتی ہے۔ناتمام کی کہانی اندرونِ شہر لاہور کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے، جہاں لوگوں کو ایک دوسرے کے دُکھ درد کا احساس ہونے کے ساتھ اُن کی خوشی میں بھی بُھرپور طریقے سے شرکت کرتے ہیں۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں یہ محبت اور یگانگت ختم ہوتی جا رہی ہے جو ہمیں عاصم بٹ کے ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

سیّد کاشف رضا کا ناول "چار درویش اور ایک کچھوا" کو ناول نگار نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔کہانی اقبال محمد اور اس کے تین بیٹوں جاوید ،آفتاب اور بالے کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔اقبال فطرتاً ایک عیاش انسان ہے اور اس کے بیٹے مختلف بیویوں سے ہیں۔ناول نگار نے ہمارے معاشرے کے ایک انتہائی اہم رُخ کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے کہ جیسا باپ ہو گا اس کی خصّلت کے کچھ پہلو اولاد میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔اقبال کی اولاد بھی اس کی طرح عیاش ہے۔جاوید جنسی طور پر ایک ناآسودہ کردار ہے، وہ اپنے گھر کے سامنے والے فلیٹ میں رہنے والی زرینہ کو اپنی کھڑکی سے چُھپ کر دیکھتا ہے۔زرینہ بھی اپنی جنسی تسکین کے لیے اس کی طرف قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرتی حالانکہ وہ شادی شدہ عورت ہے،جو کہ عورت کی اپنے مرد سے بے وفائی ثابت کرتی ہے۔اقبال کا دوسرا بیٹا آفتاب پیشے کے اعتبار سے پروفیسر ہے اور جاوید کا سوتیلا بھائی ہے۔وہ اپنی شاگرد سلمٰی سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ سلمٰی بھی اس سے محبت کا اظہار کرتی ہے۔آفتاب کی ماں احمدی فرقے سے تعلق رکھتی ہے، جس کا پتہ سلمٰی کے باپ کو لگ جاتا ہے اور وہ اسے کہتا ہے کہ تم استعفیٰ دے دو۔آفتاب پروفیسری چھوڑ کر وکیل بن جاتا ہے۔

اِس کہانی کے کردار اپنے نفس کی تسکین کی خاطر اخلاق سے گری حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ناآسودگی اُن کی زندگی میں موجود ہے۔ آفتاب کا تیسرا بیٹا بالا ولدالحرام ہے، جو پورے گاؤں کی جھڑکیاں اور گالیاں کھاتا جوان ہوا ہے۔ رفیق بالے کی بہن سے پورے گاؤں کے سامنے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ غیرت میں آکر بالا اُسے قتل کر کے گاؤں سے فرار ہو جاتا ہے اور فسادیوں کے ساتھ شامل ہو کر خودکش بمبار بن جاتا ہے۔

محمد حفیظ خان کا "ادھ ادھورے لوگ" ناول قارئین کو ریاست بہاول پور کے مکینوں کی قیامِ پاکستان کے بعد بنی ادھ اُدھوری شناخت سے روشناس کرواتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار تُلسی اور فیاض ہیں جن میں محبت کا پودا پروان چڑھتا ہے لیکن دو الگ مذاہب سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ ایک نہیں ہوسکتے۔ فیاض تُلسی کے باپ حکیم رام لعل کے پاس حکمت کا کام کرتا ہے۔ اسی عرصے میں ریاست بہاول پور کے الحاق کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جس پر عام لوگوں سے لے کر اُمراء تک سب پریشان ہیں۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد ریاست بہاول پور پاکستان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے اور اقلیتوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ حکیم رام لعل اپنی تمام ملکیت فیاض کے نام کر کے ہندوستان جانے کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ فیاض اور تُلسی کے لیے یہ جدائی بہت مشکل عمل ہوتی ہے اسی دوران میں ایوب خان کا مارشل لاء لگ جاتا ہے۔ فیاض اینٹی ون یونٹ میں شمولیت اختیار کرلیتا ہے اور دس سال بغیر کسی جرم کے جیل بھی کاٹتا ہے۔ فیاض اپنی ساری زندگی ریاست کی شناخت کے لیے لڑتا ہے، اس عرصے میں کئی عورتیں اُس کی جانب متوجہ ہوتی ہیں۔ لیکن اپنے قبیلے کی محبت اِس قدر مضبوط ہے کہ وہ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف تُلسی کی ماں اُس کے سسر کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھے ہوئے ہے جس کا اُس کے شوہر کو علم نہیں ہے۔ محمد حفیظ خان نے بہتر انداز میں عورت کی بے وفائی کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی تُلسی کی صورت میں ایک بیٹی کی اپنے والدین سے وفاداری کو دکھایا گیا ہے کہ وہ فیاض کی طرف اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو ماں باپ کی محبت میں روک لیتی ہے۔ ناول میں جائیداد کے لیے رشتوں میں تنازعات کو فیاض اور اُس کے چچا کی لڑائی کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ چچا کے دل میں جائیداد کی محبت اِس قدر زیادہ ہے کہ وہ حکیم رام لعل کی جائیداد کی خاطر جو اُس نے فیاض کو ریاست بہاول پور سے جانے سے پہلے دی تھی قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ تمام چیزیں ہماری ثقافت میں بحران کا باعث بنتی ہیں کیونکہ ہماری ثقافت میں جو پہلے پیار و محبت، رشتوں میں احترام اور قربانی کا جذبہ تھا وہ آہستہ آہستہ دم توڑتا جا رہا ہے جس کی عکاسی آج کل کے ناول کرتے نظر آتے ہیں۔

اس تمام بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر دور کا ناول کچھ نہ کچھ ثقافتی عناصر ضرور لیے ہوئے ہوتا ہے اس لیے ہر ناول کے اندر دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کسی نہ کسی ثقافت کی عکاسی ضرور ملتی ہے۔ فی الحقیقت زیادہ ناولوں میں معاشرے کی عکاسی ملتی ہے۔ ثقافت کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک شہری ثقافت اور دوسری دیہی ثقافت، دونوں کا رنگ ایک ہی جیسا ہوتا ہے مگر دیہی ثقافت میں زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ وہاں کے میلے ٹھیلے زیادہ دنوں کے لیے ہوتے ہیں۔ شہری لوگوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے اس لیے وہ چیزوں کو مختلف انداز میں کرنا چاہتے ہیں۔ معاشرے کی ثقافت بعض اوقات از خود عدالتوں کے فرائض بھی سرانجام دینے لگتی ہے جس میں علاقے کا بزرگ جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے شادی بیاہ کے معاملات کو نبٹاتا ہے اور کسی کے مر جانے پر اُس کے گھر والوں کو کھانا مہیا کرنا، پُرسہ دینے کے لیے آنے والے مہمانوں کے لیے رہائش کا انتظام کرنا بھی ہماری ثقافت کا حصّہ ہے۔ پاکستانی ثقافت پاکستان کا حُسن نکھارتی ہے اور اس کا ذکر دنیا کی بڑی ثقافتوں میں کیا جاتا ہے مگر اسے حکومتی طور پر کوئی وقعت نہیں دی جاتی اور نہ ہی ثقافت کو سمجھانے کی سنجیدہ کوشش کی جاتی ہے۔ پاکستان اپنی ثقافت سے اپنی معیشت کو بہتر کر سکتا ہے اس سے پاکستان میں سیاح آئیں گے اور کئی صنعتیں چلیں گی جبکہ سیاست دان ذاتی مفادات کے لیے اور بیرونی اشاروں پر مقامی ثقافت کو نظر انداز کرنے کے سیاسی ایجنڈے کو نفرت کے لیے استعمال کر کے خود مقبول ہونا چاہتے ہیں۔

دیگر اصناف کی نسبت سماجی اور معاشرتی زندگی کے پھیلاؤ کو ناول میں سمیٹنا زیادہ آسان ہے کیونکہ زندگی کی جو رنگارنگی، وسعت اور تنوع اِس صنف میں اظہار پاتی ہے وہ کسی اور صنف میں ممکن نہیں ہے۔ اردو ناول کے اس اجمالی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے تہذیب و ثقافت کی عکاسی کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ شہری طرزِ زندگی کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ تہذیب و ثقافت کے قدیم و جدید، مشرقی و مغربی سبھی پہلوؤں کو کسی نہ کسی صورت میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ زندگی کی ہمہ گیر عکاسی کے لیے ناول ایک موثر صنف ہے۔ ناول نگاروں نے ہر طرح کے موضوعات کو نت نئے زاویوں سے ناول کا حصّہ بنایا ہے۔ سبھی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں اکیسویں صدی کے پاکستانی معاشرے کی ثقافت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ جس سے قارئین اِس عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور ثقافتی صورتحال سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں جدت کے آنے سے جہاں لوگوں کو بہت سے فوائد ملے وہیں اُن کا تعلق اپنے کل کے ساتھ کمزور ہوا جس سے وہ اپنی قدروں سے دور ہوتے چلے

گئے۔اقدار سے دوری نے ثقافتی بحران کو جنم دیا جو زندگی کی مختلف سطحوں پر رونما ہوا، جس سے مختلف مسائل نے جنم لیا۔

ب۔نتائج:

اردو ناول میں ثقافتی بحران کے اس تفصیلی مطالعے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

ا۔معاشرے کے ثقافتی اُصولوں اور اقدار میں پائے جانے والی خراب حالت کو ثقافتی بحران کہتے ہیں۔بحران شدید خطرے یا مشکل کی صورتحال کا نام ہے،بحران مختلف صورتوں میں معاشرے میں رونما ہوتا ہے جیسے معاشی بحران، صحت کا بحران اور ثقافتی بحران وغیرہ۔ثقافتی بحران اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب معاشرے کو اپنے ثقافتی اُصولوں، اقدار یا شناخت میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بحران سے مراد ایسی صورتحال ہے جس میں حالات ایک جیسی صورتحال پر برقرار نہ رہ سکیں،اُن میں مدوجزر اور تغیر و تبدل آتا رہے۔ایسی صورتحال میں اعتماد کا قائم رہنا دشوار ہوتا ہے۔ثقافتی بحران معاشرے پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے جو کہ لوگوں میں بیگانگی کا باعث بھی بنتا ہے،ہر دور کے ناول میں اسے بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ناول نگاروں نے ناولوں میں ثقافتی بحران کے تمام پہلوؤں پر توجہ دی ہے۔اکیسویں صدی کے ناولوں میں فکری پہلو کے اثرات بھی نمایاں ہیں،ثقافت میں جدت کے آنے سے مختلف ثقافتوں کی آپس میں بڑھتی ہوئی نمائش کی وجہ سے بھی معاشرے پر بحرانی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ثقافتی بحران بہت سے عوامل سے متاثر ہوتا ہے اس کی وجہ سے لوگوں میں دوری پیدا ہوتی جارہی ہے،یہ ہمیشہ منفی طور پر ہی سامنے نہیں آتا۔عالمگیریت، آبادیاتی تبدیلیاں، تیز رفتار سماجی تبدیلی، تکنیکی ترقی، سیاسی اور سماجی ہلچل، نسلی فرق یہ سب عوامل مل کر ثقافتی بحران کا باعث بنتے ہیں۔اگر ثقافتی ورثے کے احترام اور زندگی گزارنے کے نئے طریقوں کے درمیان توازن نہ ہو تو ثقافتی افراتفری پیدا ہو جاتی ہے۔منتخب پاکستانی اُردو ناولوں میں ثقافتی بحران کے مندرجہ ذیل پہلو ثقافتی بحران کا باعث بنے۔ثقافتی بحران کے سماجی، معاشی اور دیگر پہلوؤں کو کرداروں کے ذریعے مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ثقافتی بحران کے سماجی پہلو میں پاکستانی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات، مغربی کلچر کا فروغ، اقدار کا زوال اور دیہی و شہری اسالیبِ زندگی شامل ہیں۔ثقافتی بحران کے معاشی پہلو کے تحت مواصلات، ترقیاتی کام، صنعت اور کمرشلزم و صارفیت کو ناولوں میں

موجود کرداروں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے جبکہ ثقافتی بحران کے دیگر پہلو میں سیاست، تعلیم،ہجرت اور مذہب کو بیان کیا گیا ہے اور ناولوں میں موجود ثقافتی بحران کا باعث بننے والے عامل کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

۳۔ ادیب معاشرے کا سب سے زیادہ حساس فرد ہوتا ہے جو اپنے معاشرے میں پیش آنے والے مختلف چیلنجز کو سمجھتے ہوئے اپنی تصانیف میں ان کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عہد میں ناول نگاروں نے نہایت بے باکی سے اس حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے اور ان موضوعات یا پہلوؤں پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔ ان ناول نگاروں نے اپنے عہد کے ثقافتی بحران کی اپنے اپنے نقطہ نظر سے عکاسی کی ہے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کے مختلف علاقوں کو درج ذیل چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا جن میں پاکستان کی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات ، مغربی کلچر کا فروغ،اقدار کا زوال، دیہی اور شہری اسالیب زندگی ، کمرشلزم اور صارفیت شامل ہیں۔ مغربی تہذیب کی پیروی دکھا کر مغربیت زدہ ذہنیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مذہب پر مغربی تعلیم کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔

۴۔ ثقافتی بحران کے اثرات دور رس ہوتے ہیں اور وہ اپنے ارد گرد کے کرداروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ زیرِ تحقیق ناولوں میں اس کا مشاہدہ "صفر سے ایک تک" میں ذکی کے کردار سے ہوتا ہے جو اپنے تمام کاموں کے لیے کمپیوٹر پر انحصار کرتا ہے۔ "گراں" میں غزل جان کا کردار انٹرنیٹ کی بدولت اپنے گاؤں سے جُڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کوہِ گراں میں حلیم کا کردار شہری زندگی میں موبائل اور گھڑی سے استفادہ کرتا نظر آتا ہے اور دیہات میں ان چیزوں کا اُس کی زندگی میں گزر بھی نہیں۔ میر واہ کی راتیں میں نذیر کا کردار، ناتمام میں صائمہ ، کاروانِ وجود میں ثمر کا کردار اور دشتِ وفا میں رُخسانہ کا کردار اخلاقی تنزلی کا شکار نظر آتا ہے۔ یہ سب مغربی ثقافت کے پاکستانی ثقافت پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہے۔ جدید مشینوں کے آجانے سے لوگ تن آسان ہوگئے ہیں ،کام کم ہونے کے باوجود بھی فرصت کے لمحات میسر نہیں جس کا مشاہدہ گراں ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ادھ ادھورے لوگ میں فیاض اور اس کے چچا کے درمیان جائیداد کا تنازع رشتوں میں اپنائیت کو ختم کرتا نظر آتا ہے۔

۵۔ ثقافتی بحران کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اِس کے انفرادی اور سماجی نقطہ نظر سے اثرات مخصوص حالات کے تحت مختلف ہوسکتے ہیں۔ یہ تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے جو نئے خیالات، فن کی شکلوں اور اظہار کے ظہور کا باعث بنتی ہے۔ جس سے ثقافتی منظر نامے کو تقویت ملتی ہے جو کہ نئی روایات کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے ساتھ منفی کیفیت بھی دیکھنے میں آتی ہے مثلاً صنعتی ترقی کے منفی

اثرات، مادیت پرستی، انسان پر مشینوں کی فوقیت، نسلی و تہذیبی برتری کا احساس، اخلاقی بے راہ روی اور حد سے بڑھتی ہوئی آزاد خیالی ان پہلوؤں کو کم و بیش سبھی ناول نگاروں کے ہاں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

ج۔ سفارشات:

اس تحقیق کے دوران جو نکات سامنے آئے اُن کے حوالے سے آئندہ تحقیق کے لیے چند سفارشات پیش ہیں:

ا۔ افسانے اور ناول میں اس سے پہلے تہذیب و ثقافت پر کام ہو چکا تھا زیرِ نظر مقالے میں یہ مطالعہ ناولوں میں ثقافتی بحران کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ فکشن کی ان دونوں اصناف میں ثقافتی بحران کے تقابل کے حوالے سے بھی مختلف زاویوں سے کام کی ضرورت ہے۔

۲۔ جو ناول اس مقالے کے دائرہ کار میں آتے ہیں، ان میں زیادہ پنجاب، سندھ کے علاقوں کو پیش کیا گیا ہے۔ پچھلے برس میں ایسے ناول بھی چھپے ہیں جو کہ بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے بارے میں ہیں۔ اس حوالے سے نئے مطالعات میں ان کو بھی شامل کرنا چاہیے تا کہ تصویر مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ باقی ثقافتوں کے بارے میں بھی آگاہی حاصل ہو سکے۔

۳۔ ناول کے اس مطالعے سے اکیسویں صدی کے ثقافتی بحران کے پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ اسی نوعیت کا کام افسانے کے حوالے سے بھی ہونا چاہیے تا کہ فکشن کی اس صنف میں ثقافتی بحران کی پیشکش کا جائزہ بھی لیا جاسکے۔

۴۔ ناول نگاروں کے ہاں ثقافتی بحران کے پہلو کو اُجاگر کرنے کے دوران تحقیق میں اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا ہے کہ ناول بڑی تعداد میں لکھے اور شائع ہوئے ہیں لیکن بعض ناول با آسانی دستیاب نہیں ہوتے اس سلسلے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا کم از کم نمائندہ ناولوں کی دستیابی کے عمل کو آسان بنایا جائے۔ یوں نہ صرف ناول ناقد و محقق بلکہ عام قاری کی دسترس میں بھی ہو گا اور اس سے ناول پڑھنے کے رجحان کے ساتھ ناول میں ثقافتی حالات و واقعات اور معاشرتی عوامل کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۵۔ پاکستان کے جدید دور کے ناول نگار جو آج کل اس پہلو پر کام کر رہے ہیں کی حوصلہ افزائی اور صحیح سمت رہنمائی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ نہ کہ اگر کوئی ناول نگار اپنے عہد کے بدلتے ہوئے سماجی، معاشی، سیاسی حالات کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتا ہے تو اسے باغی اور رجعت پسند تک قرار دیا جائے۔ کیونکہ ادیب اپنے

عہد کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے عہد سے کٹ کر نہیں رہ سکتا لہذا اس نکتے پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

٦۔ناول نگاروں پر اپنے اظہارِ خیال کرنے پر کسی قسم کی پابندی کی بجائے کھل کر اظہار کرنے کے اقدامات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ادیب اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا اور وہ معاشرے میں پھیلے مسائل کی نقاب کشائی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

٧۔اُردو ادب کی دیگر اصناف مثلاً ڈراما، شاعری اور مقبول عام ادب میں ثقافتی بحران کے اثرات کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے کی خاصی گنجائش موجود ہے، اسے بھی تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات

آغا گل، دشتِ وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، اگست ۲۰۱۷ء

آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفصیل پبلشرز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۸ء

امجد جاوید، روشن اندھیرے، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء

حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۸ء

خالد فتح محمد، کوہ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء

رفاقت حسین، میر واہ کی راتیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

زیف سید، گل مینہ، رُمیل ھاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء

سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، دانیال پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۸ء

سیموئیل پی، ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ: عبد المجید طاہر، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء

سیموئیل پی، ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو، ترجمہ: سہیل انجم، آکسفورڈ پریس، کراچی

طاہرہ اقبال، گراں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء

عاصم بٹ، ناتمام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء

محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۸ء

نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

ثانوی ماخذات

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ) کشاف تنقیدی اصطلاحات (طبع دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء

ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۹ء
ارشد اقبال، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ میں سماجی عناصر، بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۲۰ء
ارسطو، سید نذیر نیازی (مترجم)، سیاسیات ارسطو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء
اسلام سندیلوی، ماحول اور مزاج، سفینہ ادب، لاہور، س۔ن
اشتیاق احمد، کلچر منتخب تنقیدی مضامین، کتاب سرائے لاہور، ۲۰۰۷ء
اشفاق بیگ، مرزا، (مترجم) مارکسی فکر و فلسفہ کے خدوخال، چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، س۔ن
اشرف کمال، محمد، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء
امجد سلیم منہاس، (فلیپ) نولکھی کوٹھی، از علی اکبر ناطق، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
امور رنجن مہاپتر، فلسفہ مذاہب، ترجمہ یاسر جواد، فکشن ہاؤس، ۱۸۔ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۱۰ء
انجم رحمانی، ڈاکٹر، پاکستان میں تعلیم تحقیقی جائزہ، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء
انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء
انوار ہاشمی، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس، کراچی، ۱۹۶۸ء
ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، مترجم: محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۲ء
ایڈون اے برٹ، مؤلّف، فلسفہ مذہب، مترجم، بشیر احمد ڈار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء
باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۲ء
جان جی جیکسن، انسان، خدا اور تہذیب، مترجم یاسر جواد، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع پنجم، ۱۹۹۲ء
جمیل جالبی، ادب کلچر اور مسائل (پاکستانی ثقافت کے مسائل)، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۲ء
حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۴۴ء
حسن ریاض، اسلامی تاریخ کے بعض اہم اور امتیازی پہلو، جمیعتہ الفلاح، کراچی، ۱۹۶۲ء
حسنین کاظمی، اوراقِ فیض، مشمولہ: ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء
راجیندر ناتھ شیدا، ادب، فکر اور سماج، ایشیا پبلشرز، دہلی، ۱۹۷۲ء
رشید امجد، ڈاکٹر (مرتب)، پاکستانی ثقافت، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز، لاہور، جون ۲۰۱۲ء
روتھ بینی ڈکٹ، ڈاکٹر، قدیم تہذیب و جدید انسان، دوست پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء
ریاض انور، اُصول تمدن، مکتبہ نظامیہ، کراچی، ۱۹۵۷ء
زبیر رانا، پاکستان تہذیب کا بحران، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء
ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء
سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی، بارھویں بار، ۲۰۱۵ء
سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۸ء
سجاد باقر رضوی، تہذیبِ و تخلیق، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۶ء
سعادت سعید، ڈاکٹر، ادب اور نفی ادب (مضامین) دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء
سلامت اللہ، ڈاکٹر، تعلیم، فلسفہ اور سماج، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، مئی ۱۹۷۴ء
سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء
سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی ادارہ پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، مکتبہ عالیہ، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، کلچر اور ادب، مکتبہ عالیہ، لاہور، س۔ن
سیف الدین بوہرہ، زمین انسان اور مذہب، مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء
سید قاسم محمود (مترجم)، نقوشِ ثقافت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
شاعر علی شاعر، جدید اردو ناول اسلوب و فن، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء
شاہد وہاب، خان، اردو فکشن میں ہجرت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، دسمبر، ۲۰۰۵ء
شہید مرتضیٰ مطہری استاد، سماج اور تاریخ، سازمان تبلیغاتِ اسلامی روابط بین الملل، ربیع الاوّل ۱۴۱۰ء
صاحب علی، ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، اکتوبر ۲۰۰۶ء
صبا اکرام، جدید اردو افسانہ، چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، دسمبر ۲۰۰۱ء
صغیر افراحیم، اُردو ناول تعریف، تاریخ اور تجزیہ، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۰ء
عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۷ء شک ۱۹۰۹ء
عارفہ فرید، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر کی روایات، رائل بک کمپنی، صدر کراچی، اشاعت اوّل ۱۹۹۳ء

عابد حسین، سیّد، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۵ء
عبد الباری، سیّد، ڈاکٹر، لکھنو ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء
عبد اللہ، سیّد، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، سنگِ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء
عبد المجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء
عتیق احمد، پروفیسر، ناول کا فن، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۱ء
عثمان محمد، پروفیسر، اسلام پاکستان میں، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۴۹ء
عزیز احمد، ناول از تنقیدی ادب، مرتبہ سردار مسیح گُل، نز د سنز، لاہور، س۔ن
عشرت رحمانی، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، جاودان پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶ء
عصمت اللہ شاہ، (مرتب) حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۰ء
عطش دُرّانی، اسلامی فکر و ثقافت، مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۷ء
عکسی مفتی، پاکستانی ثقافت، الفیصل ناشرانِ و تاجرانِ کتب، لاہور، جون ۲۰۱۴ء
علی عباس جلالپوری، سیّد، روحِ عصر، روہتاس بکس، ۱۹۸۹ء
علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ و تنقید، ایجو کیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء
علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، خرد افروز پبلشرز، جہلم، ۱۹۸۷ء
غفور احمد، نئی صدی۔ نئے ناول، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۴ء
غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب (۱۹۴۷ تا حال)، بک ٹاک، لاہور، ۱۹۹۵ء
غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب (شناخت کی نصف صدی)، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء
غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء
غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب، شیخ غلام اینڈ سنز، ۱۹۷۱ء
فردوس انور قاضی، اردو ادب کے مختلف زاویے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء
قاضی جاوید، وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء
قمر رئیس، پروفیسر / عاشور کاظمی، سیّد (مرتبین)، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۴ء
قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ہم عصر اردو ناول (ایک مطالعہ)، نیو انڈیا آفیسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

کاشف صدیقی، دجالی تہذیب، بیت الحکمت، لاہور، س۔ن

کشور ناہید، پاکستان کی تہذیب و ثقافت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۷ء

مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۶ء

مبارک علی، ڈاکٹر، المیہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵ء

مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی واپسی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

محمد ارشد بھٹی، مطالعہ تہذیبِ اسلامی، اصباح الادب، لاہور، ۱۹۶۹ء

محمد حمید شاہد، اردو افسانہ صورت و معنی، مرتبہ، یسیٰن آفاقی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل لاہور، ۲۰۱۹ء

محمد یسیٰن، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، فضلی بک سپر مارکیٹ اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۳ء

مخدوم ٹیپو سلمان، تاریخِ پنجاب کے متنازعہ پہلو (سیاسی، ثقافتی اور علمی زاویے)، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء

مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، بار اوّل، س۔ن

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، بشریاتِ مذہب، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام، ۲۰۰۲ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اقبال اور ثقافت، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۸۶ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۰۴ء

منیر احمد شیخ، تہذیبی رویے، لائلپور نفیس پرنٹنگ پریس، ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء

مقصود جعفری، ڈاکٹر، چراغِ افکار، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو ادب، کراچی، ۱۹۹۷ء

ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، ادارہ نقد ادب، کراچی، ۱۹۹۲ء

ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، اردو ادب کا منظر نامہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

نگینہ جبین، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، دسمبر ۲۰۰۲ء

نوشی انجم، مرتب، سوال یہ ہے، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۴ء

وحید الدین خان، مولانا، مذہب اور سائنس، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء

وحید قریشی، ڈاکٹر، تعلیم کے بنیادی مباحث، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
ولیم جیمز، نفسیاتِ وارداتِ روحانی، مترجم، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء
یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء

رسائل وجرائد

ادبیات (خصوصی شمارہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ)، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء
اردو ریسرچ جنرل، شمارہ: ۵، نئی دہلی اپریل 2015ء
اردو جریدہ (سہ ماہی)، شمارہ: ۲، کراچی، دسمبر ۲۰۲۲
الماس اردو تحقیقی مجلہ، شمارہ: ۱۴، شاہ عبدالطیف یونیورسٹی خیرپور سندھ 2019
الحمد تحقیقی مجلہ، شمارہ: ۹ الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
اردو زبان (ماہنامہ)، سرگودھا، ۱۹۸۳ء
بازیافت (سالنامہ) شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، ۲۰۱۶ء
بنیاد، (مجلہ دراساتِ اردو)، شمارہ: ۱، یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور، ۲۰۲۳ء
جرنل آف ریسرچ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، دسمبر ۲۰۲۳ء
خیابان (ششماہی)، جامعہ پشاور، شعبہ اردو پشاور، خزاں ۲۰۰۶ء
معیار، شمارہ: ۹، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء
نقاط (ماہنامہ)، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء
روزنامہ آج، پشاور، مورخہ ۲۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء

غیر مطبوعہ مقالہ جات

آصفہ نسیم، طاہرہ اقبال ادبی خدمات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل۔ اردو، مملوکہ: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، سیشن: ۱۶۔2012ء
افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اردو، مملوکہ: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء
شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ پی ایچ ڈی اردو، مملوکہ: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء
ضیاء الحسن، اردو تنقید کا عمرانی دبستان، پی ایچ ڈی اردو، مملوکہ: پنجاب یونیورسٹی لاہور

طاہرہ اقبال (انٹرویو) از نگہت نورین، مشمولہ، طاہرہ اقبال کے افسانوں کا کرداری مطالعہ، مملوکہ: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

لغات

احمد دہلوی، سیّد، مولوی، مرتبہ، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۶ء

فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغّات، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر (مولف) قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

حامد علی خاں، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد اوّل، شیخ نیاز احمد پبلشرز، لاہور

درسی اردو لغت، جلد سوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۲ء

ساجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر، فرہنگِ علوم وادبی اصطلاحات، مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

شان الحق حقی (مرتبہ)، فرہنگِ تلفظ، طبع سوم، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۸ء

صدیق قریشی، محمد، مرتب، کشافِ اصطلاحات تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

عبد الحمید خان، جامع انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء

خویشگی، محمد عبد اللہ خان، فرہنگِ عامرہ، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

محمد امین بھٹی (مرحوم) الحاج، اظہر اللغّات، عربی سے اردو، فارسی سے اردو، اظہر پبلشرز، لاہور، س ن

نور الحسن نیرّ، مولوی، نور اللغات (جلد دوم) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

نجیب رامپوری، نئی اردو لغت (جامع) ملک بک ڈپو اردو بازار لاہور، س ن

وارث سرہندی (موٴلف) جامع عملی اردو لغت، طبع سوم، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳ء

وارث سرہندی (موٴلف)، قاموسِ مترادفات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

انگریزی کتب

*Fukuyama,francis,The end of History and the Last man,"The Hearst corporation, New York,1992.

*The penguin Dictionary of Sociology, Peng:m Group,England-1994.

ویب گاہیں (انٹرنیٹ ذرائع)

www.bbc.com

express.pk

www.fincash.com

www.faizghar.com

library bazmeurdu.net

www.rekhtadictionary.com

www.thesouthpress.com

www.wikipedia.org